Rs. 200/-

سہ ماہی

شمارہ 3-4

دہلیز

مدیر اعلیٰ:
ڈاکٹر مغل فاروق پرواز

مدیر:
زمرد مغل

آرزو کا سفر

ڈاکٹر مغل فاروق پرواز

سہ ماہی دہلیز 3-4

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر مغل فاروق پرواز

موبائل:0955473541

08826975754

مدیر

زمرد مغل

موبائل:09873480907

سہ ماہی دہلیز

وارڈ نمبر 2 نزد آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن پونچھ، جموں و کشمیر-185101

DEHLEEZ

URDU QUARTERLY

Chief Editor

Dr. Mughal Farooq Parwaz

Editor

Zamarrud Mughal

قیمت : ایک سو روپے (-/100) غیر ممالک 60 امریکی ڈالر
(خصوصی شمارہ قیمت 200 روپے)

زر سالانہ : چار سو روپے (عام ڈاک سے) پانچ سو روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے)

ادارہ جات سے: ایک ہزار روپے (سالانہ

کمپوزنگ : ممتاز احمد

ادارہ ''دہلیز'' اپنے قارئین سے گزارش کرتا ہے کہ ''دہلیز'' کو اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات / مضامین ہی بھیجیں۔ مطبوعہ مضامین / تخلیقات کو شائع کرنے کے لیے ادارہ پابند نہیں ہوگا۔

mudeerehleez@gmail.com

اڈیٹر، پرنٹر، پبلشر ڈاکٹر مغل فاروق پرواز نے، دہلی-6 میں چھپوا کر
وارڈ نمبر 2 نزد آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن پونچھ، جموں و کشمیر-185101 سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اداریہ

تخلیقی اقدار

ڈاکٹر مغل فاروق پرواز

کرۂ ارض پر چھ بلین سے بھی زیادہ جو لوگ گھوم رہے ہیں ان میں سے اکثریت ان کی ہے جن کی اصلی شخصیت کی جگہ ان کے سائے گھوم رہے ہیں، اور جو آج اپنی ان پرچھائیوں کی جگہ موجود ہوتے اور وہ سارے کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہوتے اگر سماج نے انہیں فطری بنیادوں پر پروان چڑھنے دیا ہوتا اور اگر ان کا بچپن میں ہی گلا گھونٹ کر ان کو ابدی نیند نہ سلا دیا گیا ہوتا۔ اس دنیا کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگتی کہ یہ آوے کا آوا ہی آسیب زدہ ہے۔

اس دنیا میں بے شمار چرند، پرند، چوپائے، حیوانات، حشرات الارض ہیں جو زندہ ہیں مگر اپنے زندہ ہونے کے ادراک سے محروم ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہر زندہ چیز کو ایک نہ ایک دن موت کا مزہ چکھنا ہے مگر مذکورہ بالا جاندار کو اس کا احساس بھی نہیں ہے۔ اس کائنات میں صرف انسان ایک ایسا استثنا ہے جو زندہ ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کے ادراک سے لبریز اور موت کے احساس اور تصور سے آشنا ہے۔ تمام حیوانات عمر بھر تخلیقی عمل سے گزرتے ہیں مگر ان کا یہ تخلیقی عمل جبلی سطح پر انجام پاتا ہے۔ لیکن انسان تخلیقی سطح کو جبلی سطح کے بجائے تخلیقی سطح پر انجام دینے کی نعمت سے بھی مالا مال کیا گیا ہے۔ ایک عام انسان میں اور ایک تخلیق کار میں یہی فرق ہے کہ عام انسان جبلی سطح پر ہی تخلیقی عمل کو انجام دیتا ہے جبکہ ایک تخلیق کار اپنے تخلیقی عمل کو جبلی سطح سے اوپر اٹھ کر تخلیقی سطح تک لے آتا ہے۔ اب بڑا تخلیق کار وہ ہے جس کے شعور اور لاشعور کے بیچ میں توازن قائم ہو جائے۔ اور وہ اپنی تخلیقی سطح کو جبلی سطح میں تبدیل نہ ہونے دے۔ عام تخلیق کار جب تخلیقی عمل کو تخلیقی سطح پر بار بار انجام دیتا ہے تو تخلیقی سطح جبلی سطح میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ایسا زندگی بھر ہوتا رہتا ہے۔ کہ تخلیقی سطح ایک مدت کے بعد جبلی سطح میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اس کے بعد تخلیق کار کو اپنے آپ کو پہلے کے مقابل میں اور زیادہ بلند ہونا پڑتا ہے تاکہ ایک نئی تخلیقی سطح دریافت کر سکے۔ بڑا فنکار ہمیشہ ہی فعال رہتا ہے اور وہ زندگی کے تخلیقی سفر میں کسی بھی مقام پر تھک کر دم نہیں لیتا جبکہ ایک اوسط درجہ کا فنکار اس سفر کے کسی نہ کسی مقام پر

تھک کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ مزید نئے جہانوں کی تلاش کا حوصلہ نہیں جٹا پاتا۔

اس مقام پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر انسان تخلیق کار ہے؟ اس کا جواب دینے کے لیے مرزا غالب کے دیوان کو حوالہ بنانے کیضرورت نہیں اور نہ ہی شیکسپیئر کے کسی ڈرامے پر سمینار منعقد کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کائنات میں انسان استثنائی طور پر ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے احساسات کو اظہار کا جامہ پہناتا ہے کیونکہ وہ اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ جس کے لیے اس نے سیکڑوں زبانوں کو ایجاد کیا ہے۔ اس کرۂ ارض پر بہت سی زبانوں کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر انسان تخلیق کار ہے۔ اور حیران کر دینے والی بات یہ ہے کہ ایسا انسان نے تب کیا ہے جبکہ جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ دور جاہلیت میں بھی انسان نے رشتوں کے مفاہیم اور تقدس کو برقرار رکھا ہے۔ ''ماں'' کا لفظ جن معانی و مفاہیم پر دلالت کرتا ہے وہ تمام کے تمام تہذیب انسانی کے بالکل ابتدائی دنوں میں ہی رائج ہو چکا تھا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ تہذیب انسانی کے ترقی یافتہ درندے مابعد جدیدیت کے نام پر ''ماں'' میں کبھی بہن کا اور کبھی بیوی کا مفہوم برآمد کریں اور ایسا اس دنیا میں زور و شور سے جاری ہے۔ اس دنیا کا ایک بڑا نیٹ ورک ''وائف ایکسچینج'' ''مدر ایکسچینج'' ''سسٹر ایکسچینج'' کے ذریعے مابعد جدید تہذیب کو استحکام عطا کرنے میں دن رات مصروف ہے۔ اگر اخلاقی قدریں اسی تیز رفتاری سے زوال کی طرف گامزن رہیں تو بہت جلد سماج اور تہذیب کی چولیں ہل جائیں گی۔

ایک مسئلہ تخلیق کاروں کا یہ بھی ہے کہ اگر کوئی صاحب شاعری کرتے ہیں تو اپنے آپ کو فل ٹائم شاعر سمجھتے ہیں۔ بال لمبے کر لینا، شراب کے پیگ پہ پیگ لیے جانا ان کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔ مگر تخلیقی عمل زندگی سے عبارت ہے اور زندگی غیر یقینی ہے۔ جس طرح سے انسان ہمیشہ ایک جیسے احساسات کے ساتھ نہیں رہتا ایسے ہی تخلیقی عمل بھی ایک تخلیق کار کو ہمیشہ اپنی گرفت میں نہیں رکھتا۔ ''تخلیقی عمل'' ایک کیفیت کے تحت ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ خواہ وہ آورد ہو یا آمد (اگر آورد اور آمد کوئی دو الگ چیزیں ہیں تو؟) اور وہ کیفیت وقتی ہوتی ہے اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہر بار تخلیق کار پہ ایک سی کیفیت طاری ہو۔ اگر تخلیق کار اس بات کو شعوری سطح پر برتنے لگے تو زندگی اور وجود کے معمولی تجربات کے تقدس کو محسوس کر پائے گا جو اسے ہر وقت تازہ دم رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا کیونکہ تخلیق کار کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے اسے زندگی اور وجود کے معمولی قوانین کے تحت ہی گزر بسر کرنی ہوتی ہے۔

زندگی میں بڑا قدم اٹھانے کے لیے حوصلے کی ضرورت پڑتی ہے اور تخلیقی عمل سے گزرنا ایک بڑا قدم ہے بالکل ویسا ہی جیسے انسان زندگی میں بہت سے خطرناک کردار انجام دیتا ہے بلکہ ان سے بھی کہیں زیادہ مشکل اور خطرناک ایک تخلیق کار کو ایک جنگجو کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہادری سے کام لینا پڑتا ہے۔

لوگ ایک تخلیق کار کو بنے بنائے ڈھرے کے اردگرد ہی منڈلاتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں ہر شخص کے لیے کچھ کردار میزان کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں مثلاً اگر کوئی شاعر ہے تو اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ میر، غالب، مومن، اقبال، ن۔م راشد، میراجی یا اختر الایمان جیسا بن جائے۔ مگر ایک سادہ سی بات یہ لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر کوئی مرزا غالب کی زندگی نہیں جی رہا یا ان واقعات وحوادت سے نہیں گزرتا جس سے غالب گزرے، غالب کا عہد اس کے عہد سے مختلف ہے، یہ تخلیق کار ایک بالکل مختلف زندگی جی رہا ہے تو یہ غالب کیونکر ہوسکتا ہے۔ ہمارے نقاد حضرات کو ہر جگہ ہر چیز میں من وسلویٰ کے نزول کی ضد ہے مگر زندگی اور وجود کو یکسانیت بالکل پسند نہیں، دہرائے جانے کے عمل کو زندگی اور وجود یکسر مسترد کرتے ہیں اس لیے ساقی فاروقی میں آپ کو ساقی فاروقی ہی نظر آئے گا، ظفر اقبال میں ظفر اقبال ہی سے ملاقات ہوگی۔ غالب یا میر یا اسیر یا جلال سے نہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ان تمام قوانین سے مبرا سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جیسی ضد ان کو منیر نیازی سے ہوگی کہ وہ میر تقی میر جیسا لگے، ویسی شکایت ان کو حسن عسکری سے کبھی نہیں رہی کہ وہ حالی جیسے کیوں نہیں ہیں۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ آپ ان تمام علوم وفنون کو جو آپ نے سالوں کی انتھک محنت سے حاصل کیے ہیں، ان تمام وتجربات کو جن سے آپ کا سابقہ پڑا ہے یا ان تمام احساسات وخیالات کو جو آپ کے وجود کا حصہ ہیں، کو گہری نیند سلادیں۔ بلکہ ان سب کے لیے آپ اپنے آپ کو ایک پرزم میں تبدیل کردیں تاکہ ایک '' تخلیقی اسپیکٹرم'' کے وجود کو یقینی بنایا جاسکے جبکہ زندگی کا تاریخی سفر مثبت قدروں کی مذمت سے عبارت ہے۔ اور اس بھیر میں کبھی کبھی کوئی شخص زندگی اور وجود کی طرف دوستانہ ہاتھ بڑھاتا ہوا بھی دکھائی دے جاتا ہے لیکن اس طرح کی مثالوں سے تاریخ انسانی بھری ہوئی نہیں ہے۔ ایسی مثالیں تاریخ انسانی میں خال خال ہی ہیں۔

انسان نے ستاروں پر کمندیں ڈال دی ہیں۔ محیر العقول ایجادات اور دریافتوں کے ذریعے کرۂ ارض کو حیرت کدہ بنا کر رکھ دیا ہے حتیٰ کہ قدرت کے رازہائے سربستہ میں سیندھ لگانے کی کوشش بھی جاری ہیں۔ گاڈ پارٹیکل کی دریافت کو ایک نئے عہد کے دیباچے کے طور پر دیکھا جارہا ہے۔ بہت سے لوگ انسان کی اس قدر ترقی سے حیرت زدہ دکھائی دیتے ہیں۔ جبکہ سچ تو یہ ہے کہ انسان کو جتنی اور جس قدر صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ تمام ترترقیاں اونٹ کے منہ میں زیرہ کے برابر بھی نہیں ہیں۔ انسانی صلاحیتوں کا سفر تو ابھی شروع ہوا ہے۔ رہی حیران ہونے والی بات تو حیرت اس بات پر تو بالکل بھی نہیں ہونی چاہیے جب کوئی انسانی چاند ہر قدم رکھ دے یا کلوننگ کے ذریعے ڈالی کو منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوجائے یا ہیملٹ، ڈاوانکا نووا، فاسٹس، دیوان غالب، اسرار خودی وغیرہ کے ذریعے کارہائے نمایاں انجام

دے بلکہ حیرت اس بات پر ہونی چاہیے کہ ایک انسان اتنی صلاحیتوں کے باوجود کچھ نہ کرے، کھانے، پینے اور آرام کرنے میں زندگی گزارتا چلا جائے، معمولات زندگی کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھے یہاں تک کہ داعی اجل کو لبیک کہنے کا وقت آجائے۔ یہ سوچ اور سمجھ کا فرق ہی ہے جو اس دنیا کو جہنم کدہ بنائے ہوئے ہے۔ ہر شخص یہاں وہاں دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے کا درس دیتا نظر آئے گا۔ جبکہ چاہیے تو یہ تھا کہ ہماری تربیت اس نہج پر کی جاتی کہ ہم جس طرح سے دوسروں کو دکھی دیکھ کر دکھی نہیں ہوتے، دوسروں کا جانی اور مالی نقصان ہمیں پریشان نہیں کرتا ٹھیک اسی طرح سے ہم اپنا جانی اور مالی نقصان بھی بخوشی سہہ لیتے۔ متذکرہ بالا فلسفہ کتنا درست ہے اور کتنا ممکن العمل، اس سے قطع نظر یہاں ایک بات تو تسلیم کرنی ہی پڑتی ہے کہ درد یا تکلیف کسی خاص قصے یا واقعے کا خاصہ نہیں ہے بلکہ یہ ہماری سوچ اور سمجھ کا ہی فرق ہے جو کسی خاص بات میں خوشی تلاش کر لیتا ہے اور کوئی دوسری واقعہ اسے غمگین کر دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے ترقی پسندی کی طرح آنے والے دنوں میں دنیائے ادب میں ایسی تحریکیں برپا ہوں جو انسان کو یہ درس دیتی نظر آئیں کہ کسی بھی حادثے یا واقعے سے کوئی اثر نہیں لینا ہے، نہ ہی خوشی کا اور نہ ہی غم کا، اور جو کسی بات پہ خوش یا غمگین دکھائے دے اسے ۸۰ کوڑے مارے جائیں یا بجلی کی شاک ٹریٹمنٹ دیا جائے یا پھر سولی پہ ہی کیوں نہ چڑھا دیا جائے اور پھر ان اصول وضوابط کو سامنے رکھ کر جو فن پارہ وجود میں آئے گا وہ ترقی پسند ادب سے کم مضحکہ خیز بھی نہیں ہوگا۔

ایک انسان کے جسمانی سفر کو تو معاشرہ برداشت کرتا رہتا ہے مگر اس کے نفسیاتی اور ذہنی سفر سے اسے حد درجہ بغض وعناد ہے۔ دنیا بھر کے نظریات بھانت بھانت کے تصورات اور اصول وضوابط ایک انسان کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر اپنا سفر جاری رکھنے نہیں دیتے، یہی وجہ ہے کہ ایک شخص جب جسمانی اعتبار سے ستر کے پیٹے میں ہوتا ہے اس کا ذہن محض دس یا بارہ سال کا ہوتا ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران جب ماہرین نفسیات نے نسل انسانی کا معائنہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بنی نوع انسان کی اکثریت کی جسمانی اور ذہنی عمروں میں نا قابل عبور مکانی اور زمانی فاصلہ پایا جاتا ہے، لیکن ایک بڑے تخلیق کار کا ذہنی اور جسمانی سفر ساتھ ساتھ جاری وساری رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر بڑا تخلیق کار وہ ہے جس کی ذہنی اور جسمانی عمروں میں یا تو سرے سے فرق پایا ہی نہ جاتا ہو یا پھر وہ فرق نا قابل عبور نہ ہو۔ ظاہر ہے یہ دونوں سفر غیر شعوری طور پر انجام پاتے ہیں، لیکن اگر یہ دونوں سفر شعوری سطح پر جاری رکھے جائیں تو بڑے تخلیق کاروں کا جو قحط دیکھنے میں آتا ہے اسے قصۂ پارینہ بننے میں دیر نہیں لگے گی۔

جہاں تک تخلیقی عمل کا تعلق ہے تو اس کے لیے پی ایچ ڈی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عاقل اور بالغ ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ نسل انسانی ہر لمحہ تخلیقی عمل سے گزر رہی ہے۔ یہ تخلیقی عمل ہی ہے جو نسلوں، ذاتوں، قوموں، ملکوں، مذاہب، تہذیبوں، تمدنوں، کنبوں اور قبیلوں کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہے۔ اگر

تخلیقی عمل ایک لمحہ کے لیے بھی رک جائے تو کائنات کو جہنم بننے میں دیر نہیں لگے گی۔ اگر ایک چھ مہینے کا بچہ تخلیقی عمل سے گزرنا بند کر دے تو اس کے والدین اسے اٹھا کر فٹ پاتھ پر پھینک دیں گے۔ یہ تخلیقی عمل ہی ہے جو مثبت توانائیوں کو فعال رکھتا ہے۔ بصورت دیگر نتائج بھیانک بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ تخلیقی عمل کا فقدان ہی تھا جس نے عیسائیت کو رہبانیت پر ابھارا، کیونکہ صدیوں تک عیسائی جنسی عمل سے گزرنے کا صرف ایک ہی طریقہ جانتے تھے، اب ایک ہی طرح سے ایک عمل سے زندگی بھر گزرتے رہنا کس قدر بورنگ (Boring) ہو سکتا ہے اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے دنیاداری کو ہی سرے سے دھتکار دیا اور رہبانیت کو ہی واحد نجات دہندہ کے طور پر دریافت کیا۔ ہندوستان کی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن وتسیا ئین نے ''کاماسوتر'' لکھ کر اور اس میں جنسی عمل سے گزرنے کے چوراسی دریافت کردہ نایاب طریقوں کے ذریعے خاندانی نظام کو تباہ و برباد ہونے سے بچالیا۔

ایک شخص کے اندر یا تو چوبیس گھنٹے تخلیقی عمل جاری و ساری رہتا ہے یا پھر سرے سے اس کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ ایک انسان اپنی زندگی کے ایک حصے کو تخلیقی وصف سے متصف نہیں کر سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر وقت تخلیقی عمل سے غزل، نظم یا افسانہ ہی برآمد ہو۔ ایسا ہونا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی ممکن۔ جہاں تک ناول کا تعلق ہے تو اس میں ناول نگار کا کردار ایک ایسی روح کا ہوتا ہے جو چولے بدلتی رہتی ہے، ڈھائی تین سو صفحات کے ایک ناول میں مصنف کی روح کبھی کسی کردار کے جسم میں داخل ہوتی ہے کبھی کسی دوسرے کردار کا بدن اس کا مسکن ٹھہرتا ہے۔ جبکہ افسانے میں ایسا نہیں ہوتا۔ ایک افسانے میں مصنف کی روح کا سفر کسی ایک ہی کردار کے جسم کو افسانے کے اختتام پذیر ہونے تک اپنا مسکن بنائے رہتا ہے۔ اس لیے افسانے کے تعلق سے تنقید کے بجائے نقادوں نے افواہوں کو فروغ دیا ہے۔ جہاں پر افسانہ نگار کی تربیت کرنی چاہیے وہاں وہ علامتوں، تمثیل، بیانیہ وغیرہ کا رونا رونے لگتے ہیں اور افسانے کی چیر پھاڑ میں مصروف ہو جاتے ہیں اور جہاں افسانے کی بنت کی ڈھیلی کڑیوں کو کسنا ہو وہاں وہ افسانہ نگار پر اپنی محنت صرف کرتے نظر آتے ہیں۔ میری ناقص رائے کی حد تک ابھی افسانے کے امراض کی تشخیص کا فریضہ بھی بحسن وخوبی انجام نہیں دیا جا سکا ہے۔ دراصل افسانے یا ناول یا نظم یا غزل ایک تخلیق کار سے جدا ہونے کا عمل بالکل ویسا ہی ہے جیسے ایک پکے ہوئے پھل کا درخت پر سے گرنا۔ ایک تخلیق کار کے اندر جب کوئی واقعہ یا خیال نفسیات انسان کے سرما، گرما، بسنت تک پک کر تیار ہو جاتا ہے اور تخلیقی عمل کسی واقعے یا خیال کو تخیل میں ڈھال دیتا ہے۔ پھر وہ تخیل تخلیقی مزاج کے تحت کسی نثری یا نظمیہ صنف سخن میں ڈھل جاتا ہے۔

افسانہ بھی ناول کی طرح ہی زندگی اور وجود کی پر اسراریت کی نقاب کشائی کا فریضہ انجام دیتا ہے اور

کوئی بھی ایسی چیز جو زندگی اور وجود کے معانی اور مفاہیم دریافت کرنے میں ممد و معاون ہو معمولی نہیں ہو سکتی۔ پلاٹ کا قصہ چھیڑ کر، مواد کو بنیاد بنا کر، زبان کے استعمال اور بیانیہ اور اسلوب کے بہانے ہم کسی صنف سخن کو معمولی قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ دراصل ہم معاشرے کے گریبان میں جھانک کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے نسل انسان کے خیالات و احساسات و جذبات کو بخوبی سمجھ لیا ہے۔ اس کے لیے اتنا کافی نہیں ہے بلکہ ہمیں تخلیق کار کا انفرادی سطح پر مطالعہ کرنا ہوگا۔ کسی صاحب کی زندگی کا مقصد اگر بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونا ہو تو اس کو زندگی اور وجود کے لیے رول ماڈل قرار نہیں دیا جا سکتا ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے شخص کے لیے ''ترچھی ٹوھی والے'' جیسے کسی گیت پر رقص کرنا وزیر اعظم بننے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہو۔

ہم جتنی جلدی ہو سکے اس سچائی کو تسلیم کر لیں تو بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔ تخلیقی عمل کو بھی بیڑیاں پہنا کر بندی نہیں بنایا جا سکتا۔ ''تخلیقی عمل'' کبھی بھی معمولی نہیں ہوتا اور افسانہ بھی تخلیقی عمل سے عبارت ہے۔ اس لیے اس کے معمولی صنف سخن ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نظریات تھوپنے کا سلسلہ بے معنی ہونے کے ساتھ ساتھ لامتناہی بھی ہے۔ مثال کے طور پر ایک اسکول آف تھاٹ نے خاندان کو معاشرتی نظام کی اکائی قرار دیا تو دوسرے نے اسے معاشی نظام کی اکائی قرار دے کر اول الذکر کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کی کوشش کی۔ ہمیں زندگی اور وجود کو ایک رنگ میں رنگنے کے بجائے اس کی رنگارنگی کو تسلیم کرنا ہوگا مگر نقاد کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی۔ کیونکہ تخلیق کاروں کے مختلف رجحانات اور میلانات، جو ہر لحہ تغیر پذیر بھی ہوں، کے ساتھ ایک ساتھ نباہ کرنے کے لیے جس حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ تخلیق کار ہی کا حصہ ہے۔ کیونکہ ایک بڑا تخلیق کار دوسروں کے نظریات تو کجا خود اپنے تجربات کو بھی باہری عناصر سے تعبیر کرتے ہوئے ان کی مطلق العنانیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے آمد اور آورد کی اصطلاحات کے خدوخال پہلے سے زیادہ واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور سچی بات ہے بھی یہی انسان فطرتاً پر امن مخلوق ہے۔ دنیا میں پچھلے تین ہزار سال میں پانچ ہزار خونریز جنگوں کی جو تاریخ اس نے رقم کی ہے وہ اس کے فطری میلانات اور رجحانات سے لگا نہیں کھاتی۔ ہاں ہم نے لا اینڈ آرڈر کے نام پر بڑی بڑی حکومتیں قائم کر کے، جاسوسی نظام کے نہایت ہی پیچیدہ قسم کے ادارے قائم کر کے، پولیس، فوج اور دیگر اداروں کو قائم کر کے انسان کی صلاحیتوں کو للکارنے کی جو غلطی کی ہے، یہ اسی کا خمیازہ ہے جو نسل انسانی نے پچھلے تین ہزار سالوں میں بھگتا ہے۔ آج بھی اگر نسل انسانی تمام حدود کو مسمار کر دے، تمام حکومتوں کو تحلیل کر دیا جائے، تمام افواج، پولیس و دیگر ادارے بند کر دیے جائیں اور انسان کو اس کے اپنے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے تو ایک بہتر مثالی معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ جو کچھ ریکارڈ ہوا وہ اس سے کمتر

ہے جو کہ فی الواقع ظہور پذیر ہوا، اور پھر اس اصل سے کمتر کو اسمگل کر کے لانا اور اس کی تاریخ اور جغرافیہ سے یکسر الگ ایک بالکل ہی نئی تہذیب کی آبیاری کے لیے اس سے بہت ساری امیدیں وابستہ کر لینا میرے نزدیک سادہ لوحی کی بدترین مثالوں میں سے ہے۔ اور پھر دیکھنا یہ بھی ہے کہ آیا تخلیق کار کو رہنمائی کی ضرورت ہے یا آگاہی کی؟ اور یہ نظریات کتنے ہی معنویت سے پر اور موزوں کیوں نہ ہوں، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ خود آگاہی کا وسیلہ ہیں یا رہنمائی کا ذریعہ؟ یا پھر یہ سرے سے کسی لائق ہی نہیں ہیں؟

میں سمجھتا ہوں کہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اس ''ادبی امپریلزم'' کو سنجیدگی سے لیں۔ میں ''دہلیز'' کے قارئین کو اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے بھی نہیں کہوں گا، کیونکہ وہ بھی ''کنڈیشننگ'' کی ہی ایک صورت ہوگی۔ بجائے اس ادبی امپریلزم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے ہمیں اس کو سنجیدگی سے لینا ہوگا اور اس کے محاسن و معائب کا بخوبی جائزہ لے کر مستقبل کا لائحہ عمل طے کرنا ہوگا۔ ''اردو ادب'' کے مستقبل کا لائحہ عمل طے کرتے ہوئے ہم اس بات سے صرف نظر کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ ہمارے قاری کو کئی سوراخوں سے کئی بار ڈسا گیا ہے، ہمارا قاری زخم خوردہ ہے۔ ''دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔'' کے مصداق وہ کوئی بھی قدم اٹھاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اس کے لیے ''تخلیقی عمل'' ایک ایسی پراسرار شے کی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا ہے کہ جو اس کے قریب ترین ہو پھر بھی اس کے بارے میں کچھ کہنا اسے قبل از وقت محسوس ہوتا ہو۔

سرحدوں کے پار آباد ہوتی اردو کی بستیاں اس تنوع کی بھی متقاضی ہیں جو بیک وقت مغرب و مشرق کی بہت سی تہذیبوں کے لیے اپنے دامن میں جگہ رکھتا ہو۔ ہوا یہ ہے کہ ابھی تک ہم نے یا تو مغرب کو نظر انداز کیا ہے یا مشرق کو؟ انصاف کسی ایک کے ساتھ بھی نہ ہو سکا۔ ہمیں اردو زبان و ادب کو اس قابل بنانا ہوگا کہ وہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ، مختلف جغرافیائی حدود میں، مختلف اساس پر کھڑی بلند بانگ تہذیبی اقدار میں اپنے لیے جگہ بنانے کے قابل بنائیں۔ ہوا یہ ہے کہ ہم نے آج تک اردو کو منی بھائی کے کوٹھے سے نکلنے نہیں دیا یا پھر زیادہ سے زیادہ محلے بھر میں گھومنے کی اجازت دے دی۔ اس سے زیادہ کا حوصلہ ہم نہیں جٹا پائے۔ اور ایسا کرنے میں خطرہ اس بات کا ہے کہ کہیں مختلف جغرافیائی حدود میں گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ علاقائی تمدن کے عناصر اردو پر غالب نہ آ جائیں اور اگر ایسا ہوتا ہے جس کے قوی تر امکانات بھی ہیں، تو یہ اردو کے وجود کے لیے خطرے کی گھنٹی کے مترادف ہوگا، لیکن خطرہ مول لینے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ اگر ہم اردو کو انگریزی کی طرح اتنا طاقتور بنا دیں کہ ''تہذیبوں کے تصادم کے دوران اس میں ناگزیر تبدیلیاں رونما ہونے کے باوجود یہ اردو ہی رہے تا کہ آنے والے کل کو ہمیں ہندوستانی اردو، امریکی اردو، چینی اردو، جاپانی اردو وغیرہ جیسا کچھ سننے کو ملے اور اردو مشرق اور مغرب کی تمام تہذیبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل ہو جائے۔

دہلیز اسپیشل

زمرد مغل

منٹو کے نقاد

منٹو کو ان کے افسانوں کی وجہ سے کئی مقدموں کا سامنا کرنا پڑا۔ اخبارات و رسائل و جرائد نے منٹو کے خلاف ہذیان گوئی کو اپنا وطیرہ بنا رکھا تھا۔ مگر منٹو نے ان اخبارات و رسائل و جرائد کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں کیا۔ مقدمہ تو دور کی بات ہے حرف شکایت بھی زبان پر نہیں لایا۔ اگر کبھی کسی نے کوئی ذکر چھیڑ دیا تو ہلکی سی مسکراہٹ یا کسی جملے سے آئی بلا کو ٹال دینے کو ہی اپنے تخلیقی وقار کی بحالی کا ذریعہ بنایا۔

جہاں ایک طرف لوگ منٹو کے خلاف صف آرا تھے وہیں دوسری طرف نقادوں میں سے بھی معدودے چند کے علاوہ بیشتر منٹو کے خلاف صف آرا دکھائی دیے۔ انہوں نے منٹو کو عریانیت اور فحاشی کا پیغامبر ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ الگ بات ہے کہ جب مذکورہ نقادوں نے خود کوئی تخلیقی کارنامہ انجام دیا تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے انہوں نے تخلیق کو بے لباس کر دیا ہو اور وہ بھی بیچ چوراہے پر ان ادبی فسادیوں نے ملک کے ان فسادیوں کو بھی ہزاروں میل پیچھے چھوڑ دیا جنہوں نے ساٹھ ہزار فسادات کے ذریعے ملک کی ایک بڑی اقلیت کے خلاف محاذ کھولے رکھا ہے۔ جس کا سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔ ان ادبی فسادیوں نے جب بھی کوئی نظم لکھی یا افسانہ یا ناول یا غزل تخلیق کی تو ایسا محسوس ہوا کہ انہوں نے نظم تخلیق نہ کر کے تخلیق پر پھبتی کسی ہو۔ جہاں لکھا گیا افسانہ افسانے سے زیادہ افسانے پر کسی گئی پھبتی سے زیادہ مشابہت رکھتا ہو وہاں منٹو جیسے جینوئن تخلیق کار کے ساتھ انصاف ہوگا اس کی امید کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ انصاف کے عناصر کی تلاش کا فریضہ انجام دینے کے بجائے ان لوگوں کی تحریروں سے روشنی حاصل کی جانی چاہیے۔ جو تخلیقی زندگی کی دھوپ چھاؤں میں ہمیشہ منٹو کے ساتھ کھڑے دکھائی دیتے رہے ہیں۔ مگر ایک ایسے عہد میں جب میڈیا کے قصر سچائی کے لاشے پہ تعمیر کیے گئے ہوں، ایک ایسے وقت میں جب لوگ بڑے بڑے نیوز چینلوں کے اخبارات و جرائد و رسائل، انٹرنیٹ، یوٹیوب فیس بک و دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعے سچ کو دفن کر کے اس کے مدفن پہ اپنے ہاتھوں سے مٹی ڈالنے میں مصروف عمل ہوں وہاں پر یا تو سچائی کو پیش ہی نہیں کیا جائے گا یا پھر آدھا سچ ہی قارئین کے ہاتھوں

کی لکیروں کا حصہ بن پائے گا۔

مگر مجھے شکایت ان سے نہیں ہے جنہوں نے منٹو کے خلاف پہ در پہ کئی مقدمات قائم کیے، مجھے شکایت ان سے بھی نہیں ہے جنہوں نے منٹو کے خلاف اخبارات ورسائل وجرائد میں نازیبا الفاظ کا استعمال کیا، مجھے شکایت ان ادبی فسادیوں سے بھی نہیں ہے جو منٹو کے خلاف صف آرا تھے، مجھے کوئی بھی شکوہ اس میڈیا سے بھی نہیں ہے جو آدھے سچ کو منظر عام پر لانے کے نظریے کو وقت کی ضرورت قرار دیتا ہے، بلکہ مجھے شکوہ ان سے ہے جو منٹو کے اپنے تھے، جو منٹو کے ساتھ ان کی ادبی زندگی اور تخلیقی عمر کی دھوپ چھاؤں میں ان کے ساتھ کھڑے رہے، جنہوں نے منٹو کو عظیم افسانہ نگار نہ صرف قرار دیا بلکہ دنیا کو منٹو کی عظمت کا اعتراف کرنے پر بھی مجبور کر دیا۔ لیکن کیا ایک پیاس کے مارے کو جب کہ اس کو پانی کی شدید ضرورت ہو بجائے پانی کا ایک گلاس اس کے سامنے بڑھانے کے اس کی شان میں عظمت کے قصائد پڑھنے سے اس کی پیاس بجھ جائے گی؟ ایک ادیب اپنی زندگی میں بہت سے موضوعات کو اپنی تخلیق کے ذریعے زبان عطا کرتا ہے لیکن تمام موضوعات میں اس کے دل کی تڑپ کا گراف ایک سا نہیں ہوتا۔ اسی لیے ایک فنکار کے تعلق سے جب تک اس کے حساس ترین موضوع کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا تب تک اس فنکار کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ منٹو کے افسانوں میں وہ تمام خصوصیات بھی ہیں جن کی طرف نقادوں نے اپنی تنقیدی تحریروں میں اشارہ کیا ہے یا پھر جن کا تفصیلی ذکر کیا ہے مثلاً وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیوں کا رونما ہونا، نئی تہذیب کا انگڑائی لینا، پرانی تہذیب کا رفتہ رفتہ مٹتے چلے جانا، سماج کے اندر گندگی کا موجود ہونا وغیرہ، لیکن اگر آپ منٹو کے افسانوں کا مطالعہ کریں تو بات صرف عہد کی تبدیلی کی نہیں رہ جاتی ہے، بات تہذیب نو کی انگڑائی تک بھی محدود نہیں رہتی، بات سماج میں موجود گندگی سے بھی بہت آگے کی ہے کیونکہ بات ہے صدیوں پر پھیلی ہوئی اس سازش کی جس کا لاوا صدیوں بعد پھوٹا تھا۔ جو کھچڑی صدیوں تک پکتی رہی اس کا خمیازہ تھا کہ ایک مخصوص طبقے کے خلاف ایک نیا نظام کھڑا کیا گیا، ایک نئی تہذیب کی بنا ڈالی گئی، ایک نیا نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا گیا، تا کہ اس مخصوص طبقہ پر زندگی کو تنگ سے تنگ تر کیا جا سکے۔ جس کی مثال وہ ساٹھ ہزار فسادات ہیں جس میں اس طبقے کی ماؤں کی گودیں سونی ہوگئیں، عورتیں بیوہ ہوئیں، بچے یتیم ہوگئے، بہنوں کی عصمتیں تاراج ہوئیں، حاملہ عورتوں کو زندہ جلا دیا گیا، اس طبقے کی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا تہذیبی فریضہ بھی انجام دیا گیا۔ ایک ایشر سنگھ میں منٹو نے ایک تہذیب کے کئی رنگ دکھائے تھے مگر ڈھاک کے تین پات لوگ صرف جنسی عمل کو ہی موضوع سخن بنا کر بیٹھ گئے۔

منٹو کی وفات کے بعد ''نقوش'' نے منٹو پر ایک نمبر نکالا جس میں اظہار خیال کرنے والے بیشتر تو ایسے تھے کہ جن کے وہ مضامین سرے سے قابلِ اشاعت نہیں تھے چہ جائے کہ ان مضامین کو ترجیحی بنیادوں پر شائع

کیا گیا۔ مثلاً منٹو کے فن پر لکھنے والوں میں جو مضمون فہرست میں سب سے اوپر نظر آتا ہے وہ ممتاز شیریں کا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے 'منٹو کی فنی تکمیل' مضمون شروع ہوتا ہے ان جملوں سے:

''منٹو کے آخری دور کی دو تحریریں میری نظر میں منٹو کی ادبی تکمیل کا مظہر ہیں۔ ڈرامہ ''اس منجدھار میں'' اور افسانہ ''سڑک کے کنارے'' 'بابو گوپی ناتھ' بڑا اہم موڑ تھا جس سے منٹو کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس میں منٹو نے خلاف معمول بڑا بھرپور، پیچیدہ اور مکمل کردار پیش کیا تھا اور اس کردار کو پیش کرتے ہوئے منٹو کا رویہ بھی ایک سچے فنکار کا رویہ تھا۔ ایک مکمل کردار کے ساتھ اس میں ایک مکمل اور بھرپور تجربہ بھی تھا۔'' (نقوش منٹو نمبر صفحہ 233)

متذکرہ بالا اقتباس میں ممتاز شیریں نے چند اہم راز ہائے سربستہ کا انکشاف کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ منٹو آخری دور میں بھرپور اور پیچیدہ ہوگئے تھے۔ ان کے افسانوں میں، ڈراموں میں بھرپور تجربہ دکھائی دینے لگا تھا اور دوسرے یہ کہ منٹو کا رویہ بھی ایک سچے فنکار کا رویہ تھا۔ گویا شیریں یہ کہنا چاہتی تھی کہ منٹو نے اب تک جھک ماری تھی، 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، 'ہتک'، 'بو' اور 'ٹھنڈا گوشت' جیسے مایہ ناز اور معرکتہ الآرا افسانے غیر سنجیدہ، اور بھرپور تجربے سے محروم تھے۔ میرے نزدیک اگر محترمہ درست حافظے کے ساتھ منٹو کا مطالعہ کرتیں تو موصوفہ کو 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، ''ٹھنڈا گوشت'، 'کالی شلوار' جیسے افسانے 'بابو گوپی ناتھ' اور سڑک کنارے جیسے افسانوں کے مقابلے میں کہیں بڑے فنکار کا کارنامہ معلوم ہوتے۔ اگر انہوں نے بنتی اور مٹتی ہوئی تہذیبوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہوتا، اگر وہ ان تمام سازشوں اور شیطانی حربوں سے آشنا ہوتیں تو اس کے دو فائدے براہ راست موصوفہ کو پہنچتے ایک تو یہ کہ وہ خود کوئی بڑا فن پارہ تخلیق کرنے میں کامیاب ہو جاتیں (جو کہ تمام چیخ وپکار کے باوجود وہ نہیں کرسکیں) اور دوسرے وہ منٹو کے تعلق سے نہایت ہی غیر ذمہ دارانہ بیان بازی سے پرہیز کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتیں۔

وقار عظیم اپنے مضمون 'منٹو کا فن' میں رقمطراز ہیں:

''جہاں تک ان گوناگوں موضوعات کا تعلق ہے ان کے سلسلے میں ایک اور چیز بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ بعض موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر منٹو نے بہت سوں کی دل آزاری کی ہے۔ بہت سوں کی برائی مول لی ہے اور بہت سوں کی گالیاں سنی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے پڑھنے والوں نے انہیں گالیوں کو معیار بنا کر منٹو کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے اور یہ بات

بہت کم کہی گئی ہے اور اکثر دبی زبان سے کہی گئی ہے کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کو پہچاننے کے لیے اس کے فن پر سب سے پہلے نظر ڈالنی ضروری ہے۔ اس لیے کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں ان موضوعات کی بھی اہمیت ہے جن کا منٹو نے پوری ذمہ داری سے انتخاب کیا ہے اور اس نقطۂ نظر کی بھی اہمیت ہے جو ان موضوعات کے انتخاب کا ذمہ دار ہے لیکن حقیقت میں جس چیز نے منٹو کو منٹو بنایا، جس چیز نے اسے وہ بڑائی دی جس میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا ہمسر نہیں وہ اس کا فن ہے۔
(منٹو کا فن نقوش منٹو نمبر صفحہ 231-240)

متذکرہ بالا مضمون کو منٹو کے فن کا جائزہ لینے سے زیادہ منٹو کے بارے میں پھیلائی جانے والی افواہ سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مذکورہ اقتباس میں وقار عظیم نے منٹو کے فن کو منٹو کے موضوعات پر فضیلت بخشی ہے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے موضوعات کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ موضوعات کی اہمیت تسلیم کرنے پر میں وقار عظیم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سامعین کے گوش گزار کرنا چاہوں گا کہ منٹو دنیا کے معدودے چند فنکاروں میں سے ہے جس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ترین امر ہے کہ آیا اس کا فن زیادہ فضیلت والا ہے یا موضوعات جس کا انتخاب اس نے اپنے افسانوں کے لیے کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ منٹو دنیا کا واحد ایسا تخلیق کار ہے جو محض اپنے افسانوں کے دم پر زندہ ہے۔

حسن عسکری اپنے مضمون 'منٹو کا مقام' میں رقمطراز ہیں:

''جس دن منٹو مرا تھا اس دن میں نے یہی کہا تھا کہ منٹو جیسے آدمی کی زندگی یا موت کے بارے میں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، ہمیں تو اس کی زندگی اور موت دونوں کے معنی متعین کرنے چاہئیں۔ منٹو تو ان لوگوں میں سے تھا جو صرف ایک فرد یا ایک ادیب سے کچھ زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر اب تو جذبات پرستی کی گنجائش یوں بھی نہیں رہی کہ منٹو کو مرے دو مہینے سے زیادہ ہو گئے اور ہمارے لیے یہ سوال زیادہ اہم ہو گیا ہے کہ اردو ادب میں یا کم سے کم پچھلے بیس سال کے اردو ادب میں منٹو کی جگہ کیا ہے؟ بعض لوگوں کے خیال میں منٹو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ منٹو چاہے موپاساں وغیرہ کی صف میں نہ آ سکے لیکن یوروپ کے اچھے خاصے افسانہ نگاروں سے اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ میں ان دونوں باتوں سے متفق ہوں۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر منٹو موپاساں کے

برابر نہیں پہنچ سکا تو اس میں اتنا قصور خود منٹو کا نہ تھا جتنا اس ادبی روایت کا جس میں وہ پیدا ہوا۔ جس بات میں منٹو موپاساں سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ وہ موپاساں کی نثر ہے اور موپاساں کو جس قسم کی نثر درکار تھی۔ وہ فرانس میں اور کچھ نہیں تو دو سو سال سے نشو و نما پا رہی تھی۔ موپاساں کے پیچھے روش فو کو تھا، والیئر تھا، استاں دال تھا، فلوبیئر تھا۔ منٹو کے پیچھے کون تھا؟ میری بات کا وہ مطلب نہ سمجھئے جو اردو کے ایم اے سمجھیں گے۔ میں یہ نہیں کہتا اردو کی نثر بالکل فضول ہے۔ اس میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں لیکن منٹو کو جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ اردو نثر کی روایت میں موجود نہ تھیں۔ منٹو کو پانی پینے کے لیے اپنے آپ کنواں کھودنا پڑا۔ موضوع اور ہیئت دونوں میں منٹو کی حیثیت ایک پیش رو کی ہے اسی لیے منٹو کے متعلق کوئی آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس سے پہلے اردو میں کیا تھا۔ اس کے ہم عصر کیا کر رہے تھے۔ منٹو کیا کر سکا اور کیا نہیں کر سکا۔ یہ باتیں دیکھے بغیر ہم منٹو کو اچھا یا بڑا تو کہہ لیں گے مگر اردو ادب میں منٹو کی حیثیت ہماری سمجھ میں نہ آئے گی۔''

(مضمون: منٹو کا فن از حسن عسکری، 'نقوش' منٹو نمبر صفحہ 272)

متذکرہ بالا پیراگراف میں کچھ مفروضوں کی بنیاد پر ایک ہوا محل کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ کیا ضروری ہے کہ کسی کا بڑا فنکار ہونا اس کے پیش رو فنکار ہونے کی ضد ہے۔ دنیائے ادب میں ایسے بہت سے فنکار گزرے ہیں جو پیش رو بھی تھے اور بڑے بھی۔ پھر موپاساں سے منٹو کہاں کہاں اور کیوں کر پیچھے تھا۔ اس کی وضاحت بھی مضمون میں کہیں نہیں ملتی۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ منٹو کا موازنہ انگریزی کے سب سے بڑے ادیب ڈی ایچ لارنس سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے شاہکار ناول Ladly Ahalter Ties Coner کا موازنہ اگر منٹو کے افسانے ''اس منجدھار میں'' میں سے کیا جائے جن کا موضوع بھی مشترک ہے تو لارنس موضوع اور ہیئت دونوں میں منٹو سے پست نظر آتا ہے۔ تو پھر کیا عسکری کی مغرب سے مرعوبیت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ان کو یہ لکھنا پڑا:

''منٹو نے جو کنواں کھودا تھا وہ ٹیڑھا بھینگا سہی اور اس میں جو پانی نکلا وہ گدلا یا کھاری سہی۔ مگر دو باتیں ایسی ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا ایک تو یہ کہ منٹو نے کنواں کھودا ضرور، دوسرے یہ کہ اس میں سے پانی نکلا۔''

(منٹو کا مقام، حسن عسکری، منٹو نمبر 'نقوش' صفحہ 272)

عسکری کی تمام تر علمی عظمتوں کے اعتراف کے باوجود میرا یہ ماننا ہے کہ عسکری کو دو دو مقامات پر ادبی سہو ہوا ہے ایک منٹو کے بارے میں اور دوسرا فراق کے تعلق سے۔ بجائے اس کے کہ عسکری منٹو کا مقام منٹو کے افسانوں سے طے کرتے وہ پہلے تو موپاساں کے ادبی شجرہ نسب سے منٹو کے ادبی شجرہ نسب کا موازنہ کرنے بیٹھ گئے اور جب دیکھا کہ شجرہ نسب کے اعتبار سے موپاساں بلند ہے تو تخلیقی اعتبار سے بھی عظمتوں کی ڈگری موپاساں کی جھولی میں ڈال دی۔ عسکری جیسے بڑے نقاد سے اس کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ اگر کسی نے منٹو اور فراق کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہو اور وہ عسکری صاحب کے قد سے واقف نہ ہو تو ایسا شخص جلد بازی میں عسکری صاحب کے افسانے اور شاعری کے فہم پر سوالیہ نشان قائم کرسکتا ہے۔

کرشن چندر نے منٹو پر جو مضمون 'سعادت حسن منٹو' کے عنوان سے لکھا ہے وہ منٹو پر مضمون کم افسانہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

اوپندر ناتھ اشک کے مضمون ''منٹو میرا دشمن'' میں منٹو کم خود اشک صاحب زیادہ نظر آتے ہیں۔

وارث علوی نے کسی حد تک منٹو سے انصاف ضرور کیا ہے مگر وہ بھی سچ کو پوری طرح سے پیش کرنے میں پس و پیش سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً وارث علوی اپنے مضمون 'حیات اور موت کی کشمکش (منٹو کے افسانوں میں) منٹو کے افسانوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''منٹو کو پڑھتے وقت ہم اس بات پر غور نہیں کرتے کہ اس کی ہر کہانی اس کے ذہن کی ایجاد ہے۔'' (کتاب منٹو ایک مطالعہ صفحہ 22)

ایسے عالم میں منٹو کی ہر کہانی کو اس کے ذہن کی ایجاد سے تعبیر کرنا جب چہار دانگِ عالم میں سازشوں کے نرغے میں دنیا کی ایک بڑی اکثریت اور ملک کی ایک بڑی اقلیت کو ہر طرح کے استحصال کا اور خاص طور پر فسادات میں جنسی استحصال کا نشانہ بنایا گیا ہو، جہاں عکتیاں پراپٹ کرنے کے لیے باپ اپنی بیٹی سے، بھائی اپنی بہن سے، بیٹا اپنا ماں سے ہم بستری کرتا رہا ہو اور ایسا کر کر کے اس نے نام نہاد روحانی ترقی کے کئی مدارج طے کیے ہوں۔ ایک نقاد کی علمی کم ہمتی سے ہی تعبیر کیا جائے گا۔ لے دے کے عصمت چغتائی سے امید تھی کہ وہ تو حوصلہ دکھائیں گی لیکن انہوں نے بھی ذاتی اور شخصی تاثرات پر اکتفا کرنا مناسب سمجھا اور شاید انہوں نے ایسا کر کے صحیح قدم ہی اٹھایا کیونکہ عصمت کے جنسی مسائل ایک خاص ماحول کو پیش کرتے ہیں جبکہ منٹو نے جنسی استحصال کی اس تہذیب کو بے نقاب کیا ہے جس سے تقدس وابستہ کر دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر خالد جاوید اپنے ایک مضمون ''کہانی، موت اور آخری بدیسی زبان'' میں رقمطراز ہیں:

''نامور امریکی ادیب ''ماریو ورگاس یوزا'' نے اپنی کتاب Letters to a Young Novelist

میں لکھا ہے:

''فکشن ایک جھوٹ ہے جو ایک گہرا سچ چھپائے ہوئے ہے۔''

(کہانی موت اور آخری بدیسی زبان صفحہ 65)

موصوف بات سے بات ملاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''موضوع کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنی زبان کے شانوں پر سوار ہو کر کہانی کار کے شعور میں داخل ہوتا ہے اور اس کی دنیا بدل کر رکھ دیتا ہے۔''

دراصل منٹو نے بھی اپنے افسانوں میں ایک جھوٹ بولا جو ایک سچ چھپائے ہوئے تھے۔ مگر اس کو ادبی بدنصیبی ہی سے تعبیر کیا جائے گا کہ اس جھوٹ کے چھلکے اُتار کر اس سچ کو پوری طرح سے منظر عام پر آج تک نہیں لایا گیا۔

منٹو کی صدی تقریبات کے تعلق سے جتنے بھی رسائل وجرائد نے خاص شمارے شائع کیے بھانت کے بھانت کے جو سمینار جامعات میں یا دیگر پلیٹ فارموں کے ذریعے منعقد کیے گئے، لکھنے والوں نے منٹو پر جتنی بھی کتابیں تصنیف کیں وہ سب کی سب دو کوڑی سے زیادہ کی حیثیت کی نہیں ہیں۔ ہاں ادھر پچھلے دنوں شمیم حنفی کی ایک کتاب بعنوان ''منٹو۔حقیقت سے افسانے تک'' نے ادب کے سنجیدہ اذہان کو اپنی طرف ضرور متوجہ کیا ہے۔ مذکورہ بالا کتاب کو منٹو شناسی کی طرف پہلے قدم سے عبارت کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً منٹو کے تعلق سے حنفی صاحب زمانے کو آئینہ دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہ بارش سنگ اس لیے ختم نہیں ہوتی کہ اس ذلت کا تسلسل بھی ہنوز قائم ہے جس نے منٹو کے حواس کو تھکا ڈالا تھا۔ اس لیے ہم یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ منٹو کا وجود جس واقعے سے عبارت تھا وہ آج بھی جاری ہے۔ اُس کی موت کے ساتھ نہ تو جینے کا وہ اسلوب ختم ہوا ہے، نہ لکھنے کا۔''

شمیم حنفی وہ واحد نقاد ہیں جنہوں نے منٹو منٹو کی مجذوبانہ رٹ میں ہوش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اُس غیر مختتم واقعے کو بھی موضوع قلم بنایا ہے جس سے منٹو جیسے عظیم فنکار کو جنم دیا۔ کس قدر لرزہ خیز ہوتے ہیں وہ واقعات، کس قدر بھیانک ہوتے ہیں وہ حالات، کس قدر دل دہلا دینے والی ہوتی ہیں وہ وارداتیں جو ایک عظیم فنکار کو جنم دیتی ہیں۔ دراصل ایک عظیم فنکار راکھ میں دفن اُس چنگاری کی مانند ہے جو اپنا سب کچھ ختم ہو جانے کے باوجود اپنے وجود کو باقی اور زندہ رکھتا ہے اور وقت آنے پر ''آتش فشاں نما'' شعلے میں تبدیل ہو کر اپنے جوہر سے تاریخ کا ایک نیا باب رقم کرتا ہے۔

زمرد مغل

ابن صفی

سچ کو پہلے لفظ پھر لب دیں گے ہم

ایک عرصے تک ابنِ صفی کو پاپولر ادب کا خوشہ چین قرار دیا جاتا رہا اور اسی چیز کو بنیاد بنا کر ادب کے تمام دروازے ان پر بند رکھے گئے۔ ابن صفی کی ادبی جلاوطنی کی داستان پر ایک ناول لکھا جا سکتا ہے جو ایک دلچسپ، حیرت انگیز اور سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے ادب کے تخلیقی پیمانوں پر بھی کھرا اتر سکے۔ ابنِ صفی کی ادبی جلاوطنی کی روداد بہت طویل ہے۔مگر اس صبر آزما طویل سیاہ رات کے بعد جو سحر نمودار ہوئی، وہ بھی کم سحر انگیز نہیں ہے۔ابنِ صفی کی جلاوطنی کے ختم ہوتے ہی واپسی کے سفر نے بھی بے اعتدالیوں کی ایک الگ طرح کی روایت قائم کی ہے، ابنِ صفی کو راتوں رات آسمانِ ادب کا نہ صرف درخشندہ ستارہ قرار دے دیا گیا بلکہ ان کی شان میں قصیدہ گوئی کی ایسی روایت قائم ہوئی ہے کہ شاید و باید، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ابنِ صفی کی جلاوطنی جس طرح ان کی تفہیم میں مددگار ثابت نہیں ہوئی ٹھیک اُسی طرح سے ابنِ صفی کی دن پھرتے ہی جس اندھی عقیدت کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اُس سے بھی کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔ کسی بھی تخلیق کار کے کام کی سراہنا حد درجہ اعتدال کے ساتھ ہی اس کے کام کا جائزہ لے کر کی جا سکتی ہے۔

ہمارے جہاں دیدہ نقادوں نے جاسوسی، صحافتی اور مزاحیہ تحریروں کے ساتھ 'ادبی ٹیگ' لگانے کی شدید مخالفت کی ہے۔تخلیقی عمل کی ان کے خود کے ہاں ہی کوئی متعین تعریف موجود نہیں ہے، بس جو سمجھ میں آیا یا جو منہ میں آیا بول دیا اور اسے ادب کو ماپنے کا پیمانہ قرار دیا گیا۔ جبکہ سامنے کی بات ہے کہ ادب وہ ہے جس میں تجربہ زیادہ سے زیادہ فیصد الفاظ کا روپ دھارنے میں کامیاب ہو جائے۔ اگر اس چیز کو پس منظر میں رکھ کر یا ذہن میں رکھ کر ابنِ صفی کے ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو وہ بحیثیت جاسوسی ناول نگار ہی اچھے ادب کے خالق قرار دیے جا سکتے ہیں، جبکہ ان کے ہاں مزاح کی بھرپور موجودگی بھی اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے۔

ابنِ صفی کو خالص جاسوسی ناول نگار کی حیثیت سے بھی اگر پڑھا جائے تو میری ناقص رائے کی حد تک وہ ان ناول نگاروں سے کہیں آگے نکل جاتا ہے جو اخبار کے اشتہارات کا یا تھرڈ پیج پارٹیز کا اردو ترجمہ کر کے

اور ان کے ساتھ ''پیچھے مڑ کر دیکھا'' یا ''آگے بہت دور تک دیکھا'' جیسے جملے لگا کر اُردو والوں سے اپنا لوہا منوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جبکہ ان کے سیکڑوں صفحات پر مشتمل ناولوں میں یا تو تجربہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے یا پھر تجربے کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں ناول نگار کے ہاتھ میں صرف ناکامی آئی ہے۔ تقسیم ہند کے نام پر یا کسی دوسرے دکھڑے کا رونا رو کر کوئی تحریر سپردِ قلم کرنے سے بڑا ادب وجود میں نہیں آسکتا، یہ بات گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ دو اور دو چار کی طرح صاف ہو گئی ہے۔ ابنِ صفی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کنڈیشنڈ ذہنیت سے اپنی تحریروں کو سپردِ قلم نہیں کرتے اور یہی چیز انہیں اردو کا بہترین ناول نگار بناتی ہے۔ ابنِ صفی چونکہ کنڈیشنڈ ذہن سے نہیں لکھتے، اسی لیے عمران جیسے عظیم اور لافانی کردار کو خلق کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جو برے سے برے حالات میں اپنی حسِ مزاح سے کام لینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔ ابنِ صفی کا مزاح ''The Great Indian Loughter'' جیسا مزاح نہیں ہے جہاں راجو شریواستو یا احسان قریشی مائیک پر کھڑے ہو کر لطیفے سناتے ہیں اور نہ ہی ابنِ صفی کے ہاں وہ عامیانہ پن ہے جس میں کسی مشاعرے کی روداد کے بہانے اپنی بھڑاس نکالنے کے لیے ڈائس پر موجود کم ظرف شعراء کو ذلیل کیا جاتا ہے۔ بلکہ ابنِ صفی کا مزاح اس وقت وجود میں آتا ہے جب حالات اس بات کا تقاضا کر رہے ہوتے ہیں کہ انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، وہ حواس باختہ ہو جائے، یا ڈیپریشن کا شکار ہو جائے، جو ان کے کرداروں کی نفسیاتی صحت مندی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ابنِ صفی کو وقت اور حالات ''کنڈیشن'' نہیں کر سکے۔

دوسری اور اہم بات جو ابنِ صفی کو اُردو ادب کے لیے نہ صرف Relevant بناتی ہے بلکہ ابنِ صفی کے ناولوں کی قرأت کو مشرقی تہذیب کے قاری کے لیے لازم قرار دیتی ہے وہ ہے ابنِ صفی کا ''تہذیبوں کے تصادم'' کے پس منظر اور پیش منظر کو جزئی تفصیلات کے ساتھ اجاگر کرنا Samuel Huntington نے جو ''تہذیبوں کے تصادم'' کا نعرہ بلند کیا تھا وہ دیوانے کی بڑ نہیں تھا، بلکہ اس وقت دنیا کی دو بڑی تہذیبیں عالمی سطح پر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں اور مغربی لکھنے والے اپنا کام خاموشی سے کر رہے ہیں مگر مشرقی تہذیبوں نے اُس کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے میں جو آنا کانی کی ہے، اس کا خمیازہ اس کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ابنِ صفی وہ واحد ناول نگار ہے جس نے فرض کفایہ ادا کرتے ہوئے اس بلند ترین عمارت کی نیو رکھ دی ہے جس کی آخری منزل پر مشرقی تہذیب کے جھنڈے کو نصیب ہونا ہے۔ ابنِ صفی کے عظیم اور لافانی کردار ''عمران'' کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عمران جن مشکل ترین مہمات کو سر کرتا ہے، ان مہمات کو سر کرنے کے لیے عمران جن خصوصیات اور صفات کا استعمال کرتا ہے، اور مشکل سے مشکل سچویشن سے مکھن کے بال کی

طرح نکل جاتا ہے وہ اس کا مارشل آرٹ کا ماہر ہونا ہے اور یہ مارشل آرٹ اس نے اپنے چینی استاذ سنگ ہی سے سیکھا ہے۔ اس مارشل آرٹ کا نام بھی ''سنگ آرٹ ہی ہے'' جو غالباً اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ اس آرٹ کا موجد ''سنگ ہی'' ہی ہے۔ یہاں پر جو باتیں قابلِ غور ہیں وہ یہ ہیں:

عمران کے لیے ابنِ صفی کا چینی استاذ کا انتخاب کرنا ابنِ صفی کی دور اندیشی پر دال ہے۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ ''بائی پولر'' دنیا سے روس کے زوال کے بعد ''یونی پولر'' دنیا جس کا سربراہ اور سرغنہ امریکہ تھا، نے بھی اپنا بوریا بستر سمیٹنا شروع کر دیا ہے۔ ظلم وستم کی جو داستان سقوطِ غرناطہ سے شروع ہوئی تھی اور جس نے اپنے عروج کے دن کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے کے بعد دیکھے اور ظلم ستم سے تاریخ کے صفحات کو سیاہ کرنا جاری رکھا، اب افغانستان سے انخلا کے بعد وہ بسترِ مرگ پر ایڑھیاں رگڑنے میں مصروف ہے۔ اس وقت چین ہی دنیا کی ایسی بڑی طاقت ہے جس نے دنیا کی زمام کار سنبھال لی ہے۔ مشرقی تہذیبوں کو آئندگان کی منزلیں چین کی سربراہی میں ہی طے کرنی ہیں۔ ابنِ صفی نے جو نوشتۂ دیار پڑھا تھا وہ سچ ہو کر رہا۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے جو نقاد مغرب سے صرف وہی سامان نظریات کے نام پر اسمگل کرتے ہیں جو وہاں سو سال پہلے سے ہی اپنی معنویت اپنے ہی وطن میں کھو چکا ہو، جس کا کوئی پرسان حال خود اسی سرزمین پر نہ ہو جہاں اس کا طوطی بولتا رہا ہو، ایسے مغربی نظریات کو برآمد کر کے ہمارے ہاں، خاص طور پر اُردو ادب لے آتے ہیں، آخری سانس لیتے ہوئے فرسودہ مغربی نظریات کو ''وینٹی لیٹر'' پر ادبی آکسیجن کی فراہمی کے ذریعے زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو ابنِ صفی کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا یہ بات بعید از قیاس بھی ہے اور بعید از امکان بھی۔ کیونکہ ابن صفی براہِ راست ''عہد حاضر'' کے مغرب کو برآمد کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تہذیبوں کی کشمکش کے وہ رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں جو عہد حاضر کا خاصہ ہیں، ان کے ہاں ہمیں وہ مغرب نظر آتا ہے جو ہمارا ''ہم عصر'' مغرب ہے۔ ابنِ صفی کی اہمیت کے اجاگر ہونے کے پیچھے بھی یہی راز کارفرما ہے کیونکہ ابنِ صفی کے وقت کے مغرب کو ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ اور ہمارے دانشور ''جبل گردد جبلت نہ گردد'' کے مصداق اس وقت کے مغرب کی برآمدگی کے لیے راہیں ہموار کر رہے ہیں، ایسے میں انہیں ابنِ صفی کے عیوب بھی محاسن نظر آنے لگے ہیں۔

ابنِ صفی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اس بات کو بھانپ لیا تھا کہ مغرب کا سیاسی زوال مغرب کے فکری غلبے اور تسلط کے سنگِ بنیاد کا کام کر رہا ہے۔ جنسی بے راہ روی کو سامنے کی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ ابنِ صفی وہ واحد مصنف ہے جس نے مشرق کے اس خطے کو (جس میں ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش آتے ہیں) جنسی بے راہ روی سے محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نہیں تو حال یہ تھا کہ بڑے بڑے

شنکراچاریہ اور شیخ الحدیث لحاف اوڑھے اوباش، فحش، عریانیت سے بھرپور اور چھچھورے لٹریچر پڑھنے میں مصروف دکھائی دے جاتے تھے۔ ادیبوں کا حال تو یہ تھا کہ وہ ہم جنسیت کا شکار ہوکر رہ گئے تھے، تیسرے درجے کی فحش اور عریانیت سے بھرپور تخلیقات پر مضامین کے انبار لگائے جا رہے تھے، ایسے میں ابنِ صفی کا قارئین کا دھیان بالکل ایک دوسری سمت میں کھینچنا اتنا بڑا سیاسی، سماجی، ادبی اور تہذیبی کارنامہ ہے جس کے لیے دفتروں کے دفتر بھی کم پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔

ابنِ صفی نے کچھ دنوں تک اسرار ناروی کے نام سے شاعری بھی کی مگر اسرار ناروی نے جلد ہی اس بات کو محسوس کرلیا کہ اب وقت شاعری کرنے کا نہیں بلکہ اس میدانِ ادب سے کوڑا کرکٹ اور کباڑ ہٹانے کا وقت آ گیا ہے۔ اگر وہ شاعری ہی کرتے رہے تو اس عظیم مشن کو کبھی بھی پایۂ تکمیل تک پہنچایا نہیں جا سکے گا۔ لہٰذا انہوں نے فکشن کے میدان کا انتخاب کیا، کیونکہ اس وقت فکشن کے ہی راستے سے اخلاقی اقدار کا جنازہ نکالنے کے لیے راہیں ہموار کی جا رہی تھیں، معیار سے گرے ہوئے، تہذیبی اقدار سے عاری، عریانیت اور فحاشی سے لیس تحریروں سے فکشن کے نام پر ادبی بازاروں میں گہما گہمی تھی، لیکن فحش و عریاں ادب کے علمبرداروں سے ان کے قارئین کی کثیر تعداد چھین لی اور انہیں ڈرائنگ روم تک سمٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ ابنِ صفی پر ''پاپولر ادب'' تخلیق کرنے والوں کو اپنے اپنے گریبانوں میں بھی جھانک لینا چاہیے۔ ابنِ صفی نے ایسے قارئین کی ایک کثیر تعداد وقت کے نام نہاد بڑے تخلیق کاروں سے چھینی ہے، جن کی تربیت انہوں نے اپنے درجنوں ناولوں، سیکڑوں افسانوں سے کی تھی، کئی سال کی محنت سے تیار کی گئی قارئین کی اس نسل نے جب اپنے اپنے چہیتے ناول نگاروں، افسانہ نگاروں کو پیٹھ دکھا کر ابنِ صفی کے ناولوں کا انتظار بے چینی سے کرنا شروع کیا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میدان جنگ میں فوجیوں نے بغاوت کر دی ہو اور دشمن فوج سے جا ملے ہوں۔ اس لیے ابنِ صفی پر پاپولر ادب خلق کرنے کا الزام بھی دعویٰ بلا ثبوت کے ہی مترادف قرار پاتا ہے اور یہ ابنِ صفی کی تحریروں کی عظمت ہی ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی جیسا دیدہ ور نقاد عمر کی ایسی منزل میں، جب اعصاب جواب دے جاتے ہیں، ابنِ صفی کے ناولوں کے انگریزی تراجم کے لیے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے۔ فاروقی صاحب نے ابنِ صفی کے چار ناولوں کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ جن کے عناوین مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) Smoke Water

(2) Poisoned Arrow

(3) Doctor Dread

(4) The Laughing Corpse

فاروقی صاحب اس بات کو بخوبی جانتے ہیں جس طرح سے خود انہوں نے ادبی من چلوں سے اُردو کی عزت و آبرو کی حفاظت کی ہے۔ٹھیک اُسی طرح سے ابنِ صفی نے بھی اپنے ناولوں کے ذریعہ اردو ادب کو فحاشی کا اڈہ بنائے جانے کے ناپاک عزائم کو دھول چاٹنے پر مجبور کر کے اردو کی بے پناہ خدمت کی ہے۔ سچ بات تو یہ ہے شمس الرحمٰن فاروقی کا ابنِ صفی کے ناولوں کا ترجمہ کرنا ایک بڑے انسان کا دوسرے بڑے انسان کے تئیں احترام محبت کے اس جذبے کا عکاس ہے،جس کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ نامکمل رہے گی۔

ابنِ صفی نے یہ جان لیا تھا کہ مستقبل کی کمان عورت کے ہاتھوں میں جانے والی ہے۔کیونکہ مرد نے غلبہ اور تسلط کے ہزاروں سال یہ ثابت کرنے میں لگا دیے ہیں کہ وہ نااہل ہے،عورت بے پناہ صلاحیتوں کی مالک ہے۔اس کا احساس ابنِ صفی کو تھا،لیکن ابنِ صفی کوئی خطرہ مول لیے بغیر عورت کی صلاحیتوں کو لوہا منوانا چاہتے تھے،اسی لیے انہوں نے ویلن کے کردار میں عورت کو پیش کیا،ہیرو کے کردار میں پیش کرنے کی جرأت نہیں کر پائے،اور ایسا شاید ابنِ صفی کے اندر کے بڑے تخلیق کار اور پاپولر لٹریچر کے خالق کے بیچ نفسیاتی کشمکش میں پاپولر لٹریچر کے خالق ابنِ صفی کی بڑے تخلیق کار ابنِ صفی پر برتری اور غلبہ کی وجہ سے ہوا ہے۔مثلاً تھریسا اور چولیا کے کرداروں میں ابنِ صفی نے موررت کو بے پناہ صلاحیتوں کی مالک کے طور پر متعارف کرایا ہے،مگر وہ عمران،حمید اور کرنل فریدی جیسا کوئی نسوانی کردار خلق نہیں کرتے غالباً جس کا سبب یہ ہے کہ وہ بھی Male Dominant Society سے انحراف کی جرأت نہیں کر پائے۔

ابنِ صفی کے ناولوں میں بے شمار خوبیاں ہیں۔ابنِ صفی کے ناولوں میں بہت سی کمیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ابنِ صفی بڑے ادیب ہوں یا نہ ہوں لیکن ایک بات تو طے ہے کہ وہ بے حد اوریجنل تخلیق کار ہیں۔مگر ایک عرصے سے ابنِ صفی پر سرقے کا الزام ہے۔میرے خیال میں سرقے کا الزام لگانے والوں کو سرقہ کے خدوخال کی صحیح پہچان تو ہونی ہی چاہیے ہے کیونکہ سرقے کی ہمارے ہاں ایک طویل روایت رہی ہے جس کی ایک تازہ مثال ایک شخص کی تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ایک ایک سطر چوری کی پکڑی گئی ہے۔ابنِ صفی کی تحریروں میں تو سرقہ دور دور تک نظر نہیں آتا۔

☆☆

بیاد منٹو

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

منٹو کی ایک اہم نو دریافت خودنوشت سوانحی تحریر

پچھلے برس ۲۰۰۴ء میں ترقی پسند ادب کے ترجمان ''انگارے'' کے مرتب عزیز مکرم ڈاکٹر سید عامر سہیل نے منٹو کی پچاس ویں برسی کی مناسبت سے ''انگارے'' کے مجوزہ ''سعادت حسن منٹو نمبر'' کے لیے مجھ سے منٹو کی کسی قلمی تحریر وغیرہ کے بارے میں استفادہ کیا، نوادر کے میرے ذخیرے میں منٹو کی کوئی قلمی تحریر نہیں تھی، یہ فرمائش پوری نہ کرسکا، مجھے سہیل صاحب کو ڈاکٹر علی ثنا بخاری سے متعارف کرانے کی مسرت ضرور حاصل ہوئی، جو عہد موجودہ میں منٹو کے ایک بہت سیریس اسکالر ہیں اور جنہوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے سعادت حسن منٹو پر تحقیقی کام کر کے پی ایچ ڈی کی سند فضیلت پائی۔

منٹو کی کسی قلمی تحریر کے اپنے ذخیرے میں ناموجود ہونے پر بے اختیار، دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی ''کاش! کہ مجھے ان کی کوئی تحریر مل سکے۔'' اللہ کے کرم ہائے بے حساب، اور اللہ کے بندوں کی مجھ پر عنایات بے شمار کی کوئی حد ہے، نہ اور چھور کہ مجھے سال جاریہ (۲۰۰۵ء) میں منجملہ سعادت حسن منٹو، بہت سے اکابر ادب کی اہم قلمی تحریریں ملیں۔ یہاں ایسے چند منتخب اسماء کا ذکر کرتا ہوں جن کی قلمی تحریریں میرے ذخیرۂ نوادر کا تازہ اضافہ ہیں:

''سر شیخ عبدالقادر، پطرس بخاری، برجموہن دتاتریہ کیفی، صغرا بیگم ہمایوں، مولانا غلام رسول مہر، فرحت اللہ بیگ، قاضی عبدالغفار، حسن نظامی، ن۔م۔راشد، تلوک چند محروم، معین حسن جذبی، احمد فراز، محسن احسان، خاطر غزنوی، رضا ہمدانی، فارغ بخاری، شوکت واسطی، سید آل رضا، ساغر نظامی، احمد ندیم قاسمی، خواجہ محمد شفیع دہلوی، خمار بارہ بنکوی، ملا رموزی، احسان دانش، اختر انصاری (علیگ)، کوثر چاند پوری، بیگم سلمیٰ تصدق حسین، محی الدین قادری زور، جوش ملیح آبادی، میاں بشیر احمد، بیگم زاہد خلیق الزماں، ڈاکٹر رشید جہاں، فراق گورکھپوری، محمد حسین عرشی، امرتسری، نسیم انہونوی، الیاس برنی، صفی لکھنوی، میرزا ثاقب لکھنوی، مرزا فدا علی خنجر، یاس یگانہ چنگیزی، سید حسن امام، انصار ناصری، یوسف ظفر، میکش اکبرآبادی، ارشد تھانوی، شوکت تھانوی، نواب محمد اصطفا خاں، فیاض علی (ایڈووکیٹ) امین سلولوی، سلام مچھلی شہری، ماہر القادری، حامد اللہ افسر علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، شیر محمد اختر، نہال سیوہاروی، عباد اللہ اختر، محمد منیر الدین چغتائی، رشید اختر

ندوی، پروفیسر احمد علی، ایم ڈی تاثیر، کنہیالال کپور، سلطان حید جوش، خواجہ احمد عباس، غلام عباس، شفیق الرحمٰن، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو۔''

شعروادب کے ان اکابر کی اصل تحریریں میرے ذخیرہ نوادر کا قیمتی اضافہ ہیں۔ یہاں سعادت حسن منٹو کی ایک اہم خودنوشت سوانحی تحریر کا تعارف مقصود ہے جو منٹو کے احوال کے ضمن میں ایک بیش قیمت اور نودریافت ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ادارہ فیروز سنز (لاہور) کے ڈاکٹر عبدالوحید[۱] نے اپنے معروف طباعتی واشاعتی ادارے فیروز سنز لمیٹڈ کی جانب سے شائع ہونے والے نثر نگاروں اور شاعروں کے ایک انتخاب کے لیے متعدد صاحب طرز اہل قلم سے اپنے خیالات لکھ بھیجنے، نیز اپنی تصویر عطا کیے جانے کی تحریک کی تھی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عبدالوحید کا ایک عمومی مکتوب (تحری ستمبر ۱۹۴۳ء) میرے پیش نظر ہے۔

عبدالوحید خاں صاحب کی اس فرمائش کی تائید اور پیروی میں شوکت تھانوی نے بھی اپنے بعض احباب کو توجہ دلائی اور انہیں تصویر نیز اپنے حالات لکھ بھیجنے پر آمادہ کیا۔ اس سلسلے کے ایک دو اصل دستخطی خط بھی میرے ذخیرے میں ہیں۔ ۱۵/نومبر ۱۹۴۳ء کے شوکت تھانوی کے ایک خط کی متعلقہ عبارت یہ ہے:

''...... میں یہ خط لکھ کر آپ کو ایک خاص تکلیف دینا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ اول تو ادب اردو کے لیے ورنہ شوکت کے لیے آپ یہ تکلیف ضرور گوارا کریں گے۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ ہندوستان کا مشہور ادارہ فیروز سنز لاہور ادبائے اردو کا ایک ایسا مبسوط اور مصور تذکرہ مرتب کر رہا ہے جس میں انیسویں اور بیسویں صدی کے فاضل اور صاحب طرز ادیبوں اور شاعروں کے حالات کے علاوہ ان کا نمونہ انشا یا نمونہ کلام بھی پیش کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں آپ کی ذمہ داری میں نے لی ہے کہ آپ کے حالات، آپ کا فوٹو اور آپ کے کلام نظم ونثر کا نمونہ میں منگوائے دیتا ہوں۔ میری اس ذمہ داری کی لاج رکھتے ہوئے آپ اپنی بہترین تصویر اور اپنے حالات جن میں سنہ ولادت، مولد، وطن، تعلیم، موجودہ شغل اور اپنی تصانیف کا حوالہ ضرور ہو بہ واپسی بھیج دیجیے......

(نیاز کیش شوکت تھانوی، ۱۵/نومبر ۱۹۴۳ء)

منٹو نے ''سعادت حسن منٹو'' کے عنوان سے اپنے مختصر سوانح ڈاکٹر عبدالوحید کو لکھ بھیجے۔ حالات کے اختتام پر وحید صاحب کے نام منٹو کا چند سطری خط بھی ہے۔ میرے علم اور نظر کی حد تک یہ خودنوشت حالات، ادارہ فیروز سنز لاہور سے چھپنے والے کسی انتخاب یا تذکرے میں جگہ نہیں پا سکے۔

اپنے سوانحی حالات کے لیے منٹو نے ۲×۲/۱۹۱ انچ سائز کی دو سلپس (Slips) استعمال کی ہیں۔ پہلی

سلپ کے دونوں اطراف لکھا گیا ہے۔ دوسری سلپ کا صرف ایک حصہ استعمال میں آیا ہے۔ پشت کا صفحہ (حصہ) خالی ہے۔ منٹو کی اس قلمی تحریر پر کوئی تاریخ درج نہیں لیکن اسے عبدالوحید صاحب کے عمومی مکتوب (تحریر ستمبر ۱۹۴۳ء) اور شوکت تھانوی کے متذکرہ بالا خط مورخہ ۱۴ (کذا) نومبر ۱۹۴۳ء کی روشنی میں سال ۱۹۴۳ء کے اوخر کی تحریر خیال کرنا چاہیے۔

اس قیاس کی تائید میں ایک داخلی شہادت منٹو کی اس سوانحی تحریر سے بھی ملتی ہے اس میں منٹو نے اپنا سال ولادت ۱۹۱۲ء بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ''...... میں نے تا حال اپنی زندگی کی اکتیس بہاریں دیکھیں ہیں......'' اس سے بھی منٹو کی اس تحریر کا سال ۱۹۴۳ء ہی ہاتھ آتا ہے۔

سعادت حسن منٹو کی یہ نادر قلمی نگارش، ڈاکٹر عبدالوحید کی مرتب کردہ کسی کتاب، یا انتخاب، یا تذکرے کا حصہ نہیں بن پائی اور منٹو کی پچاسویں برسی کے سال اور لکھے جانے کے باسٹھ سال بعد اب پہلی بار ڈاکٹر رشید امجد کی قدر دانی کے طفیل ''دریافت'' کے ذریعے منظر عام پر آ رہی ہے۔

سعادت حسن منٹو کی یہ نادر قلمی نگارش (متعدد دوسری یادگار تحریروں کے بشمول) مجھے حضرت امیر مینائی کے معروف علمی خانوادے میں ان کے عزیزوں کے پاس سے ملی۔ ذیل میں اس خودنوشت سوانح کا متن اور مابعد اس تحریر کی عکسی نقل محفوظ کی جاتی ہے۔

سوانح حیات: سعادت حسن منٹو

دوستو۔ تم یہ سن کر شاید حیران ہو گے کہ میں نے تا حال اپنی زندگی میں اکتیس بہاریں دیکھی ہیں۔ میری پیدائش، پنجاب کے تجارتی مرکز امرتسر میں ۱۱ رمئی ۱۹۱۲ء کو ہوئی۔

کھاتے پیتے گھر میں بچوں کی تربیت بہت خوب ہو جاتی ہے لیکن میں اپنے گھریلو معاملات کی پیچیدگیوں میں کچھ اس (بری) طرح سے گھرا ہوا تھا کہ امرتسر میں بمشکل انٹرنس کا امتحان پاس کر سکا۔

میرا ابتدائی دور اگرچہ خوش اثر تھا لیکن قبلہ ام والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد خاندانی حالات کے مدنظر چند دشواریاں آ گئیں جن سے بخوبی عہدہ برآ ہونا مجھ ایسے صغرسن کے لیے حد سے زیادہ مشکل تھا۔ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ طبیعت میں آوارگی کی نمود ہو چکی تھی لیکن سایۂ پدری کا سر سے اٹھ جانا مجھے اپنی حیثیت جانچنے کا داعی ہوا۔

والدہ محترمہ سے اجازت حاصل کرے۔ (کرکے) اکناف کشمیر میں بغرض بحالی صحت گیا۔ بٹوت میں کچھ مدت قیام کیا۔ طبیعت میں رنگینیوں نے جھلک دکھائی۔ دل کو مضبوط کیا کہ کسی قیمت پر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دنیا اور دنیا والوں کو اپنی طرف جھکاؤں گا۔

گھر لوٹا تو والدہ ماجدہ سے حصول تعلم کا ارادہ بیان کیا چنانچہ علی گڑھ میں بغرض استفادہ بھیجا گیا۔ کچھ بچپن کی آزادیٔ طبع، کچھ آب و ہوا کی ناموافقت نے بستر علالت پر لٹادیا۔ چاروناچار تعلیم پانے سے اجتناب کیا۔

امرتسر واپس آنے پر کتاب بینی کا شوق بدستور بڑھتا گیا۔ چنانچہ یہ بات کہہ دینے میں مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ میں نے روسی ادب میں زیادہ دلچسپی لینا شروع کردی۔

اسی اثنا میں مجھے اکثر اردو اخبارات میں خدمت زبان، سرانجام دینے کا اتفاق ہوا۔ بسااوقات میرے مضامین کو سراہا گیا بلکہ بعض احباب (نے) میرے حوصلہ بندی کے لیے تعریفی جملے بھی کہے جن سے میری خواہش انشاء پردازی میں متعدد بہ اضافہ ہوا۔

میں آج ان مضامین کو نیم جان محسوس کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ صاحب نظر احباب نے میری حوصلہ افزائی کے لیے میرے مضامین کو سراہا...... مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں اپنی تحاریر کے ساتھ کسی دوسرے شغل سے بھی مطمئن نہیں اور اگر اسے مبالغے پر محمول نہ کیا جائے تو آج بھی اپنی کسی کوشش پر مطمئن نہیں ہوں۔ بقول ؏

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اس میں کوئی کلام نہیں کہ میں نے ہر اس پرزۂ کاغذ تک سے فائدہ اٹھایا جس میں کسی بنیے نے بیکار دیکھ کر سودا باندھ کر مجھے دیا۔

میں نے (مجھے) مغربی اور مشرقی ادیبوں کی سیکڑوں کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا لیکن کوئی ایسی کتاب دستیاب نہ ہوسکی جس سے میرے تشنہ مذاق کو طمانیت حاصل ہوتی۔

میں نے کئی ایک کتابیں خود لکھ دیں۔ کئی افسانے، کئی ڈرامے اور متعدد مضامین ریڈیو کے ذریعے سے نشر کیے گئے۔ اصحاب اور عوام کی طرف سے مجھے پے در پے خطوط موصول ہوئے۔ میری تعریفوں کے انبار لگادیے گیے۔ بعض عقیدت مندوں نے تو مجھے اول صف کے ادیبوں میں لاکر کھڑا کردیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں آج بھی اپنے دل میں اطمینان نہیں پاتا۔

میرا خیال ہے کہ جس منزل کی مجھے تلاش ہے، ہنوز میری نظروں سے اوجھل ہے۔ میں یہاں یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ میں نے اردو زبان سے اسکول کے زمانے میں بے اعتنائی سے کام لیا تھا۔ مجھے اس وقت اردو کی ان ہمہ گیریوں کا علم تک نہ تھا جو ایک ہی صحبت میں صاحب دلوں کو گرویدہ بنالیتی ہیں۔

میں اردو زبان کی اس مٹھاس سے ناآشنا تھا جو ذائقے کو مدتوں اپنی تلاش میں سرگرداں رکھتی ہے اور میں اردو کی اس ہر دل عزیزی سے بھی کورا تھا جو (جس نے) اس ایک تھوڑی سی مدت میں دنیا بھر میں تیسرے (نمبر) درجے کی زبان بن کر عوام کو اپنی طرف متوجہ (کرلیا) تھا۔ ان سب کمزوریوں کے باوصف میں نے

اپنے مطالعے میں کوئی فرد گزاشت نہ تھی (کی)۔

احباب نے مجھے سڑی، چھچھورا اور ضدی تک کہنے سے گریز نہ کیا لیکن میں نے اپنے مذاق کی تکمیل میں دوستوں کی سنی، ان سنی کر دی اور اس وقت تک کرمک کتابی بنا رہا جس وقت تک اپنی ڈور (دوڑ) دھوپ پر رائے زنی کر کے ندامت کا شکار ہونے سے بچ جانے کے قابل نہ ہو سکا۔

میرے ارادوں میں یہ بات داخل ہے کہ مجھے معراج ترقی کی طوالت ناپنے میں اپنی ساری زندگی صرف کرنا ہوگی۔ اور تاحین حیات، اس کوشش میں رہنا ہوگا کہ طمانیت قلب کے حصول کے لیے کوئی راستہ تلاش کر سکوں۔

بخدمت محترمی عبدالوحید صاحب

علاوہ برایں معروض خدمت کہ فی الحال میرے پاکوئی فوٹو موجود نہیں ہے۔ میں آج کل ممبئی کے ایک فلمی ادارے ''فلمستان'' میں معقول مشاہرے پر ملازم ہوں اگر چہ دل کو اطمینان نصیب نہیں۔

مصروفیتوں کے مدنظر جلد تر تصویر نہ بھیج سکوں گا، لہٰذا فی الحال معذرت خواہ ہوں۔

نیاز مآل

سعادت حسن منٹو

منٹو کے اس قلمی خط کے نادرالوجود اور بیش قیمت ہونے کا اندازہ اس امر سے لگایئے کہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے گوشۂ خطوط میں مشاہیر ادب کے سوا دو لاکھ سے زائد خط موجود ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ سعادت حسن منٹو کا کوئی خط تا حال انجمن کو فراہم نہیں ہو سکا ہے۔

سعادت حسن منٹو کی یہ اصل، قلمی تحریر ایک بیش قیمت سرمایہ ہے، جسے میں منٹو کے مخصص عزیز گرامی ڈاکٹر علی ثنا بخاری کی تحویل میں دے رہا ہوں۔ علی ثناء اس تحریر کے غیر مطبوعہ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔ امید ہے اور یقین بھی کہ ڈاکٹر علی ثنا بخاری، منٹو کی اس قلمی یادگار تحریر کی حفاظت کے بہتر کفیل ثابت ہوں گے۔

حواشی: ۱؎ پروفیسر محمد اسلم (۱۹۳۲ء۔ ۱۹۹۸ء) نے اپنی تالیف ''خفتگان خاک لاہور'' (مطبوعہ، ادارۂ تحقیقات پاکستان، لاہور مارچ ۱۹۹۳ء) میں ماہنامہ ''تعلیم وتربیت'' کے سابق مدیر ڈاکٹر عبدالوحید مرحوم کے لوح مزار پر درج عبارت پیش کی ہے جو ان کے بارے میں ضروری کوائف تک رسائی کا موجب بنتی ہے۔ کتبے کے مطابق ''آخری آرام گاہ ڈاکٹر عبدالوحید خلف الصدق الحاج مولوی فیروز الدین، بانی وچیئر مین فیروز سنز لیبارٹریز لمیٹڈ، سابق چیئر مین فیروز سنز لمیٹڈ، ٹرسٹی فیروز سنز ٹرسٹ وبانی فاطمہ میموریل ہسپتال، لاہور، تاریخ وصال ۹ راگست ۱۹۸۵ء بروز جمعۃ المبارک بمطابق ۲۲ رذوالقعدہ ۱۴۰۵ ہجری۔''

۲؎ دیکھیے ہفت روزہ ''ہماری زبان'' نئی دہلی، یکم تا ۷ مارچ ۲۰۰۲ء صفحہ ۱

☆☆

منٹو

منٹو اپنے ہمزاد کی نظر میں

انتقال سے چند ماہ پہلے منٹو نے یہ مضمون اپنے بارے میں لکھا تھا۔ اس وقت اس کی نوعیت اور تھی۔ لیکن اب یہ آواز دوسری دنیا سے آتی معلوم ہوتی ہے۔ ''ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے۔'' سعادت حسن کا یہ خیال غلط نکلا، قیاس صحیح ثابت ہوا۔ اکٹھے پیدا ہونے والے اکٹھے نہیں مرتے ہیں۔ منٹو کا صرف ہمزاد اس دنیا سے رخصت ہوا ہے۔ (ادارہ افکار)

منٹو کے متعلق اب تک بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے اس کے حق میں کم اور خلاف زیادہ۔ یہ تحریریں اگر پیش نظر رکھی جائیں تو کوئی صاحب عقل منٹو کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا۔ میں یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ منٹو کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ لیکن ایک لحاظ سے آسان بھی ہے اس لیے کہ منٹو سے مجھے قربت کا شرف حاصل رہا ہے اور سچ پوچھیے تو منٹو کا میں ہمزاد ہوں۔

اب تک اس شخص کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن میں اتنا سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ان مضامین میں پیش کیا گیا ہے حقیقت سے بالاتر ہے۔ بعض اسے شیطان کہتے ہیں، بعض گنجا فرشتہ...... ذرا ٹھہریے میں دیکھ لوں کہیں وہ کم بخت یہیں سن تو نہیں رہا...... نہیں نہیں ٹھیک ہے۔ مجھے یاد آ گیا کہ یہ وہ وقت ہے جب وہ پیا کرتا ہے۔ اس کو شام کے چھ بجے کے بعد کڑوا شربت پینے کی عادت ہے۔

ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے اور ہمیشہ مجھے یہ اندیشہ بہت دکھ دیتا ہے۔ اس لیے کہ میں نے اس کے ساتھ اپنی دوستی نباہنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اگر وہ زندہ رہا اور میں مر گیا تو ایسا ہوگا کہ انڈے کا خول تو سلامت ہے اور اس کے اندر کی زردی اور سفیدی غائب ہو گئی۔

اب میں زیادہ تمہید میں جانا نہیں چاہتا۔ آپ سے صاف کہے دیتا ہوں کہ منٹو ایسا ون ٹو آدمی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا، جسے اگر جمع کیا جائے تو وہ تین بن جائے۔ مثلث کے بارے میں اس کی معلومات کافی ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ ابھی اس کی تثلیث نہیں ہوئی۔ یہ اشارے ایسے ہی جو صرف بافہم سامعین ہی سمجھ سکتے ہیں۔

یوں تو منٹو کو میں اس کی پیدائش ہی سے جانتا ہوں۔ ہم دونوں اکٹھے ایک ہی وقت ۱۱ر مئی ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے لیکن اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ وہ خود کو کچھوا بنائے رکھے، جو ایک دفعہ اپنا سر اور گردن اندر چھپا لے تو آپ لاکھ ڈھونڈتے رہیں تو اس کا سراغ نہ ملے، لیکن میں بھی آخر اس کا ہمزاد ہوں میں نے اس کی ہر جنبش کا مطالعہ کر ہی لیا۔

لیجئے اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ خرذات افسانہ نگار کیسے بنا؟ تنقید نگار بڑے لمبے چوڑے مضامین لکھتے ہیں۔ اپنی ہمہ دانی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شوپن ہار، فرائڈ، ہیگل، نٹ شے، مارکس کے حوالے دیتے ہیں مگر حقیقت سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

منٹو کی افسانہ نگاری دو متضاد عناصر کے تصادم کا باعث ہے۔ اس کے والد خدا انہیں بخشے بڑے سخت گیر تھے اور اس کی والدہ بے حد نرم دل۔ ان دو پاٹوں کے اندر پس کر یہ دانۂ گندم کس شکل میں باہر نکلا ہوگا، اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔

اب میں اس کی اسکول کی زندگی کی طرف آتا ہوں۔ بہت ذہین لڑکا تھا اور بے حد شریر۔ اس زمانے میں اس کا قد زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین فٹ ہوگا۔ وہ اپنے باپ کا آخری بچہ تھا۔ اس کو اپنے ماں باپ کی محبت تو میسر تھی لیکن اس کے تین بڑے بھائی جو عمر میں اس سے بہت بڑے تھے اور ولایت میں تعلیم پا رہے تھے ان سے اس کو کبھی ملاقات کا موقع ہی نہیں ملا تھا، اس لیے کہ وہ سوتیلے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے ملیں، اس سے بڑے بھائیوں ایسا سلوک کریں۔ یہ سلوک اسے اس وقت نصیب ہوا جب دنیائے ادب اسے بہت بڑا افسانہ نگار تسلیم کر چکی تھی۔

اچھا اب اس کی افسانہ نگاری کے متعلق سنیے۔ وہ اول درجے کا فراڈ ہے۔ پہلا افسانہ اس نے بعنوان ''تماشہ'' لکھا جو جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے سے متعلق تھا۔ یہ اس نے اپنے نام سے نہ چھپوایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پولیس کی دست برد سے بچ گیا۔

اس کے بعد اس کے متلون مزاج میں ایک لہر پیدا ہوئی کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے۔ یہاں اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اس نے انٹرنس کا امتحان دو بار فیل ہو کر پاس کیا، وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں اور آپ کو یہ سن کر بھی حیرت ہوگی کہ وہ اردو کے پرچے میں ناکام رہا۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ وہ اردو کا بہت بڑا ادیب ہے اور میں یہ سن کر ہنستا ہوں اس لیے کہ اردو اب بھی اسے نہیں آتی۔ وہ لفظوں کے پیچھے یوں بھاگتا ہے جیسے کوئی جال والا شکاری تتلیوں کے پیچھے۔ وہ اس کے ہاتھ نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں میں خوبصورت الفاظ کی کمی ہے۔ وہ لٹھ مار ہے لیکن جتنے لٹھ اس کی گردن پر پڑے ہیں، اس نے بڑی خوشی سے برداشت کیے ہیں۔

اس کی لٹھ بازی عام محاورے کے مطابق جاٹوں کی لٹھ بازی نہیں ہے۔ وہ نبوت اور پھکیت ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جو صاف اور سیدھی سڑک پر نہیں چلتا، بلکہ تنے ہوئے رسّے پر چلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب گرا...... لیکن وہ کم بخت آج تک کبھی نہیں گرا...... شاید گر جائے، اوندھے منہ...... کہ پھر نہ اٹھے، لیکن میں جانتا ہوں کہ مرتے وقت وہ لوگوں سے کہے گا کہ میں اسی لیے گرا تھا کہ گراوٹ کی مایوسی ختم ہو جائے۔

میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں کہ منٹو اول درجے کا فراڈ ہے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ افسانہ نہیں سوچتا خود افسانہ اسے سوچتا ہے۔ یہ بھی ایک فراڈ ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ جب اسے افسانہ لکھنا ہوتا ہے تو اس کی وہی حالت ہوتی ہے جب کسی مرغی کو انڈا دینا ہوتا ہے لیکن وہ یہ انڈا چھپ کر نہیں دیتا۔ سب کے سامنے دیتا ہے۔ اس کے دوست یار بیٹھے ہوئے ہیں، اس کی تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں اور وہ اپنی مخصوص کرسی پر اکڑوں بیٹھا انڈے دیئے جاتا ہے، جو بعد میں چوں چوں کرتے افسانے بن جاتے ہیں۔ اس کی بیوی اس سے بہت نالاں ہے۔ وہ اس سے کثر کہا کرتی ہے کہ تم افسانہ نگاری چھوڑ دو ــــــ کوئی دکان کھول لو لیکن منٹو کے دماغ میں جو دکان کھلی ہے اس میں منیاری کے سامان سے کہیں زیادہ سامان موجود ہے۔ اس لیے وہ اکثر سوچا کرتا ہے اگر میں نے کبھی کوئی اسٹور کھول لیا تو ایسا نہ ہو کہ وہ کولڈ اسٹوریج یعنی سرد خانہ بن جائے ــــــ جہاں اس کے تمام خیالات اور افکار منجمد ہو جائیں۔

میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اور مجھے ڈر ہے کہ منٹو مجھ سے خفا ہو جائے گا۔ اس کی ہر چیز برداشت کی جاسکتی ہے مگر خفگی برداشت نہیں کی جاسکتی۔ خفگی کے عالم میں وہ بالکل شیطان بن جاتا ہے لیکن صرف چند منٹوں کے لیے اور وہ چند منٹ اللہ کی پناہ۔

افسانہ لکھنے کے معاملے میں وہ نخرے ضرور بگھارتا ہے لیکن میں جانتا ہوں، اس لیے ــــــ کہ اس کا ہمزاد ہوں ــــــ کہ وہ فراڈ کر رہا ہے ــــــ اس نے ایک دفعہ خود لکھا تھا کہ اس کی جیب مس بے شمار افسانے پڑے ہوئے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جب اسے افسانہ لکھنا ہوگا تو وہ رات کو سوچے گا ــــــ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ صبح پانچ بجے اٹھے گا اور اخباروں سے کسی افسانے کا رَس چوسنے کا خیال کرے گا ــــــ لیکن اسے ناکامی ہوگی۔ پھر وہ غسل خانے میں جائے گا۔ وہاں وہ اپنے شوریدہ سر کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ سوچنے کے قابل ہو سکے لیکن ناکام رہے گا۔ پھر جھنجھلا کر اپنی بیوی سے خواہ مخواہ کا جھگڑا شروع کر دے گا۔ یہاں سے بھی ناکامی ہوگی تو باہر پان لینے کے لیے چلا جائے گا۔ پان اس کی ٹیبل پر پڑا رہے گا لیکن افسانے کا موضوع اس کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آئے گا۔ آخر وہ انتقامی طور پر قلم یا پنسل ہاتھ میں لے گا اور ۷۸۶ لکھ کر جو پہلا فقرہ اس کے ذہن میں آئے گا، اس سے افسانے کا آغاز کر دے گا۔

بابو گوپی ناتھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ہتک، ممی، موذیل یہ سب افسانے اس نے اسی فراڈ طریقے سے لکھے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ لوگ اسے بڑا غیر مذہبی اور فحش انسان سمجھتے ہیں اور میرا بھی خیال ہے کہ وہ کسی حد تک اس درجہ میں آتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر اوقات وہ بڑے گہرے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے اور ایسے الفاظ اپنی تحریر میں استعمال کرتا ہے جن پر اعتراض کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ جب بھی اس نے کوئی مضمون لکھا پہلے صفحے کی پیشانی پر ۷۸۶ ضرور لکھا جس کا مطلب ہے۔ بسم اللہ ــــــ اور یہ شخص جو اکثر خدا سے منکر نظر آتا ہے کاغذ پر مومن بن جاتا ہے۔ یہ وہ کاغذی منٹو ہے، جسے آپ کاغذی باداموں کی طرح صرف انگلیوں ہی میں توڑ سکتے ہیں، ورنہ وہ لوہے کہ ہتھوڑے سے بھی ٹوٹنے والا آدمی نہیں۔

اب میں منٹو کی شخصیت کی طرف آتا ہوں۔ جو چند القاب میں بیان کیے دیتا ہوں۔ وہ چور ہے۔ جھوٹا ہے۔ دغاباز ہے اور جمع گیر ہے۔

اس نے اکثر اپنی بیوی کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی کئی سو روپے اڑائے ہیں۔ ادھر آٹھ سو لاکے دیئے اور چور آنکھ سے دیکھتا رہا کہ اس نے کہاں رکھے ہیں اور دوسرے دن اس میں سے ایک سبزہ غائب کردیا اور اس بے چاری کو جب اپنے اس نقصان کی خبر ہوئی تو اس نے نوکروں کو ڈانٹنا پیٹنا شروع کردیا۔

یوں تو منٹو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ راست گو ہے لیکن میں اس سے اتفاق کرنے کے لیے تیار نہیں وہ اول درجے کا جھوٹا ہے ــــــ شروع شروع اس کا جھوٹ اس کے گھر چل جاتا تھا، اس لیے کہ اس میں منٹو کا ایک خاص ٹچ ہوتا تھا لیکن بعد میں اس کی بیوی کو معلوم ہو گیا کہ اب تک مجھ سے خاص معاملے کے مطابق جو کچھ کہا جاتا تھا، جھوٹ تھا۔

منٹو جھوٹ بقدر کفایت بولتا ہے لیکن اس کے گھر والے مصیبت ہے کہ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس کی ہر بات جھوٹی ہے ــــــ اس تل کی طرح جو کسی عورت نے اپنے گال پر سرمے سے بنا رکھا ہو۔

وہ ان پڑھ ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس نے کبھی مارکس کا مطالعہ نہیں کیا۔ فرائڈ کی کوئی کتاب آج تک اس کی نظر سے نہیں گزری۔ ہیگل کا وہ صرف نام ہی جانتا ہے۔ ہیولک ایلس کو وہ صرف نام سے جانتا ہے لیکن ، مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ ــــــ میرا مطلب ہے تنقید نگار، یہ کہتے ہیں کہ وہ ان تمام مفکروں سے متاثر ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، منٹو کسی دوسرے شخص کے خیال سے متاثر ہوتا ہی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ سمجھانے والے سب چغد ہیں۔ دنیا کو سمجھانا نہیں چاہیے اس کو خود سمجھنا چاہیے۔

خود کو سمجھا سمجھا کر وہ ایک ایسی سمجھ بن گیا ہے جو عقل و فہم سے بالاتر ہے۔ بعض اوقات ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے کہ مجھے ہنسی آتی ہے۔ میں آپ کو پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ منٹو، جس پر فحش نگاری کے سلسلے میں کئی مقدمے چل چکے ہیں، بہت طہارت پسند ہے لیکن میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک ایسا پا انداز ہے جو خود کو جھاڑتا پھٹکتا رہتا ہے۔

منٹو

پانچواں مقدمہ

اپنے افسانوں کے سلسلے میں مجھ پر چار مقدمے چل چکے تھے۔ پانچواں اب چلا ہے، جس کی روداد میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

پہلے چار افسانے جن پر مقدمہ چلا، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) کالی شلوار

(۲) دھواں

(۳) بو

(۴) ٹھنڈا گوشت

اور پانچواں: ''اوپر، نیچے اور درمیان''

پہلے تین افسانوں میں تو میری خلاصی ہوگئی۔ ''کالی شلوار'' کے سلسلے میں مجھے دلّی سے دو تین بار لاہور آنا پڑا۔ ''دھواں'' اور ''بو'' نے مجھے بہت تنگ کیا، اس لیے کہ مجھے بمبئی سے لاہور آنا پڑتا تھا...... لیکن ''ٹھنڈا گوشت'' کا مقدمہ سب سے بازی لے گیا۔ اس نے میرا ابھرکس نکال دیا۔

یہ مقدمہ گو یہاں پاکستان ہی میں ہوا مگر عدالتوں کے چکر کچھ ایسے تھے جو مجھ ایسا حساس آدمی برداشت نہیں کرسکتا تھا لیکن عدالت ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر توہین برداشت کرنا ہی پڑتی ہے۔

خدا کرے کسی کو جس کا نام ''عدالت'' ہے، اس سے واسطہ نہ پڑے۔ ایسی عجیب جگہ میں نے کہیں بھی نہیں دیکھی۔

پولیس والوں سے مجھے نفرت ہے۔ ان لوگوں نے میرے ساتھ ہمیشہ ایسا سلوک کیا ہے جو گھٹیا قسم کے اخلاقی ملزموں سے کیا جاتا ہے۔

پچھلے دنوں جب کراچی کے ایک پرچے ''پیام مشرق'' نے میری اجازت کے بغیر میرا مضمون ''اوپر نیچے اور درمیان'' لاہور کے اخبار ''احسان'' سے نقل کیا تو کراچی کی حکومت نے میرا وارنٹ جاری کردیا۔

میں گھر پر نہیں تھا۔ پولیس کے دو سب انسپکٹر، چار سپاہیوں کے ساتھ آئے اور میرے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ میری بیوی نے ان سے کہا کہ منٹو باہر گیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اسے ابھی بلا لیتی ہوں۔ مگر وہ نہ مانے۔ وہ مصر تھے کہ منٹو گھر ہی میں ہے اور میری بیوی جھوٹ بول رہی ہے۔

جو پولیس آئی تھی، میں اس وقت چوہدری نذیر احمد کی دکان ''نیا ادارہ'' میں، جو ''سویرا'' کا دفتر بھی ہے، بیٹھا تھا اور میں نے ایک افسانہ لکھنا شروع کیا تھا۔ اس افسانے کی میں نے بمشکل دس سطریں لکھی ہوں گی کہ چوہدری رشید احمد صاحب جو چودھری نذیر کے چھوٹے بھائی ہیں اور مکتبہ جدید کے مالک ہیں، تشریف لائے۔ انہوں نے کچھ توقف کے بعد پوچھا ''یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟''

میں نے جواب دیا: ''ایک افسانہ شروع کیا ہے...... لیکن یہ بہت لمبا ہوگا۔''

چوہدری رشید صاحب نے بڑے تشویش ناک لہجے میں کہا: ''میں آپ کو ایک بہت بری خبر سنانے آیا ہوں۔''

ظاہر ہے کہ میرا ردعمل کیا ہوگا۔ چند منٹ تو میں سوچتا رہا کہ ''بہت بری خبر'' کیا ہوسکتی ہے۔ کئی خیال دماغ میں آئے۔ میں اوپر، نیچے اور درمیان ہوتا رہا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

آخر میں نے چوہدری رشید سے پوچھا کہ بھائی، قصہ کیا ہے؟

انہوں نے کہا: ''قصہ یہ ہے کہ پولیس آپ کے گھر کے دروازے کے باہر کھڑی ہے۔ وہ مصر ہے کہ آپ گھر میں موجود ہیں، اس لیے وہ زبردستی اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔''

میرے پاس احمد راہی اور حمید اختر بیٹھے تھے۔ جب ان کو یہ خبر ملی تو وہ بہت مضطرب ہوئے۔ چنانچہ وہ بھی میرے ساتھ ہولیے۔

ہم نے تانگہ لیا اور گھر روانہ ہوئے۔

جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ فلیٹ کے دروازے کے پاس پولیس کھڑی ہے۔

میرا بھانجا اور برادر نسبتی (حامد جلال اور ظہیر الدین) اپنی موٹروں کے پاس کھڑے پولیس والوں سے محو گفتگو تھے اور ان سے کہہ رہے تھے کہ اگر آپ تلاشی لینا چاہتے ہیں تو لے سکتے ہیں۔ آپ یقین مانیے کہ منٹو گھر میں نہیں ہے۔

وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ میں، احمد راہی اور حمید اختر تانگے میں گھر پہنچ گئے۔ ہم نے راستے میں چوہدری رشید صاحب سے کہہ دیا تھا کہ وہ مختلف اخباروں کو ٹیلی فون کردیں تاکہ دوسرے روز جو کچھ میرے ساتھ گزرا ہے، اخباروں میں چھپ جائے۔

میں، حمید اور احمد راہی جب گھر پہنچے تو دیکھا کہ عبداللہ ملک کھڑا پولیس کے افسروں سے گفتگو میں

مصروف ہے۔

عبداللہ ملک کمیونسٹ ہے۔ اس کی تحریر ہمیشہ ''سرخ'' ہوتی ہے حالانکہ میں نے اس میں کبھی وہ سرخی نہیں دیکھی جو اصل سرخی ہے۔ عبداللہ کمیونسٹ میرے مکان کے باہر کھڑا تھا اور سب انسپکٹروں اور سپاہیوں سے گفتگو کر رہا تھا...... میں، احمد راہی اور حمید اختر تانگے میں پہنچے۔

سب انسپکٹروں اور سپاہیوں نے میری بیوی اور میری بہن کو یہ دھمکی دی تھی کہ وہ تلاشی لینا چاہتے ہیں اور اگر دروازے نہ کھولے گئے تو وہ زبردستی اندر گھس آئیں گے۔

میں جب آیا اور باہر کمپونڈ میں ان پولیس افسروں سے ملاقات ہوئی تو میرا خیال ہے کہ انہیں بقدر کفایت ندامت ہوئی۔ میں نے انہیں اندر مکان میں تشریف لانے کے لیے کہا۔ یہ دعوت انہوں نے قبول فرمائی اور اندر تشریف لے آئے۔

دو افسر تھے، بڑے اکھڑ قسم کے...... میں نے ان سے ان کی ملاقات کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ کراچی سے وارنٹ آئے ہیں کہ آپ کی خانہ تلاشی لی جائے۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ میں کوئی خفیہ فروش نہیں ہوں۔ افیون نہیں بیچتا، شراب کا غیر قانونی کاروبار نہیں کرتا۔ میرے پاس کوکین بھی نہیں ہے، پھر یہ پولیس والے جو کراچی سے وارنٹ لے کر آئے ہیں، میری خانہ تلاشی کیوں لے رہے ہیں؟

پولیس افسر جب اندر تشریف لائے تو انہوں نے مجھ سے، پہلے یہ سوال کیا کہ تمہاری لائبریری کہاں ہے؟''

اب میں ان سے کیا کہتا۔ میری لائبریری یہاں پاکستان میں چند کتابوں پر مشتمل ہے۔ ان میں تین ڈکشنریاں یا لغت ہیں۔

میں نے ان سے عرض کیا: ''میری جتنی کتابیں تھیں، وہ تو ممبئی میں رہ گئیں۔ آپ کو اگر کسی پرچے یا پرزے کی تلاش ہے تو آپ ممبئی تشریف لے جائیں۔ ایڈریس حاضر ہے۔''

وہ افسر کچھ ایسے بدذوق تھے کہ انہوں نے اس بذلہ سنجی کی داد نہ دی اور میری خانہ تلاشی شروع کر دی۔ خانہ، میرا سے خانہ نہیں۔ البتہ بیئر کی آٹھ دس خالی بوتلیں ضرور تھیں، لیکن پولیس افسروں نے ان کو دیکھنے کی زحمت نہ کی۔

الماریوں میں چینی کے پیالے تھے۔ میری ایک تپائی پر چھوٹا سا بکس تھا جس میں کچھ کاغذات تھے۔ پولیس افسروں نے اس کا ایک ایک پرزہ دیکھا۔ اخباروں کے چند تراشے تھے۔ وہ انہوں نے اپنے قبضے میں لے لیے۔

اس کے بعد میں نے ان افسروں سے کہا کہ اب براہ کرم تلاشی کے وارنٹ جو دارالحکومت کراچی سے آئے ہی، دکھا دیجیے...... مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

وارنٹ کا کاغذ ایک حوالدار کے ہاتھ میں تھا۔اس نے مجھے دور سے دکھاتے ہوئے کہا:''یہ ہے......''
میں نے اس سے پوچھا:''یہ کیا ہے؟''
اس نے جواب دیا کہ''یہ وہی چیز ہے جس کے ذریعے سے ہم یہاں پہنچے ہیں۔''
جب میں نے اصرار کیا کہ میں یہ کاغذ دیکھے بغیر نہیں ٹلوں گا تو انہوں نے وارنٹ کا کاغذ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے رکھا اور کہنے لگے کہ آپ پڑھ لیجیے۔
میں نے سرسری طور پر پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ خانہ تلاشی کے علاوہ یہ کاغذ میری گرفتاری کا وارنٹ بھی ہے۔اب ضمانت کا مرحلہ درپیش آیا۔
پولیس افسر تو کچھ اتنے خودسر تھے کہ انہوں نے کسی کی ضمانت قبول نہ کی......میرا بھانجا تھا گزیٹڈ افسر، میرا برادر نسبتی، وہ بھی گزیٹڈ افسر، مگر پولیس والوں نے ان کی ضمانت قبول نہیں کی۔ان سے یہ کہا کہ آپ حکومت کے ملازم ہیں، ہوسکتا ہے کہ آپ کل برطرف کردیے جائیں۔
قصہ مختصر یہ ہے کہ میں نے دومرتبہ اپنی علالت کے باعث کراچی کی عدالت کو معذرت نامہ مع ڈاکٹری سرٹیفکیٹ پیش کیا کہ میں حاضر عدالت نہیں ہوسکتا لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ مجھے بالآخر کراچی جانا ہی پڑا۔
یہ ایک دلچسپ لطیفہ ہے۔یہاں جب آخری وارنٹ آئے تو ضمانت دینے کے لیے گھر میں کوئی موجود نہیں تھا۔
میں اپنے بہت سے دوستوں کے پاس گیا مگر ان میں سے کوئی بھی نہ ملا......آخر محمد طفیل صاحب کے پاس گیا۔وہ بڑے شریف آدمی ہیں۔وہ میرے ساتھ بادل ناخواستہ یا خواستہ ہولیے۔ضمانت ہوگئی، اس لیے کہ ان کا ایک ادبی ادارہ ہے (جو''نقوش'' کے مالک بھی ہیں اور مدیر بھی) اور ان کی دکان میں جتنی کتابیں ہیں وہ اس کی ضمانت ہیں کہ وہ پانچ ہزار روپے کی ضمانت دے سکتے ہیں۔
ایک اور لطیفہ سنیے: طفیل صاحب نے ضمانت تو دے دی مگر انہیں یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ شاید میں تاریخ مقررہ پر حاضر عدالت نہیں ہوں گا۔
خدا گواہ ہے کہ میرے پاس زہر کھانے کو بھی ایک پیسہ نہیں تھا، مگر طفیل صاحب صبح پانچ بجے میرے غریب خانے پر تشریف لے آئے۔ان کی جیب میں دوسیکنڈ کلاس کے ٹکٹ تھے......تانگے کا خرچ بھی انہوں نے دیا۔ اسٹیشن تک چھوڑنے گئے اور جب تک گاڑی کراچی روانہ نہ ہوئی، میرے ساتھ رہے......میرے ساتھ انہوں نے میرا ایک دوست نصیر انور کردیا تھا تاکہ میں کراچی یقینی طور پر پہنچ جاؤں۔
کراچی میں جو کچھ مجھ پر بیتی، اس کا حال آپ کو پھر کبھی سناؤں گا۔اس لیے کہ سخت بیمار ہوں۔

منٹو

میں کیوں لکھتا ہوں؟

...... میں کیوں لکھتا ہوں؟ یہ ایک ایسا ہی سوال ہے کہ میں کیوں کھاتا ہوں۔ میں کیوں پیتا ہوں لیکن اس لحاظ سے مختلف ہے کہ کھانے اور پینے پر مجھے روپے خرچ کرنا پڑتے ہیں اور جب لکھتا ہوں تو مجھے نقدی کی صورت میں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ پر جب گہرائی میں جاتا ہوں تو پتا چلتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ اس لیے کہ میں روپے کے بل بوتے ہی پر لکھتا ہوں۔

اگر مجھے کھانا پینا نہ ملے تو ظاہر ہے کہ میرے قویٰ اس حالت میں نہیں ہوں گے کہ میں قلم ہاتھ میں پکڑ سکوں۔ ہوسکتا ہے، فاقہ کشی کی حالت میں دماغ چلتا رہے، مگر ہاتھ کا چلنا تو ضروری ہے۔ ہاتھ نہ چلے تو زبان ہی چلنی چاہیے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ انسان کھائے پئے بغیر کچھ بھی نہیں کرسکتا۔

لوگ فن کو اتنا اونچا رتبہ دیتے ہیں اس کے ڈانڈے ساتویں آسمان سے ملا دیتے ہیں۔ مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہ ارفع و اعلیٰ شے ایک سوکھی روٹی کی محتاج ہے۔

میں لکھتا ہوں، اس لیے کہ مجھے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ میں لکھتا ہوں، اس لیے کہ میں کچھ کما سکوں، تا کہ میں کچھ کہنے کے قابل ہوسکوں۔

روٹی اور فن کا رشتہ بظاہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ خداوند تعالیٰ کو یہی منظور ہے۔ وہ خود کو ہر چیز سے بے نیاز کہتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ وہ بے نیاز اور بے احتیاج ہرگز نہیں ہے۔ اس کو عبادت چاہیے اور عبادت بڑی ہی نرم و نازک روٹی ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ چپڑی ہوئی روٹی ہے، جس سے وہ اپنا پیٹ بھرتا ہے۔

سعادت حسن منٹو لکھتا ہے، اس لیے کہ وہ خدا جتنا بڑا افسانہ ساز اور شاعر نہیں۔ یہ اس کا عجز ہے جو اس سے لکھواتا ہے۔

☆☆

محمد حمید شاہد

منٹو کا دِن

خدا خدا کر کے اکادمی ادبیات، پاکستان پر بھی دن آئے ہیں۔ اور 'دن آنا' کے معنی تو آپ کو آتے ہی ہوں گے ۔ ہاں، اس پر دن آئے ہیں اور اس کے ناتواں تن میں بھی منٹو کے افسانے،'' کھول دو'' کی سکینہ کی طرح زندگی کی رمق جاگ اٹھی ہے۔ وہی سکینہ، جس نے ڈاکٹر کی آواز'' کھول دو'' پر اپنی شلوار یوں نیچے سرکائی تھی کہ پوری انسانیت ننگی ہونے لگی تھی اور افسانہ پڑھتے ہوئے ہمارا دھیان اُس کے بوڑھے باپ سراج الدین کی طرف نہیں گیا تھا جو اپنی بیٹی میں زندگی کی رمق پا کر خوشی سے چلانے لگا تھا کہ ہم تو اُن رضا کاروں کی سفا کی سے دہشت زدہ ہو گئے تھے جو ایک کھیت میں سہم کر چھپ جانے والی سکینہ کو تلاش کر کے اُسے دلاسے کے دام میں لے آئے تھے، اُس کی دہشت دور کر کے اُن میں سے ایک نے اُس کے کندھوں پر اپنا کوٹ بھی رکھ دیا تھا کہ دوپٹہ نہ ہونے کے سبب وہ اپنے سینے کو بار بار بانہوں سے ڈھانپے جا رہی تھی۔

یہ منٹو کا دن ہے۔

اور اکادمی اس خوشی میں منا رہی ہے کہ منٹو کو پیدا ہوئے سو سال ہو گئے ہیں

حالاں کہ پیدا ہونا اتنی خوشی کی بات نہیں ہوتی، جتنا کہ مر کر بھی نہ مرنا۔

سو سال پہلے تو سعادت حسن پیدا ہوا تھا، ۱۱ مئی ۱۹۱۲ کو پیدا ہونے والا بچہ، جس کا منٹو نے اپنی ایک تحریر میں'' خر ذات'' کہہ کر تمسخر اڑایا تھا۔ ایک کشمیری، غلام حسن منٹو کے گھر میں، بالکل اسی طرح پیدا ہونے والا بچہ جس طرح، اسی روز ہزاروں، لاکھوں بچے، اپنی اپنی ماؤں کی کوکھوں سے چیختے کرلاتے پیدا ہو گئے تھے۔ جی، مرنے کے لیے پیدا۔ کہ اپنا وقت آنے پر مر گئے یا مر رہے ہیں تھوڑا تھوڑا کر کے۔ مر رہے ہیں یا مار رہے ہیں ایک بارود بھری جیکٹ پہن کر یا ڈرون اُڑا اُڑا کر۔ بڑے ہو کر ایک ایک کر کے یا ایک ہی ہلے میں مرنے والے اور مار ڈالنے والے یہ سب بچے منٹو کا موضوع ہو سکتے تھے، مگر ویسے نہیں جیسا کہ منٹو خود تھا۔ کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ٹھنڈا گوشت، دھواں، بو، کالی شلوار، یزید اور نمرود کی خدائی جیسی کہانیاں لکھنے کے بعد محض ۴۲ سال کی عمر میں ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ کو قطرہ بھر شراب حلقوم میں اتارنے اور باقی باچھوں سے ادھر ادھر بہانے

کے بعد بہ ظاہر مرجانے مگر ققنس کی طرح پھر سے جی اٹھنے والا منٹو۔
یہ منٹو کا دن ہے، اس لیے نہیں کہ اس روز سعادت حسن پیدا ہوا تھا، بلکہ اس لیے کہ یہ دن ان دنوں کے بیچ آیا ہے جو منٹو کے دن ہیں، مر کر بھی نہ مرنے والے منٹو کے دن۔
میں انہیں منٹو کے دن اس لیے کہہ رہا ہوں کہ پوری قوم، یہ ملک اور اس کے ادارے بھی ان دنوں منٹو کی دہشت زدہ 'سکینہ' جیسے ہو گئے ہیں، ''کھول دو'' کی ایک آواز پر اپنی شلوار نیچے کھسکانے والی سکینہ کہ طرح ،سب کچھ کھلنے لگتا ہے۔ چاہے وہ قومی حمیت کا بھرم ہو، یا دہشت گرد جارح کے لیے بارود بھرے کنٹینرز کے لیے راستہ۔ ہم، جو سکینہ کے باپ جیسے ہیں، 'جھوم جھوم کر' ہم زندہ قوم ہیں، کے نعرے لگا رہے ہیں۔ جب کہ میں دیکھ رہا ہوں، منٹو اپنے ٹائپ رائیٹر پر بیٹھ گیا ہے، اس کی انگلیاں چل رہی ہیں، اور دن دن کے بیچ ایسی کہانی مکمل ہو رہی ہے کہ سب کے پسنے چھوٹ رہے ہیں۔
منٹو تھا ہی ایسا، نعرہ لگانے اور منافقت کا لبادہ اوڑھنے والے بے حمیت کرداروں کو یوں لکھ لینے والا کہ وہ ننگے ہو جائیں سب کے سامنے۔ اب جب کہ اس 'کھول دو' کی آواز پر سب ننگے ہو گئے ہیں تو منٹو کی بابت کیوں نہ سوچیں۔
منٹو جس کا یہ دن ہے، بلکہ منٹو جس کے یہ دن ہیں۔
دہشت زدہ ہونے والی اس قوم کے کندھوں پر اپنے دام دلاسے کا کوٹ ڈالنے والے نام نہاد قومی رضا کاروں کی محافظت میں در آنے والے عالمی دہشت گرد نے اسے پھر سے ریلے وینٹ کر دیا ہے، جی ہاں، اپنی اپنی سیاسی اور فرقہ ورانہ شلواروں میں ہاتھ ڈال کر سب کے سامنے نجاست صاف کرنے والے ہمارے اپنے ملاؤں نے اور، ننگی ٹانگیں، ناف پیالے، چھاتیاں اور غلاظت کو میڈیا اور انٹرنیٹ کی کھڑکی سے ہمارے صحنوں میں پھینکنے والے چچا سام اور اس کے پیاروں نے منٹو کو، اس کے افسانوں کو اور چچا سام کے نام لکھے ہوئے خطوط کو آج سے ریلے وینٹ کر دیا ہے۔
منٹو کے قلم سے ٹپکا ہوا ''نیا قانون'' کل کا افسانہ نہیں رہا، ہماری پارلیمنٹ سے منظور ہونے والی قراردادوں اور عدالتی فیصلوں کے باوجود اسی طرح کی ناقابل برداشت صورت حال میں پڑے رہنے پر مجبور ہو جانے کی وجہ سے، کہ جس کا شکار منٹو کا تراشا ہوا شاہکار کردار 'منگو کوچوان' تھا، آج کا افسانہ ہو گیا ہے۔
اپنی سرزمین پر فوجی اڈوں کی سہولتیں فراہم کرنے کے وقوعے سے لے کر ڈومور کے مطالبے پر مسلسل مرنے والی قوم کا معاملہ ہو یا اپنے دھتکارے جانے کے وقوعے کی تکرار، ہر بار منٹو یاد آتا ہے اور اس کا افسانہ ''ہتک'' بھی۔ جی، وہی افسانہ ''ہتک''، جس میں منٹو نے سوگندھی جیسی طوائف کا کردار لکھا تھا جو دھتکارے جانے پر

یوں محسوس کرنے لگی تھی کہ جیسے وہ اندر سے خالی ہوگئی تھی، جیسے مسافروں سے بھری ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافروں کو اتار کر لوہے کے شیڈ میں اکیلی کھڑی ہوگئی ہو۔ ایک طوائف نے اپنی ہتک کو شدت سے محسوس کیا تھا اور منٹو نے طوائف کے بدن سے جیتی جاگتی عورت تلاش کر لی تھی جب کہ ہم اب اس منٹو کی تلاش میں ہیں کہ جو ہمارے اندر اپنی ہتک کا احساس جگا دے، اس ضرورت نے منٹو کو آج سے ریلے وینٹ کر دیا ہے۔

منٹو ریلے وینٹ تھا، ہے اور رہے گا،

سو یہ منٹو کے دن ہیں۔

ابھی آدمی کو زندگی کے چلن سیکھنا ہیں۔ اس کی موٹی کھال پر اور چرکے لگائے جانے کی ضرورت ہے، اسے سیکھنا ہے کہ زندگی کو لطیف اور کثیف، دونوں رُخوں سے کیسے دیکھا جاتا ہے۔ بظاہر مولوی، دلال، استاد اور طوائفیں ہو جانے والے کردار، محض افسانے کے کردار نہیں رہتے زندگی کی تفہیم بلکہ جیتی جاگتی زندگی کی اذیت ہو جاتے ہیں۔ ایسی زندگی جہاں کوئی آڑ نہیں ہوتی، کوئی ملمع نہیں ہوتا، کوئی ریا کاری نہیں ہوتی، کچھ اخفا میں نہیں رہتا، جیسی وہ ہوتی ہے ویسی ہی، بلکہ اپنے اندر تک سے کاغذ پر اتر آتی ہے۔ یوں جسے حقیقت کی چولی اتر گئی ہو۔

کہیں یہ حقیقت رومانی تجربے کا اظہار ہو جاتی ہے۔ 'بیگو'، 'مصری کی ڈلی' اور 'لالٹین' جیسے افسانوں میں اور کہیں 'ماتمی جلوس'، 'شغل'، 'نعرہ'، 'نیا قانون' جیسے افسانوں میں سیاست کے مکر کو کھولتی ہے۔ طوائفیں 'ہتک'، 'دس روپے'، 'کالی شلوار' اور 'ہیجان' میں آکر عورت ہو جاتی ہیں اور ہمارے بدنوں سے ہیجان کا سارا گندا خون چرکے لگا لگا کر معاشرے کی گندی نالی میں بہا دیتی ہیں۔ صاحبو، یہ افسانے پڑھ کر ہمارے اندر آج بھی وہ احساس جاگنے لگتا ہے، جس سے انسان بنتا ہے۔ خالص اور کھرا انسان۔ 'کھول دو' افسانے کا ذکر ہوا اور 'ٹھنڈا گوشت' کا بھی، 'شریفن' کو یاد کریں اور 'موذیل' کو بھی یہ افسانے زمین کی تقسیم اور انسان کی تقسیم کی بات کرتے ہیں یوں کہ اپنا سارا وزن انسان کے پلڑے میں ڈالتے ہیں۔ منٹو سوئے پڑے آدمی کے اندر وار کرتا ہے، اسے جگاتا ہے اور اس کی حسوں کو بھی۔ وہ نہ جاگے تو 'سو کینڈل پاور کا بلب' جیسا افسانہ لکھتا ہے، اس کے بدن پر 'ننگی تلواریں' چلاتا ہے یوں جیسے اس نے 'ٹھنڈا گوشت' کے ایشور سنگھ کے بدن پر کلونت کور سے چرکے لگوائے تھے۔

'ٹھنڈا گوشت' میں منٹو نے محض ایشور سنگھ جیسے کردار کے یخ ہاتھ میں کلونت کور کا گرما گرم ہاتھ نہیں تھمایا تھا ہمارے بدن بھی جھنجھوڑے تھے۔ مجھے تو آج بھی منٹو کے افسانے کے یہ کردار آنکھوں کے سامنے دِکھتے ہیں۔ منٹو سارے ایشور سنگھوں سے کہتا ہے، چل ترپ چال، پتے بہت پھینٹ چکا، اب پتا پھینک۔ مگر صاحبو

معاملہ یہ ہے کہ ہم اپنی اپنی محبتوں، اپنے اپنے آدرشوں کے پاس اسی ایشور سنگھ کی طرح آتے ہیں، یخ بستہ بدنوں کے ساتھ۔ یوں جیسے ہم نے بھی ایک دو نہیں سات سات قتل کیے ہوں، اپنی اپنی کرپانوں سے اور ہمارے بدنوں میں برف پڑ گئی ہو کہ ان میں اپنے خوابوں کی سی لڑکی بھی ہو، منٹو کے ایشور سنگھ کے مطابق 'بہت سندر'۔

تو یوں ہے کہ یہ منٹو کے دن ہیں، اور تقاضا کرتے ہیں کہ منٹو کو آج سے جوڑ کر پڑھا جائے۔

مگر ہو یہ رہا ہے کہ ہم منٹو کو آج سے جوڑ کر پڑھنے کے بہ جائے اس کل سے جوڑ کر پڑھنا چاہتے ہیں جسے خود منٹو اپنے دوست شیام سے آخری بار گلے ملتے ہوئے بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

منٹو کی حسیات گزرتے وقت کو گرفت میں لیتی رہی ہیں اور ہم اسے ابھی پیچھے کہیں اٹکا ہوا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ بار بار ۱۹۴۵ء والی ''موتری'' کی مثال سامنے لے آتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ''موتری'' کی غلاظت بھری فضا سے تو وہ کب کا نکل آیا تھا اور تقسیم کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ اسے ''یزید'' لکھنا پڑا۔

تقسیم سے پہلے اس کے سیاسی شعور نے ''موتری'' کی دیواروں پر بنے ہوئے انسان پیدا کرنے والے اعضاء کے درمیان لکھے گئے، مگر شدید تعفن پھیلاتے ''مسلمانوں کی بہن کا پاکستان مارا،، اور ''ہندوؤں کی ماں کا اکھنڈ ہندوستان مارا'' جیسے تیزابی جملوں کی فضا سے نکلنے کا یہ حل سوجھا تھا کہ ان سفاک جملوں کو مدہم ہونے دیا جائے اور ان کے نیچے چاک کی سفیدی سے ایک ایسے جملے کا اضافہ کر دیا جائے جو بدبوؤں کے اس گھر میں ایک بے نام سی مہک جاری کر دے۔ یوں منٹو نے جس اُجلے جملے کا اہتمام کیا، وہ تھا ''دونوں کی ماں کا ہندوستان مارا''۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اس مجوزہ حل کی عمر تھوڑی تھی اور یہ بات بھی منٹو جانتا تھا لہذا اس نے صاف صاف لکھ دیا تھا ''صرف ایک لحظہ کے لیے''۔

منٹو کو آج سے جوڑ کر پڑھنے کے لیے، اس حقیقت کو بھی یاد رکھنا ہوگا کہ منٹو نے سینتالیس کے ہنگامے دیکھے۔ اور ''یزید'' کی ابتدائی سطروں کے مطابق 'یہ ہنگامے آئے اور گزر گئے تھے، بالکل اسی طرح، جس طرح موسم میں خلاف معمول چند دن خراب آئیں اور گزر جائیں'۔ ایسے میں ''موتری'' والے راوی کردار کے سیاسی شعور کی ایک ترقی یافتہ صورت، ''یزید'' میں سامنے آتی ہے۔ اب ''یزید'' کا کریم داد اس حقیقت کو تسلیم کر چکا ہے کہ، جس تقسیم کو ہونا تھا، وہ ہو چکی اور جب ساتھ ساتھ رہنا ممکن نہیں رہتا؛ سگے بھائی بھی گھر تقسیم کر لیتے ہیں تو دیوار محترم ہو جاتی ہے، اتنی کہ اس پر گالی نہیں لکھی جانی چاہیئے، اور پھر یہ بھی ہے گالی کمزوری کی علامت ہے۔ گویا جب ہم بھائیوں کی طرح رہنا بھول جاتے ہیں تو تقسیم کرنے والی دیواریں ہمارے لئے مواقع پیدا کرتی ہیں کہ اچھے ہمسائیوں کی طرح بھی رہا جائے۔ منٹو کے سیاسی شعور کا اب یہ فیصلہ ہے کہ جنگ سے ہم

اپنے مسائل حل نہیں کر سکتے۔ پانی بند کر کے یزید کا کردار ادا کرنا ہو یا گالیوں سے جی کا غبار نکالنا دونوں غیر انسانی افعال ہیں۔ تاہم پہلا طرزِ عمل اگر دشمن کی فطرت کے قریب تر ہے تو دوسرا کمزوری اور شکست خوردگی کی علامت۔ خود منٹو کے الفاظ میں:

''کیا فائدہ ہے یار۔۔۔وہ پانی بند کر کے تمہاری زمینیں بنجر بنانا چاہتے ہیں،
اور تم انہیں گالی دے کر سمجھتے ہو کہ حساب بے باق ہوا۔ یہ کہاں کی عقل مندی
ہے۔ گالی تو اس وقت دی جاتی ہے، جب اور کوئی جواب پاس نہ ہو۔''

سینتالیس کی تقسیم میں بلوائیوں کی برچھیوں سے چھلنی ہو کر قتل ہونے والا شہ زور رحیم داد، کریم داد کا باپ تھا۔ باپ کی لاش کنویں کے پاس گڑھا کھود کر بیٹے نے اپنے ہاتھوں سے دفنائی تھی۔ مقتول باپ کی روح سے یہ کہنے والا کہ' تم نے اپنے پاس ہتھیار رکھ کر ٹھیک نہ کیا' اب اگر چوہدری نتھو کو روک رہا تھا کہ یزیدیت پر اتر آئے اپنے قاتلوں کو محض گالی نہ دے، کہ گالی تو وہ دیتا ہے جس کے پاس کوئی اور جواب نہ ہو تو اس کے بھی کچھ معنی بنتے ہیں۔ اسی کریم داد نے اپنی محبوبہ بیوی جیناں کو شہتیر جیسے کڑیل بھائی کے تقسیم میں مارے جانے کے غم میں آنسو بہانے سے روک دیا تھا، کہ آنسو بھی تو کمزوری کی علامت ہیں۔ حتیٰ کہ منٹو کا سیاسی شعور اسے ایسے یزید کا باپ بنا دیتا ہے، جسے پانی بند نہیں کرنا بلکہ پانی کھول دینا ہے۔ جی منٹو کا یزید، جسے اس نے، اس وقت کہ جب وہ جیناں کی کوکھ میں تھا، پیار سے 'سور کا بچہ' کہا تھا۔

سور کا ذکر ہوا تو شیام یاد آتا ہے، اور شیام کے حوالے سے کچھ دن پہلے لاہور میں، لمز کے تحت بیادِ سعادت حسن منٹو ''نیا اردو افسانہ کانفرنس'' بھی، جس میں شیام کا ذکر ہوا منٹو کا اور اس وسیلے سے نئے افسانے کا بھی، کہ نیا افسانہ منٹو کے ساتھ جڑنے میں زیادہ توقیر محسوس کرتا ہے۔ کشور ناہید نے روزنامہ ''جنگ'' 20 اپریل 2012 کے ادارتی صفحے پر اپنے کالم میں اس کا ذکر کیا تو اچھا لگا تھا مگر ایک دو مقامات ایسے آئے کہ الجھتا ہی چلا گیا۔ اس حوالے سے اپنا فوری ردعمل ایک برقی خط میں پہلے دے چکا ہوں اور اب یہاں دہرائے دیتا ہوں۔ کشور نے کہا تھا کہ منٹو کے بارے میں گفتگو تشنہ رہی تھی۔ میں بھی وہاں تھا اور محسوس کیا تھا کہ بس ایک شمیم حنفی کا مضمون بھرپور تھا، انتظار حسین، جو لکھ کر لائے تھے، اسے پڑھا نہیں۔ یاسمین حمید کے اصرار پر بھی، اور صاف کہہ دیا 'وہ تو اب نہیں پڑھوں گا'۔ شاید جو فضا شمیم حنفی نے بنا دی تھی، اس کا تقاضا بھی یہی ہوگا۔ منٹو کے حوالے سے دوسری نشست انگریزی میں تھی، جس میں انگریزی بہت تھی منٹو کم کم تھا۔ اس کا حوالہ کشور نے اپنے کالم میں دیا۔ اس نشست میں ڈاکٹر فرخ خان نے وہ درفنطنی یا پھر درفنطنی چھوڑی تھی جو تھی تو خلافِ متن مگر کشور کو لطف دے گئی تب ہی تو کالم میں جانچے پرکھے بغیر اسے ''نیا نکتہ'' کہہ کر آگے بڑھا دیا

گیا۔ جی، وہی جس میں منٹو کے افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کے متن کے حوالے سے ایک مغالطہ پیدا کرنے کی سعی کی گئی تھی۔ پہلے جس طرح کشور نے لکھا اور ''نیا نکتہ'' رپورٹ کیا وہ ہو بہو نقل کر رہا ہوں۔

"ان [فرخ] کا کہنا تھا کہ جس پاگل خانے کے کرداروں کو منٹو نے پیش کیا ہے اس میں صرف اکیلا بھشن سنگھ ہے، جس کو پاگل نہیں دکھایا گیا ہے۔ وہ اپنی بیٹی سے بھی ملتا ہے، اس کو یاد بھی کرتا ہے۔ کسی پاگل کی سی حرکت بھی نہیں کرتا۔ بھشن سنگھ اس بات پر حیران ہے کہ کل تک ٹوبہ ٹیک سنگھ، ہندوستان میں تھا اور آج وہی علاقہ پاکستان میں قرار دیا جا رہا ہے۔ وہ مہاجرین کی ٹرین میں بھی سوار نہیں ہوتا۔ وہ ایک گم شدہ روح ہے جو سوچ رہا ہے، وہ کہاں ہے۔ آخر وہ کھیت، جنگل سب کچھ پار کرتا ہوا بارڈر پر پہنچ جاتا ہے اور "نومینز لینڈ" پر گر کر مر جاتا ہے۔ کسی لکھنے والے نے اس کو ہندوؤں کا ایجنٹ کہا، کسی نے اس کو پاگل قرار دیا، اسے ایسا انسان سمجھنے سے سارا ادب گریزاں رہا ہے کہ عام آدمی کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آبادیوں کے تبادلے حتیٰ کہ پاگلوں کے تبادلے ہو رہے ہیں آخر کیوں۔"

اچھا، جب ڈاکٹر فرخ، یہ نیا نکتہ بجھانے کو اس افسانے کی نقل فضا میں لہرا رہے تھے تو میں اس بات پر کڑھ رہا تھا کہ ہمارے ہاں متن پڑھ کر اپنا ''نیا نکتہ'' کیوں نہیں ثابت کر رہے۔ خیر بہت ساری انگریزی تو بولی گئی مگر سارا منٹو منہا ہو گیا تھا اور پھر جب کشور نے اسی تعبیر کو لائق اعتنا جانا جس کا منٹو کے لکھے ہوئے متن سے کوئی علاقہ نہیں تھا، اور اس میں کچھ اپنی جانب سے ایسے تائیدی اضافے کیے، جو افسانے کے روح سے مطابقت نہیں رکھتے تھے تو ریکارڈ کی درستی ضروری ہو گئی ہے کہ یہ منٹو کے دن ہیں۔

میں آپ کی توجہ درج ذیل نقاط کی جانب چاہوں گا۔

1۔ منٹو نے اپنے کردار کو "بھشن سنگھ" نہیں بل کہ "بشن سنگھ" لکھا تھا لہذا اس کا حوالہ اسی املا میں ہونا چاہیئے۔

2۔ ڈاکٹر فرخ کا یہ کہنا خلاف واقعہ ہے کہ بس اکیلا بشن سنگھ تھا جسے افسانے میں منٹو نے پاگل نہیں دکھایا/ بتایا۔ مثلاً افسانے کا یہ مقام دیکھیے:

"بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے، افسروں کو دے دلا کر، پاگل

خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ
سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا اور یہ پاکستان کیا ہے لیکن صحیح
واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔"

3۔ڈاکٹر فرخ کا یہ کہنا کہ منٹو نے افسانے کے متن میں اپنے اس کردار یعنی بشن سنگھ کو پاگل نہیں دکھایا بھی نادرست ہے۔افسانے میں اس سکھ کردار کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ:

"ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے
تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب وغریب جملے سننے میں آتے
تھے "اوپڑدی گڑگڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف
لالٹین"۔

اور یہ کہ وہ دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔منٹو نے تو اس کی ذہنی کیفیت بتانے کے لیے پہرے داروں کا مبالغے کی حد تک بڑھا ہوا یہ بیان بھی لکھ دیا تھا کہ بشن سنگھ کا یہ افسانوی کردار'پندرہ برس کے طویل عرصہ میں ایک لحہ کے لیے بھی نہیں سویا تھا۔ ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں۔مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔اور جب اس سے کچھ پوچھا جاتا تو وہ'اوپڑدی گڑگڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان گورنمنٹ' کہتا جسے بعد میں نے'اوف دی پاکستان' کی بہ جائے'اوف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ' کرلیا تھا۔

4۔یاد رہے منٹو نے افسانے کے لگ بھگ تین صفحات پر مشتمل ابتدایئے میں پاگل خانے میں موجود پاگلوں کے پاگل پن کے درجے بنائے تھے تو یہ نشان دہی بھی کر دی تھی:

''پاگل خانے میں وہ سب،جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا
تھا،اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔
اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے!''

گویا بشن سنگھ ایسا پاگل تھا،جس کا دماغ بہ قول منٹو پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا،وہ پاگل تھا مگر بے ضرر،اچھل کر درخت پر نہیں چڑھتا تھا،کسی سے الجھتا نہیں تھا،گالم گلوچ کرتا نہ کسی کو مارتا تاہم اس کے اندر اس کا اپنا ٹوبہ ٹیک سنگھ بستا تھا،قیام پاکستان سے کئی سال پہلے والا ٹوبہ ٹیک سنگھ،جس میں اس کی زمینیں تھیں۔

5۔ منٹو کا اپنے ایک اور کردار کے ذریعے، بشن سنگھ کے بارے میں یہ بیان بھی ڈاکٹر فرخ کے نقطہ نظر کو رد کرنے کے لیے کافی ہے کہ

"ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔"

6۔ یہ بجا کہ اسے باقی پاگلوں کی طرح یا برخلاف ملاقات آنے کا انتظار ہوتا تھا تاہم منٹو کے یہ جملے نگاہ میں رکھے بغیر آپ کیسے کوئی فیصلہ دے سکتے ہیں کہ:

"اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ بش سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جواں ہوئی تب بھی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔"

7۔ یہ بات منٹو نے افسانے کے متن میں کئی وضاحتوں سے اچھی طرح بجھا دی ہے کہ بشن سنگھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے جڑا ہوا کردار تھا۔ زمین سے پاگل پنے کی حد تک جڑا ہوا شخص۔ ایسا شخص جس کے اندر اس کی بالشت بالشت بڑھتی اور پندرہ سالوں میں جوان ہو جانے والی بیٹی کے آنسو کوئی جذباتی ابال پیدا نہ کر سکتے تھے۔ تاہم جسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی فکر تھی۔ منٹو کے مطابق، وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ جہاں اس کی زمینیں تھیں۔

آپ اتفاق کریں گے کہ منٹو کی تحریروں سے اپنی مرضی کے معنی نکالنے کے لیے ایک ایسی متھ بنالی گئی ہے۔ منٹو پر بات کرنا فیشن ہو گیا ہے، چونکانے والی بات مگر کسی حد تک متن اور منٹو سے منحرف بات، کہ منٹو کے دن ہیں۔

ایسے میں منٹو وہ رہتا ہی نہیں ہے جیسا کہ وہ ہمیں ''زحمت مہر درخشاں'' میں دکھائی دیتا ہے۔ پاکستان آنے کے بعد والا منٹو، جس کے سامنے عجب سوالات تھے۔ جن میں دو ایک یوں بھی تھے:

" کیا ہماری اسٹیٹ مذہبی اسٹیٹ ہے۔ اسٹیٹ کے تو ہم ہر حالت میں وفادار رہیں گے، مگر کیا حکومت پر نکتہ چینی کی اجازت ہوگی "......اور"... آزاد ہو کر کیا یہاں کے حالات فرنگی عہد حکومت کے حالات سے مختلف ہوں گے "

اتنے بنیادی سوالات والے منٹو کے تخلیقی وجود کو پوری طرح سمجھنے کے لیے منٹو کے دوست شیام کے حوالے سے اس کی ایک تحریر کی طرف توجہ چاہوں گا۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ تقسیم کے ہنگاموں کے دوران ایک مرتبہ منٹو نے اپنے دوست شیام سے پوچھا تھا؛

''میں مسلمان ہوں۔ کیا تمہارا جی نہیں نہیں چاہتا کہ مجھے قتل کر دو''

شیام نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا

''اِس وقت نہیں...... لیکن اُس وقت جب کہ میں مسلمانوں کے ڈھائے ہوئے مظالم کی داستان سن رہا تھا...... میں تمہیں قتل کر سکتا تھا''

منٹو نے یہ سنا تو اس کے دل کو بہت دھچکا لگا تھا۔ جب ہندو اور مسلمان دھڑا دھڑ مارے جارہے تھے تو شیام جیسے دوست کا "اِس وقت" کبھی بھی "اُس وقت" بن سکتا تھا۔ منٹو نے بہت غور کیا اور پاکستان آنے کا فیصلہ کرلیا۔ شیام نے منٹو کو روکا نہیں۔ بندھا سامان دیکھ کر صرف اتنا کہا" چلے" اور منٹو کے "ہاں" کہنے پر اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی اس نے سامان بندھوانے میں منٹو کا ہاتھ بٹایا۔ برانڈی کی بوتل نکالی۔ دو پیگ بنائے اور کہا" ہپ ٹلا" پھر قہقہے لگا کر سینے سے لگایا اور کہا" سور کہیں کے" منٹو نے آنسوؤں کو روکا اور جواب دیا" پاکستان کے "......اور......سیدھا پاکستان چلا آیا۔

اس واقعہ کا ذکر بھی اس کانفرنس میں ہوا تھا

کہ وہ کانفرنس منٹو سے منسوب تھی، تاہم اسے اپنے اپنے ڈھنگ سے تعبیر دی گئی تھی۔

منٹو کا ذکر ہوتا ہے، تو سب کی سوئی جنس اور تقسیم پر ٹکی رہتی ہے، بات آگے نہیں بڑھتی۔

اور ہاں کشور کے کالم میں ایک اور اطلاع بھی تھی۔ یہ کہ چائے کا وقفہ تھا، ایک نوجوان کشور کے پاس آیا، پوچھا:

''تقسیم ہند کے علاوہ منٹو نے کیا لکھا ہے؟''

میں نہیں جانتا کہ کشور نے کیوں اس ضمن میں ''موذیل'' اور سیاہ حاشیے'' کو بھی گنوا دیا۔ جب کہ مجھے عین اس موقع پر ''سیاہ حاشیے'' کا انتساب یاد آ گیا ہے جسے پڑھتے ہی نگاہوں کے سامنے عجب سفاک منظر پھر جاتا ہے۔

''اس آدمی کے نام

جس نے اپنی خونریزیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

جب میں نے ایک بڑھیا کو مارا تو مجھے ایسا لگا، مجھ سے قتل ہو گیا ہے۔''

اور ہاں '' لمز'' والے پہلے اجلاس کی بابت یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس میں ایک جملہ شمیم حنفی نے ایسا کہا کہ سب کھل کھلا اُٹھے تھے۔ وہ جملہ فتح محمد ملک کے مضمون "ٹوبہ ٹیک سنگھ: ایک نئی تعبیر" کے حوالے سے تھا جس میں ایسے بھی جملے موجود تھے، جو صرف اسلام آباد میں بیٹھ کر لکھے جا سکتے تھے۔ مثلاً یہی کہ:

"پاکستان کا قیام بھلا پاگلوں کی سمجھ میں کیوں کر آ سکتا تھا"۔

اسلام آباد میں بیٹھ کر لکھے گئے ایک جملے پر شمیم حنفی کا قہقہہ اچھالتا جملہ بھی ایسا ہی تھا جسے دلی یا ممبئی میں لکھا جا سکتا تھا۔ صاحب، جسے فتح محمد ملک کے ایسے جملوں پر گرفت کرنا ہے ضرور کرے، ظاہر ہے جو اُدھر رہ گئے ادھر نہیں آئے اُن کا بھی ایک نقطہ نظر تھا، مگر نقطہ نظر کا اختلاف ادبی متن کی تحریف کی صورت میں یا پھر اسے سرے سے پس پشت ڈال کر من مانی تعبیر کی صورت میں نہیں نکلنا چاہیے۔

کہ صاحبو یہ منٹو کے دن ہیں۔ منٹو کہیں گیا نہیں ہے یہیں موجود ہے اپنے افسانوں کے اصل متن کے ساتھ۔

[سعادت حسن منٹو کی سوویں سالگرہ پر اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام ''یوم منٹو'' کے نام سے، ۱۱ مئی ۲۰۱۲ کو منعقدہ کانفرنس میں پڑھا گیا۔]

عائشہ جلال
انگریزی سے ترجمہ مسعود الحق

ایک کھو کھلے ضمیر کا نگہبان

سعادت حسن منٹو نے جن کی جنم شتابدی کے جشن آج (11 رمئی 2002ء) پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں منائے جارہے ہیں ایک وفد کہا تھا کہ برصغیر سے انگریزوں کی مراجعت کے وقت پیدا ہونے والی تباہ کن اور مہلک نفرت کی شدت کا اندازہ لگانے کی ہر سعی کا آغاز خود انسانی خلوت کی تفتیش وتحقیق سے ہونا چاہیے۔

اردو کے عظیم افسانہ نگار کا یہ فیصلہ کسی قدر کی تعین کا فیصلہ نہیں تھا یہ تو ایک ایسے واقعے کا بہانہ تھا جس کا بغور مشاہدہ کرنے اور وسیع ذہنی وجذباتی غور وفکر کے بعد وہ اس حتمی نتیجے پر پہنچا تھا۔ برصغیر کو ٹکڑوں میں بانٹنے کے اس فیصلے کے عواقب سے حواس باختہ اور ششدر منٹو سوچتا تھا کہ کیا وہ تمام لوگ جو ابھی کل تک دوست تھے، ایک دوسرے کے پڑوسی تھے، ہم وطن تھے، انسانی اخوت و بھائی چارے اور انسانیت کے ہر احساس سے محروم ہو گئے تھے؟ وہ خود بھی ایک انسان تھا، ویسا ہی انسان جس نے انسانیت کی حرمت کو گزند پہنچائی تھی، جو قتل وغارت گری میں ملوث ہوا تھا، اس میں وہ تمام اچھائیاں بھی تھیں اور تمام وہ برائیاں بھی تھیں جو تمام دوسرے انسانوں میں ہوتی ہیں۔ مگر انسان کی محرومی چاہے جتنی وسیع ہو، چاہے جتنی قابل نفریں ہو، انسانیت کے احساس کو یکسر نیست ونابود نہیں کرسکتی۔ انسانیت کی ایسی نوع پر تعین کامل رکھتے ہوئے منٹو نے 1947ء کے المیے کے بارے میں بڑی اثر آفریں اور توجہ طلب کہانیاں لکھیں جو اجڑی اور سہمی ہوئی انسانیت کی حالت زار کی بے مثال غیر جانب داری اور انتہائی ہمدردی کے ساتھ لکھی ہوئی کہانیوں کے طور پر عالمی پیمانے پر تسلیم کی گئیں اور پسند کی گئیں۔

تقسیم کے شخصی پہلو:

ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کی تشکیل کے شخصی پہلوؤں سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کو تقسیم سے متعلق منٹو کی ان کہانیوں کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ جذباتی شکست وریخت کے ان دنوں کے، عام آدمیوں کے تجربات

کے غائر مشاہدات کی بنیاد پر ضبط تحریر میں لائی ہوئی منٹو کی یہ کہانیاں نہ صرف بے نظیر ادبی خوبیوں کی حامل ہیں بلکہ انتہائی اہم اور نادر تاریخی دستاویزات بھی ہیں۔ افراتفری کے اس زمانے کے صحافتی اور عصبیت زدہ بیانات کے برعکس منٹو خود ستائیوں پر محمول، ہندوستان اور پاکستان دونوں کے فرقہ جاتی (Communalism) بیانیوں کی تنگ نو حدود کو توڑتا ہے۔ منٹو نے تقسیم کے تشدد اور اس دوران ہونے والی بربریت سے پیدا ہونے والے اخلاقی بحران کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو الگ کر کے اپنے آپ کو بچا کر دوسرے فرقے میں......اور آسیب تلاش نہیں کیے۔ ایک غیر متعصب اور جگت آشنا انسان دوست منٹو نے تنگ نظر عصبیت اور تنگ کٹر پن کو مسترد کیا اور اپنے دوستوں کے انتخاب میں مذہبی اور تہذیبی امتیازات کی دخل اندازی سے انکار کیا۔ تینتالیس برس سے کچھ کم کی مختصر زندگی میں وہ امرتسر میں رہا۔ ممبئی میں رہا، دہلی اور لاہور میں رہا اور ان جگہوں پر اس نے وہ دوستیاں قائم کیں جو 1947ء کی زبردستی مسلط کی ہوئی سرحدوں کی پابندیوں کے باوجود بچی اور قائم رہیں۔ دوستوں کا جو جھرمٹ اس نے ہندوستان میں چھوڑا اس میں اردو اور ہندی کے ترقی پسند ادب کے رجحان ساز راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور علی سردار جعفری جیسی شخصیتیں تھی اور ممبئی کی فلم انڈسٹری کے اشوک کمار اور شیام جیسے مقبول و ممتاز ستارے بھی تھے۔

مذہبی خطوط پر ہونے والی ایک ڈرامائی شکست و ریخت اور ابتری کے ان حالات میں منٹو نے تاویلات کے ان تمام گروہی رجحانات کو مسترد کیا جن کی بنا پر تقسیم اور اس کے تباہ کن خمیازوں کی تشریح و توضیح میں دوسرے تمام عوامل پر مذہب کی بالادستی تھی۔ منٹو نے اپنی ایک نیم سوانحی کہانی 'سہائے' جس کی تحریک انہیں راولپنڈی میں مسلمانوں کے برپا کیے ہوئے فسادات میں ایک سکھ..... کے دردناک واقعات پر شیام سے ہونے والی گفتگو سے ملی تھی۔ انہوں نے کہا تھا ''چاقو چھریاں اور گولیاں مذہب کو ختم نہیں کر سکتی ہیں۔'' منٹو نے اس وقت شیام سے پوچھا تھا کہ کیا وہ میرے ایک مسلمان ہونے کی وجہ سے مجھے جان سے مار سکتا ہے؟ اور شیام نے جواب دیا تھا۔ اب نہیں مگر جب میں مسلمانوں کے ہندوؤں پر کیے ہوئے مظالم اور ان کی درندگیوں کے واقعات کے بارے میں سن رہا تھا اس وقت میں تمہیں مار سکتا تھا۔'' ''اگر ایک ہندو نے ایک مسلمان کو مار دیا۔'' منٹو نے سہائے میں لکھا۔ تو اس نے اسلام کو نہیں ایک انسان کو مار دیا، اسلام پر تو اس کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑے گا۔ مسلمان جن کا خیال تھا کہ ہندوؤں کو مار کر وہ ہندوازم کو ختم کر سکتے ہیں، ایک ہی جیسی غلط فہمی کا شکار تھے۔''

پہلی کہانی

طویل انتظار کے بعد آنے والی آزادی کی صبح کو خود اس کے صوبے پنجاب میں ہونے والے خون

خرابے کے اسباب وعدل کو سمجھنے کے لیے منٹو نے فطرت انسانی کے نہاں خانوں میں جھانکا۔ 1947ء میں جو تشدد اور جو بربریت اس نے دیکھی اور اس کے بہت دیر تک رہنے والے اثرات کا مشاہدہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ مذہبی جوش وخروش اور زہد وتقویٰ نہیں ہے بلکہ یہ محض انسانی حرص وہوس اور درندہ بن جانے کی ان کی حیرت انگیز صلاحیت ہے جس نے برصغیر کو اس افسوسناک صورت حال تک پہنچایا ہے۔ تقسیم کے انسانی تجربات کے بارے میں اگرچہ تخلیقی ادیبوں نے، پیشہ ور مورخین کے مقابلے میں زیادہ موثر طور پر لکھا ہے مگر منٹو، افراتفری کے اس زمانے کی عام زندگی کی اپنی بے باک تصویر کشی، اپنی زبان کی سادگی اور کہانی کے بہاؤ اور روانی کی بنا پر اپنے معاصرین سے کہیں آگے ہے۔ اس نے تشدد کا ارتکاب کرنے والوں پر جو توجہ مرکوز کی وہی اور اتنی ہی توجہ تشدد کے شکار لوگوں کو بھی دی۔ خصوصاً پاکستان کی سرزمین پر لکھی جانے والی اپنی اولین اور انتہائی متنازعہ فیہ کہانی 'ٹھنڈا گوشت' میں۔ جس کے لکھنے کی پاداش میں، نئی نئی وجود میں آئی ہوئی مسلم مملکت خداداد میں، کلونیل آقاؤں کے وضع کیے ہوئے فحاشی مخالف قوانین کے تحت اس پر فحاشی کا الزام لگایا گیا تھا۔ کہانی ایک ایسے کردار کے گرد گھومتی ہے، جو یہ سننے کے بعد کہ عصمت دری کی نیت سے وہ جس نوجوان لڑکی کو اغوا کر کے لایا تھا وہ مرگئی، وہ جنسی طور پر ناکارہ ہو جاتا ہے۔ کہانی لکھنے کی تحریک منٹو کو بداخلاقی سے کسی دلچسپی یا کسی کجروی سے نہیں ملی تھی جیسا کہ ریاستی محکموں میں سے اسے پریشان کرنے والے کچھ افراد کو شبہ تھا۔ اس نے شدید جذباتی انداز میں پنجاب کے دونوں مدمقابل فرقوں کے مردوں کے ہاتھوں ہونے والی اس ناقابل یقین تحقیر اور ان زیادتیوں کے بارے میں لکھا جو وہاں عورتوں کے ساتھ ہو رہی تھیں۔ کون سا مذہب ہے جو ایسی قابل نفریں اور گھناؤنی حرکتوں کی اجازت دیتا ہے؟ سیکڑوں ہزاروں معصوم لوگوں کے قتل وخون کا ذمہ دار کون تھا؟

مورخین کے لیے اہم:

یہ اجتماعی پاگل پن کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جسے اتفاقی کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ تقسیم ملک منٹو کے لیے ایک ایسے کھیلے جانے والے ڈرامے کا حصہ تھا جس نے نوع انسانی کے بہترین اور بدترین پہلوؤں کو دکھایا۔ منٹو کی کہانیاں تاریخ لکھنے والوں کے لیے اہم مآخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کہانیوں نے تقسیم کے بعد ہونے والے تشدد اور مابعد بربریت کے تجزیے کے رائج عمومی طور طریقوں کو اتھل پتھل کر دیا، انہیں الٹ پلٹ دیا۔ منٹو جانتا تھا کہ کچوکے کس طرح دیئے جاتے ہیں، خلش کیوں کر پیدا کی جاتی ہے۔ ملک کو تقسیم کرنے اور پھر یہاں سے چلے جانے کے برطانیہ کے فیصلے سے پھوٹ پڑنے والے بھیانک تشدد کو ان لوگوں کی ذہنی بے

آرامی کے راست تقابلی تناسب کے پس منظر میں دیکھا اور تولا جا سکتا ہے جو چیزوں کو مذہبی شناختوں کے مسخ آئینوں میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔

تقین (منٹو کی ایک کہانی) میں منٹو نے کلونیل ازم کے چنگل سے آزاد ہونے والی دو ریاستوں کی ان کوششوں کا مذاق اڑایا جو یہ ریاستیں پنجاب میں ہونے والے فرقہ وارانہ پاگل پن کے دوران اغوا کی گئی عورتوں کی باز آبادکاری کے ذریعے ان مظلوموں کی عصمتوں کے جستہ پیراہن کو سینے کے لیے کر رہی تھیں۔ المناک کہانی ایک اجڑی اور نیم پاگل عورت کے گرد گھومتی ہے جو مایوسی اور ناامیدی کے باوجود بڑی بے قراری سے اپنی بیٹی کو ڈھونڈھنے میں سرگرداں تھی۔ رابطہ افسر قصے کو بیان کرتے ہوئے بوڑھی عورت کو بتاتا ہے کہ اس کی بیٹی ماری جا چکی ہے اور اب اسے (عورت کو) اس کے ساتھ پاکستان چلنا چاہیے۔ عورت رابطہ افسر کی اس بات کو ماننے سے انکار کرتی ہے کہ اس کی خوبصورت بیٹی ماری بھی جا سکتی ہے۔ ایک دن وہ عورت اپنی بیٹی کو سڑک پر ایک سکھ نوجوان کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھ لیتی ہے۔ سکھ نوجوان بھی لڑکی کی ماں کو دیکھ لیتا ہے اور لڑکی کو بتاتا ہے۔ ''تمہاری ماتا جی۔'' لڑکی اس بوڑھی عورت پر ایک نظر ڈالتی ہے اور آگے بڑھ جاتی ہے۔ حیران و پریشانی، بولائی ہوئی عورت چیخ چیخ کر لڑکی کو پکارتی ہے۔ رابطہ افسر خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ اس کی بیٹی واقعی مر چکی ہے یہ سن کر وہ زمین پر گر پڑتی ہے اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے۔ منٹو بڑے پراسرار طور پر اس بات کو غیر واضح اور مذبذب چھوڑ دیتا ہے کہ آیا لڑکی اس سکھ نوجوان کے ساتھ خود بھاگی تھی یا اسے اغوا کیا گیا تھا اور کیا اب اس نے اس سکھ نوجوان کے ساتھ رہنے کے خیال سے مفاہمت کر لی تھی اور اپنی مجبور اور بدنصیب ماں کے پاس واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔

......کیمپوں سے جمع کی ہوئی معلومات اور حقیقت پسندانہ فکشن کو باہم آمیز کر کے منٹو نے تقسیم کے ہمہ چہرہ مصائب کو تحریری شکل میں اس ڈھنگ سے یکجا کر دیا جو پیشہ ور مورخین کے لیے ان کے کام کی منہاجی بندشوں کی وجہ سے ان کے لیے مشکل الحصول تھا۔ کلونیل استبداد سے نکلی ہوئی دو حریف ریاستوں کے معاندانہ قومی نظریات کے اعداد و شمار میں جکڑے ہوئے بیانیوں سے آزاد رہتے ہوئے اور اپنی انسان دوست حس اور توازن و معقولیت کو ترک کیے بغیر منٹو نے تشدد کرنے والوں اور تشدد کے شکار لوگوں کی روحوں کو جھنجھوڑ دیا۔ ملک کی تقسیم نے جو عظیم دہشت انگیز ہیجان برپا کیا تھا۔ ''میں نے اس کے خلاف بغاوت کی۔'' منٹو نے اعتراف کیا ''اور میں آج بھی اسی طرح محسوس کرتا ہوں۔'' مگر مایوسی اور نومیدی کی چادر اوڑھ کر بے بس اور مجبور پڑے رہنے کی بجائے منٹو اس بدہیت اور غیر فطری حقیقت کے روبرو ہوا، سنجیدہ سماجی مسائل کو غیر معتدل انداز سے بیان کرنے کا بہتان لگنے کے باوجود، بھائی کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے

کے لیے انسان نے انسان کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس پر پچھتاوے اور تاسف کے چند موتیوں کی تلاش میں اس نے خون کے سمندر میں چھلانگ لگادی۔ اس نے ان چند آنسوؤں کو جمع کیا جو کچھ ایسے لوگوں نے بہائے تھے جو اپنی انسانیت کو پورے طور پر مار نہیں سکتے تھے۔ پھر ان آنسوؤں کو اس نے اپنی کتاب 'سیاہ حاشیے' میں باہم گوندھ دیا۔ (1948ء میں شائع ہونے والی اس کتاب کا خالد حسین نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔)

تاریخ کے گواہ کی حیثیت سے:

اپنے صد سالہ جنم دن پر ادب کے افق پر منٹو ان تمام دوسرے لوگوں میں ممتاز تر ہے جنہوں نے 1947ء میں ہونے والی عوامی ہجرتوں کے بارے میں لکھا ہے۔ تعریف و تحسین کا مستحق منٹو کا وہ رول ہے جو تقسیم ملک سے متعلق اپنے جھنجھوڑ دینے والے بیانیوں میں تاریخ کے ایک گواہ کی حیثیت سے اس نے ادا کیا ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں شماریاتی نظریات...... کے اپنے مفادات ۔کے فروغ وابلاغ کی خاطر ایک مضمون کی حیثیت سے تاریخ دانستہ اور منصوبہ بند بے توجہی کا شکار رہی ہے۔ ایک ایسے ماضی کو جس نے ان کے حال کو ایسی بے یقینیوں اور ایسے خدشات سے بوجھل کر دیا ہے سمجھنے کے خواہش مند متجسس ذہنوں کے لیے تقسیم سے متعلق منٹو کو کہانیاں بہترین نقطۂ آغاز ہیں۔ ہمہ وقت چوکس رہنے والے زیرک منٹو نے مذہب کو ایک ذاتی عقیدے اور اخلاقیات کی بجائے ایک ہتھیار کی طرح استعمال کیے جانے کے ان مسائل کی پیش بینی کر لی تھی۔ جنہوں نے پچھلی تین دہائیوں میں مسلم پاکستان میں ایک انتقامی انداز میں سر اٹھایا ہے۔ منٹو کی چیتاونی میں ایک گونج ہے جو آج اس وقت سے زیادہ قوی ہے جب اس نے کہا تھا۔ ''ہمارا شکستہ تمدن'' اور ہماری منقسم تہذیب، ہمارے فنون کی باقیات اور وہ سب جو خود ہمارے جسموں کے کٹے ہوئے ٹکڑوں سے ہمیں ملا ہے اور وہ جو مغرب کی سیاست کی راکھ میں دفن ہے، اس سب کی بازیافت کی ضرورت ہے۔ اس کی جھاڑ پونچھ، اس کی صفائی کی ضرورت ہے اس کو وہی سرسبزی وشادابی واپس دلانا ہے۔ اس طوفانی آندھی میں ہم نے جو کچھ کھویا ہے اس سب کی بازیابی کے لیے۔

جنم دن کے اس موقع پر اگر کوئی تحفہ ہے جو ہندوستان اور پاکستان کے لوگ مل کر مشترکہ طور پر منٹو کو دے سکتے ہیں تو وہ ان مسائل کی حقیقت کا اعتراف ہے جس کی توضیح منٹو نے تقسیم سے متعلق اپنی تحریروں میں کی ہے۔ شاید اس طرح اس ساری متاع گم گشتہ کو دوبارہ حاصل کرنا ممکن ہو جسے دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کی حیثیت اور مقام کو سمجھنے، ماضی کی غلطیوں کو درست کرنے اور باہمی مفاد پر مبنی کوئی پائیدار تاریخی معاہدہ کرنے سے اپنے کوتاہ بیں انکار کی وجہ سے کھو دیا ہے۔

تنقیدی مضامین

وارث علوی

ناول بن جینا بھی کوئی جینا ہے

پچھلے پچاس سال میں جدید اور علامتی اور اسطوری اور حقیقت پسند لیبلوں کے تحت جو افسانے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ان پر ہمارے ملک کی اس مخصوص صورت حال کا اثر بہت گہرا ہے جو بھرشٹاچار سے بھری ہوئی پرتشدد خوں چکاں فرقہ پرست اور دن بہ دن نراج کی طرف بڑھتی ہوئی سیاست سے عبارت ہے۔ ناول تو بے دریغ طور پر صحافیانہ بن گئے ہیں۔ میرا خیال ہے دوسری زبانوں پر بھی اس صورت حال کا اثر پڑا ہے لیکن اتنا شدید اور ہمہ گیر نہیں جتنا کہ اردو میں نظر آتا ہے۔ دوسری زبانوں میں روزمرہ کی سیاست اور صحافت سے الگ دور جدید میں بدلتے ہوئے انسانی تعلقات، نفسیاتی اور اخلاقی مسائل، انفرادی عزائم، شخصی احساسات اور ذاتی آرزومندیوں اور محرومیوں کے موضوعات اس طرح عنقا نہیں ہوئے جیسے کہ اردو میں ہوئے ہیں۔ اس کی صاف وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد مسلمان جس دور ابتلا سے گزرے ہیں اس میں زندگی کی سلامتی اور تحفظ ذات کا مسئلہ تمام مسائل پر حاوی ہوگیا ہے۔ دوسرے مسائل ہیں، اندرونی تضادات اور تضادات بھی ہیں، درد کے ان گنت نازک مقامات بھی ہیں، لیکن وہ سب کے سب ایک اندوہناک صورت حال میں تخلیقی طور پر غیر اہم بن گئے ہیں۔ یہ وبا کس قدر پھیلی ہوئی ہے اس کی عبرتناک مثال سریندر پرکاش جیسا خلاق افسانہ نگار ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تقسیم ملک میں اور ارض پاک کے ہندوؤں کی ہجرت کا المناک واقعہ سریندر پرکاش کے لیے اتنا وحشت ناک ثابت ہوا ہے کہ اب وہ جو بھی افسانہ لکھتے ہیں ایک ہی تھیم کا Variation ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں چند ایسے جدید افسانوں کا ذکر کیا ہے جن کی تھیم طاقتور اور ظالم کا کمزور پر غلبہ اور ظلم ہے۔ یہی تھیم ناولوں میں بھی نظر آئے گی مثلاً اقبال مجید کے ''کسی دن'' سید محمد اشرف کے ''نمبر دار کا نیلا'' اور عبدالصمد کے ناول ایسا لگتا ہے کہ افسانہ اور ناول چاہے علامتی، تجریدی یا حقیقت پسندانہ ہو، تھیم اور مواد کے اعتبار سے ایک ایسی تاریک سرنگ سے گزر رہا ہے جہاں دور تک روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ کمیونسٹ آئیڈیلزم کی شکست کے بعد تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ موضوع افسانہ میں یہ یک رنگی اور تنگ دامنی فکشن کے لیے بہت ہی برا شگون ہے۔ اتنا برا کہ یہ فکشن کی موت کی علامت ہے۔

مغرب میں تو ناول کی موت کا اعلان ہو چکا تھا۔ مجھ جیسے ناول کے رسیا اس اعلان پر یقین نہیں کرتے تھے۔

میں تو آج بھی نہیں کر رہا کیونکہ مغرب میں آج بھی کچھ نہ کچھ چیزیں ایسی سامنے آتی ہیں جو ناول کی زندگی کا ثبوت دیتی ہیں۔ یہ بات کہ شہزاد کے پاس کہنے کے لیے کہانیاں نہیں رہیں کم از کم اردو کی حد تک تو درست معلوم ہوتی ہے۔ سر دھڑ بغیر کی کہانیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ رات ختم ہو چکی ہے اور شہزاد کا سر قلم ہو چکا ہے۔

میں واویلا مچانے والے اور فریاد وفغاں کرنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے اپنی زندگی بہت عزیز رہی ہے اور ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں میں تو عزیز تر بن گئی ہے۔ سوائے خرافات نویسی کے میں نے عمر عزیز کا ایک لمحہ بھی فضولیات پڑھنے پر ضائع نہیں کیا۔ وقت کا مجھے بڑا احساس رہا ہے اور سیل رواں کے ہر لمحہ میں پنہاں مسرت کا پورا رس کس میں نے نچوڑا ہے۔ مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ جب میں چاروں طرف رسالوں کے اداریوں میں، اخبارات کے کالموں میں، مضامین میں، خطوط میں، تقریروں میں اردو زبان کی کسمپرسی، اردو پروفیسر کی نااہلیت، ڈاکٹریٹ کے مقالات کا کھوکھلا پن، شاعروں اور ادیبوں کی گروہ بندی، انعامات اور کرامات میں دوست نوازی اور اقربا پروری، بے کیف معاصرانہ چشمک، جاہلانہ تنقیدی دار وگیر اور اسی نوع کی ان ہزاروں کھٹی ڈکاروں کی بوباس دیکھتا ہوں جو ادب کی بوڑھی کنواریوں کے بادٔ گولوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ تو میں سوچتا ہوں، میں کن لوگوں میں گھر گیا ہوں، کہاں آ گیا ہوں، کیا کر رہا ہوں۔ یہ ادب تو نہیں ہے جو حسن و مسرت کا سر چشمہ ہے، جو فلسفہ دانشمندی، فکر ونظر، بصیرت و بصارت، احساس کی نزاکت اور جذبہ کی ملائمت کا خزینہ ہے۔

مجھے تلاش ہے ان ناولوں کی جن کی دنیاؤں میں کھو کر آدمی خود کو پاتا تھا، ان افسانوں کی جو نیرنگی جہاں کا آئینہ ہوتے ہیں۔ مجھے پتہ نہیں ان پچھلے پچاس سالوں میں اردو والے کون سے ناول اور افسانے اور ڈرامے پڑھتے رہے ہیں۔ اردو والوں سے یہاں مراد وہ لڑکے اور لڑکیاں ہیں جن کی آج کی عمر میں ہم پریم چند، بیدی، منٹو، عصمت، کرشن چندر، بلونت سنگھ، اپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی، عزیز احمد، غلام عباس، علی عباس حسینی، اختر حسین رائے پوری، ہاجرہ اور خدیجہ مستور اور قرۃ العین حیدر کو پڑھا کرتے تھے۔

ان میں سے ہر افسانہ نگار دوسرے سے مختلف اور اس کا ہر افسانہ دوسرے افسانہ سے مختلف رنگ کا ہوتا تھا۔ یہ رنگا رنگی آج کہاں غائب ہوگئی کہ لگتا ہے سب کے چہرے ایک سے ہیں اور سب باہم مل کر ایک ہی افسانہ لکھ رہے ہیں۔ اندرون خانہ بھی وہی نوحہ گری اور فریاد وفغاں ہے جو بیرون خانہ ہے۔ میں نے اپنی دنیا تنگ اور راستے مسدود نہیں کیے۔ میں اس گوشۂ چمن سے بھاگ کھڑا ہوتا ہوں جس کی دوب سوکھی گھاس بن چکی ہوتی ہے اور بے برگ وبار درختوں پر کرگسوں کے جھنڈ ہوتے ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو نقاد بننے کی خاطر گلی سڑی بوٹیوں کو بھی نوچتے رہتے ہیں۔ میرے خلاف نئے لکھنے والوں کو شکایت یہ ہے کہ میں

بیدی اور منٹو سے آگے دیکھتا ہی نہیں۔ میرے لیے بیدی اور منٹو وہ نہیں ہیں جیسے پوجنے کے لیے محمد حسن عسکری کے لیے فراق گورکھپوری تھے۔ اوپر جن افسانہ نگاروں کے میں نے نام گنوائے ہیں ان میں میری دلچسپی آج بھی ہے اور ان میں سے کچھ پر لکھ چکا ہوں اور وقت نے ساتھ دیا تو دوسروں پر لکھوں گا۔

جب ایک باغ نغمہ سراؤں سے خالی ہو جاتا ہے تو میں دوسرے کی طرف نکل جاتا ہوں لیکن وہ لوگ کیا کرتے ہوں گے جو دوسرے پرندوں کی بولیوں کو نہیں سمجھتے۔ کیا وہ دوسری زبانوں کے ناولوں سے دل بہلاتے ہیں۔ ایک مزید سانحہ اردو پر یہ گزرا ہے کہ اکادمیاں نیشنل بک ٹرسٹ اور اردو بیورو کے باوجود ہمارے یہاں دوسری زبانوں کی ناولیں اب اتنی بھی ترجمہ نہیں ہو رہی ہیں جو چوتھی پانچویں اور چھٹی دہائی میں مذکورہ اداروں کی عدم موجودگی کے باوصف ہوتی تھیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ چھٹی دہائی کے بعد کی نسل ناول اور افسانے پڑھنے والی نسل نہیں ہے۔ دراصل اس نسل نے پڑھنے والے نہیں لکھنے والے پیدا کیے ہیں۔ ہر آدمی ادیب یا شاعر بننا چاہتا ہے۔ خراب لکھتا ہے اور خراب پڑھنے والے پیدا کرتا ہے جو پھر خراب لکھنے والے بن کر خراب پڑھنے والے پیدا کرتے ہیں۔ آج ادب عبارت ہے اسی خانہ خرابی سے۔

ناول کے تو معنی ہی ہیں ہر تخلیق کا نیا ہونا، تازہ کار اور یکتا ہونا۔ کسی ایسے تجربہ کا بیان ہونا جو دوسری ناولوں میں نہ ہو، ایسی انفرادیت جو مادام بواری کی اینا کارے نینا سے بالکل الگ قسم کا ناول بناتی ہو۔ یہ کائنات، یہ زندگی، یہ انسان کتنی بے پایاں تخلیقی وسعتوں اور امکانات کا حامل ہے۔ انسان کے احساسات اور جذبات کی دنیا میں کیسی رنگا رنگ، ندرت اور انفرادیت ہے۔ انسانی تعلقات کی دنیا میں کیسا بے پناہ تنوع ہے۔ ہر فرد کے مشاہدات اور تجربات کتنے مختلف اور متنوع ہوتے ہیں۔ فطرت انسانی کیسی حیران کن، بھید بھری گتھیوں کا جھمیلا ہے۔ آپ ڈور کو سلجھاتے جائیے اور وہ الجھتی جائے گی۔ ان تمام باتوں کا شعور ہمیں ناول اور افسانے ہی عطا کرتے ہیں۔ ہمارے جدید افسانہ کے پاس، چاہے وہ علامتی ہو یا حقیقت پسند، انسانی زندگی میں دلچسپیوں کے یہ مراکز نہیں ہیں۔ خراب افسانوں کا تو یہاں ذکر ہی نہیں، اچھے افسانے بھی موضوع کی یک رنگی کا ایسا شکار ہیں کہ لگتا ہے کہ افسانہ بھی غزل کی راہ چل پڑا ہے جس کے ایک سے مضامین اور معاملات ہیں۔ ترقی پسند افسانہ، خصوصاً کرشن چندر، احمد عباس اور ان کے مدرسہ کے دوسرے صحافتی لکھنے والوں کے افسانوں پر بھی یہی الزام تھا کہ وہ بھی سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کسان، طاقتور اور کمزور کے چکر سے باہر نہیں نکل سکے۔ جدیدیت جو اس صورت حال کے خلاف ردعمل تھی بالآخر اسی کا شکار ہو گئی۔

ترقی پسندی کے برعکس جدیدیت نے موضوع کی بجائے فارم پر زور دیا اور یہ رویہ غلط نہیں تھا، لیکن یہ محض التباس تھا۔ فکشن کی تنقید موضوع ہی کی حلقہ بگوش رہی۔ مثلاً انور سجاد کو بلراج مینرا اور باقر مہدی نے بغیر

یہ دیکھے کہ ان کے افسانوں کا فارم ناقص اور خام کار تھا اور ان کے افسانے بے روح اور بے جان تھے (جس کے سبب چند ہی برسوں میں وہ بھلا دیے گئے) اس لیے انہیں بانس پر چڑھایا کہ وہ ان کے ہم عقیدہ تھے اور ان کے یہاں سامراجیت وغیرہ وغیرہ کی تصویر پر چھپکلی کی چال ترقی پسندی کے ٹوٹتے خمار کی فریم ورک میں ٹھیک سے سما رہی تھی۔ مجھے انور سجاد کی یساریت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور میں نے ان کے فارم کی فنکارانہ رائیگانی اور لاغری، جو اس وقت کے تمثیلی افسانوں کے ہڈ پنجروں کا مقدمہ تھا، کی گرفت کی تھی، لیکن اس وقت میرے مارکسی دوستوں کا مجھ پر الزام یہی تھا، جو آج بھی ہے، کہ میں غالی مخالف یساریت ہوں۔ آج انور سجاد کی یساریت خود ان کے نام کے ساتھ ایک گالی کی طرح چپکی ہوئی ہے کیونکہ برصغیر کے دونوں بدنصیب ملکوں میں جوہری دھماکوں کے بعد انور سجاد کے یہاں اسلامی عقائد، دین محمدی اور نظام مصطفوی کا ایسا بروز ہوا ہے کہ اب حیات سے جملہ مستعار لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ باقر مہدی چپ اور سارا ادب دھم ہے۔ مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ یہ تماشے میں نے بہت دیکھے ہیں کہ وقت کی ایک ہی موج عقائد کو خس و خاشاک کی طرح ساحل پر لگا دیتی ہے۔ آج شمس الرحمٰن فاروقی 'شب خون' کے صفحات میں زمین کی اس کروٹ کو جذب کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو جوہری دھماکے سے انور سجاد میں پیدا ہوئی ہے۔ انور سجاد کا ڈھول پیٹنے میں فاروقی بھی آگے آگے تھے۔ ان کی دلچسپی موضوع میں نہیں فارم میں ہے لیکن فکشن کے فارم کا ان کے پاس کوئی شعور نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک بھی ناول یا افسانہ نگار پر وہ کوئی معنی خیز تنقید نہیں لکھ سکے۔ انہیں اس وقت علامتی افسانوں کے گن گانے تھے سو گائے، یہ دیکھے بغیر کہ اس مکھڑے پر یہ سہرا سجتا ہے یا نہیں۔ انور سجاد اپنے کہے سے مکر گئے ہیں اور فاروقی کہہ مکرنیوں کے اتنے ہی دلدادہ ہیں جتنے کہ تجنیس لفظی اور معنی کے۔ انور سجاد کہہ رہے ہیں کہ ان کا مضمون طنزیہ تھا اور فاروقی صاحب سوفٹ کی غلط مثال دے کر ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اگر ان کے مضمون کے طنز کو ہم بھانپ نہیں سکے ہیں تو یہ ہماری کوتاہ فہمی اور انور سجاد کا المیہ ہے۔ یہ تو چہ دلاور یست وزدی کہ بکف چراغ دارد والا معاملہ ہے۔ ایسے کرتب سیاست میں چل سکتے ہیں ادب میں نہیں کیونکہ ادب میں کوئی نہ کوئی انتظار حسین بہروپ کا پردہ چاک کر دیتا ہے۔ انتظار حسین کے یہ جملے ملاحظہ فرمایئے:

> ''اس عزیز نے طنز اتنا گہرا دابا ہے کہ اب کوئی حافظ محمود شیرازی ایسا جید محقق ہی اسے کھود کر برآمد کرے تو کرے۔ پھر اسے لیبارٹری میں جا کر تجزیہ کرایا جائے کہ یہ واقعہ طنز ہے اور اگر ہے تو کتنا۔ خیر اب جب کہ انور سجاد نے خود ہی اس راز سے پردہ اٹھادیا ہے کہ یہ سب طنز ہے تو اب مجھے یہ پریشانی لاحق ہے کہ اس نے محمدی ریاست کا جو تصور پیش کیا ہے اور محمدیت میں جو اپنے ایمان کا اعلان کیا ہے اسے اب کس طریقہ

سے سمجھا جائے۔''

ادب جب ادیب نہیں رہتا تو اپنے صحافتی بیانات سے اپنا وجود ثابت کرتا ہے۔ چند فراموش شدہ افسانے لکھ کر جب آپ ختم ہو گئے تو آپ کا کوئی بھی بیان یا انٹرویو ہو، اس میں دلچسپی محض صحافتی ہے اور اسے اس مسرت سے دور کا بھی واسطہ نہیں جو ایک خوبصورت ناول یا کہانی بخشتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ ایسے مباحث سوائے ذہنی تردد کے کچھ پیدا نہیں کرتے۔ انور سجاد کا ذہنی سفر ایک کٹھ ملائیت سے دوسری کٹھ ملائیت کی طرف ہے۔ ہاتھ میں عقیدے کا لوٹا لے کر تیرتھ یاتراؤں پر نکلنے والے اور نظریات کی لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والوں کی ہمارے یہاں کوئی کمی نہیں رہی۔ یہ سب ان لوگوں کے گورکھ دھندے ہیں جن کے پاس ادب میں پیش کرنے کے لیے کوئی عمل نہیں ہوتا۔

تخلیق ادب کوئی میکانکی کام نہیں ہے۔ یہاں ہر لحظہ نیا طور نیا ذوق تجلی والا معاملہ ہے۔ آپ موضوع پر زور دیں یا ہیئت پر، تجربات کے نئے جزیروں کی طرف آپ کی کشتی تخیل کا بادبان کھولے روانہ نہیں ہوتی تو تجسس، انکشاف، سیاحت اور دریافت کی ولولہ خیزی کی بجائے مٹی ڈھونے کا میکانکی کام کرتی ہے اور ایک ہی نوع کے افسانوں کے ڈھیر لگاتی ہے۔ آج کا اردو افسانہ اور ناول اسی میکانکی کھٹا کھٹ میں پھس گیا ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ ویسا ہی ہوگا جیسے کہ سماجی اور سیاسی حالات ہوں گے۔ یہاں بجائے اس کے کہ فنکار حالات سے آنکھیں چار کرتا، ان کی ترجمانی کرتا اور پھر ان سے بلند ہو کر زندگی کے دوسرے مظاہر کی طرف نظر کرتا، وہ حالات کا اس قدر مغلوب ہو گیا کہ تخلیق فن کے بنیادی انسانی سرچشموں سے دور ہو گیا۔ وہ اس نظر کو کھو بیٹھا جو زندگی کو اپنی کلیت میں دیکھتی ہے، پوری زندگی اور پورے انسان کا مطالعہ کرتی ہے، انسانی رشتہ کے المیہ اور طربیہ سبھی روپ اس کے سامنے ہوتے ہیں اور انسان کی نفسیاتی اور باطنی زندگی کی ایک پوری کائنات اسے دعوت نظر دیتی ہے۔ قصور وار حالات نہیں بلکہ خود افسانہ نگار ہے کہ وہ کسری آدمی ہے جس کا تخیل پاپیادہ، مشاہدات سطحی دلچسپیاں محدود، فن ناقص اور حس ظرافت کالعدم ہے۔ میں اس حس مزاح کی بات کر رہا ہوں جو انسانی تماشہ کو خندہ جبینی اور دردمندی کے ساتھ دیکھنے کے آداب سکھاتی ہے، جس کے بغیر فنکار میں زندگی کے اچھے اور برے ہر تجربہ کو قبول کرنے کی وہ اہلیت پیدا نہیں ہوتی جو اسے ایک اخلاق پسند آدمی سے مختلف بناتی ہے۔ اخلاقی آدمی تو ہر آدمی میں ہوتا ہے لیکن فنکار تخلیق فن کے وقت اخلاقیات کو معلق رکھتا ہے، اور اس مقصد کے لیے اسے اپنی اخلاقی شخصیت سے گریز کرنا پڑتا ہے، جس کا فکشن میں طریقۂ کار ڈرامائی تکنیک ہے جو غیر شخصی آرٹ کا نہایت ہی کارگر حربہ ہے۔ حقیقت پسند روایت کو کھو کر ہم نے تخلیق فن کے ان تمام امکانات کو ختم کر دیا۔

اور حالات بھی ذمہ دار ہیں۔ جس ملک میں ناخواندگی کی شرح ساٹھ فیصد ہو، چالیس فیصدی آبادی

غریبی کی ریکھا کے نیچے جیتی ہو، توہمات، ضعیف الاعتقادی، مذہبی خبط اور ہجوم کی نفسیات کا غلبہ ہو، قدیم وجدید، رجعت وترقی، عقلیت اور عقیدت، مشرق ومغرب کا ٹکراؤ ہو، تشدد، بھرشٹا چار اور تہذیبی اور سیاسی انتشار ہو، سماجی استحکام، سیاسی آدرش اور اخلاقی نصب العین عنقا ہوں، وہاں آدمی شخصیت کی سالمیت کھودیتا ہے۔ ریزہ ریزہ جیتا ہے اور اپنا کوئی قرینۂ حیات اور نظام جذبات مرتب نہیں کر پاتا۔ نہ پرانی دنیا مرتی ہے نہ نئی دنیا جنم لیتی ہے۔ قید وبند میں زندگی رندھتی ہے تو آزادی میں قدم زمین سے اکھڑ جاتے ہیں۔ یہ صورت حال فکشن کے لیے سازگار نہیں جو کردار کے لیے شخصیت کا ارتباط اور اقدار کے لیے ہم آہنگ اور مستحکم سوشیل اسٹرکچر کا متقاضی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم پچھلے چالیس سال میں چالیس تو کیا چار ناول اور چار افسانہ نگار بھی ایسے پیدا نہیں کر پائے جو ہماری فکشن کی پیاس کو بجھا سکیں۔ العطش العطش کے عالم میں فن کا گدلا پانی بھی سکون بخشتا ہے، لیکن جب آنکھیں کھلتی ہیں تو گدلا پانی گدلا ہی نظر آتا ہے۔

مغرب میں آج کل ہزاروں ایسے ناول لکھے جارہے ہیں جو گڈ رائٹنگ کے نمونہ ہیں۔ اعلیٰ تعلیم عام ہونے کے بعد سلیس، رواں اور دلآویز نثر سبھی لکھ لیتے ہیں۔ کلی شی موضوعات مثلاً فرد کی تنہائی، ذات کی شناخت، اجنبیت، آزاد جنسی تعلقات ہر کسی کے بس میں نہیں۔ مابعد جدیدیت میں مرکز اپنے مرکز پر قائم نہیں تو اچھی لکھی ہوئی سوانح عمری، خودنوشت، سفرنامہ، یادیں، جرنلزم، کسی کنبہ یا قبیلہ کی سماجیاتی تحقیق، کسی تاریخ شہر کے فن تعمیر کا بیان، سب کچھ ناول کی شق میں شمار ہوسکتا ہے۔ ایسی چیزوں کو آپ ناولیاتی سوانح، ناولیاتی سفرنامہ یا ناولیاتی جرنلزم کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ ناول نہیں ہے۔ چنانچہ میلان کنڈیرا کا کہنا ہے کہ ہر آرٹ فارم کی طرح ناول کی اپنی ایک تاریخ ہے جو عظیم فن پاروں کے ذریعہ تشکیل پاتی ہے، اور ہر اچھے ناول کو اس تاریخ کے اندر ہی جنم لینا پڑتا ہے کیونکہ اس تاریخ ہی میں ہم جان سکتے ہیں کہ کون سی چیز نئی ہے، کون سی ایجاد اور اجتہاد ہے، کون سی محض تکرار یا نقل ہے۔ مختصر یہ کہ تاریخ ہی میں کوئی تخلیق بطور ایک جمالیاتی اور فنکارانہ قدر کے جیتی ہے۔ ایک ایسی قدر جس کی ہم شناخت اور پرکھ کرسکیں اور جس پر کوئی حکم لگا سکیں۔ کسی بھی فنی تخلیق کے لیے اس سے زیادہ بدنصیبی کی کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنی صنف کی تاریخ کے باہر رہ جائے کیونکہ اس کا انجام تاریخ کے باہر پھیلی ہوئی اس انار کی گمشدگی ہے جہاں جمالیاتی اقدار کا کوئی تعین نہیں ہو پاتا۔

امریکی پبلشنگ انڈسٹری کا آج کل یہ عالم ہے کہ وہ سال بہ سال پانچ ہزار ناول شائع کرتی ہے جس میں سے بقول سلمان رشدی پانچ بھی فکر انگیز مطالعہ کے معیار پر پوری نہیں اترتیں، لیکن سب بک جاتی ہیں اور ان کے پڑھنے والے بھی نکل آتے ہیں جو پوسٹ ماڈرن اور صارفی معاشرے کی پیداوار ہیں اور تکثیریت اور لامرکزیت کے زمانہ میں پاپ سنگیت اور ٹی وی سیریلوں کی طرح ناولوں کو بھوگنے اور فراموش کرنے کے عادی

ہو چکے ہیں۔ایسی ناولیں تاریخ کے باہر اناری کے آسمان پر جلتے بجھتے ستاروں کی طرح گردش کرتی رہتی ہیں۔ ان پر کسی پائیدار اور معنی خیز نقد وفکر کے نظام کی تعمیر ممکن نہیں۔آج کا معاشرہ اس معاشرے سے بہت مختلف ہے جس کے لیے ناول ایک فلسفیانہ ذہنی سرگرمی تھی۔آزادی کے بعد اردو ناول کے جائزوں میں آپ کو کم از کم سو ناولوں کے نام مل جائیں گے اور چونکہ جائزہ نویس نقاد نہیں ہوتے لہٰذا ہر ناول کی تعریف نیلام کرنے والے کی طرح کرتے نظر آئیں گے۔ان میں پانچ چھے ایسے ناول بھی نکل آئیں گے جن کی مدح میں ہمارے مستند نقاد بھی رطب اللسان ہوں گے۔ان جائزوں اور تبصروں کے باوجود ان ناولوں نے اپنے قاری پیدا نہیں کیے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارا معاشرہ ناول پڑھنے والوں کا معاشرہ نہیں رہا۔ناول کو ہم پانی کی طرح نہیں پیتے، پیپسی کولا کی طرح پیتے ہیں جو کارخانوں میں تیار ہوتا ہے۔اشتہاروں کے زور پر بکتا ہے اور وہ تسکین نہیں دیتا جو انسان کی فطرت میں پڑی ہوئی کہانی اور کتھا کی ازلی پیاس کو پانی کے ذریعہ بجھانے سے حاصل ہوتی ہے۔

میں ناول پڑھنے والا آدمی ہوں اور اسی لیے بہت معمولی آدمی ہوں۔ یہ تو اتفاق سے قلم چل گیا ورنہ پوری عمر ناول پڑھنے میں گزر جاتی اور جب جنازہ اٹھتا تو لوگ یہی سمجھتے کہ ایک اور نامراد دنیا سے گیا، اور کوئی جان بھی نہ پاتا کہ ناول کے سبب کیسی سرسبز و شاداب، پر بہار و پر مسرت زندگی خاکسار نے گزاری۔جدید افسانہ کے خلاف میرا ردعمل نظریاتی یا ادبی نہیں تھا۔ نہ ہی یہ مذاق سلیم کا معاملہ تھا۔یہ ردعمل تو حیاتیاتی تھا، ناول کا ہونا یا نہ ہونا تو میرے لیے زندگی اور موت کا سوال تھا۔

اگر ہرے بھرے درخت کٹ جاتے ہیں ،وادیاں خشک ہو جاتی ہیں، جھرنوں کا پانی زنگ آلود ہو جاتا ہے، تو اس کی فکر انہیں نہیں ہوتی جو نئی صنعتیں یا صنعت گری کو قائم کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس ماحولیاتی آلودگی سے وہ جانور بہت پریشان ہوتے ہیں جن کی زندگی کی چلچلاتی دوپہریں ناول کی گھنی جھاڑیوں میں گزری ہیں۔ایسے جانور یا تو مر جاتے ہیں یا دوسری زبانوں کے خطوں کی طرف پرواز کر جاتے ہیں جہاں جنگل ابھی سلامت ہیں۔

میرے کچھ خواب نہ سہی، کچھ خوف ضرور ہیں۔ مجھے خوف آتا ہے اس وقت سے جب مجھے ایسی دنیا میں جینا پڑے جہاں پڑھنے کے لیے ناول نہ ہوں۔ مجھے ہول آتا ہے اردو فکشن کے جدید منظر نامہ کو دیکھ کر جس میں نظریات کی پلاسٹک کی تھیلیاں چاروں طرف بکھری پڑی ہیں اور ایک لنڈ منڈ درخت پر افسانہ اپنی بے بال و پری پر نوحہ کناں ہے۔جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نمونوں کے طور پر جن ناولوں کے نام لیے جاتے ہیں وہ تو پیاسے کو پانی پلانا ہے اور ان خاردار بدرنگ جھاڑیوں پر نظر اسی لیے جاتی ہے کہ ان کا ہونا کسی چیز کے نہ ہونے کی دلیل ہے۔

وارث علوی

افسانہ کی تشریح: چند مسائل

شاعری کی مانند افسانہ کے فارم، موضوع اور مواد کے مطالعہ کے بے شمار پہلو ہیں۔ کہانی، پلاٹ، کردار، تمثیل، علامات، اساطیر، تکنیک، تجسیم، امیج، استعارہ، مرقع، تصویر گری، منظر نگاری، مقام، ماحول، فضا، قدرتی اور تہذیبی پس منظر، موزونیت، آہنگ، تضاد، تصادم، معروضیت، ڈرامائیت، لب ولہجہ، اسلوب، بیانیہ، لسانی ساخت نقطۂ نظر، جمالیاتی فاصلہ، طنز، ظرافت Irony، المیہ، طربیہ، نفسیاتی، فلسفیانہ، سماجی، اخلاقی ڈائمنشن اور پھر ان موضوعات کے ان گنت ذیلی مباحث اور نکات، نقاد کو حق ہے کہ وہ افسانہ کے جس پہلو کا اور جس پہلو سے افسانہ کا مطالعہ کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ یہ دعویٰ کہ محض بیانیہ یا زبان یا لسانی ساخت کا مطالعہ ہی افسانہ کے تمام فن اور معنوی اسرار کو منکشف کر سکتا ہے، درست نہیں۔

لیکن کہانی ہو یا پلاٹ، کردار ہو یا ماحول، علامت ہو یا طنز افسانہ میں ان کا اظہار زبان کے ذریعہ ہوتا ہے۔ پورا افسانہ ایک لسانی ساخت ہے۔ اس لیے افسانہ میں زبان اور بیان کی نوعیت کا علم حاصل کیے بغیر افسانہ کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ ثمر آور ثابت نہیں ہوتا۔ جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ تفہیم معنی میں بہت ساری معذوریوں اور غلط فہمیوں کا سبب پلاٹ یا کردار یا افسانہ کے دوسرے وضعی رشتوں کے مطالعہ میں بعض کلیدی لفظوں، علامتوں اور لسانی نشانیوں کی اہمیت سے اغماض برتنے میں رہا ہے۔

متن کی تعبیر کے متعلق کوئی اصول وضوابط طے نہیں۔ تعبیر ذہن کا وجدانی عمل ہے۔ صاحب نظر کے سامنے قرأت کے دوران بصیرت کو کوندا لپکتا ہے، ابہام کے اندھیرے چھٹتے ہیں اور متن کے بطن میں رہے ہوئے معنی منور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے تنقید متن صاحب نظری کی قیمت ہے۔ تنقیدی بصیرت نہ ہو، انکشاف معنی نہ ہو، عقدہ کشائی نہ ہو، پہلو دار پیچیدہ کرداروں کی نفسیاتی اور فلسفیانہ تعبیر نہ ہو۔ انسانی برتاؤ، اعمال اور سلوک کی تفہیم کی غرض سے فطرت اور جبلت کے تاریک پانیوں میں علم وبصیرت کی مشعل کی روشنی نہ ہو تو پھر تنقید اپنی تمام طلاقت بیان کے باوجود ایک عام اور اوسط ذہن کی فہم وفراست کی سطح سے بلند نہیں ہوتی۔

افسانہ اپنے حسن کا راز فوراً اور سب پر ظاہر نہیں کرتا وہ صاحب نظر نقاد کا انتظار کرتا ہے۔ افسانہ کی معنیاتی بصیرت کا راز اس رشتہ میں ہے جو نقاد افسانہ سے قائم کرتا ہے۔ یہ رشتہ محبت، نشاط اور وارفتگی کا ہوتا ہے۔ تنقید اور

تعبیر فن پارے پر سر دوستانہ پوش ہاتھوں کا عمل جراحی نہیں۔اگر افسانہ نقاد کے دل میں نہیں بستا، اگر اس کا ذکر کرتے ہوئے اس کا لہو رقص نہیں کرتا تو وہ افسانہ کی روح تک نہیں پہنچ سکتا۔افسانہ بوالہوسوں کے سامنے نہیں بلکہ حسن شناس نظروں کے سامنے معنی کے بند قبا کھولتا ہے۔

تشریح ایک شرمیلی خاتون کی مانند کم سخن ہوتی ہے۔کبھی کبھی تو کسی علامت، کسی اسطور، کسی تلمیح کی طرف دبے لفظوں سے اشارہ کرکے آنکھیں جھکالیتی ہے۔البتہ مدرس کے نکاح میں آنے کے بعد فیض صحبت سے اس بے زبان نے نہ صرف زبان پیدا کی بلکہ ذہن بھی پیدا کرلیا۔پہلے کم بول کر اس خوف سے ٹھٹھک جاتی تھی کہ کہیں زیادہ تو نہیں بول گئی۔اب اتنا بولتی ہے کہ متن کو بولنے نہیں دیتی۔مدرس کا کام اب اتنا رہ گیا ہے کہ ناخن عقدہ کشا کے لیے عقدے تلاش کرے۔نہیں ملتے تو سیدھے سادے شعروں میں خود ہی لگا دیتا ہے۔وہ اشعار جو منہ میں سو کینڈل پاور کے بلب لے کر آتے ہیں ان پر روشنی ڈالنا مدرس کی پیشہ ورانہ بیماری ہے۔

تشریح کے برعکس تعبیر ایک خودسر، خود پسند مغرور حسینہ ہے۔یعنی تعبیر کو اگر ہم وہ سمجھیں جو سوزاں سونٹاگ نے سمجھایا ہے۔سوزاں سونٹاگ کے بیوٹی پارلر سے جب وہ نکلتی ہے تو اس کی سج دھج دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، بالکل منٹو کے افسانہ ''سرکنڈوں کے پیچھے'' کی ہلاکت کا روپ جو مجسم حسد ہے اور متن کے پہلو میں اپنے سوا کسی اور معنی کا وجود برداشت نہیں کرسکتی وہ بڑی بے دردی سے معانی کا قتل کرتی ہے اور ان کی جگہ اپنے معنی رکھتی ہے۔یہ معنی فارم اور مواد اور افسانہ کے وضعی رشتوں کے جزرس مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ افسانہ کے ایک شخصی تاثر سے پیدا ہوتے ہیں۔افسانہ کو ایسے معنی دینے کا افسوس ناک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ افسانہ نگار کے حقیقی فن پارے کی جگہ نقاد کا بنایا ہوا تلبیسی فن پارہ ہمارے سامنے آتا ہے۔افسانہ از سر نو لکھا نہیں جاتا، اس میں ایک لفظ بدلا نہیں جاتا لیکن اس کی تعبیر اس طرح کی جاتی ہے کہ اصل افسانہ کی جگہ ایک دوسرا افسانہ جنم لیتا ہے۔سوزان سونٹاگ اس قلب ماہیت کی مثال ٹینی سن ولیم کے مشہور ڈرامے A Street car named desire کی اس تعبیر سے دیتی ہے جو ڈرامے کے ڈائریکٹر ایلیا کازان نے اپنی نوٹ میں درج کی، گویا ڈرامے کی ہدایت کاری اس تعبیر کی روشنی میں ہوگی۔اس ڈرامے کے دو کردار ہیں۔سٹینلی کو اس کی جو ایک اکل کھرا، جنس زدہ خوبصورت وحشی نوجوان ہے۔دوسرا اس کی بیوی کی بہن بلانش ہے جو ایک رقاصہ بلکہ طوائف کی زندگی گزارنے کے بعد تھکی ہاری اب ایک شریف عورت کی زندگی گزارنے اپنی بہن کے یہاں آئی ہے۔لیکن اب وہ سٹینلی کی ہوس کا نشانہ ہے۔سٹینلی کو بڑا غصہ ہے اس بات پر کہ جو عورت طوائف رہی ہو وہ اس کی خواہشوں کو رد کیوں کرتی ہے۔دوسری طرف بلانش پاک باز زندگی گزارنا چاہتی ہے پھر یہ اس کی بہن کا گھر ہے۔بالآخر سٹینلی بلانش سے زنا بالجبر کرتا ہے اور بلانش پاگل ہوجاتی ہے۔ایلیا کازان کی فلم میں سٹینلی کا کردار مشہور

ایکٹر مارلو برانڈو نے کیا تھا۔

ایلیا کازان کی تعبیر یہ تھی کہ سٹینلی کو اس کی کارکردار ہوس اور انتقام سے کف در دہن بربریت کی علامت ہے اور بلانش کا کردار مغربی تمدن ہے جو ملائم ملبوسات، مدھم روشنی اور شائستہ جذبات سے عبارت ہے۔ گویا اس ڈرامے میں بربریت کے ہاتھوں تمدن کا ریپ ہے۔ اب یہ ڈراما دو مخالف طاقتور کرداروں کے درمیان نفسیاتی اور جنسی جنگ نہیں رہا جس کا ہر منظر شخصیتوں کے تصادم اور جذبات کی طوفانی موجوں سے کانپتا تھا، بلکہ مغربی تمدن کے زوال کی علامت بن بیٹھا۔

ہمارے یہاں ایسی تعبیر کی مثالیں انتظار حسین کے افسانے 'زناری' اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانے ''کوارنٹن'' کی وہ تعبیریں ہیں جو علی الترتیب گوپی چند نارنگ اور قمر رئیس نے پیش کی ہیں۔ نارنگ نے بتایا ہے کہ ''زناری' بنگلہ دیش بننے کے بعد کٹے پھٹے پاکستان کی طرف وہاں کے لوگوں کے جذباتی رویہ کی تمثیل ہے اور قمر رئیس کا کہنا ہے کہ ''کوارنٹن'' میں پلیگ علامت ہے ہندوستان کی غلامی کی۔

میری نظر میں دونوں تعبیرات شوق تعبیر کی بے راہ روی اور انکل خیال آرائی کا ثبوت ہیں۔ انتظار حسین کا اسطور سیاست کے چوکھٹے میں نہیں سماتا اور بیدی کی حقیقت نگاری علامت بننے سے انکار کرتی ہے۔ قمر رئیس کی تعبیر کے بعد ''کوارنٹن'' میں بھارگو کے کردار کی کوئی اہمیت نہیں رہتی جو بے لوث خدمت کا بے مثال نمونہ ہے۔ ڈاکٹر کی فرض شناسی اور بھارگو کی خدمت گزاری میں جو ایک نازک فرق ہے اور جو افسانہ کی مشینری کے بغیر نمایاں نہیں کیا جاسکتا، اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔

افسانہ پھر سے لکھا نہیں گیا۔ ایک لفظ بھی بدلا نہیں گیا لیکن تعبیر نے انتظار حسین اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کی بجائے ایک نیا افسانہ پیش کردیا جس کے مصنف نارنگ اور قمر رئیس ہیں۔ تعبیر میں خواب گم ہوتے ہیں، تو افسانے کیوں نہ گم ہوں۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مختلف تعبیرات میں کون سی تعبیر کو صحیح یا مناسب خیال کیا جائے۔ علم تعبیر کے ماہرین کے پاس اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ہے۔ الٹے وہ تو دلائل سے ثابت کریں گے اور کرتے ہیں کہ ہر تعبیر پھر وہ چاہے اتنی دور از کار ہو، اہم ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ معنی شعر یا افسانہ میں ہیں ہی نہیں (کیونکہ متن عبارت ہے لسانی نشانیوں سے، جن کی تعبیر کرنے میں قاری آزاد ہے، متن کا پابند نہیں، یا دوسرے الفاظ میں دال کی تعبیر مدلول کے حوالے کے بغیر ہو سکتی ہے) تو پھر شعر یا افسانہ کی تعبیر میں قاری یعنی نقاد کا ذہن آزاد ہے۔ تعبیر پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ گویا کسی تعبیر کو دور از کار، انکل، ترنگی، لامرکز، گمراہ کن اور مضحکہ خیز کہنے کا قاری کے پاس کوئی عقلی جواز نہیں رہتا۔

جب صورت حال یہ ہوتو قاری تعبیراتی تنقیدوں کے بھنور میں چکراتا رہتا ہے اور اسے باہر نکل کر پھر سے شعر وافسانہ سے رابطہ قائم کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس کے پاس کسی تعبیر کو رد کرنے یا کسی کو قبول کرنے کا کوئی عقلی جواز نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعبیراتی تنقید پر کسی بھی زاویہ سے جرح ونقد ممکن نہیں رہتی۔ ہر اعتراض کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ یہ میری تعبیر ہے چاہے آپ کو قبول ہو یا نہ ہو۔

ان حالات میں قاری تعبیر اور تنقید کے تمام بکھیڑوں سے دامن چھڑا کر شعر وافسانہ کا دامن پکڑتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بالکل ایک بچہ کی طرح آرٹ کی جادونگری میں گم ہو جائے لیکن گوناگوں وجوہات کی بنا پر آرٹ کا یہ تجربہ اس کا مقدر نہیں۔ ادب خود بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ اسے جگہ جگہ تعبیر وتشریح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جادونگری میں بھی قاری کے ذہن میں سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے، کیسے ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے، تعبیراتی نقادوں کی یہ بات بالکل درست ہے کہ معصوم قاری کا وجود محض فرضی ہے کوئی قاری معصوم نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر قاری کی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ اس کے جذباتی میلانات اور تہذیبی وابستگیاں ہوتی ہیں۔ اس کی پسند ناپسند، اس کے اپنے خیالات، تعصبات، عقائد اور ذہنی رویے ہوتے ہیں۔ چونکہ قاری خود ہی معتبر ہوتا ہے تو اگر کوئی قاری معصوم نہیں تو کوئی تعبیر بھی معصوم نہیں ہو سکتی۔ ہر معبّر کے ذہنی اور تہذیبی میلانات کا اس پر عکس ہوگا۔ ہم جو بھی تعبیر پڑھیں گے شعر وافسانہ کی اتنی نہیں ہوگی جتنی کہ معبّر کے مذاق شعر کی آئینہ دار ہوگی۔ یہ ممکن ہے کہ معبّر کی شخصیت فقیہانہ ہو، اسے بال کی کھال نکالنے کی عادت ہو، معنی آفرینی کا چسکہ ہو، مضامین کے طوطا مینا اڑانے میں لطف آتا ہو، تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ شعر کی تعبیر معنی واضح کرنے کی بجائے انہیں اور الجھا دے۔ ہم پھر شعر سے دور ہو گئے اور تعبیر کے چکراوے میں پڑ گئے۔

تو ہمارے پاس کوئی نہ کوئی معیار اور پیمانہ ایسا ہونا چاہیے جو تعبیر کے اچھے یا برے ہونے کی نشاندہی کرے۔ اس خیال کو غلط ثابت کرے کہ ہر امکانی تعبیر صحیح تعبیر ہوتی ہے۔

میری نظر میں تعبیر وہی اچھی ہے جو شعر کی مشکلات دور کرے، ابہام کے پردے اٹھائے، معنیاتی گتھیوں کو سلجھائے اور یہ کام کرنے کے بعد قاری اور شعر کے بیچ سے ہٹ جائے تاکہ قاری شعر کو پڑھے تو اسی معنی سے لطف اندوز ہو جو شعر میں ہیں۔ یہ معنی شعر میں پہلے بھی تھے لیکن واضح نہیں تھے، شرح کے بعد اب زیادہ واضح ہو گئے۔

بہت سے نقادوں کو شعر کے تمام معنی نچوڑنے کا شوق فضول ہے جو تفہیم شعر کے عمل کو الجھا دیتا ہے۔ آپ نے شعر کے ایک درجن معنی بتا دیے! کیا فائدہ جب کہ شعر کو ہم آپ کے شرح معنی کے بعد بھی پڑھیں تو وہی معنی دینے لگے جو پہلے دیتا تھا۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ کے بنائے ہوئے درجن معنی میں سے نصف درجن قاری

کے ذہن میں چپک جائیں اور جب بھی وہ شعر پڑھے تو شعر یہ نصف درجن بھر معنی دینے لگے۔ انسانی ذہن اور یادداشت کی اپنی کچھ حدود ہوتی ہیں اور شعر و افسانہ کی قرأت کے اپنے بھی کچھ نفسیاتی عوامل ہوتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ شعر کی اپنی ایک روشنی ہوتی ہے جو شعر کے تہہ در تہہ معنیاتی نظام کو کہیں کم کہیں زیادہ روشن کرتی ہے۔ ہر ڈرامائی منظر کے ساتھ سٹیج کی روشنی کا نظام بھی بدلتا ہے جسے Light Effect کہتے ہیں وہ Full Effect سے یا سٹیج کو بقعۂ نور بنانا ایک الگ قسم کی چیز ہے اور فنکارانہ ہے۔ یہ روشنی کہیں تیز ہے کہیں مدھم، تو کہیں فرنیچر اور اشیا پر خاص زاویوں سے ڈالی جاتی ہے۔ شعر کے معنیاتی نظام میں اندھیرے اور روشنی کا یہی کھیل ہوتا ہے۔ کچھ معنی سطح شعر پر ہوتے ہیں، کچھ بین السطور، کچھ مجسم ہوتے ہیں، کچھ مراد لیے جاتے ہیں، کچھ غائب ہوتے ہیں جن کے غیاب کا احساس حاضر معنی دلاتے ہیں۔ شعر کی تعبیر اور تشریح روشنی اور اندھیرے کے اسی کھیل کا بیان ہوتی ہے۔

دیوان حافظ کی صوفیانہ شرحوں کے دفاتر پڑھنے کے بعد کیا ہم حافظ کے شعروں کو ان کے صوفیانہ معنوں میں ہی پڑھتے ہیں؟ جی نہیں! حافظ کی قرأت کا عام میلان مجاز کی طرف ہی رہا ہے۔ ممکن ہے اہل اللہ ان شعروں کے حقیقی معنی صوفیانہ معنی ہی مراد لیتے ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شعر کے قاری دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک مجازی معنی مراد لیتے ہیں اور دوسرے حقیقی۔ فیض کی غزلوں کے متعلق بھی یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی لوگوں کے لیے ان میں سیاسی معنی ہیں اور عام لوگوں کے لیے غزلیہ۔ میرا خیال ہے کہ اس میں کسی بھی ایک رویہ کی مکمل تردید مستحسن نہیں۔ شعر دونوں طرح کے معنی دیتا ہے۔ حقیقی بھی اور مجازی بھی، سیاسی بھی اور عشقیہ بھی۔ عام قاری معنی کو اسی ابہام کی فضا میں دیکھنا پسند کرتا ہے۔ اسے قطعیت پسند نہیں۔ گیت ملن کے ہوں یا برہا کے، ظلمی پیار کے ہوں یا ہرجائی بالما کے، ان کا مرکزی اسطور تو کرشن ہی ہے لیکن اس سے شخصی تجربہ یا انفرادی کسک کی اپیل رد نہیں ہوتی۔

برہن عام عورت بھی رہتی ہے رادھا بھی اور دیوگ میں تڑپتی آتما بھی۔ نظروں کے سامنے تو عورت ہے لیکن رادھا بہت فاصلے پر نہیں گو آتما اندھیروں میں چھپی ہوئی ہے۔ معنی کا چاند جب ابہام کی بدلیوں سے جھانکتا ہے تو شعر چاندنی رات کا پراسرار حسن پیدا کرتا ہے۔ معنی کے قمقموں کی روشنی چاندنی رات کے اسی حسن کو غارت کرتی ہے۔ کون سادہ لوح ہوگا جو قمقموں کی روشنی میں شعر پڑھنا پسند کرے گا جب کہ چاند اور بدلی کی آنکھ مچولی اور روشنی اور تاریکی کا کھیل فی نفسہ اتنا حسین اور حیرت ناک ہے۔

چنانچہ وہ تمام تصورات جو تعبیر و تشریح کو ایک مطلب اور Ultimate چیز سمجھتے ہیں ان پر کچھ حدود عاید کرنی پڑیں گی۔ ہر تنقیدی کاروبار کی طرح تعبیر و تشریح بھی Parasitical ہے یعنی وہ تخلیق پر پلتی اور پروان

چڑھتی ہے۔اس کا یہ دعویٰ کہ وہی سب کچھ ہے۔شاعر اور شاعر کا ارادہ کچھ بھی نہیں،شعر اور شعر کے معنی کچھ بھی نہیں کیونکہ قرأت ہی متن کو معنی دیتی ہے،بغیر معروضات کے قبول نہیں کیا جاسکتا۔

تعبیر وتشریح سے فن پارے کی تفہیم،معنی اور اہمیت کو اجاگر کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔عام طور پر ایک ناول،افسانہ یا نظم کے جامع یا جزرس مطالعۂ متن میں یہ تینوں مقاصد پیش نظر ہوتے ہیں محض تشریح اور محض تعبیر کی بھی اپنی اہمیت ہے اور ضرورت کے تحت ان سے کام لیا جاسکتا ہے لیکن محض تعبیر اور محض تشریح فن پارے کے متعلق قدری فیصلوں سے اجتناب کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کا فنکشن نہیں۔اس سے ایک بڑا گھپلا یہ پیدا ہوتا ہے کہ فنی طور پر کمزور افسانوں اور نظموں کی عالمانہ تعبیر انہیں وہ مقام اور منزلت عطا کرتی ہے جس کے وہ مستحق نہیں ہوتے۔ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ بڑے فن پاروں کی تعبیر اور تحسین میں جن افکار اور تصورات سے کام لیا جاتا ہے ان کا استعمال کمزور فن پاروں کی تعبیر کے وقت بھی ہوسکتا ہے،مثلاً فرد کی تنہائی کا مسئلہ بڑا ادب بھی تخلیق کرتا ہے اور معمولی ادب بھی۔معمولی ادب کی تعبیر کے وقت تنہائی سے متعلق بڑے ادب کے تصورات کا استعمال ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے۔چنانچہ ایسی تعبیر کمزور افسانوں کو بھی اہم بنا کر پیش کرتی ہے۔لنڈا ویٹنگ اور مہدی جعفر کی تنقیدیں اسی نوع کی ہیں۔ان میں گھوڑوں اور گدھوں کو ایک ساتھ ہانکا گیا ہے۔

چنانچہ تعبیر اور تشریح کو بھی ہیئتی تنقید کی مانند کامیاب اور بڑی تخلیقات سے سروکار رکھنا چاہیے۔نقاد مسیحا نہیں ہوتا کہ مردہ شعر اور افسانوں میں جان ڈال دے۔وہ صرف کامیاب تخلیقات کی فنی اور معنوی خوبیوں کا انکشاف کرسکتا ہے۔

کون سی تخلیقات کی تعبیر وتشریح کی جائے اس میں کوئی پابندی نہیں،نقاد انتخاب میں آزاد ہے،لیکن اتنی احتیاط ضروری ہے کہ تعبیر وتشریح تنقید کا وہ شعبہ نہ بن جائے جس کے ذریعہ کمزور تخلیقات کو وہ وزن حاصل ہوجائے جس کی وہ مستحق نہیں ہوتیں۔تنقید موافقانہ ہو کہ مخالفانہ،اگر وہ معمولی تصنیف پر ہے تو تصنیف میں تو کوئی ایسی چیز نہیں جو تنقید کو وزن عطا کرے،لہٰذا تنقید میں جو بھی خوبی پیدا ہوگی وہ نقاد کی طرف سے ہی آئے گی۔اس کی تعبیر اس کی جودت طبع کی یا اس کی تشریح اس کے علم وفضل کی آئینہ دار ہوگی۔نتیجہ یہ ہوگا کہ معمولی چیز غیر معمولی بن جائے گی اور بے جان شعر جان دار نظر آئے گا۔اس طرح تنقید،اس کا جو فنکشن ہے کہ موتیوں کو خزف ریزوں سے الگ کرے،اس کے علی الرغم اپنی تعبیر کے زور پر خاشاک کے تودے کو دماوند ثابت کرنے کا معکوس کام کرے گی۔جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہیئتی تنقید کو (جس کا ایک جز تعبیر وتشریح ہے) اعلیٰ فن پاروں سے سروکار رکھنا چاہیے تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ صرف اعلیٰ فن پاروں میں ہیئت ومعنی کا حسن ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ کہ قارئین کا حلقہ ان فن پاروں سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے اس لیے تنقید بڑے تعبیراتی اجتہادات سے

کام لے سکتی ہے کیوں کہ آدمی اگر راستہ سے واقف ہے تو گمراہ ہونے کا خوف نہیں رہتا۔اسی لیے وہ ہر انکل تعبیر کو ہنس کر نظر انداز کرسکتا ہے اور اچھی تعبیر وتشریح سے اسے مسرت ہوگی کہ فن پارے کے نئے معنوی ابعاد اس کے سامنے آئے۔ شیکسپیئر کی مثال ہمارے سامنے ہے۔اس کے ڈراموں کی تعبیر وتشریح کا سلسلہ آج تک ختم ہونے نہیں پاتا۔ یہاں پر ڈراما خود تعبیر کی کسوٹی بنتا ہے کیونکہ ڈراما دائمی فیکٹر ہے،تعبیریں تو آتی جاتی رہتی ہیں صرف وہی تعبیریں تھوڑی بہت زندہ رہتی ہیں جو ڈرامے کی ہر قرأت میں معنی کا ساتھ دیتی ہیں۔اڈیپس کامپلکس کی اساس پر ارنسٹ جانس کی ہملٹ کی تعبیر کتنی ذہین اور فطین ہے لیکن تعبیر ارنسٹ جانس کی کتاب سے نکل کر ڈرامے کے معنی کا جز و نہیں بنتی۔یعنی قاری جب ڈراما پڑھتا ہے تو واقعات اسے اس طرح متاثر نہیں کرتے جس طرح وہ ارنسٹ جانس کی کتاب میں بیان ہوئے ہیں۔قاری کے ذہن سے سٹیج پر نہیں لیکن تھیٹر کے سٹیج پر واقعات کو وہ رنگ دیا جاسکتا ہے جو ارنسٹ جانس کی تعبیر میں جھلکتا ہے۔مثلاً لارنس آلیور کی ہملٹ کی فلم میں خواب گاہ میں ہملٹ اور اس کی ماں کی ملاقات کا منظر ارنسٹ جانس کی تعبیر کا رنگ لیے ہوئے۔شکسپیئر کے ڈرامے میں تو ہملٹ ملکہ گرٹریوڈ کو دوسری شادی کرنے کے عجلت بھرے قدم اٹھانے پر سخت ملامت کر کے چلا جاتا ہے لیکن فلم میں وہ ماں کی آغوش میں گر پڑتا ہے اور جس گرم جوشی سے وہ ماں کو پیار کرتا ہے وہ ارنسٹ جانس کی تعبیر کردہ تعلق حرمین کی تعبیر کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

لیکن ارنسٹ جانس کی کتاب اور لارنس آلیور کی فلم دیکھنے کے بعد قاری جب پھر ڈراما پڑھتا ہے تو خواب گاہ کا منظر اس رنگ میں رنگا ہوا اس کے سامنے نہیں آتا۔یہ منظر ماں بیٹے کی اسی اثر انگیز ڈرامائی ملاقات کو پیش کرتا ہے جو باپ کے قتل اور ماں کی دوسری شادی پر ہملٹ کے فطری غم وغصہ کا اظہار ہے۔یہیں پر ارنسٹ جانس کی تعبیر ناکام ہوجاتی ہے۔ڈرامے سے غیر متعلق بن جاتی ہے۔ڈراما قاری کو اپنے بہاؤ میں لیتا ہے اور ارنسٹ جانس کی تعبیر اس بہاؤ کا رخ موڑنے میں ناکام رہتی ہے۔شیکسپیئر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ڈرامائی تکنیک کو اپنا کام کرنے دیتا ہے۔

جو کام تکنیک سے لینا چاہیے وہی کام جب خود مصنف سرانجام دینے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا نتیجہ کیسا غیر اطمینان بخش ہوتا ہے اس کی مثال مارک شور نے اپنے شہرۂ آفاق مضمون 'تکنیک بطور انکشاف' میں دی ہے۔ڈی ایچ لارنس کی ناول Sons and Lovers میں ماں اور بیٹے میں گہرا لگاؤ ہے۔وجہ یہ ہے کہ ماں مڈل کلاس سے آئی ہے اور شوہر کان میں کام کرنے والا مزدور ہے۔شوہر میں نشاط جوئی کا اور بیوی میں متوسط طبقہ کے رکھ رکھاؤ اور تہذیب وتادیب کے عناصر ہیں۔شوہر اس رکھ رکھاؤ سے بیزار ہوکر شراب نوشی کی طرف مائل ہوجاتا ہے اور بیوی شوہر سے بے نیاز ہوکر بیٹے کو اپنی محبت والتفات کا مرکز بنالیتی ہے۔یہاں ماں اور بیٹے کی

رفاقت بالکل انسانی سطح پر ہے۔ یعنی دونوں میں گاڑھی چھنتی ہے۔ خریداری کو ساتھ نکلتے ہیں، کام کاج میں ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ ناول لکھنے کے دوران لارنس کی نظر سے فرائڈ کا اڈیپس کامپلکس کا مقالہ گزرتا ہے۔ پھر کیا تھا ماں اور بیٹے کا ناول میں جو فطری رشتہ تھا اس میں لارنس نہایت شعوری کاوش اور مصنوعی ڈھنگ سے تعلق حریمن کی گرہ لگادیتا ہے۔ جو کام تکنک کو کرنا چاہیے وہ کام ناول نگار کر رہا ہے۔ اگر تکنک اپنا کام کرتی تو شاید ماں بیٹے کا تعلق فطری سطح پر رہتا جیسا کہ ہملٹ میں ہے اور خواہ مخواہ تھیم میں تعلق حریمن کا ناگوار عنصر پیدا نہ ہوتا۔

آپ دیکھیں گے کہ یہاں تنقید متن کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ لارنس کی شخصیت، اس کے مطالعہ اور اس کے ارادے کو بھی حساب میں رکھتی ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتی ہے کہ اس کا اچھا یا برا اثر ناول پر کیا پڑا، یہ تو سامنے کی بات ہے کہ تنقید و تعبیر تشریح سے بڑی ہے اور اگر تعبیر کی بھی کوئی کسوٹی ہے تو وہ تنقیدی ہے۔ تعبیر کا تعلق عقل وذہانت سے ہے جب کہ تنقید کا تعلق دانش مندی سے ہے۔ ذہانت استدلالی فکر اور عقلی دلائل سے کام لیتی ہے جبکہ دانش مندی زندگی اور ادب دونوں میں تجربات سے قوت حاصل کرتی ہے۔ دلیل کے زور پر ہملٹ کو مردانہ لباس میں ایسی عورت بھی ثابت کیا جاسکتا ہے جو ہوریشیو سے عشق لڑاتی ہے، لیکن دانش مندی ہملٹ کے مطالعہ کے وقت ایسی تمام اوٹ پٹانگ تعبیرات کو فاصلہ پر رکھتی ہے اور اپنے ادبی تجربات اور مذاق سلیم کے سبب شیکسپئر کے ڈرامے کو شیکسپئر کے ڈرامے کے طور پر پڑھنے سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کے آداب سے واقف ہوتی ہے۔ دانش مندی تفہیم معنی کا کام عقل کی چلچلاتی دھوپ میں نہیں بلکہ ابہام کے دھندلکوں میں کرتی ہے۔ تعبیر چرب زبان وکیل کی مانند شعر وافسانہ سے ایسے ایسے سوالات کرتی ہے جو عموماً سرزمین ادب پر تنقید نہیں پوچھتی۔ ناقدانہ ذہن (قاری کا تربیت یافتہ ذہن) ادبی تجزیہ کو اسی طرح جذب کرتا ہے جس طرح زمین برسات کے پانی کو قاری کا ذہن جتنا اوبڑ کھابڑ ہوگا اتنی ہی پانی جوہڑ بنے گا جس میں بے جا سوالات اور اعتراضات کے لاروے ادھر ادھر تیرتے پھریں گے۔

ہماری بیشتر افسانوی تنقیدیں افسانوں کے ایسے جائزوں پر مشتمل ہیں جس میں افسانوں کے گہرے اور جامع مطالعہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان مضامین میں افسانوں کے جو معنی بیان کیے جاتے ہیں وہ کہانی یا کردار یا تھیم سے مستعار ہوتے ہیں اور اس مفروضہ پر قائم کہ افسانہ کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ افسانہ کثیر الاسالیب بھی ہوتا ہے اور کثیر المعنی بھی اور افسانہ کا معنیاتی نظام افسانہ کے سارے فارم پر پھیلا ہوتا ہے۔ لہٰذا تفہیم معنی کا عمل پورے فارم کے جزرس مطالعہ سے عبارت ہے۔ یعنی محض کہانی، پلاٹ، کردار یا واقعات ہی کو پیش نظر نہیں رکھنا پڑتا بلکہ افسانہ کی امیجری علامات، استعارے، اساطیر، تشبیہ، مناظر، ثقافتی

اشارے، اسالیب کا آہنگ اور زبان و بیان کے پیرایوں پر بھی نظر مرکوز کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح افسانہ کی تعبیر اور تشریح فطری طور پر ہیئتی تنقید کا روپ اختیار کرتی ہے یا دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو تعبیر اور تشریح اپنی تکمیل کو ہیئتی تنقید میں پہنچتی ہے۔ وہ تنقید جو افسانہ کے مشکل مقامات سے سہل گزرتی ہے اس بات کی چغلی کھاتی ہے کہ تعبیر و تشریح سے اس کی پہلو تہی عجز فہم کا نتیجہ ہے جس کی پردہ پوشی وہ تعمیمات اور لفاظی سے کرتی ہے۔ اچھی تنقید کا تجزیاتی طریقۂ کار مشکلات کا چیلنج قبول کرتا ہے اور تعبیر اور تشریح کو اپنے پہلو میں جگہ دیتا ہے۔ ہمارے اچھے افسانوں کے متعلق ہمارے بڑے ادیبوں کے غلط فیصلوں کی وجہ بھی یہی تھی کہ انہوں نے سمجھا کہ معنی کہانی یا کسی واقعہ ہی میں ہوتے ہیں۔ لسانی نشانیوں اور علامات کو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو محض سڑک یا شہر گھر یا موسم کا بیان ہے حالانکہ معنوی اشارے ان میں بھی پوشیدہ تھے۔

مثلاً منٹو کے افسانہ ''بو'' کے متعلق ترقی پسندوں کا یہ ردعمل کہ یہ ایک بورژوا طبقہ کے ایک فرد کی بے کار، بے مصرف عیاشانہ زندگی کا افسانہ ہے افسانہ کی اہم جزئیات اور بنیادی اشاروں کو نظر انداز کر کے محض کہانی کے خاکے کو سامنے رکھنے کا نتیجہ ہے مثلاً افسانہ میں برسات کا بیان فطرت کی انگڑائی، زمین کی سوندھی خوشبو، برسات کے سبب آسمان اور زمین کا ملن، انسانی حیوانی اور جنسی زندگی میں بو کی اہمیت، جج صاحب کی لڑکی کا مصنوعی پن، ایک طرف دلہن کا سنگھار دوسری طرف گھاٹن کا فطری نکھار، دلہن کے بیان میں بکس کی کیلیں نکال کر گڑیا کو نکالنے کا اشارہ، فطرت اور مصنوعی پن، جبلت اور تمدن کے تصادم کی معنویت یہ اور اس طرح کے کئی رمزو اشارے ہیں جو الگ الگ معنی رکھتے ہیں اور باہم مل کر افسانہ کی مرکزی معنویت کی تشکیل کرتے ہیں۔

چونکہ افسانہ کو کہانی کی طرح پڑھنے کی ہماری عادت ہے ہم مجبور ہیں اس لیے جزئیات اور تفاصیل کی معنوی اہمیت پر ہماری نظر نہیں جاتی۔ ''بو'' میں برسات کو ہم ایک موسم کا بیان سمجھتے ہیں لیکن ''بو'' میں برسات موسم سے کچھ زیادہ ہی معنوی تعلیقات رکھتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی تو افسانہ میں ایک لفظ اتنا سب کچھ کہہ جاتا ہے یعنی ایسا گنج بنتا ہے کہ نقاد اس کی تفسیر میں دفتر سیاہ کرتا چلا جائے۔ تب بھی اس کی معنوی گہرائی اور حسن آفرینی کو نہیں پہنچ سکتا۔ بابو گوپی ناتھ کے متعلق سینڈو کا یہ کہنا ہے کہ ''بڑے خانہ خراب آدمی ہیں'' کی داد صرف اردو والا ہی دے سکتا ہے کہ کسی اور زبان میں اس کا ترجمہ انسلاکات کے اس سلسلہ کو جنبش میں نہیں لا سکتا جو عشق و فسق نے، غزل اور کوٹھے نے اس لفظ کو عطا کیا ہے۔

اسی طرح ممبئی کے فلیٹ میں صوفے پر بیٹھ کر بابو گوپی ناتھ کا حقہ پینا۔ یہ امیج بابو گوپی ناتھ کی شخصیت کے متعلق کیسی ان کہی باتیں کہہ جاتا ہے۔ اس موقعہ پر سگریٹ کا ذکر بھی ہو سکتا تھا لیکن اس سے امیج نہ بنتا۔ وہ بیان واقعہ کرتا، شخصیت کو منور نہ کرتا۔ بھولا کا ماموں راکھی بندھوانے آ رہا ہے۔ بھولا کی ماں بھائی کے لیے دودھ بلو کر

مکھن تیار کر رہی ہے۔ بیدی سوکھڑی، حلوے۔ مٹھائی یا کسی اور پکوان کا ذکر بھی کر سکتے تھے۔ ''گرم کوٹ'' میں تو چولہا پھونکنے اور دھوئیں سے خوبصورت آنکھوں کے لال ہو جانے کا بیان انہوں نے چاؤ سے کیا ہے۔ وہ اس افسانہ میں بھی آگ جلا سکتے تھے، لیکن ایسا کرنا بھولا کی فضا کے منافی ہوتا جو اتنی صاف شفاف اور نرم آہنگ ہے کہ آگ دھواں اور سرخ آنکھیں اور کڑھائی اور تیل اور برتنوں کی آوازیں اس آہنگ کو ضرب پہنچاتیں جس میں سیدھی سادی زندگی کے خاموش سنگیت کی لرزشیں ہیں۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ معنوی تفہیم کے یہ طریقے ہیئتی یا ساختیاتی کا عطیہ ہیں۔ شیکسپئر کی پوری تنقید اسی نوع کی ہے جس میں ایک ایک لفظ کا ایسا عالمانہ اور بصیرت افروز مطالعہ ہے کہ شیکسپیئر کے عاشقوں کے لیے اس کی تنقید کا پڑھنا بھی ایک بڑا ادبی تجربہ ہے۔ یہی حال شیکسپئر کی علامات اور امیجری کا ہے۔ ناولوں کی تنقید بھی تفہیم معنی کے انہی پیرایوں کی طاقت و روایت پیش کرتی ہے۔ میں یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ میری مکارتھی نے مادام بواری پر اپنے مضمون میں بتایا ہے کہ شارل بواری، جسے ہم ایک خشک، غیر دلچسپ، بے ڈھب دیہاتی ڈاکٹر سمجھتے ہیں، وہ ناول کا واحد روحانی کردار ہے۔ جب وہ ایما کے باپ کے علاج کے لیے اس کے گھر آتا ہے تو ایما کے حسن کو دیکھ کر مسحور ہو جاتا ہے۔ حسن کے Mystique کے حضور یہ حیرت زدگی اس کی رومانیت کی دلیل ہے۔ دوسرا واقعہ وہ ہے جب وہ شادی کے بعد ایک دوپہر اپنے گھر آتا ہے تو کمرے میں بڑی آسودگی محسوس کرتا ہے۔ کھڑکیوں کے پردے، صوفے پر وہ کپڑا جس پر ایما کروشیا کا کام کرتے کرتے ادھورا چھوڑ کر اوپر گئی تھی اور اِدھر اُدھر کی بکھری ہوئی چیزیں۔ یہ سب مل کر نسائی لمس کا جو احساس پیدا کرتے تھے اسے شارل اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتا تھا۔

یہ قرأت میری مکارتھی کی ہے۔ فلابیر نے تو کمرے میں صرف چیزوں کا بیان کیا ہے۔ فلابیر ایما کے حسن کا بیان قاری کے لیے نہیں کرتا۔ یہ تو سستی ناولوں کے لکھنے والے ہوتے ہیں جو قاری کو گدگدیاں کرنے کے لیے اپنی چکنی چپڑی عورتوں کا بیان، لچھے دار زبان میں کرتے ہیں فلابیر کے یہاں تو ایما کو ہم شارل کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حسن کا جو اثر شارل پر ہوتا ہے اسے فلابیر ہم تک پہنچانے میں کامیاب ہوا ہے۔

افسانہ کی ہیئت کو نظر انداز کر کے محض افسانہ کے پلاٹ یا کہانی سے معنی اخذ کرنے کے نتائج کیسے غلط نکل سکتے ہیں اس کی عبرت ناک مثال منٹو کے افسانے ''پانچ دن'' پر ممتاز شیریں کا تبصرہ ہے۔ ممتاز شیریں سے صحیح معنی میں ہمارے یہاں فکشن کی تنقید کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ افسانہ کی بڑی زیرک اور درّاک نقاد تھیں۔ منٹو پر ان کے مضامین نے ہماری ذہنی تربیت میں جو رول ادا کیا ہے اس کا قرض چکانے کا شاید یہ طریقہ آپ کو پسند نہ آئے کہ ان کی تعبیرات میں اسقام ڈھونڈے جائیں، لیکن اہم نقادوں کے اسقام کا مطالعہ فی نفسہ ان سے ذہنی

یگانگی کی علامت ہے پھر بڑے فن کاروں کے متعلق بڑے نقادوں کی غلط تعبیرات کو بھی لوگ صحیح رایوں اور صائب فیصلوں کا مقام دیتے ہیں اس لیے ان کی تصحیح ضروری ہے۔ میری کوشش یہ ہے کہ میں دیکھوں کہ کون سے غلط تنقیدی رویے نقاد کو غلط فیصلوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ ''پانچ دن'' کے متعلق ممتاز شیریں لکھتی ہیں:

> ''چنانچہ افسانہ 'پانچ دن'' اس کی ایک مثال ہے کہ کس طرح ہمارے نئے ادیبوں نے پرانی قدروں سے بغاوت کے جوش میں صریحاً غلط اقدار قائم کی ہیں۔ ''پانچ دن'' کا پروفیسر جو ساری عمر عورت اور گناہ سے بچے رہنے کی کوشش کرتا ہے، یہ محسوس کر کے کہ وہ کس قدر ریاکار رہا ہے، مرنے سے پہلے ریاکاری کا نقاب اتار پھینکتا ہے اور آخری پانچ دنوں میں ایک لڑکی کے ساتھ، جسے خود اس نے پناہ دی تھی، گناہ کرتا ہے اور مطمئن مرتا ہے۔ ساتھ ہی وہ اس لڑکی کو اپنی مہلک بیماری دق بھی بخش جاتا ہے۔ تاہم یہ لڑکی خود موت سے ہم کنار ہونے کے باوجود اس پر خوش ہے کہ وہ اس کے آخری دنوں میں کام آئی۔ اس افسانہ کو پڑھنے کے بعد بڑا سخت ردعمل تو یہ ہوتا ہے کہ بہتر ہوتا اگر وہ مرد اپنی ریاکاری کو ساتھ لے کر مرجاتا بہ نسبت اس کے کہ وہ مرنے کے دنوں میں گناہ کی لذّت چکھے اور ایک صحت مند نوجوان لڑکی کو، جسے زندہ رہنے کا پورا حق تھا، ہمیشہ کے لیے ایک مہلک بیماری میں مبتلا کر جائے۔''
>
> (منٹو، نوری نہ ناری صفحہ ۱۲۹)

اگر ممتاز شیریں نے صرف کہانی کے تاثر کی بجائے افسانہ کے پورے فارم اور اس کی تکنیک کو نظر میں رکھا ہوتا تو انہیں پتہ چلتا کہ بارہ صفحہ کے اس افسانہ کا نصف سے زائد حصہ تو اس سینی ٹوریم کی نذر ہو گیا جہاں سکینہ پروفیسر کا بخشا ہوا دق لے کر آتی ہے اور مرجاتی ہے۔ مرنے سے قبل وہ افسانہ نگار کے سامنے پروفیسر کی کہانی بیان کرتی ہے۔ پروفیسر نے اپنے دل کی بات سکینہ کو بتائی اور وہ بات یہ تھی کہ اس کی زندگی سراسر جھوٹ تھی۔ وہ نیک اور شریف ہونے کا دکھاوا کرتا تھا لیکن اندر سے عورت کے لیے ترستا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی طالبات کہیں گی کہ پروفیسر کتنا اچھا آدمی تھا۔ ان کی مدد کرتا تھا لیکن وہ یہ بات کبھی نہیں جانیں گی کہ وہ ان کے جوان جسموں کی طرف کیسی کشش محسوس کرتا تھا۔ سکینہ کو اس نے پناہ دی ہے اور سکینہ سمجھتی ہے کہ پروفیسر کیسا فرشتہ سیرت آدمی ہے لیکن سکینہ کو خبر نہیں کہ وہ اسے چھپ چھپ کر کیسی خواہشمند نظروں سے دیکھا کرتا ہے۔ پروفیسر کی یہ باتیں سن کر سکینہ خود کو پروفیسر کے سپرد کر دیتی ہے۔ پروفیسر زندگی میں پہلی بار عورت کے جسم سے ہمکنار ہوتا ہے۔ وہ سکینہ سے کہتا ہے ''سکینہ میں لالچی نہیں'' زندگی کے یہ آخری پانچ دن میرے لیے بہت

ہیں۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔'' اور چند ہی دنوں بعد مر جاتا ہے۔

یہ اعتراف پروفیسر کسی کے سامنے نہیں کر سکتا سوائے سکینہ کے، اور سکینہ یہ بات کسی کو نہ بتاتی اگر وہ قریب المرگ نہ ہوتی۔ مرتے وقت آدمی اپنے دل کے سب راز بتا دیتا ہے اگر موقعہ ملے، اور سکینہ کو سینی ٹوریم میں افسانہ نگار سے گفتگو کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ افسانہ نگار سینی ٹوریم میں اپنے ایک دوست کی خاطر آیا ہے جس کی بیوی تپ دق کی آخری منزل میں ہے۔ سینی ٹوریم میں موت کی حکمرانی ہے۔ لوگ ٹپاٹپ مرتے ہیں۔ لاشیں جلائی جاتی ہیں اور افسانہ نگار نہایت پژمردہ ہے۔ اس وقت سکینہ پروفیسر کی کہانی سناتی ہے۔ گویا موت کچھ بھی نہیں لوگ مرتے ہی رہتے ہیں۔ اصل چیز تو زندگی ہے اور زندگی کی قدر اس بات میں نہیں کہ آدمی کتنا جیا بلکہ اس بات میں ہے کہ وہ کیسا جیا۔ آدمی کا مارنا کچھ نہیں لیکن ایک جائز فطری خواہش کا مارنا بڑا قتل ہے۔ اس کی سزا خود آدمی کو اپنی زندگی میں مل جاتی ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ وہ ''پانچ دن'' جو افسانہ کا عنوان ہیں جو افسانہ کی اساس ہیں اور جو پروفیسر کی زندگی کا حاصل ہیں، ان کا ذکر افسانہ میں پانچ سطروں میں بھی نہیں ہوا۔ ان کے متعلق پروفیسر صرف اتنا کہتا ہے۔ ''یہ پانچ دن میرے لیے بہت ہیں۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔'' پورے افسانہ کی تکنیک پروفیسر کے اس اعتراف کو پہنچنے کے لیے ہے۔ افسانہ منٹو نے لکھا ہے لیکن بطور افسانہ نگار کے وہ پروفیسر کے اس اعتراف تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اسے اس سینی ٹوریم میں پہنچنا پڑا جہاں سکینہ آئی ہوئی تھی۔ ممتاز شیریں لکھتی ہیں ''بہتر ہوتا اگر وہ مرد اپنی ریاکاری کو ساتھ لے کر مر جاتا۔'' لیکن اس صورت میں افسانہ وجود ہی میں نہیں آتا۔ افسانہ کا جنم ہی ریاکاری کے اعتراف سے ہوتا ہے اور افسانہ کی تھیم ریاکاری نہیں بلکہ عورت کے جسم کو ترسی ہوئی روح کی سیرابی ہے۔ سیرابی کا اعتراف مرد اس عورت کے سامنے ہی کرتا ہے جس نے اس کی زندگی کی پیاس بجھائی اور یہ اعتراف کتنے کم لفظوں میں ہے۔ ''میں لالچی نہیں ہوں''۔ اس سے زیادہ کچھ بھی کہا ہوتا تو خود سکینہ کو یہ بات بتانے میں پس و پیش ہوتا۔ یہ خود آگہی اور قدر کی شناخت کا افسانہ ہے۔ آدمی جنسی جذبہ کی طاقت، سرمستی اور احتیاج سے واقف ہے لیکن وہ کیا معنی اور کیا قدر رکھتی ہے۔ اس کا اسے شعور نہیں۔ ''پانچ دن'' جنس کی معنویت اور قدر کی شناخت کا افسانہ ہے۔ خاطر نشان رہے کہ یہ افسانہ جنس کے نشاط کا میتھون کا بدن کا نغمہ کا افسانہ نہیں معنویت اور قدر شخصی تجربہ کے ذریعہ ہی قائم کی جاتی ہے۔ اور پروفیسر جو چند لفظ کہتا ہے اس میں معنویت اور قدر کا احساس آ جاتا ہے۔

اب خود سکینہ کی کہانی لیجیے جس سے ممتاز شیریں کو گہری ہمدردی پیدا ہوگئی ہے۔ سکینہ زندگی کی پائمالی اور رائگانی کی ہولناک تصویر ہے۔ وہ قحط بنگال میں بیچی گئی۔ کلکتہ سے لاہور آئی کوٹھے سے بھاگی تو بھوکی پیاسی

خستہ حال پروفیسر کے گھر کا دروازہ کھلا دیکھا تو اندر گھس گئی اور کھانے پر پل پڑی۔ پروفیسر کے یہاں چند مہینوں میں ہی اس پر نکھار آجاتا ہے، اور پروفیسر کی نامرادی کی کہانی سن کر وہ اس کی زندگی کو سیراب کرتی ہے۔ اب مر رہی ہے تو اس احساس کے ساتھ کی رائگاں زندگی بھی کسی کے کام آئی اور جس کے کام آئی وہی اس کی زندگی کا پہلا او ر آخری سہارا تھا، اس کا محسن تھا۔ جسے خود اپنے مرنے کا غم نہیں۔ اسپر نقاد کی اشک باری لا حاصل ہے۔

اور افسانہ میں پروفیسر تو مرنے والا تھا۔ سکینہ کی موت بھی ضروری تھی تا کہ کچھ نہ بچے، نہ عیار زندگی، نہ پیاسی زندگی، نہ رائگاں زندگی، بچ جائیں تو وہ پانچ دن جس میں زندگی اپنی تکمیل کو پہنچی۔ یہ پانچ دن افسانہ کے عنوان کے مانند ستاروں کے جھرمٹ کی طرح وقت کی پہنائیوں میں چمکتے نظر آئیں۔ جنس یہاں جبلت کی سفاکی اور جبریت سے بھی بلند ہوگئی ہے۔ وہ روحانی بن گئی ہے جس کے آگے اب کوئی تمنا باقی نہیں۔ روح کی اڑان کا یہ تجربہ مکتی اور موکش کا تجربہ ہے جو آدمی کو پرم آنند کے تجربہ سے دوچار کرتا ہے۔ جنس ہمارے تمام اخلاقی اور سماجی سروکاروں سے بلند، زندگی اور موت سے بھی ماورا، عظیم فطرت کی ایک صفت بن گئی ہے۔ چونکہ آدمی عظیم فطرت ہی کا ایک جزو ہے اس لیے وہ فطرت کے اس عظیم تجربہ کو جان سکتا ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نقاد کی تفہیم تو درست ہے لیکن تعبیر کے وقت وہ ایسی زبان استعمال کرتا ہے یا ایسے خیالات کا اظہار کرتا ہے جو نہایت لطیف پیرایہ میں افسانہ کی اصل حقیقت کو بدل دیتے ہیں۔ منٹو کے افسانہ ''باسط'' کے متعلق ممتاز شیریں کے اس بیان کو دیکھیے:

> ''انسان ضبط نفس سے ایک روحانی بلندی حاصل کرتا ہے۔ وہ اصول پرستی اور پاک بازی کی خاطر جسمانی لذتوں کو قربان کرسکتا ہے اور اپنی فطری حیوانی جبلتوں پر فتح پاکر بلند ہوسکتا ہے۔ نیکی اور ضبط نفس سے انسان کو روحانی کیف ملتا ہے۔ بے راہ روی اور گناہ کا احساس انسان کو ایک مسلسل روحانی کرب واضطراب میں مبتلا رکھتا ہے۔ منٹو نے اپنے آخری دور کے ایک افسانے ''باسط'' میں انسان کو اس شبیہ میں دکھایا ہے۔''

اس کے بعد ممتاز شیریں ''پانچ دن'' کے پروفیسر کا ذکر کرتی ہیں۔ پچھلے صفحات میں اس سلسلہ میں پیش کردہ محترمہ کے اقتباس میں آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ وہ عورت سے ہم کناری کے واقعہ کو گناہ کے لفظ سے یاد کرتی ہیں۔ ان کی فکر کا میلان اب اس طرف ہے کہ آدمی گناہ کی ترغیب پر قابو پاتا اور ضبط نفس سے کام لیتا تو روحانی بلندی کو پہنچ سکتا ہے جس کی مثال ''باسط'' ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ منٹو کو ویسے بھی گناہ اور ضبط نفس اور فطری حیوانی جبلتوں پر فتح حاصل کرنے اور

روحانی بلندی اور روحانی کیف پانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ انسان کی جائز فطری خواہشوں کے قتل کو بڑا جرم سمجھتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ جنسی گھٹن سے انسانی فطرت اور نفسیات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ وہ ان ماہرین نفسیات کا ہم خیال ہے جو ارتقاع جنسی کو بھی ایک طرح کی جنسی گھٹن ہی سمجھتے ہیں۔ ''پانچ دن'' کے پروفیسر نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ وہ زندگی بھر ضبط نفس کرتا رہا اور اپنی ذات سے جھوٹ بولتا رہا۔ عورت سے ہم کنار ہو کر وہ سچائی کو پہنچا۔ ''پانچ دن'' کی غلط تفہیم پر تعمیر کردہ ضبط نفس اور روحانی بلندی کی تصورات کو وہ ''باسط'' کے آئینہ میں دیکھتی ہیں۔ ظاہر ہے وہ کردار جوان تصورات کا حامل ہوگا مثالی ہوگا مثلاً دوستوفسکی کی ناولوں میں بردرز کار اموزوف کا آلیوشا اور ایڈیٹ کا پرنس مشکن جو یسوع مسیح کی شبیہ ہیں۔ منٹو کی حقیقت پسندی کسی نوع کے آئیڈیلزم کو پسند نہیں کرتی۔ لہٰذا ''باسط'' کی روحانی بلندی ضبط نفس سے حاصل کردہ نہیں ہے۔ منٹو 'باسط' میں روحانی بلندی نہیں بلکہ من کا چوکھا پن دیکھتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح وہ 'خورشٹ' میں من کا میلا پن دیکھتا ہے۔ باسط کے جیسا دوسرا کردار اگر دیکھنا ہو تو وہ ہے بیدی کے افسانہ ''من کی من میں رہی'' کا مادھو جس سے کسی دوسرے کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ یہاں بھی وہی من کا چوکھا پن ہے۔ فرق صرف عمر کا ہے۔ باسط میں شباب کی تمازت ہے۔ مادھو میں ڈھلتی ہوئی شام کی ملائمت۔

باسط نوجوان لڑکا ہے جس کی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے اس کی دلہن پیٹ میں کسی کا پاپ لے کر آئی ہے۔ اس پاپ کو باسط کی نظروں سے چھپانے کے لیے یہ لڑکی کیسی کیسی تکلیفوں سے گزری ہوگی یہی خیال باسط کو اس سے گہری ہمدردی کی طرف مائل کرتا ہے۔ باسط نہ صرف حمام میں اسقاط کی نشانیوں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتا ہے بلکہ اپنی بیوی کو خبر بھی ہونے نہیں دیتا کہ وہ اس کے راز کو جان گیا ہے۔ اس کی ماں اس صدمے سے مرجاتی ہے تو اس کا غم بھی خاموشی سے برداشت کر لیتا ہے۔ باسط میں جو بھی روحانی پاکیزگی ہے وہ فطری اور جبلی ہے اور کسی ضبط نفس، اصول پرستی اور حیوانی جبلتوں پر فتح کا نتیجہ نہیں۔ ایسی کوئی کش مکش افسانہ میں نہیں اور انسانی دکھ کی طرف باسط کا ردعمل انسانی ہے جو سماجی انسان کی اخلاقیات سے بلند ہے۔ وہ جو دکھ اور تکلیف میں ہو اس سے ہمدردی کی جاتی ہے، اس کے اعمال کا حکم نہیں بنا جاتا۔

اس افسانہ میں منٹو کا کمال یہ ہے کہ وہ طرز عمل جو ایک پیغمبر، مہاتما اور ولی کو زیب دے اسے ایک نا تجربہ کار اور معصوم نوجوان میں دکھایا ہے۔ اس کی نیکی اس کی بھلمنساہٹ ہے اور اس کے کردار کا اضطراری عمل۔ گویا باطن کی پاکیزگی اور معصومیت محض اکتسابی نہیں بلکہ کچھ لوگوں میں فطری بھی ہوتی ہے۔ قدرت چنگیز و ہلاکو کو پیدا کر سکتی ہے تو باسط اور مادھو کو بھی پیدا کر سکتی ہے جن کی سرشت میں ہی انسا دردمندی کا اتھاہ سمندر ہوتا ہے۔ وہ ولی یا سنت بنے بغیر انسان کی فطری پاکیزگی کا علامیہ ہوتے ہیں۔ گنگوتری کے شیتل جل کی مانند، آلائشوں سے

پاک...... ممتاز شیریں سے تعبیر میں بہت ہی نازک اور باریک تسامح ہوا ہے۔ وہ Being کے افسانہ کو Becoming کا افسانہ سمجھ بیٹھیں۔ یہ فروگذاشت بتاتی ہے کہ تعبیر کا کام پل صراط پر چلنے کا نام ہے۔

تعبیر تشریح اور تجزیہ معنی خیز اسی وقت بنتا ہے جب فن پارے میں معنوی تہہ داری ہو۔ غواص معانی چھچھلے پانیوں میں غوطہ نہیں لگاتے۔ جن افسانہ نگاروں کے یہاں معنوی گہرائی نہیں ہوتی نقاد تعبیر کا کام پیرافریز سے نکال لیتے ہیں۔ دراصل افسانہ کے رموز و علائم کو سمجھنے سمجھانے کا کام تعبیر کو حیرت خیز اور ہوش ربا انکشاف کا جوہر عطا کرتا ہے۔ ایسی ناقدانہ تعبیریں ایک تخلیقی تجربہ کا لطف رکھتی ہیں۔ ایسی تنقیدوں کی زبان بھی حساس، تخیلی، استعاراتی اور انجسٹ ہوتی ہے۔ اچھی تعبیراتی تنقید ذکر عیش نصف عیش کے مصداق پیرافریز کا شکار ہوئے بغیر افسانہ کی باز آفرینی کی مسرتوں سے سرشار بنتی ہے۔

ہیئتی تنقید جو تعبیر کا حسن اور تجزیہ کا وصف رکھتی ہے، تنقید کی اعلیٰ ترین قسم ہے ہر نقاد اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے فن پارے کے حسن کا راز کیا ہے۔ چونکہ کوئی جواب آخری نہیں ہوتا اس لیے فن پارے پر اعلیٰ ترین اور جامع ترین مضمون بھی حرف آخر نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ ادب کے شاہکاروں کے لیے ہر نسل اپنے بہترین ناقدانہ دماغوں کو تفہیم، تجزیہ اور تحسین کے لیے وقف کرتی ہے۔ ناقدانہ گفتگو فن پارے میں دلچسپی کو ماند پڑنے نہیں دیتی اور فن پارہ ایک تسلسل کے ساتھ تنقید کو سرگرم گفتار رکھتا ہے۔

تعبیراتی تنقید کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں نقاد کے علم، بصیرت اور ذہانت کا استعمال چونکہ اس کی ذات سے بھی عظیم تر چیز یعنی فن پارے کے لیے ہوتا ہے تو اس میں نمائش علم اگر ہے تو بھی اتنی ناگوار معلوم نہیں ہوتی۔ علم کی روشنی اس کرن میں بدل جاتی ہے جو معنی کے موتی کو روشن کرتی ہے۔ البتہ نقاد کو چوکنا رہنا چاہیے کہ کہیں اس کی تنقید علم کو تلوار سے معنی کی پھانس نکالنے کا عمل نہ بن جائے۔ مثلاً شفق کا ایک افسانہ ہے جس میں ایٹم بم کی تباہ کاری کی تمثیل ہے۔ اس افسانہ کے تجزیہ میں قمر رئیس سے ایٹم بم کی بناوٹ اور اس کی تباہ کاری پر ایک نہایت ہی سائنٹفک مضمون لکھ ڈالا۔ یہ مضمون شفق کے افسانہ پر ایک بم ہی کی طرح گرا ہے۔ افسانہ کا دور دراز تک پتہ نہیں، اس سے بہتر تھا کہ پروفیسر صاحب افسانہ کی کمزوریوں کا ذکر کرتے کم از کم افسانہ کمزور ہی سہی اپنی ٹانگوں پر تو کھڑا نظر آتا۔

اس سلسلہ میں Rosamond Tuve کی کتاب A Reading of George Herbert کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ یہ کتاب اس بات کا بہت ہی اچھا ثبوت ہے کہ ادب کو تشریح کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب حالات بدلتے ہیں اور تہذیبی اور مذہبی علامتیں اور عقائد اپنے معنی کھو دیتے ہیں تو ترسیل معنی کی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ جارج ہربرٹ کا تعلق میٹافزیکل شاعروں سے ہے جو ملٹن کے بعد منصۂ شہود پر آئے۔ جارج

ہربرٹ کی شاعری مذہبی شاعری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ذاتی طور پر مجھ جیسے لامذہب کو بھی اس کی شاعری نے اتنے شدید طور پر متاثر کیا ہے کہ اس کے لیے میرے دل میں وہی محبت اور عقیدت کا جذبہ ہے جو ایک سالک راہ کو اپنے روحانی مرشد سے ہوتا ہے۔

اس کی ایک نظم ہے Sacrifice جدید قاری کو یہ نظم ذرا مشکل سے سمجھ میں آتی ہے کیونکہ نظم کی امیجری اور استعاروں کا مآخذ قدیم عیسائی Iconography ہے۔روز امنڈ توو ے نے اس نظم کی تفسیر میں بائبل، بائبل کی تفاسیر، لیٹرجی، لاطینی اور مقامی زبانوں سے گیتوں، حمد اور کیرول، وعظوں اور عبادت کی کتابوں، عہد وسطی کے ڈراموں، کلیسا کے دریچوں کی رنگین تصویروں مخطوطات کے سنہرے مرقعوں اور Wood Cuts کے نمونوں کے مطالعہ کے ذریعہ وہ پوری مذہبی، ثقافتی اور ذہنی فضا تعمیر کردی جس کی تلمیحات، عقائد اور استعاروں سے اس نظم کا تانا بانا بنا گیا تھا۔قاری یہ باریک باتیں نہیں جانتا تھا جو روز امنڈ کو پڑھنے کے بعد وہ جان گیا اور جو نظم کی تفہیم کے لیے ناگزیر تھیں کہ عہد وسطی میں موسیٰ اور نوح عیسیٰ ہی کے نائب تھے۔من وسلویٰ کا من Eucharist کا ابتدائی نقش ہے۔(یعنی من وہی چیز ہے جس سے کیتھولک عبادت میں وہ روٹی تیار کی جاتی ہے جو عیسائی عقیدے کے مطابق عیسیٰ کا بدن ہے) سوئے ہوئے آدم کی پسلی نکال کر اس سے حوا کی تخلیق مترادف ہے۔''مصلوب عیسیٰ کے بدن میں بھالا بھونکنے اور مقدس لہو کے بہنے سے'' اور خلد بریں کا وہ شجر جس کا پھل چکھ کر آدم نے پہلا گناہ کیا تھا۔اسی درخت کی لکڑی سے وہ صلیب بنائی گئی جس کا پھل مصلوب عیسیٰ کا زخمی بدن تھا۔

ہمارے یہاں ایسی تشریحات کی مثالیں بہت کم ہیں۔شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ Poetic Conciet جو میٹافزیکل شاعروں کا امتیازی صف ہے۔ ہمارے شعری مزاج کا جز و نہیں۔لیکن اس قسم کی تنقید کے کچھ اچھے نمونے افسانوں کے تجزیوں میں مل جائیں گے۔افسانوں کے بھرپور اور جامع تجزیے جدید اردو تنقید کا ایک اہم اور نمایاں میلان ہے۔منٹو، بیدی، انتظار حسین اور سریندر پرکاش کے افسانوں کے وہ تجزیے جو نارنگ، محمد عمر میمن، شمیم حنفی اور ابوالکلام قاسمی نے کیے ہیں عالمانہ تنقید کے اچھے نمونے ہیں۔راقم الحروف نے بیدی کے افسانہ ''یوکلپٹس'' کے تجزیہ میں ایک کیتھولک کالج میں اپنی ۳۳ سالہ ملازمت کے دوران حاصل کیے گئے عیسائی مذہب کے علم کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کی ہے۔

اس موقعہ پر وسٹ اور بیرڈزلی کے رجحان ساز دو مضامین Inetntional اور Effective Fallacies کا ذکر ضروری ہے جنہوں نے تعبیراتی تنقید پر گہرے اثرات ڈالے۔ان مضامین سے جو منفی اثر پیدا ہوا ہے اس کا تذکرہ منظور ہے۔اس منفی اثر کا تعلق فن کار کی شخصیت سوانح اور ارادے کا تعبیر اور تنقید کے

وقت کس حد تک استعمال جائز ہے، اس سے ہے۔ اس معاملہ میں مذکورہ نقادوں کے تصورات نے جو سخت گیری پیدا کی اسے بعد کی ساختیاتی اور پس ساختیاتی تنقید نے شدید تر بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادب سے ادیب ہی، فن سے فن کار ہی اور افسانہ سے افسانہ نگار ہی بے دخل ہو گیا۔ میں اس سلسلہ میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ تمام تنقیدی نظریات کی مانند یہ نظریات بھی اضافی ہیں، مطلق نہیں۔ تصورات کو ممنوعات اور مکروہات نہیں سمجھنا چاہیے کہ نقاد تعبیر کی چوکی پر بیٹھے تو ہاتھ میں گنگا جل لے کر قسم کھائے کہ فن کار کی سوانح اور شخصیت کو چھو کر بھرشٹ نہیں ہوگا۔ فن کار کو اس طرح عاق کرنے کے پیچھے مجھے تو ایک ناپاک ارادہ کام کرتا نظر آتا ہے کہ نقاد خود تعبیر کے زور پر افسانہ کا گاڈ فادر بن جائے۔ ہمیں یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ افسانہ، افسانہ نگار کے وجود کی گہرائیوں سے جنم لیتا ہے اور افسانہ کے اسلوب اور آہنگ کی نازک ترین لرزشوں میں اس کی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے۔ پچھلے صفحات میں منٹو کے افسانوں پر بحث میں اس کی شخصیت سے جو استفادہ کیا گیا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے۔ سنا ہے کہ حسرت موہانی نے بدھ مذہب کے متعلق کہا تھا کہ یہ وہ عجیب مذہب ہے جس میں خدا ہی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ساختیات بھی وہ نظریۂ فن ہے جس میں فن کار ہی کا کوئی مقام نہیں متن کا مطالعہ عالم کثرت کا مطالعہ ہے جو وحدت یعنی خالق کے تصور کے بغیر فساد نظر کا باعث بن سکتا ہے۔

اب جب کہ اسلوب میں تصوف کے اکتارے پر چھیڑے ہوئے استعاروں کا آہنگ پیدا ہو چلا ہے تو کیوں نہ میں اپنے تعبیر کے خیال کو دھر پد دھمار کو مذہب ہی کی تان پر ختم کروں۔

لوقا کی انجیل میں ایک حکایت بیان ہوئی ہے:

> ''پھر اس نے (یسوع نے) بعض لوگوں سے، جو اپنے پر بھروسہ رکھتے تھے، یہ تمثیل کہی کہ دو شخص ہیکل میں دعا کرنے گئے۔ ایک فریسی دوسرا محصول لینے والا۔ فریسی کھڑا ہو کر اپنے جی میں یوں دعا کرنے لگا کہ ''اے خدا! میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ میں باقی آدمیوں کی طرح ظالم، بے انصاف، زنا کار یا اس محصول لینے والے کی مانند نہیں ہوں، میں ہفتہ میں دو بار روزہ رکھتا ہوں اور اپنی ساری آمدنی پر ''دہ یکی'' دیتا ہوں لیکن محصول لینے والے نے دور کھڑے ہو کر اتنا بھی نہ چاہا کہ آسمان کی طرف آنکھ اٹھائے بلکہ چھاتی پیٹ پیٹ کر کہا کہ اے خدا! مجھ گنہگار پر رحم کر۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ یہ شخص دوسرے کی نسبت راست باز ٹھہر کر اپنے گھر گیا کیونکہ جو کوئی اپنے آپ کو بڑا بنائے گا وہ چھوٹا کیا جائے گا اور جو اپنے آپ کو چھوٹا بنائے گا وہ بڑا کیا جائے گا۔''

بعض عیسائی مفکرین کا کہنا ہے کہ لوقا نے یہ حکایت بیان تو کی ہے لیکن اس کی معنوی اہمیت کا شاید اسے بھی بہت احساس نہیں تھا۔ بعد میں آنے والے مفکرین نے اس حکایت کی تفسیر کی اساس پر عیسائی تھیولوجی کے چند کلیدی تصورات کی تعمیر کی۔ ایک طرف راست روی کا پندار ہے دوسری طرف گم کردہ راہی کا انفعال۔ وہ جسے اپنے اعمال نیک پر اعتماد ہے اس سے کہیں زیادہ وہ جو اپنے گناہوں کے باعث آسمان کی طرف آنکھ اٹھانے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتا اور نظریں جھکائے رحم کی بھیک مانگتا ہے اس پر خدا رحمت برساتا ہے۔

عیسائی مذہب کے رحمت خداوندی کے آفاق گیر تصور کی تعمیر میں اس حکایت کی تعمیر اور تفسیر کا بڑا حصہ رہا ہے۔ دراصل تعبیر اور تفسیر ہی مذاہب کی شریعتوں اور فلسفوں کی اساس رہی ہیں۔ اسی سبب سے مذہبی تعبیر Hermaneutics کا جدید ادبی تعبیرات کے نظریات پر گہرا اثر ہے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ جس پر گفتگو کی یہاں گنجائش نہیں۔

ہمارے بیسیوں افسانوں میں ایسے معنیاتی رموز پنہاں ہیں کہ اگر ژرف نگاہی اور صحیح تنقیدی طریقہ کار کے ذریعہ افسانہ کی ساخت اور بافت کا تجزیہ کیا جائے اور معنیاتی اشاروں کی تشریح، تفسیر اور تعبیر کی جائے تو وہ نہ صرف زندگی کے اسرار کو بے نقاب کریں گے بلکہ ادب اور آرٹ کی ماہیئت اور فنکشن کے متعلق وہ علم عطا کریں گے جو ان کے بارے میں خلا میں نظریہ سازی سے حاصل نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر ظہور الدین

انٹی ناول

انٹی ناول، ناول کی جدید ترین قسم ہے۔ جسے ان جدید فلسفیانہ رجحانات نے جنم دیا ہے جن کا واحد مقصد اس زمین پر انسان کے وجود کی بے معنویت کو اجاگر کرنا ہے۔ ان رجحانات نے زندگی کے ہر دور کو متاثر کیا ہے۔ ادب میں بھی ان کی وجہ سے موضوعاتی اور ہیئتی دونوں سطحوں پر وہ بحران نمودار ہوا جس نے ماضی کی ہر قدر سے انحراف کر کے بے مقصدیت اور بے سمتی کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ بنایا ہے۔

انٹی ناول کے فن کی کامیاب ترین تجربی صورت ہمیں جیمز جوائس کے یولی سس Ulyssis اور فنی گنز ویک Finnegans Wake ورجینیا ولف کے مسز ڈیلووے Mrs Delloway دی ویوز The waves اور ٹو دی لائٹ ہاؤس To the Light House اور سیموئیل بیکٹ کے موتے Mulley وغیرہ ناولوں میں نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ اس ضمن میں جن دوسرے ادیبوں اور ان کی تخلیقات کا ذکر کیا جا سکتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ لا نازی La- Nausee ۱۹۳۲ء سارتر

۲۔ دو تیرتے پرندے At Swim Two birds ۱۹۳۹ء فلین او برائن

۳۔ ٹراپسم Tropismes ۱۹۳۹ء اور لی پلانیٹوریم Le- Planetorium ۱۹۵۹ء نتھالی سروت Nathalie Surraut

۴۔ L, estranger ۱۹۴۲ء کیمو۔

۵۔ محترمہ گوڈمین کے ساتھ چائے Tea With Mrs. Godman ۱۹۴۷ء فلپ ٹائن بی۔

۶۔ جیلوسی Jalousie ۱۹۵۷ء روب گرلٹ Robe Grillet

۷۔ L, Emopol de Temps اور...... بوٹر La - moditications

۸۔ پیلی آگ Pale Fire ۱۹۶۲ء نابوکو Nabokov

۹۔ ملواں دروازہ The Connecting Door ۱۹۶۲ء اور اون کاٹنے والے۔ The Shearers ۱۹۶۹ء ریز ہپن اسٹال Rayner Happen Stall

۱۰۔ اوٹ Out ۱۹۶۴ء Such ۱۹۶۶ء اور Between کرسٹائن بروک روز Christine Brooke Rose

۱۱۔ Lherbe ۱۹۵۸ء کلاڈ ے سائمن Cloude Simon

انٹی ناول کے تجربے کے تحت جتنے بھی ناول لکھے گئے ہیں، چاہے جیمس جوائس کا یولی سس یا فنی گنس ویک ہو یا سارتر کا لاناسی ان سب کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نہ تو ان میں کوئی پلاٹ ہوتا ہے نہ کردار نگاری نہ وقت کا تسلسل۔ واقعات کو بڑے مبہم اور غیر محسوس طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ اشیائے سطحی لیکن مفصل بیان پر زور دیا جاتا ہے۔ ان میں تکرار کی بھر مار ہوتی ہے۔ الفاظ کی روایتی ہیئت بگاڑ کر یا ان کے روایتی استعمال سے قطعی انحراف کر کے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اوقات کے استعمال کو بھی بدل دیا جاتا ہے۔ جملوں کی ساخت قطعی بدلی ہوئی نظر آتی ہے اور اس طرح اس اصول پر عمل کرتے ہوئے کہ روایت سے کوئی کسی طرح کا استفادہ نہ کیا جائے۔ ہر پہلو سے انتہائی حیرت کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ کردار تو ہوتے ہیں لیکن ان کے عمل سے کوئی مجموعی تاثر اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں نہ تو کوئی مرکزی کردار ہوتا ہے اور نہ کوئی ایسی شخصیت جس کے گرد کردار گھومتے ہوں۔ ہر کردار اپنا منفرد وجود اور مقام رکھتا ہے۔ اس کی وجہ وہی بنیادی تبدیلی ہے جس کی رو سے اب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ کوئی شخص اپنے وجود میں کسی طرح کی کوئی مجموعی شخصیت نہیں رکھتا۔ یا یہ کہ کسی بھی انسان کے اندر کوئی خصوصیت یا قدر اس حد تک موجود نہیں ہوتی کہ اس کی بنا پر اس کی کوئی مجموعی شخصیت ابھاری جا سکے۔

یہ ناول تاش کی گڈی کی طرح ہوتے ہیں جن کے صفحات کو خوب چھانٹ لینے کے بعد بھی اگر پڑھا جائے تو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ رنگوں خاکوں اور تصویروں سے بھی صفحات کو مزین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بعض اوقات صفحات کو سادہ رکھ کر مخصوص تاثرات ابھارے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ انٹی ناول، مصوری، موسیقی اور ادب کے تمام حربوں سے استفادہ کر کے زندگی کی کرب ناک تصویریں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ناول کی اس قسم کو وجود میں لانے کے لیے موجودہ دور کے بہت سے جدید رجحانات نے اہم رول ادا کیا ہے۔ جن میں اظہاریت، تاثریت، شعور کی رو، علامت نگاری، اور سرریلزم خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

موضوع کے اعتبار سے بھی انٹی ناول نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ ناول میں کسی موضوع کو مرکزی حیثیت نہ دی جائے اور نہ کسی ایک موضوع کو اپنا کر اس کے گرد ایک مضبوط اور مسلسل پلاٹ تشکیل دیا جائے یعنی ایک ناول میں ہزاروں مختلف و متضاد موضوعات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اور ان کے درمیان کوئی

ربط ہونا بھی ضروری نہیں۔

ان ناولوں کے بارے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہیئت کے اعتبار سے ان میں نہ تو کسی پلاٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کردار نگاری کی۔ نہ ان میں کوئی مرکز ہوتا ہے اور نہ کوئی نقطۂ عروج۔ نہ تاثر کے ارتقا کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کسی مجموعی تاثر کو ابھارنے کی۔ نہ کوئی مرکزی کردار ہوتا ہے اور نہ کوئی مرکزی اسلوب ان ناولوں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ زندگی کے قنوطی اور منفیانہ حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ناول میں کیے جانے والے انہیں تجربات نے انٹی کلائمکس Anti Climax اور انٹی ہیرو Anti Hero ایسی اصطلاحوں کو بھی جنم دیا۔ یہی نہیں ڈرامے کو متاثر کر کے وہاں بھی انٹی پلے Anti Play کے عنوان کے تحت تجربوں کے لیے راہ ہموار کی۔ ان سب تجربات کے پس پشت وہی فلسفیانہ رجحانات کارفرما ہیں جن کا ذکر ابتدا میں کیا گیا ہے۔

یہ بات اوپر کہی جا چکی ہے کہ انٹی ناول، ناول کی وہ قسم ہے جس میں روایتی ناول کا پلاٹ نظر نہیں آتا۔ یعنی جس طرح روایتی ناول میں ہمیں کہانی تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتی اور اپنے منطقی انجام کو پہنچتی نظر آتی ہے، انٹی ناول میں اسی طرح ایک لیک پر چلنے والی کہانی نہیں ہوتی۔ اس میں واقعات کی وہ ترتیب بھی نظر نہیں آتی جو روایتی ناول کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے تاکہ پلاٹ کی ایک مربوط صورت چاہے وہ کتنی ہی ڈھیلی ڈھالی کیوں نہ ہو باقی رہے اور قاری کو یہ احساس رہے کہ وہ ایک مربوط کہانی پڑھ رہا ہے۔

اس بات کو مزید واضح کرنے کے لیے یہاں دو ناولوں کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ ایک کا تعلق انگریزی زبان سے ہے اور دوسری کا اردو سے۔ انگریزی ناول کا عنوان فنی گنز ویک ہے اور اردو ناول کا آڈنٹٹی کارڈ۔

جدید ناول کی تاریخ میں فنی گنز ویک سے زیادہ مبہم ناول آج تک نہیں لکھا گیا ہے۔ جیمس جوائس نے اس ناول کی تخلیق میں سترہ سال صرف کیے اور اسے اپنی کد و کاوش سے ایسا روپ دیا کہ آج تک سیکڑوں تشریحی و تنقیدی کتب وجود میں آنے کے بعد بھی نہ تو اس کی صحیح تفہیم ممکن ہو سکی ہے اور نہ تنقید۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ قدر و قیمت کا مناسب تعین تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ہم کسی فن پارے کو پوری طرح سمجھ پائیں۔ یہاں چونکہ معاملہ ہمیشہ اس کے برعکس رہتا ہے اس لیے ہر نئی کتاب آنے کے بعد بھی اطمینان نہیں ہو پاتا۔ اسی بنا پر کچھ نقاد یہ کہنے پر بھی مجبور ہیں کہ فنی گنز ویک کی صحیح تفہیم کبھی ممکن نہ ہو سکے گی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا نے بھی اس فن پارے کو سب سے مبہم تخلیق قرار دیا ہے۔ جیمس جوائس کی دلی خواہش یہ بھی تھی کہ اس ناول کو سمجھنے کے لیے قارئین اپنی زندگیاں صرف کر دیں۔ ۱۹۳۹ء میں شائع ہونے کے

بعد اب تک اس کے بارے میں سیکڑوں مضامین اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن معاملہ وہیں کا وہیں ہے۔

فنی گنز ویک کے بارے میں پہلی تشریحی کاوش ایڈمنڈ ولن کا وہ مضمون ہے جو ''اریوکر کا خواب'' کے عنوان سے شائع ہوا جسے بعد میں The Wound And the Bow کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس میں مصنف نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ یہ ساری کتاب دراصل شراب کے نشے میں دھت ایک ایسے شخص کے خواب کا بیان ہے جو Chapelizod کا رہنے والا تھا۔ جوائس نے اگر چہ اس کی کچھ تفصیلات سے اختلاف کیا لیکن ولسن کے بیان کو پوری طرح غلط قرار نہیں دیا۔

کچھ نقادوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ فن پارہ دراصل خود جوائس کے خواب کا بیان ہے۔ اس دلیل کو اکثر لوگوں نے قبول کیا ہے۔ اسی لیے اس ناول کو سوانحی ہی نہیں اعترافاتی بھی قرار دیا گیا ہے۔ اس دلیل کو اس بات سے مزید تقویت ملتی ہے کہ جوائس خود اس فن پارے میں بہت سی ایسی کتابوں کا ذکر کرتا ہے جو اسی زمرے میں آتی ہیں۔ مثلاً سینٹ آگسٹس یا دوسو کے اعترافات اور جیمس ہاگ کا جرنل وغیرہ۔

جوائس نے اس ناول کو بڑی محنت سے لکھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کے الفاظ میں کچھ ایسا جادوئی اثر ہے جو اسے وہی درجہ عطا کرادے گا جو کسی بھی مذہبی صحیفے کو حاصل ہے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی نئے دین کی بشارت دینے والا پیغمبر ہو۔ اس ناول کی تخلیق کے دوران یکے بعد دیگرے کچھ ایسے حادثات ہوئے جن کی وجہ سے اسے یہ یقین ہوگیا کہ اس کی تحریر میں کوئی خاص فوق فطری قوت ضرور پیدا ہوگئی ہے۔ وہ جس کی زندہ شخصیت کو چن کر کردار کے طور پر پیش کرتا وہ کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہو کر جاں بحق تسلیم ہو جاتی۔ اسی طرح بہت سے واقعات جن کا اس ناول میں ذکر کیا تھا بعد میں سچ مچ رونما ہوگئے۔ اسی وجہ سے جوائس کو پورا یقین تھا کہ اس کے الفاظ کوئی ان دیکھی اور خاموش قوت رکھتے ہیں۔

یہ ناول اس کے لیے اس کی زندگی کی سی اہمیت رکھتا تھا۔ اسی لیے اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے صفحات میں زندگی کے کچھ اہم پہلوؤں کو قید کر کے پیش کر رہا ہے۔ وہ زبان کو اپنی مرضی کے مطابق برتنے کے گر جانتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے اس کا بھی احساس تھا کہ کسی نہ کسی طرح سے زبان کی روح بالارادہ طور پر اس کے ذریعے اپنا کام کر رہی ہے۔ زبان کس طرح اسے اپنے اظہار کا آلہ کار بنا رہی تھی اس کے بارے میں ایک واقعہ سنیے:

جوائس فنی گنس ویک کے سلسلے میں بیکٹ کو کچھ لکھوا رہا تھا کہ اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔ جوائس نے اسی روانی سے کہ جس سے وہ لکھوا رہا تھا Come in کے الفاظ کہے۔ بیکٹ نے چونکہ دستک کو نہیں سنا تھا اس لیے اس نے متعلقہ متن میں come in کے الفاظ بھی لکھ دیئے۔ بعد میں جب وہ لکھی تحریر کو پڑھ کر

سنانے لگا اور come in کے الفاظ تک پہنچا تو جوائس نے پوچھا کہ یہ come in کیا ہے۔ بیکٹ نے جواب دیا۔ جو آپ نے لکھوایا۔ جوائس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بولا۔ چلو رہنے دو۔ اس واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک بات جو غلط فہمی کی وجہ سے ہو گئی تھی کس طرح تخلیق کے درجے تک پہنچی۔ وہ دراصل ایک کتاب ہی نہیں لکھ رہا تھا بلکہ جادو کے ایک فن پارے کو عملی طور پر پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تاہم اس بنیادی سوال کا تسلی بخش جواب ابھی تک نہیں دیا جا سکا ہے کہ یہ ناول کس کے بارے میں ہے اس کا ایک سیدھا سا جواب جو تسلی بخش بھی ہے وہی ہے جو بیکٹ نے اس موقع پر پیش کیا ہے وہ کہتا ہے، یہ کسی چیز کے بارے میں نہیں ہے یہ خود ہی وہ مخصوص شے ہے، جوائس نے خود اس ناول کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی بنیاد وہ واقعہ تھا جو اس کے والد اور ایک آوارہ گرد کے درمیان فونکس پارک میں ہوا۔ یہ تصادم عین اسی مقام پر ہوا تھا جس مقام پر لا فانو کے ناول میں ڈینجر فیلڈ نے سڑک کو پیٹا تھا۔ جوائس نے جولاس کو ایک بار کہا تھا کہ وہ چیپ لی زاد خاندان کی کہانی کو ایک نئے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وقت دریا اور پہاڑ میری کہانی کے حقیقی ہیرو ہیں۔

جوائس کی تشریحات کی تفصیلات زیادہ ان خطوط میں موجود ہیں جو جوائس اپنے ناول کے ہر حصے کی تکمیل پر مس ویور کو بھیجتا رہا جن کے ساتھ تشریح کا ایک نوٹ بھی اکثر لگا رہتا تھا۔

مس ویور اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔ ''یہ کہنا کہ یہ کتاب کسی کردار کے خواب پر مبنی ہے بکواس ہے۔ جوائس نے درحقیقت خواب کے اسلوب کو برتنے کی کوشش کی ہے تا کہ وہ کسی بھی مواد کو آزادانہ طور پر اس میں شامل کر سکے۔''

مس ویور ایک اور موقع پر پروفیسر جوزن پر لیکاٹ کو اس سلسلے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہے۔

''۱۹۲۳ء کی گرمیوں میں جب جوائس اس کے گھر والوں کے ساتھ لندن میں مقیم تھا تو اس نے مجھ کو بتایا کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھنا چاہتا ہے جو ایک قسم کی عالمی تاریخ ہو۔ اس نے اس کے کچھ ابتدائی حصے اس کے لیے ٹائپ بھی کیے جو اس نے کرداروں کے لیے بنا رکھے تھے۔ جب مس ویور نے جوائس سے شکایت کی کہ وہ ان حصوں کو قطعی سمجھ نہیں پائی ہے جو اس نے ٹائپ کیے ہیں۔ تو جوائس نے اس سے کہا: ''اسے افسوس ہے کہ پیٹرک اور بر کلے اس پر خود کو واضح کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔''

یہ ناول دراصل Cyclic History کے اصولوں کے مطابق لکھا گیا ہے۔ جس کے نئے حصوں میں جو کردار نمودار ہوتے ہیں وہ نئے نہیں ہوتے بلکہ انہیں پرانے کرداروں کا دوسرا جنم قرار دینا چاہیے۔ اس کا نہ آغاز ہے نہ تو اختتام۔ یہ ناول دراصل ایک انسان اور اس کے اہل خانہ سے متعلق ہے جو عالم انسانیت کی

تاریخ بن جاتا ہے۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ فنی گنس ویک دو چیزوں پر مبنی ہے۔

جوائس کی اپنی زندگی اور اس کا مطالعہ۔ ان میں جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ تین ہیں: اول یہ کہ جوائس اس ناول کو بیک وقت معنیٰ کی کئی سطحوں پر لکھ رہا تھا۔ اس لیے ہر جملے کے کئی مفہوم ہیں۔ دوم چونکہ اس کا زیادہ تر مواد خود نوشتی ہے اس لیے اسے اس کے سوانح نگاروں کی مدد سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اور سوم یہ کہ چونکہ جوائس کا مطالعہ غیر معمولی طور پر وسیع تھا اور اس نے اپنی کتاب کی بنیاد کئی دوسری کتابوں پر رکھی اس لیے جب تک ان کا علم نہ ہو اسے نہیں سمجھا جا سکتا۔

جوائس نے مس ویور کو جب بھی کسی پیرے یا اقتباس کی وضاحت کی تو ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ وہ اگر اس اقتباس کو ٹھیک طرح سمجھنا چاہتی ہے تو فلاں کتاب کا مطالعہ کرے۔ کچھ کتابیں جن کا اس نے ذکر کیا خاصی مشہور تھیں۔

فنی گنس ویک کے پس پشت دراصل یہ تصور کارفرما تھا کہ آرٹسٹ اپنی تخلیق میں خدا کی طرح ہوتا ہے۔

قرون وسطیٰ میں یہ تصور عام تھا کہ خدا نے دو صحیفے ترتیب دیئے ہیں۔ ایک وہ جو اس نے اپنے ذہن میں ترتیب دیا تھا اور جس کے مطابق اس نے دنیا کو تخلیق کیا اور دوسرا بائبل۔ فنی گنس ویک میں جوائس دراصل ایک تیسرے صحیفے کی تخلیق کر رہا تھا۔

جس طرح ہماری کائنات کچھ اصولوں پر مبنی ہے۔ جنہیں سمجھنا فلسفیوں کا کام ہے۔ فنی گنس ویک کی کائنات بھی چند بدیہات پر مبنی ہے۔ جن کے راز ہم پر افشا کرنے کے لیے اس نے چند کلیدی نقطے بھی فراہم کیے ہیں۔ ان تک پہنچنا قارئین کا فرض ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ اس کی ساخت یا کاوگاہ تاریخ کے سائکلک تصور پر مبنی ہے جسے اس نے Vico سے مستعار لیا۔ منطق برونو کی قدیم نفسیات سے متعلق کتابوں سے ماخوذ ہے۔ لیوی برول کے قدیم نفسیات کے کیے کام سے بھی مدد لی گئی ہے۔ فرائڈ سے بھی استعفادہ سے کا پتا چلتا ہے۔ اسلوب آرتھر سائمن کی کتاب، ادب میں علامت نگاری کی تحریک سے متاثر نظر آتا ہے۔ میلارمے کے نظریات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس میں جوائس نے پونڈ کے صرف اس قول کا اضافہ کیا ہے کہ ہر لفظ کو بھرپور معنویت کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ اس نے اس تصور کو ویگز کے اوپر اور موسیقی کی دوسری اقسام کی ٹیکنک استعمال کر کے ترقی دی۔ بہت سے مصوروں کے نظریات کو بھی برتا۔

Vico کو جوائس نے نہ صرف پڑھا تھا بلکہ اس ناول کی تخلیق کے دوران اس نے اس سے بھرپور

استفادہ بھی کیا۔

وانکو کا خیال تھا کہ خدا نے کائنات کی تشکیل پوری تفصیلات کی ترتیب کے بعد بڑی وفاداری اور ہوشیاری سے عمل میں لائی ہے۔ یہ کام خدا نے مخلوق سے پہلے مکمل کرلیا تھا۔ خدا کا نظام تخلیق اگرچہ بہت پیچیدہ تھا لیکن اسی کے طے کردہ قوانین کے مطابق چل رہا تھا۔ جوائس بھی چونکہ تخلیق کار تھا اس لیے اس نے بھی یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اپنی تخلیق کے نظام کو پوری تفصیلات کے ساتھ ترتیب دے کر انہیں اپنے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق ہی چلائے گا۔

وانکو کے فلسفے کا سب سے اہم نقطہ یہ ہے کہ وہ تاریخ کی دائروی فطرت پر یقین رکھتا ہے۔ یہ فنی گنس ویک کی وہ سچائیاں ہیں جن کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔ اسی وجہ سے اس کتاب میں بھی واقعات بار بار نمودار ہوتے ہیں۔ وہ دہرائے جاتے ہیں وہ بار بار ہوتے نظر آتے ہیں۔

وانکو نے زبان کے آغاز کے نظریے کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی تھی کہ بادل کی گرج خدا کی آواز ہے ابتدا میں آدمی گونگے تھے۔ ان کی واحد زبان ان کی حرکات تھیں، لیکن انہوں نے بادل کی گرج سے پیدا ہونے والی آواز کی نقل کرنے کی کوشش کی۔ ان کے پہلے الفاظ ہکلائے ہوئے سے تھے جیسے بادل ہکلاتا ہے۔ فنی گنس ویک میں ہم ان سے Jute اور Mutto کی شکل میں ملتے ہیں۔

وانکو کہتا ہے کہ گونگے غیر واضح آوازوں کو گا کر ادا کرتے ہیں اور ہکلانے والے گا کے اپنی زبان کو ادا کرنا سکھاتے ہیں۔ جدید علم نفسیات کے مطابق ہکلانا احساس گناہ کی علامت ہے۔ جوائس کہتا ہے کہ خدا سب سے بڑا خالق ہے۔ وہ اس وقت ہکلاتا ہے جب بادل گرجتے ہیں۔ یعنی وہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ اسے اس کا احساس ہے کہ اس نے گناہ کیا ہے یا اس سے گناہ سرزد ہوا ہے۔

پہلے گناہ کا الزام خدا پر عائد کرنا فنی گنس ویک کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ جوائس نے مذہبیات کا مطالعہ Jesuit اساتذہ کے تحت کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کیتھولک عیسائیت کے مطابق ایک طاقت ور خدا کے تحت چل رہے نظام میں درد کی موجودگی کے مسئلے کا حل ابتدائی گناہ کے تصور میں ہی پایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جوائس نے اس گناہ کو خدا کے سر تھوپ دیا۔

وانکو کے مندرجہ ذیل اقوال کا فنی گنس ویک کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

۱۔ تاریخ ایک بیضوی ردائروی عمل ہے جس کے دوران حالات کی کچھ مخصوص صورتیں بار بار رونما ہوتی ہیں۔

۲۔ ہر ایک دائرے میں ہونے والے واقعات دوسرے دائروں میں بھی رونما ہوتے ہیں۔

۳۔ ایک دائرے کے کردار دوسرے دائروں میں بھی نئے ناموں کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

۴۔ ہر تہذیب کا اپنا خدا ہوتا ہے۔

۵۔ ہر خدا اپنے سائکل یا دائرے کے از سر نو آغاز کے لیے پھر وہی بنیادی گناہ کرتا ہے جس پر تخلیق کائنات کا انحصار ہوتا ہے۔اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تخلیق ہی دراصل بنیادی گناہ ہے۔

وائکو نے زبان کی جن تین قسموں کا بیان کیا ہے وہ سب کی سب فنی گنس ویک میں برتی گئی ہیں۔وائکو کا خیال تھا کہ ابتدا میں الوہی ذہنی زبان تھی جس کا اظہار خاموش مذہبی تقریبات کے دوران حرکات کے ذریعے ہوتا تھا۔ایسا کرنا ضروری تھا کیوں کہ اس وقت الفاظ پر مشتمل زبان انسان کے پاس نہیں تھی۔

زبان کی دوسری قسم تشہیر شجاعت تھی۔جو اسلحے کے ذریعے اظہار پاتی تھی۔زبان کی یہ قسم فوجی نظم وضبط میں باقی رہی۔تیسری قسم وہ زبان ہے جو ہم سب بولتے ہیں یعنی الفاظ کے ذریعے اظہار کو ممکن بنانے والی زبان۔

یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ جوائس کسی ایک مفہوم کے انتقال کی کوشش کرتا ہے۔فنی گنس ویک کے ہر لفظ کے کم سے کم دو معنی ضرور ہیں۔

جنگ جو خاندانوں کے کارناموں کی تاریخ سے حاصل کردہ موضوعات کو بھی جوائس نے اس میں بار بار پیش کیا ہے۔اور اس کے حوالے اکثر اس وقت دیئے جاتے ہیں جب ذرہ بکتروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جوائس نے فنی گنس ویک کی تشکیل کے لیے متعدد مآخذ سے استفادہ کیا۔خصوصاً اس نے ایڈگر کیونٹ Edgar Quinet نکولاس آف کوسا Nicholas of Cusa برونو Giordano Bruno فرائڈ اور یونگ سے استفادہ کیا۔اس کے ساتھ ہی ساتھ جیمز ہاگ James Hugg لیوی بروہل Levy Bruhl اور آرتھر سائمن سے بھی مدد لی۔

جوائس اور برونو دونوں اضداد کی بیک وقت موجودگی پر یقین رکھتے تھے۔اس نظریے کو جوائس نے بڑی چابک دستی سے فنی گنس ویک میں استعمال کیا۔جہاں Butt اور Taff جیسے لڑاکو جوڑے کو ایک ہی انسان کا روپ اختیار کرتے دکھایا جاتا ہے۔کیونکہ وہ ایک دوسرے کے مرادف ہیں۔برونو کے خیال کے مطابق جو سچ ہے اور جس کا امکان ہے دونوں ابدیت میں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں۔اسی سے جوائس یہ مفروضہ اخذ کرتا ہے کہ تاریخ ادب اور اصناھیات میں پیش گئے واقعات اور کردار برابر کی جوازیت کے حامل ہیں۔ چنانچہ ماریا مارٹن،ہملٹ اور ڈیوک آف ولنگٹن ایک ہی طرح کے کردار ہیں۔برونو کا یہ بھی خیال تھا کہ ہر چیز اپنے اندر کل کا روپ بھی رکھتی ہے۔اس سے شاید اس کی مراد یہ تھی کہ کائنات مختلف وجودی اجزا سے مل کر بنی ہے۔لیکن ہر وجود اپنے اندر پوری کائنات بھی رکھتا ہے۔یہ نظریہ قرون وسطیٰ میں عام تھا۔اس سے اس بدیہہ کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے کہ فنی گنس ویک نے بھی فنی گنس ویک کے ڈھانچے کو متاثر کیا۔اس کا دعویٰ تھا کہ

یہاں چھوٹے سے چھوٹے سے لے کر بڑے سے بڑے تک جو خدائی وجود موجود ہیں وہ سب کے سب سوائے آخری وجود کے لگاتار بدل رہے ہیں۔ صرف بڑے یا چھوٹے ہونے کی صورت میں نہیں بلکہ ایک دوسرے کی جگہ لینے کی صورت میں بھی اس سے ہمیں فنی گنس ویک کے کرداروں اور الفاظ کے برتاؤ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ جہاں ہر حصہ ہر وقت اپنا وجود اور اپنا تشخص بدلنے کے لیے کوشاں نظر آتا ہے۔

ویک میں برونو کا نام سو سے زیادہ بار لیا گیا ہے۔ یہ سعادت کسی دوسرے فلسفی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اسے ڈبلن کی ایک کتاب گھر کی شخصیت کے طور پر بھی پیش کیا گیا ہے جس کا نام Brown and Nolan ہے۔

ویک کے پلاٹ میں ہزاروں نام جن کا تعلق انسانوں، دریاؤں، پیڑ پودوں سے ہے برتے گئے ہیں۔ اسی طرح کچھ پراسرار ہندسوں کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مشہور قول ہے کہ کچھ ہندسے جادو کی خصوصیات رکھتے ہیں۔ رنگوں کے متعلق توہمات کو بھی اس میں جگہ دی گئی ہے۔ سیکڑوں کتابوں کا ذکر ہے۔ مقدس انجیل اور قرآن پاک کی آیتوں کو برتا گیا ہے۔ کیمیا گری، جادوگری، نجوم عمل توجہ اور اسی طرح کے دوسرے علوم سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود ابھی بہت سے مآخذ پردۂ خفا میں ہیں۔ ان تک لاکھ کوشش کے باوجود رسائی حاصل نہیں ہوسکی ہے۔

پلاٹ کی ترتیب خواب کے عمل سے پوری طرح مشابہت رکھتی ہے۔ جس طرح خواب میں رونما ہونے والے واقعات میں کوئی منطقی ربط تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اس میں بھی واقعات، حالات، نام، اشیا بغیر کسی منطقی ربط کے گزرتی چلی جاتی ہیں۔

جادو یا نجوم میں جوائس کی دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس زمانے میں اس کی شخصیت تربیت کے مراحل سے گزر رہی تھی ڈبلن میں یہ بحث مباحثہ کا خاص موضوع تھا۔ بہت سے مشہور ادیب جو اس وقت وہاں مقیم تھے وہ Cabbala جیسے موضوعات میں خاص دلچسپی لے رہے تھے۔ ساتھ ہی علامت نگاری کی تحریک میں بھی جو فرانس سے وہاں پہنچی تھی۔ جوائس کے زمانے میں یونیورسٹی کے سبھی طالب علم آرتھر سائمن کے عاشق تھے۔ جوائس بھی یقیناً سائمن کو پسند کرتا تھا اور اس نے اس کی تخلیقات کو بڑے غور سے پڑھا بھی تھا۔

سائمن ہی نے جوائس کی پہلی کتاب Chambe Music کو چھپوانے میں مدد دی۔ اس کے لیے جوائس اس کا ہمیشہ احسان مند رہا۔ سائمن نے The Joyce Book کے لیے اپی لوگ بھی لکھا۔

اس اپی لوگ میں سائمن نے جوائس کے اسلوب کا میلارمے سے موازنہ کیا۔ سائمن کی کتاب The

Synbolise Movement سے ہی جوائس کو وہ فارمولا بھی ملا جسے اس نے فنی گنس و یک میں استعمال کرنا تھا۔ یعنی پہیلی سے شروع کرو اور پھر اس کو سمجھنے والی کلید کو تیار کرو۔

ناول میں کردار نگاری کی بھی کوئی شعوری کوشش نہیں کی جاتی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہاں وہ ممکن ہی نہیں ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ہزاروں کردار تھرکتے چلے جاتے ہیں۔ بعض تو محض سایوں کی طرح دیواروں پر سے گزر جاتے ہیں۔

جہاں تک زبان کا تعلق ہے اس نے ناول میں نئی زبان تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ جوائس نے اس سلسلے میں مکمل فلفسیانہ نظام بھی تشکیل دینے کا کام انجام دیا ہے۔ جسے اس نے خود اپنے الفاظ میں روزمرہ زندگی کی ایک بڑی اسطور کا نام دیا ہے۔

پونڈ کے اس قول پر اسے پورا یقین تھا کہ اچھے ادب سے مراد ایک ایسی زبان ہوتا ہے جس میں انتہائی درجے تک معنی ٹھونس دیئے گئے ہوں۔ ویک میں لسانی اعتبار سے جوائس یہی سب کچھ کرتا نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ ہماری طبیعت مکدر ہونے لگتی ہے۔ جوائس نے یہ سب کچھ ان نظریوں سے متعلق جاری ہونے والے اعلانیوں کے زیر اثر کیا۔ جو اس دور میں مختلف رجحانات کے سلسلے میں ہر وقت سامنے آ رہے تھے۔ خصوصاً وہ رجحانات جو مصوری کی دنیا میں انقلاب پیدا کر رہے تھے۔

اس فن پارے کی تشکیل کے سلسلے میں وانگو کے علاوہ جوائس نے جن دوسرے مآخذ سے استفادہ کیا ان سے کچھ کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا۔ سہولت کے لیے یہاں انہیں موضوعات کے اعتبار سے مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔

کائنات کا ڈھانچہ

۱۔ یہاں بے شمار دنیائیں آباد ہیں۔ (برونو، کلی)

۲۔ ابہام ہر لفظ کا مقدر ہے (فرائڈ) اور ہر لفظ کی یہ فطری عادت ہے کہ وہ دوسری حالت میں پھسل جائے (برونو)

۳۔ کردار الفاظ کی طرح نہ صرف ہر دور میں منتقل ہو جاتے ہیں (وانگو، برونو) بلکہ وہ اپنی شخصیت کو بھی ایک دوسرے سے بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (نکولاس آف کوسا)

اعداد و شمار

۱۔ اتحاد اور اختلاف دو متضاد حالتیں ہیں، لیکن ہر ایک دوسرے کا روپ اختیار کرنے کی کوشش میں رہتی

ہے۔ (نکولاس آف کوسا)

۲۔ دوییت سب سے زیادہ مخصوص قسم کی کثرت ہے۔ ایک قسم کی دو چیزیں اس قسم کی سبھی چیزوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ (لیوی بروہل)

۳۔ ہندسوں کی جادوئی نہ کہ ابی اہمیت ہوتی ہے (دی کبالا) ایک سے بارہ تک کے ہندسے کچھ کرداروں یا کرداروں کے گروہوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ کچھ ہندسے جیسے ۲۲، ۱۱ کی خالص جادوئی اہمیت ہے۔

مذہب

۱۔ پہلا گناہ خدا نے کیا تھا یہ محض عمل تخلیق ہے۔ (برونو)

۲۔ ہر تہذیب کا اپنا Jove ہوتا ہے (وائکو)

۳۔ ہر خدا ابتدائی گناہ جس پر تخلیق کا دارومدار ہے دوبارہ کرتا ہے تاکہ اپنے سائکل کو نئے انداز سے شروع کرے۔

اسلوب

۱۔ ہر لفظ کو انتہائی حد تک معنیٰ سے معمور کرنا چاہیے۔ (پونڈ)

۲۔ ہر زبان کا مقصد ہے کہ وہ موسیقی کی صورت اختیار کرے (پیٹر)

۳۔ چونکہ کتاب ایک کل کا درجہ رکھتی ہے اس لیے سب حصوں کو ہم آہنگ ہونا چاہیے۔

زبان

۱۔ ہر چیز کا اظہار ممکن ہے۔ (گاشے)

۲۔ ہکلانے کا عمل احساس گناہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ (جوائس، روائکو)

۳۔ بادل کی گرج جو بذاتِ خود ہکلانے کی ایک قسم ہے احساس گناہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ (جوائس، روائکو)

☆☆

آصف فرخی

باتوں سے افسانے تک

افسانے کی بھی کیا بات ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے اور افسانہ ہو جاتی ہے۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ آخر وہ کون سی بات ہے جس کا افسانہ بن جاتا ہے؟ اس ایک بات سے افسانے میں محاورہ کیوں کر قائم ہوتا ہے؟ اور پھر زندگی کی اچھی اور بری، بھدی اور کومل، بے تحاشا باتوں کے رس جس میں بسا ہوا، افسانہ کس طور بن جاتا ہے کہ دنیا اس کی رگوں میں چلتی ہے، باتیں اس کے اندر دھڑکتی ہیں۔ افسانے کی یہی تو باتیں ہیں۔

مگر ایک بات اور ہے۔ باتیں بنانے کے معاملے میں صحافی لوگ ادیبوں سے کہیں آگے نکل گئے ہیں۔ ملگجے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے آج کل کے ادیب بسا اوقات ایسی مبہم، دقت طلب اور ذاتی علامات کے تانے بانے سے بنی ہوئی تحریریں سامنے لاتے ہیں، جب کہ اطلاع وخبر کا سامان مہیا کرنے والی بعض صحافیانہ تحریریں ایسی چست وچالاک، تیز طرار نظر آتی ہیں اور عبارت ایسی گٹھی ہوئی ہوتی ہے کہ اسلوب کی چاٹ کا بھی مزہ آ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے خوش ونت سنگھ میرے چنیدہ وپسندیدہ لکھنے والوں میں سے ہیں، اس حد تک کہ ان کی By-line جہاں نظر آتی ہے، اولین فرصت میں پڑھنے کے لیے سنبھال کر رکھ لیتا ہوں۔ اسی لیے جب ان کے تمام افسانوں کا مجموعہ ہندوستان سے چھپ کر آیا اور کراچی میں کتابوں کے چور بازار میں دگنے داموں بکنے لگا گویا کوئی رسیلا، ترغیب بھرا نسخہ ہو، تو مجھے بھی اس کے پڑھنے کا لپکا ہوا۔ اس کتاب کے مشمولات سے واقفیت سے پہلے ہی خوش ونت سنگھ کی افسانہ طرازی کا سکّہ بیٹھ چکا تھا۔ ان کی صحافیانہ رپورٹیں اور اخباری کالم پڑھنے والا کون شخص ان کی اس قوت کا قائل ہوئے بغیر رہ سکتا ہے؟ مثلاً ۱۹۶۸ء میں بہار کی غذائی قلت اور دیہات کی مفلوک الحال پر وہ تحریر پڑھ کر دیکھیے جو ''خوش ونت سنگھ کا ہندوستان'' میں شامل ہے۔ ماحول کی حساس تصویر کشی، مصنف کے اپنے نقطۂ نظر کی موجودگی، واقعات کی تفصیلات کے پیچھے سیاسی اور سماجی حالات کی جکڑ بندی، بھوک کے مارے دیہاتی اور شہر میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے بے حس مردوزن، تضادات ان کہی باتوں کا احساس...... افسانہ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے؟ (کرشن چندر کے ''ان داتا'' میں، جس کی تعریف کے پل ممتاز شیریں تک نے باندھے ہیں، اس کے سوا اور کیا بات ہے، اگر کوئی بات ہے؟) ایسی تحریروں کو پڑھ کر میں دُبدھا میں پڑ جاتا ہوں...... ایسی گمبھیر اور

المناک صورت حال سے لوگوں کو واقف کرانے کے لیے کیا اب بھی افسانے لکھے جا سکتے ہیں؟ خوش ونت سنگھ اور بعض دوسرے اخبار نویس جب یہ کام بہ طریق احسن کر سکتے ہیں تو کیا افسانے کو کوئی اور کام نہیں کرنا چاہیے؟ کرشن چندر اور ممتاز شیریں چاہے کچھ بھی کہیں، میں تو جیمز جوئس کا ہم خیال ہوں کہ ''ادب کو کبھی بھی غیر معمولی پن کے بارے میں نہیں لکھنا چاہیے، اس لیے کہ یہ صحافیوں کا حصہ ہے۔'' اور خوش ونت سنگھ جیسے صحافی لوگ یہ ثابت کر چکے ہیں کہ یہ علاقہ ان کے تصرف میں ہے، وہ ایسی باتوں سے بہتر طور پر نمٹ سکتے ہیں۔ زندگی کی بے حد معمولی اور بہ ظاہر بے رنگ باتیں افسانے کے لیے رہ گئی ہیں۔

رخوش ونت سنگھ کے افسانوں کے مرحلے سے تو میں بہ خوبی گزر گیا۔ افسانے کی ماہیئت کے بارے میں جو مضمون مگر انہوں نے لکھا ہے، اور دیباچے کے طور پر اس کتاب میں شامل کر دیا ہے، اس نے مجھے بہت حیران کر دیا۔ جی تو چاہتا ہے کہ اپنے اس پسندیدہ مصنف کی خدمت میں عرض کروں:

تم ہو بت پھر تمہیں پندار خدائی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

پریشانی مجھے یہ ہے کہ اس مضمون میں رخوش ونت سنگھ ابتدا اس دعوے سے کرتے ہیں کہ کون کہتا ہے کہ افسانہ مر گیا، ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس کی حالت مغربی افسانے کی موجودہ حالت سے بہتر ہے اور اس کے ثبوت میں جن دو افسانوں کو پیش کرتے ہیں وہ دونوں افسانے اردو کے ہیں: منشی پریم چند کا 'استعفیٰ' اور منٹو کا 'ٹو بہ ٹیک سنگھ' مگر پھر وہ اس برتری کی وجہ بھی بیان کر دیتے ہیں:

> ''جس وجہ سے افسانہ مغربی دنیا میں متروک ہوا جا رہا ہے اور ہندوستان میں فروغ پا رہا ہے وہ یہ ہے کہ ایک صنف کے طور پر افسانہ بعض قواعد و ضوابط کی پابندی کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہندوستانی مصنف ان قواعد کی پابندی کرتے ہیں جدید یورپی اور امریکی مصنف ایسا نہیں کرتے۔''

میں تو سمجھے بیٹھا تھا کہ تیسری دنیا کے ممالک میں، جن میں برصغیر بھی شامل ہے، افسانے کے فروغ کی کچھ اور وجوہات ہیں، جن میں ان ممالک کی اپنی صورت حال، کہانی کہنے کی پرانی روایت کی عطا کردہ حیات اور قوت، موضوعات اور صنف کی باہمی مناسبت اور اس طرح کی باتیں ہیں۔ رخوش ونت سنگھ نے اپنی صحافیانہ مہارت سے کام لیتے ہوئے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ جس چیز کو ہم فنی معجزہ یا جادو کا تماشا سمجھ رہے ہیں، وہ دراصل بعض سیدھی سادی تراکیب کا مرہون منت ہے۔ میری پریشانی بھی ان ناظرین کی کوفت اور مایوسی ہے جنہیں کھیل کے وقفے میں یہ پتا چلے کہ وہ اب تک جس عمل پر تالیاں بجا بجا کر داد دے رہے ہیں، وہ نظر کا

دھوکا ہے، ہاتھ کی صفائی...... جو تھوڑی سی پھرتی اور بعض بنیادی اصولوں کی گرفت سے حاصل ہو جاتی ہے اور بس! میری پریشانی کو اس بات سے بھی تسلی نہیں ہوتی کہ مضمون کے انجام تک آتے آتے خوش ونت سنگھ بھی بہت پریشان نظر آرہے ہیں، اس تماشاگر کی طرح جس کا بھید بھرم کھل گیا ہے۔

موئے کو ماریں شاہ مدار۔ یہ تماشاگر ہمیں وہ ترکیبیں بھی پڑھا دینا چاہتا ہے جن کی مدد سے رسّی سانپ کی طرح چل سکتی ہے۔ پانچ موٹے موٹے اصول، جن کی تلخیص میں اسی طرح کرسکتا ہوں جس طرح مضمون میں منٹو کے افسانے کی ہوئی ہے:

ا۔ مختصر افسانے کو فی الواقع مختصر ہونا چاہیے (ساڑھے تین ہزار الفاظ کی حد کی صراحت بھی کردی گئی ہے۔)

۲۔ افسانے کو ایک واقعے یا واقعے کے ایک سلسلے کے گرد تعمیر ہونا چاہیے جو ایک موضوع یا ایک کردار کی تصویر کشی، یا اس ایک کردار اور دوسروں کے درمیان تعلق کو اجاگر کرے۔

۳۔ افسانہ فنتاسی بھی ہوسکتا ہے، اس کے کردار اور واقعات مصنف کی مرضی کے مطابق تخیلاتی ہوسکتے ہیں بشرطیکہ ان میں سچ کا سا احتمال ہو اور ایک 'پیغام' ہو۔

۴۔ افسانے میں ایک واضح ابتدا، وسط اور انجام ہونا چاہیے۔

۵۔ یہ ضروری ہے کہ افسانے میں اختتام پر پہنچتے پہنچتے بچھو کی دم میں چھپے ہوئے ڈنگ کی طرح ایسے پیچ وخم ہوں کہ کہانی کا نچوڑ ان میں آجائے۔

اس پورے ٹکڑے میں نسخۂ ترکیب استعمال کا سا انداز ہے، جس میں ایک قطعیت موجود ہے کہ اس نسخے پر نہ پکایا تو ہانڈی ادھ پکی رہ جائے گی۔ رخوش ونت سنگھ یہ تو مان لیتے ہیں کہ یہ قواعد ذاتی اور کچھ مشتے از خروارے قسم کے ہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ اسی جملے کے آخر میں...... بچھو کے ڈنک کی طرح...... یہ گھماؤ بھی پیدا کردیتے ہیں کہ دنیا کے بہترین افسانہ نگار شعوری یا لاشعوری طور پر انھی اصولوں کی پابندی کرتے چلے آئے ہیں۔ ان کا یہ فقرہ جاتے جاتے مجھے ڈنک مار گیا۔ سردار کا ڈنک! اس ڈنک کی کاٹ کا اندازہ اس وقت ہوا تھا جب رتن سنگھ کے افسانے میں گاؤں کے اس بچپن کا حال پڑھا تھا جسے وہ پاکستان میں چھوڑ گئے:

> ''بچپن میں مجھے کبھی بچھو نے کاٹا تھا۔ میری ساری زندگی لے لو اور اس بچھو کا ڈنک واپس دے دو۔''

مگر میں اس بچھو کو چٹکی سے پکڑ کر دور پھینک دوں گا۔ اردو کے افسانہ نگاروں پر اسی طرح جذباتی ہوتا رہا تو ''دنیا کے بہترین افسانہ نگاروں'' کا کیا ہوگا، اس مضمون میں جن کا ذکر مجھے بدحواس اور اعصاب زدہ

کر دینے کے لیے کافی ہے۔اس گھبراہٹ پر قابو نہ پایا تو زبان لڑکھڑانے لگے گی، رہوارِ تخیل بدلگامی پر اتر آئے گا، کردار شیخ سدو بن کر سر پر سوار ہو جائیں گے، نیند اڑ جائے گی، دل ڈوب جائے گا، تھوڑا بہت لکھنے سے بھی جاؤں گا...... دنیا کے بہترین افسانہ نگار......! کیا ان ستاروں کو چھو لینے کی حسرت ہی میں سانس اکھڑ جائے گی، منکہ مسمّی اردو کا افسانہ نگار ہوں اور ویسے بھی احساس کم تری کا مارا ہوا ہوں پھر بھی زیرلب 'یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا' قسم کے مصرعے تقویت قلوب کے لیے گنگناتا ہوں اور وارث علوی کی کتابیں تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا ہوں تا کہ دفع بلیات رہے، خواب بھی لڑتے بھڑتے، گتھے متھے نظر آئیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے تبحر علمی کا جی جان سے قائل ہوں اور وہ مضامین پڑھ چکا ہوں جن میں انہوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ افسانہ معمولی صنفِ سخن ہے۔اس لیے یہ شبہ سینے میں سرطان کی طرح پل رہا ہے کہ اردو میں افسانے لکھنے میں مرپٹ کر درجۂ کمال حاصل کیا اور مرجع خلائق بھی ٹھہرے تو کون سا تیر مار لیا، رہے تو وہی تیلی کے تیلی۔ کیا معلوم تھا یہ دن بھی دیکھنا پڑے گا۔اس سے تو بہتر تھا باپ کی نصیحت پکڑتے اور کوئی فن شریف اختیار کرتے۔اب پچھتائے کیا ہووت جب تنقید کی چڑیا چگ گئی کھیت...... مگر ٹھہریے ابھی نہ دنیا ختم ہوئی نہ افسانہ۔خوش ونت سنگھ کا نسخہ تیر بہ ہدف معلوم ہوتا ہے۔پھر وہ انگریزی میں لکھتے ہیں تو ظاہر ہے مغربی ادب وغیرہ کے بارے میں زیادہ جانتے ہوں گے۔کیوں نہ ان کے بیان کردہ قواعد کو رٹو طوطے کی طرح، گھول کر پی لوں، اور جتنے افسانے ہیں سب کو توڑ تاڑ کر اسی سانچے میں ڈال دوں؟ آخر کو افسانہ چٹخے ہوئے انڈے جیسا ہمپٹی ڈمپٹی تو ہے نہیں کہ تنقید کے سارے گھوڑے اور تنقید کے سارے سپاہی اسے دوبارہ کھڑا نہ کر سکیں۔لہٰذا چل میرے منکے ٹمبکٹو۔ جہاں کی بڑھیا وہاں کا تو......

یا پھر شاید بات کذھب ہے، کیونکہ اچھے افسانوں کی مجمع بہت سی مثالیں یاد آ رہی ہیں جو ان قواعد پر پوری نہیں اترتیں۔میں نے اختر شماری تو کی ہے، لفظ شماری نہیں کی، پھر بھی اندازہ ہے کہ جوئس کا ''دی ڈیڈ'' خوش ونت سنگھ کی مقرر کردہ لمبائی سے طویل تر ہے۔سارتر کی ''لیڈر کا بچپن'' ہیمنگوے کی ''کلیمن جادو کی برف''، بونن کی ''سان فرانسسکو کا شہری''، محمد حسن عسکری کی ''چائے کی پیالی'' بھی اس حد سے گزر جاتی ہیں۔ لہٰذا اس حد کا فائدہ معلوم! مگر الفاظ کی کوئی تعداد مقرر کر دینے سے افسانے کی صنفی تعریف کا اہم تر مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ کن خصوصیات کی بنیاد پر افسانے کو کہانی کا ایک واضح روپ سمجھا جا سکتا ہے اور طویل بیانیہ سے ممتاز و ممیز کیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس امتیاز کی بنیاد محض حجم پر نہیں رکھی جا سکتی۔کیا افسانے کو واقعی مختصر ہونے کی ضرورت ہے؟ اردو والے اب افسانے کے ساتھ مختصر کا لاحقہ بالعموم نہیں لگاتے جو انگریزی کی اصطلاح Short Story کا اتباع تھا اور اس سے وہی مراد ہے جو ہندی میں ''کہانی'' اور فارسی میں ''داستان

کوتاہ'' سے مراد ہے یعنی ایک واضح اور متعین ادبی صنف پھر یہی صنف ''مختصر مختصر افسانے'' (Short Short Story) اور ''طویل مختصر افسانے'' (Long Short Story) کی صورت میں بھی لکھی جاسکتی ہے۔ طویل مختصر افسانے اور ناولٹ کے درمیان خط امتیاز کھینچ کر ممتاز شیریں نے اس کو ایک علاحدہ صنف کے طور پر واجب الاحترام قرار دیا ہے۔ الجھاؤ پھر بھی باقی رہتا ہے اور تمام تحریروں کو آسانی کے ساتھ خانوں میں بٹھانا ممکن نہیں ہے۔ ہنری جیمز اپنے طویل قصوں کو Novella کہا کرتا تھا۔ اس اصطلاح کی اصل اطالوی لفظ Nouvelle ہے جو قصے کہانی کے لیے استعمال ہوتا آیا ہے۔ اصناف کے درمیان ایک گھلاوٹ، ایک Flux کی کیفیت ہے، مختلف روایات اور زبانوں کے سفر کے دوران اصطلاحوں میں شدید انتشار ہے جو قواعد کی سختی کے بس میں نہیں آتا۔ خوش ونت سنگھ کے اصول ہوں یا ممتاز شیریں اور ڈاکٹر احسن فاروقی کی اصطلاحات، کہانی کا سیماب وش جوہر ان کی گرفت میں آتے آتے نکلا پڑتا ہے اور مجھے ہنری ڈیوڈ تھورو کی بات زیادہ معقول لگتی ہے..... اور پھر یہ کہ تھورو کوئی افسانہ نگار نہیں تھا:

Not: that the story need be long, but it will take a long while to make in short.

ہم اس Long While میں زندہ ہیں اور جب تک کہانی اپنے آپ کو مختصر نہ کر لے ساڑھے تین ہزار الفاظ ہمیں کہاں تک لے جاسکتے ہیں؟

واقعات اور کردار افسانے کی تعمیر کا جزو ہیں مگر مختلف ماہر فن افسانہ نگاروں کے ہاتھوں اتنی متنوع صورتیں اور طریقے اختیار کرتے ہیں کہ ان کے بارے میں کلیہ سازی، مردہ گھوڑے کی کھال میں بھُس بھرنے کا عمل معلوم ہوتی ہے۔ بعض کہانیوں میں کوئی واقعہ پیش نہیں آتا اور اس واقعے کا پیش نہ آنا ہی کہانی کا تجربہ ہے۔ غلام عباس کی ''آنندی'' میں ان معنوں میں کوئی مرکزی کردار نہیں ہیں جس طرح خوش ونت سنگھ نے شرط رکھی ہے۔ اس افسانے کی کامیابی یہی ہے کہ وہ کسی ایک فرد کا نہیں، پورے شہر کا افسانہ ہے۔ چیخوف کی کہانیوں میں ابتدا، وسط اور انتہا کی پابندی نہیں ہوتی۔ گالزوردی نے کہا تھا کہ چیخوف کے افسانے میں نہ ابتدا ہوتی ہے نہ انتہا بس درمیان ہی درمیان ہوتا ہے کچھوے کی طرح۔ اس اصول کو توڑنے کے باوجود چیخوف افسانے کا اعلیٰ تر معیار ہے۔ دھیمی موسیقی کی طرح سناٹوں میں گم ہوجانے والی اس کی کہانیوں کے آخر میں کوئی بچھو ڈنک نہیں مارتا۔ چیخوف کے ہاں تو جگنو اڑتے ہیں..... ڈنک کے بجائے اپنی دم میں منور لرزشیں لیے ہوئے، جو کائنات کے اندھیرے کا محض ایک نقطہ چند لمحوں کے لیے روشن کر جاتی ہیں۔

مرحوم ابوالفضل صدیقی پرانی وضع کے بزرگ تھے اور اپنے مزاج کے مطابق ایسے افسانے لکھتے تھے جو

جدید تکنیک اور قواعد وضوابط کو یکسر نظر انداز کر دینے کے باوجود مؤثر اور کامیاب ہیں۔ان کی کامیابی کسی اصول کی مرہون منت نہیں۔ بلکہ مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ ایک صنف کے طور پر افسانے کی کامیابی اسی قاعدے اور اصول سے بے نیاز Resilience میں مضمر ہے...... ایک مختصر قطعہ زمین جس میں بیج ڈالنے، تلائی اور گڑائی کرنے اور فصل اگانے کا دارومدار اس کے کاشت کار پر ہے۔ یہ کاشت کار کا کمال ہے کہ اس مختصر قطعے سے کیسی فصل اگاتا ہے۔ابوالفضل صدیقی کے طول طویل قصوں کو تاتیانا ٹولسٹوئیا (سنہرے پورچ پر) یا جین این فلپنر (سیاہ ٹکٹ) یا آج کے کسی اور بین الاقوامی طور پر ابھرتے ہوئے افسانہ نگار کے مقابلے رکھ کر دیکھیے تو اس صنف کے تنوع اور ایک بنیادی مشابہت کا احساس ہوگا، ایسی مشابہت جو زندگی کو دیکھنے کے ایک مخصوص زاویے کی وجہ سے آئی ہے کمپوزیشن کے اصولوں پر کاربند رہنے کی وجہ سے نہیں۔تنوع اور مشابہت کی بہ یک وقت موجودگی سے اس صنف کے امکانات کا دائرہ بنتا ہے۔

امکانات کی تفہیم نو کا یہ احساس، خوش ونت سنگھ کے قواعد سے وفاداری بہ شرط استواری سے معدوم ہونے لگتا ہے۔ان اصولوں پر پابندی کے ادعا سے مجھے ایک اور خطرے کی بو آتی ہے اور یہ اصول حد سے بڑھی ہوئی سادہ بیانی نظر آنے لگتے ہیں۔ان کی وجہ سے افسانہ Trick or treat قسم کی شعبدہ بازی معلوم ہونے لگتا ہے جو مقبول عام رسالوں میں چھپنے والے تجارتی صنعتی مال کے لیے درست سہی، اس افسانے کے لیے یکسر نامناسب ہے جو اپنی اصل میں ادب ہے۔عین ممکن ہو کہ یہ افسانوی مصنوعات، قواعد اور تراکیب کے ذریعے سہل ہو جاتی ہوں مگر ان سے تفریق کرنا بلکہ چھوت چھات برتنا امر لازم ہے۔تجارتی مقاصد کے لیے تیار کیے جانے والے ان افسانوں کی یلغار ادبی افسانے کے لیے شمس الرحمٰن فاروقی کی حمایت اور خوش ونت سنگھ کی دلالت سے زیادہ تشویش ناک بات ہے۔

عوامی تفریح کے اخبار، رسالوں میں افسانے کی فراوانی اس خام خیالی کا سبب ہو سکتی ہے کہ افسانہ لکھنا کوئی بڑی بات نہیں۔خوش ونت سنگھ کے ان اصولوں سے بھی کچھ اس قسم کے خیالات کو تقویت ملتی ہے۔اس خیال کو کہیں زیادہ قطعیت کے ساتھ غلام عباس نے ترویج دی۔ان کا کہنا تھا جو شخص اپنے عزیزوں دوستوں کو طویل خط لکھتا رہا ہو یا لکھ سکتا ہو، وہ تھوڑی سی کوشش سے افسانہ بھی لکھ سکتا ہے۔مرحوم کو خود بھی اس آسانی کی مشکلات کا اندازہ تھا۔اس سلسلے میں سب سے زیادہ معقول بات مجھے امریکی افسانہ نگار رچرڈ فورڈ کی معلوم ہوئی، جس کا مرتب کردہ ۱۹۹۰ء کی بہترین امریکی کہانیوں کا انتخاب حال ہی میں شائع ہوا ہے۔اس انتخاب کے دیباچے ''کہانیوں کا سمندر'' میں اس نے بیان کیا ہے کہ اس انتخاب کی تیاری کے لیے اسے کوئی سوا برس تک افسانوں کی خاصی بڑی تعداد پڑھنا پڑی اور اس دوران اس پر کیا مراحل گزرے۔افسانے کے احیا

یا افسانے کی مقبولیت پر شادیانے بجانے والے پروفیسر نقادوں کے برخلاف فورڈ نے صاف کہہ دیا ہے کہ اس مطالعے کے دوران اس کا سابقہ جن افسانوں سے پڑا، ان میں سے اکثر تو اس قابل ہی نہیں تھے کہ انتخاب کے لیے سامنے رکھے جاتے (یہ الگ بات ہے، کہ وہ کہتا ہے کہ رابطے کا احساس مجھے ان ہی افسانوں اور ان کے لکھنے والوں سے ہوا) یہاں فورڈ نے بڑے پتے کی بات کہی ہے:

''اس میں بحث کی گنجائش نہیں کہ افسانے لکھنا...... بنی نوع انسان کی داستان میں ایک ضمنی سا اضافہ...... ایسا کام ہے جو اکثر لوگ بہت اچھے طریقے سے نہیں کر سکتے۔ مجھے نہیں معلوم کیوں۔ شاید یہ جتنا نظر آتا ہے اس سے زیادہ مشکل ہے، اور عمدہ کہانیاں چھوٹے چھوٹے معجزوں کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔''

اردو کے افسانہ نگار اتنے عرصے سے بنی نوع انسان کی داستان میں ضمنی اور فروعی اضافے کرتے آئے ہیں کہ اب ہمیں پتا چل گیا ہے، بشارتیں ڈاکیے کی طرح دروازے پر دستک نہیں دیتیں اور معجزے خط کے لفافوں میں بند ہو کر نہیں آتے۔ ان کے حصول کے لیے اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اور شاید افسانے کے سلسلے میں یہی بات گرہ میں باندھ کر رکھنے والی ہے۔

☆☆

گابریئل گارسیا مارکیز
عمران شاہد بھنڈر

مابعد جدیدیت: چند معروضات

تحقیق خواہ علم کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتی ہو، ذمے داری اور سنجیدگی کا تقاضا کرتی ہے۔ تحقیقی عمل آسان نہیں ہوتا، تاہم فلسفیانہ تحقیق اور بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ اس میں درپیش مشکلات کا ادراک صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو اس مرحلے سے گزرے ہوں اور جن کی فکری تربیت میں علمیات و منطق نے اہم کردار ادا کیا ہو۔ جب فلسفیانہ تحقیق میں حقائق کو جوں کا توں پیش کرنے کے علاوہ ان کا تنقیدی تجزیہ بھی مقصود ہو تو مشکل افکار کی تفہیم، ان کے درمیان لازمی تعلق، امتیاز، افتراق اور مختلف تناظر میں ان کے متعلقہ یا غیر متعلقہ ہونے کا معاملہ مزید مشکل ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ تحقیق اور تنقید حتیٰ کہ فلسفے کے بارے میں کہانیاں لکھنے والوں اور شعراء کے علاوہ وہ لوگ بھی رائے دینے کے لیے تیار رہتے ہیں جو اس مخصوص موضوع کے بارے میں یا تو بالکل ہی کچھ نہیں جانتے یا پھر ان کا علم بہت ہی محدود ہوتا ہے۔ آزادانہ تفکر کے نتیجے میں پروان چڑھنے والے فلسفیانہ خیالات کے بارے میں اذعانی طبع کے ادیبوں سے رائے لی جاتی ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسی قسم کے اذہان رکھنے والے ہی وہ لوگ ہوتے ہیں، جو معیاری مطالعے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔ مغربی ممالک میں جہاں شاعری زوال کا شکار ہوئی ہے تو وہاں تحقیق کی اہمیت میں بہت اضافہ ہو چکا ہے، اگر تنقید و تحقیق کی اہمیت دریافت کرنی ہے یا مختلف معاشروں پر اس کے اثرات کا جائزہ لینا ہے تو ابتدا مغربی ناقدین اور محققین کے افکار کے جائزے سے کرنی چاہیے نہ کہ اردو کے مجہول ناقدین کے چربہ شدہ افکار سے! ہمارے سامنے وہ معاشرے رہنے ضروری ہیں جو تحقیقی عمل کے نتیجے میں ارتقا پذیر ہوئے اور وہ محقق جن کے فکری نتائج لوگوں کے اذہان اور معاشرتی عمل پر اثر انداز ہوئے ہیں۔

تنقید، تخلیق اور تحقیق تین مختلف میدان ہیں۔ ''تخلیق'' کی برتری کے خیال کی جڑیں اٹھارویں اور انیسویں صدی کی رومانیت میں پیوست ہیں، جنھیں بیسویں صدی کے آغاز میں ہی کھوکھلا کر دیا گیا تھا۔ ''تخلیق'' اب صرف اردو سے وابستہ چند لوگوں کا نفسیاتی مسئلہ ہی رہ گئی ہے۔ روس میں انقلاب کے بعد ''تنقیدی حقیقت نگاری'' اور فرانس میں انیس سو پچاس کے بعد تنقیدی نظریات کے معاشرے پر گہرائی سے اثر انداز ہونے کے رجحان کی شناخت ہو چکی تھی۔ عہد حاضر میں تنقیدی نظریات نے جس طرح لوگوں کو ایک مختلف فکری جہت عطا کی ہے اس سے تنقید کی اہمیت

میں حد درجے اضافہ ہوا ہے۔ آج فلسفے وتنقید سے جنم لینے والے خیالات سیاسی وسماجی علوم کا حصہ بن چکے ہیں۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ادب وتنقید سے ظہور کرتی ہوئی ڈی کنسٹرکشن کی تھیوری کے گہرے اثرات سیاسیات، سماجیات، علم الانسان حتیٰ کہ سائنس پر بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ژاک دریدا نے ادب سے ماخوذ تصور "To Come" کو ''جمہوریت'' پر لاگو کر دیا۔ لہذا وہ لوگ جنھوں نے ادب برائے ادب کا واویلہ کیا ان کی کم عقلی عیاں ہوگئی کہ اب صرف شور مچانے یا بڑے بڑے دعوے کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ علوم کا دروازہ کسی نقاد پر تو بند ہو سکتا ہے، اور وہ اس قسم کے مہمل دعوے کر سکتا ہے، تاہم علوم کو علوم کے لیے شجرِ ممنوعہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ علوم باطنی طور پر مربوط ہوتے ہیں، جو اپنی تخصیصی حیثیت کے باوجود ایک دوسرے سے باطنی ربط رکھتے ہیں۔ اگر مابعد جدید فکری مباحث کو ان کے حقیقی پسِ منظر میں پیش کیا جائے تو مغربی و امریکی علمیاتی اور ادبی رجحانات کے لوگوں کے اذہان پر اثر کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے، خواہ ان کے خیالات بعض سطحوں پر فسطائیت ہی کی عکاسی کیوں نہ کر رہے ہوں۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ مابعد جدیدیت کے نظری مباحث نے بعض مقامات پر عقلیت کے اس روشن خیالی پروجیکٹ کو سخت چیلنج سے دوچار کر دیا ہے جس کی ابتدا رینے ڈیکارٹ سے ہوتی ہے اور انتہا جرمن فلسفی فریڈرک ہیگل کے فلسفے پر! مثال کے طور پر فلسفے میں تعقل کا عدم استحکام اور ترکیبی قضایا کا بحران سامنے آچکا ہے۔ مابعد جدیدیت کے بنیادی عدم تعقلات جیسا کہ ادب میں معنی کا التوا، مصنف کی لامرکزیت اور لامرکزیت کا یہی تصور سماجیات، ثقافت اور ریاست کے کلیت پسندانہ کردار کے بحران کو نمایاں کر چکا ہے۔ جس تصور کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا ہے وہ بلاشبہ مرکزیت اور مآخذ کا تصور ہے، دیگر تمام تصورات اسی سے جڑے ہوئے ہیں۔ فلسفے میں جب اس کو نقصان پہنچتا ہے تو تعقل میں عدم استحکام کی وجہ سے ترکیب کا عمل مشکل تر ہو جاتا ہے جو علمیات کے سوال کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ ادب اور شاعری میں مرکزیت کے انہدام کا مطلب مصنف و شاعر کے معنی پر دعوے کے تصور کا خاتمہ ہے۔ جب مصنف بطور مرکز موجود ہی نہیں ہوگا تو خواہ وہ علمیات کی بحث میں خارجیت کی تخفیف کا عمل ہو یا ادب میں معنی کا تعین کیے جانے کا عمل، اس کا کردار فیصلہ کن نہیں رہے گا۔ اس کے علاوہ جب ریاست پر لامرکزیت کے تصور کا اطلاق کیا جائے گا تو اس کے کلیت پسندانہ کردار کو زک پہنچے گی۔ ریاست، مصنف اور ہر قسم کے بڑے بیانیے کا آفاقی کردار ختم ہو جائے گا۔ یہ وہ خیالات ہیں جو فرانسیسی فلسفی ژاک دریدا اور ادبی نقاد رولاں بارتھ کے افکار میں موجود ہیں۔ اور جنھیں بعد ازاں ایک اور فرانسیسی فلسفی لیوتارڈ نے ۱۹۷۹ میں ''ترقی یافتہ معاشروں'' کی ثقافتی اور علمیاتی سطحوں کا تعین کرتے وقت اختیار کر لیا تھا۔ بڑے بیانیے پر تشکیک سے سیاست میں مائکرو سیاست کے تصور کا آغاز ہوا، مگر دریدا کے لاتشکیلی خیالات سے مائکرو سیاست کو بھی دھچکا لگا، کیونکہ اصل مقصد اس تعین کو چیلنج کرنا تھا جو کلیت کے تصور کے وسیلے سے ممکن تھی۔ مائکرو سطح پر بھی مرکزیت کے تصور کا انہدام ممکن نہ تھا، اس کے بغیر معنی کے التوا کے

بارے میں سوچنا بھی محال تھا۔

ادب میں شیکسپیئر، گوئٹے، ملارمے سمیت وہ تمام ادبا و شعرا اس مابعد جدید تصور کی زد پر تھے جن کا بحیثیت ایک ''بڑا بیانیہ'' حوالہ استعمال کیا جاتا تھا۔ مغرب میں مابعد جدیدیت کے بعد شیکسپیئر کی اہمیت کم ہو چکی تھی، سوائے ان چند ''قدامت پسندوں'' کے جو ابھی تک ادب میں ''ویلیو ججمنٹ'' پر یقین رکھتے تھے، مگر اس کے باوجود شعری و ادبی متون کا تجزیہ یہ ثابت کر دیتا تھا کہ جس معنی کی تشکیل کی کوشش شعرا اور ادبا نے کی ہے اس کی حیثیت محض ایک افسانے جیسی ہے اور وہ ''تخلیق کار'' کے اپنے ذہن کے علاوہ کہیں موجود نہیں ہے۔ اس طرح اعلیٰ ہونے کا تصور محض ایک طرح کی آئیڈیولاجیکل تشکیل بن جاتا ہے۔ کوئی ازلی و ابدی سچائی نہیں ہے، اس فکری پس منظر کے تحت نئے عہد کا تقاضا تھا کہ شیکسپیئر کی بطور ایک ''اعلیٰ ادیب'' کے تحت قائم ہوئی ''باطل'' شناخت کو ختم کیا جاتا تاکہ ''بڑے بیانیے'' کے حوالے کے تحت کسی بھی فن پارے کو نہ پرکھا جا سکے۔

مابعد جدیدیت کی نظری جہات کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں کلی طور پر تجریدی خیالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ مغربی ثقافتی نقادوں نے اسے مغربی معاشرے کی ثقافتی حالت سے تعبیر کیا ہے۔ ہر ثقافت ایک ٹھوس سماجی پس منظر رکھتی ہے، جبکہ معاشرتی حالت ایک واضح شکل رکھتی ہے، جو کسی ایسے ابہام کی عکاسی نہیں کرتی کہ جس کی ہر تشریح کو درست تسلیم کرلیا جائے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ فرانس میں مختلف طبقات تشریحات کا اپنا اپنا معیار قائم کرلیں مگر اس کے باوجود ایک واضح شکل ایسی ہوگی جو مکمل فرانسیسی معاشرے کی عکاسی کرے گی۔ ہمارے ہاں المیہ یہ ہوا ہے کہ کبھی ''نقادوں'' نے خیالات کو مستعار لیتے وقت ان کے پسِ منظر کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ اردو میں مابعد جدیدیت کو ایک مخصوص مغربی تناظر کی اہمیت کے پیش نظر متعارف کرایا جا سکتا تھا، مگر ایسا کسی نے نہیں کیا۔ بعض جلد بازوں نے تو مابعد جدید تنقیدی نظریات کا اطلاق بھی اردو ادب پر کرنا شروع کر دیا، یہ تجزیہ کیے بغیر کہ ان نظریات کا اطلاق کیوں ضروری ہے؟ مغرب میں مابعد جدیدیت کے نظری مباحث کی بنیاد پر کئی نعرے بلند ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند بنیادی نوعیت کے نعروں میں آئیڈیالوجی کا خاتمہ، انسان کا خاتمہ، تاریخ کا خاتمہ، ادب کا خاتمہ، مصنف کا خاتمہ، معنی کا خاتمہ، موجودگی کا خاتمہ بلکہ یہاں تک کہ خاتمے کے خاتمے کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ ادب کی افضلیت ختم ہوگئی، شاعر کو تخلیق کار گردانے والے رومانوی خیال کا خاتمہ ہوگیا۔ نتیجتاً شاعر کو بھی مختلف ٹکڑے اکھٹے کر کے پیش کرنے والا مداری گر تصور کرلیا گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ جن فلسفیوں اور نقادوں نے وہ تضادات تلاش کیے اور جو ان ماورائی نوعیت کے تصورات کے خاتمے کا اعلان کر رہے تھے، وہ سب فلسفی اور ناقدین غیر معمولی طور پر ذہین تھے۔ ان سے برسرِ پیکار ہونا شعرا اور کہانی کاروں کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس حوالے سے مارکسیت کے نقطہ نظر سے لوئی التھیو سے، پیئر ماشیرے، گولڈ مان کے نام اہم ہیں۔ جن مفکرین کے خیالات مابعد ساختیات کے نظری مباحث میں ابتدا ہی سے

سرایت کر گئے تھے، ان میں ژاک دریدااور رولاں بارتھ کے نام انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ تاہم اردو کے مترجمین اور شارحین کے لیے یہ دیکھنا لازمی تھا کہ مغرب میں مرکزیت، ماخذ، مصنف اور معنی کے خاتمے جیسے خیالات سے کیا مراد تھی اور ان کا تعلق اس مغربی معاشرے سے کس نوعیت کا تھا جن میں ان خیالات کا ظہور ہوا تھا۔ اور پھر یہ کہ ہمارے ہاں ان وسیع سطح پر ہونے والے اعلانات کا کیا جواز تراشا جانا ضروری تھا؟ افسوس کہ ہمارے ہاں اس سطح کی کوئی تحقیق سامنے نہیں آتی۔ محض خود کو تسلی دینے کی چند کاوشیں ہیں۔ حقیقت میں ''خاتمے'' کے تصور سے مراد ان تعقلات کی معذوری کو عیاں کرنا تھا جن کی بنیاد پر مذکورہ بالا تمام آئیڈیالوجیز کو متشکل کیا گیا تھا۔ جب مخصوص تعقلات نئے ظہور کرتے ہوئے معاشرتی، ثقافتی اور ادبی رجحانات کی شناخت نہ کر سکتے ہوں تو اس عمل کو ان تعقلات کی معذوری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مغرب میں ژاک دریدا، پیئر ماشیرے اور رولاں بارتھ کے خیالات کے تحت ان تعقلات میں ایسے تضادات یا گیپس دکھائی دینے لگے کہ جن کے عیاں ہونے سے ان تعقلات کی اہمیت میں کمی واقع ہوئی۔ لہٰذا فلسفے میں کلیتی رجحان، تنقید میں معنی کا التوا اور مصنف کی لامرکزیت لازمی نتائج تھے۔ معنی کے التوا، مصنف کی لامرکزیت چانو کہ صارفی کلچر سے ہم آہنگ تھے، اس لیے پیدا کنندے سے زیادہ صارفیت کو اہمیت دی جانے لگی۔ مابعد جدید عہد میں قاری صارفیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس تناظر میں مصنف اور معنی کا التوا میں جانا لازمی تھا۔ تاہم مغرب میں بھی لامرکزیت و معنی کے التوا جیسے رجحانات کو ''بحران'' سے تعبیر کیا گیا تھا۔ حقیقت میں مابعد جدیدیت لبرل ازم کے مثالی آدرشوں کا انہدام ہے۔ تاہم ہمارے ہاں اس ''بحران'' کی کہیں کوئی تفصیل نہیں ملتی جو مغربی عینیت پسند اور تجربیت پسند ناقدین و مفکرین کے ہاں ملتی ہے۔ اُردو کا سماج اپنی ہیئت میں عینیت کے قریب رہا ہے، خواہ وہ مذہبیت کا رجحان ہو یا تصوف کی کوئی جہت، اس حوالے سے دیکھیں تو مابعد جدیدیت اُردو ثقافت پر بھی ایک سخت حملہ ہے، لیکن کسی نے ان ''بحران'' کی عکاسی کرنے والے عناصر کو دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی۔

مابعد جدید نظری مباحث بڑی باریکی سے مغربی سماج کے سماجی، فلسفیانہ، ادبی اور ثقافتی متون کو انتہائی قریبی ربط میں رہ کر گیپس یا تضادات کی تلاش کرتے ہیں۔ لاتشکیل مابعد جدیدیت کی ارتقاشدہ شکل ہے، جو لیوتارڈ اور فوکو کی مابعد جدیدیت سے خاصی دور ہے، بلکہ لاتشکیل ان دونوں کو روشن خیالی کا ہی تسلسل قرار دیتی ہے۔ لاتشکیل مغربی معاشرے کے داخلی تضادات کا اظہار ہے، اس کا گہرا تعلق ''موجودگی کی مابعد الطبیعات'' کی بنیاد پر پنپنے والے ان رجحانات کے ساتھ ہے جو الٰہیات، منطق اور علم الوجود کے اس اشتراکی نکتے کی بنیاد رکھتی ہے جو مرکزیت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ بھی ذہن نشین رہنا ضروری ہے کہ دریدا اور بارتھ کے ذہن میں لاتشکیل کی تشکیل کرتے وقت اسلام کا کوئی پہلو موجود نہیں تھا۔ اس کی مثالیں دریدا کی مغربی متون کی قرأت سے نمایاں ہو جاتی ہیں۔ دریدا نے بار بار واضح کیا کہ

مابعد الطبیعات سے اس کی مراد مغربی مابعد الطبیعات کے ساتھ ہے، جسے وہ ''موجودگی کی مابعد الطبیعات'' قرار دیتا ہے اور جو فوقیتی ترتیب کو تشکیل دے کر، یکطرفہ مرکز کو قائم کرتے ہوئے، خارجیت کی تخفیف اور معنی کی تشکیل کا دعویٰ کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت کی لاتشکیلی جہت جن متون کو ڈی کنسٹرکٹ کرتی ہے، اور متعین معنی سے تضادات کو برآمد کرتی ہے، وہ ایک مخصوص لیکن جبری و استحصالی پسِ منظر میں متشکل ہوئے تھے، اس لیے ان کے تضادات کو دکھانا، مغربیت کے حقیقی جابر و ظالم اور استحصالی چہرے کو منکشف کرنے کے لیے لازمی تھا۔ ان کے جبری و استحصالی کردار کی وجہ سے انھیں ڈی کنسٹرکٹ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لہٰذا اگلا مرحلہ معنی کی عدم تعیین کا ہے، یعنی معنی کی تعیین کے بعد اس کی عدم تعیین بھی مغربی سماج ہی کے تضادات کو نمایاں کرتی ہے۔ لہٰذا دونوں ہی صورتیں یعنی متن کی تشکیل اور لاتشکیل ایک مخصوص تناظر کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس عمل کی تفہیم کے بغیر نظری اوزاروں سے اپنے سماج میں پنپنے والے تضادات کو عیاں کرنے کا مطلب گمراہی پھیلانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

مابعد جدیدیت اپنی سرشت میں سیاسی ہے۔ ڈی کنسٹرکشن کو دریدا خود بنیاد پرستی کی حد تک سیاسی کہتا ہے، اس کو ثابت کرنے کے لیے میں نے کئی اہم نکات پر اپنی کتابوں میں بحث کی تھی جنھیں دہرانا یہاں مناسب نہیں ہے۔ مابعد جدیدیت میں مضمر سیاست کو اس کی پیش کردہ ثقافتی شکل میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مابعد جدید مباحث میں دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس کی بنیاد تحریر کے اصولوں پر رکھی گئی ہے اور جہاں تک تحریر کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں سیوسیر سے دریدا تک تمام نقاد متفق ہیں کہ تحریر حقیقت میں ثقافتی تشکیل ہے۔ اگر تحریر ثقافتی تشکیل ہے اور سماج کی تمام جہات تحریر کے اصولوں کے تحت متعین ہوتی ہیں تو تحریر کی حیثیت مرکزی کہلاتی ہے۔ اس مفہوم میں تحریر یعنی ثقافتی تشکیل ہی سیاسی عمل کا تعین کرتی ہے۔ تحریر کے اصولوں کے تحت ہی سیاسی متون کی قرأت کا عمل طے پاتا ہے۔ تحریر کی ''مرکزیت'' ہی بورژوا سیاست میں کم از کم نظری سطح پر سبجیکٹ کے انہدام کا باعث بنتی ہے۔ تحریر کی مرکزیت کی بنیاد پر ہی کنارے لگے ہوئے طبقات کو ''مرکز'' میں لانے کی سعی کی جاتی ہے۔ تحریر کی مرکزیت ہی سے معنی کا التوا ممکن ہوتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھیں تو تحریر ہی وہ بڑا بیانیہ ہے، جو خود تو بڑا بیانیہ رہتا ہے مگر تاریخ کے بڑے بیانیے کو جسے پہلے ہی کنارے پر پڑا تصور کر لیا گیا تھا، اس کے اوصاف سے محروم کر کے مرکز میں لاتا ہے۔ لیوتارڈ نے تحریر کی مرکزیت کا سوال اٹھا کر یہ واضح کر دیا تھا کہ اب تحریر ہی تعقل کے راستے میں حائل ہوگی۔ یہی وہ نکات ہیں جن کی وجہ سے ثقافت اور سیاست کے مابین ایک اندرونی تعلق قائم ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں، مغربی ممالک کے برعکس، پیداواری قوتوں کے عدم ارتقا کی وجہ سے عقل اس سطح پر نہیں پہنچ پائی کہ وہ ایسے انتظامی معاشرے کی تشکیل کرتی، جو انسان کی مرکزیت قائم ہوتا۔ عقل کے تعقلاتی نظام کو مابعد جدیدیت کے نام پر اسی صورت منہدم کیا جا سکتا ہے جب پہلے اس کی تشکیل کر لی جائے۔ اس لیے اردو کی مابعد جدیدیت، اگر کوئی

تھی، تو تعقلات کی تشکیل اور پس منظر میں پیداواری قوتوں کے اغلب کردار اور سماجی ہیئت کی تفریق و امتیاز قائم نہ کرسکنے کی وجہ سے باطل محض تھی۔ ہمارے ہاں شناختوں کا بحران تو ہے مگر یہ روشن خیالی

پروجیکٹ کے بحران کا نتیجہ نہیں ہے کیونکہ ہمارے ہاں صنعتی پیداوار کے عمل غالب نہیں ہے، جس پر مرکزیت کا مختلف تصور تشکیل پاتا۔ ہمارے ہاں حقیقی بحران روشن خیالی کا نہ پنپنا تھا، اس میں سے جس شناخت کا قضیہ پھوٹتا ہے وہ دراصل روشن خیالی کے ارتقا کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ مغرب میں روشن خیالی کے بحران سے جس مابعد جدیدیت کا ارتقا ہوا ہے اس کی کوئی سمت نہیں ہے۔ بے سمت ہونے کو بھی مابعد جدیدیت کا بحران کہا جاسکتا ہے۔ اقدار کی شناخت کی عدم تعیین بحران نہیں تو اور کیا ہے۔ کم از کم عینیت پسندانہ تہذیب کے رکھوالوں کے لیے تو یہ بحران ہی کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن یہ بحران دراصل ہے کس فلسفیانہ، تنقیدی، یا ثقافتی عمل کا؟ بلاشبہ یہ بحران جدیدیت کے قضایا کا بحران ہے۔ اگر ''بحران'' کا لفظ استعمال نہ کیا جائے تو اس کا مطلب مابعد جدیدیت کو قبول کرنا ہوگا۔ اسی طرح اگر ماضی کی حاصلات پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے ''بحران'' کو تسلیم کیر لیا جائے تو یقیناً یہ جدیدیت کے فلسفیانہ و تنقیدی قضایا کے حوالے سے عدم اطمینانی کا اظہار ہوگا، کیونکہ مابعد جدید نظری و ثقافتی مباحث میں انہی تصورات اور رویوں کو چیلنج کیا گیا ہے جو جدیدیت کی فکری اساس پر قائم تھے۔ ایک اور نکتہ ذہن میں رہنا ضروری ہے کہ مغرب میں شناختوں کا بحران کسی نئی شناخت کا پیش خیمہ نہیں ہے، جبکہ ہمارے ہاں انسان کی مرکزیت پر قائم کی جانے والی اس شناخت کا مسئلہ اہم ہے، جسے الہیاتی مابعد الطبیعات نے ایک عرصے سے دبا رکھا ہے۔

مختصر یہ کہ اردو میں کوئی بھی ''نقاد'' یا محقق اس سوال کا جواب نہیں دے سکا کہ اردو میں مابعد جدیدیت کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ وجہ یہ کہ ان کے ذہن میں ایسا کوئی سوال موجود ہی نہیں تھا۔ ایسی علمیاتی، جمالیاتی، علم البشریاتی اور سیاسی تحریکیں جو فرانس اور امریکہ میں شروع ہوئیں انھیں پاکستان یا ہندوستان میں کسی بھی طرح کے تنقیدی جائزے کے بغیر قبول کرنا یا ان کا درس دینا ناقدین کی ذاتی خواہشات کی تسکین کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ خیالات کہیں خلا میں جنم نہیں لیتے کہ انہیں آفاقی تسلیم کرلیا جائے۔ ان کی آفاقیت کو تناظر کی تبدیلی سے چیلنج کیا جاسکتا ہے۔ اگر خیالات کو آفاقی گردان بھی لیا جائے تو اس صورت میں بھی آفاقیت کا قضیہ نہ صرف مابعد جدیدیت بلکہ مادیت کی نظری جہت کی بھی زد پر رہتا ہے۔

☆☆

فکشن کی کائنات

گابریئل گارسیا مارکیز
ترجمہ: فاروق حسن

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

داماسو نور کے تڑکے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کی بیوی آنا چھ ماہ کی حاملہ، کپڑے اور جوتے پہنے بستر میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ تیل کا لیمپ بجھنے کے قریب تھا۔ داماسو کو احساس ہوا کہ اس کی بیوی لمحہ لمحہ کر کے ساری رات اس کا انتظار کرتی رہی ہے، بلکہ اب بھی، جب وہ اس کے سامنے موجود ہے، وہ انتظار کیے جا رہی ہے۔ اس نے انگلی سے آنا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، جس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنا کی خوف زدہ آنکھیں سرخ کپڑے کے اس بنڈل پر مرکوز تھیں جو داماسو نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا: اس کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے اور وہ ایک لخت کانپنے لگی۔ داماسو نے خاموشی مگر درشتی کے ساتھ اس کو قمیص سے پکڑ لیا۔ داماسو کے پاس سے کڑوی سی بُو آ رہی تھی۔

داماسو نے آنا کو تقریباً ہوا میں اٹھا لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس کے جسم کا سارا بوجھ آگے کو جھک گیا اور وہ اپنے خاوند کی سرخ دھاریوں والی قمیص سے چمٹ کر ہاتھ اس کی کمر کے گرد لے جا کر اسے گردوں کے قریب پکڑ کر رونے لگی، اور اس وقت تک روتی رہی جب تک اسے قرار نہ آ گیا۔

''میں بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''یک دم دروازہ کھلا اور کسی نے تمہیں خون میں تر بتر اندر دھکیل دیا۔''

کچھ کہے بغیر داماسو نے اسے ہاتھ کے فاصلے پر روکے رکھا۔ پھر اس نے اسے بستر پر بٹھا دیا اور بنڈل اس کی گود میں رکھ کر باہر صحن میں پیشاب کرنے چلا گیا۔ آنا نے ڈوری کو کھولا اور دیکھا: بنڈل کے اندر بلیرڈ کی تین گیندیں تھیں، دو سفید اور ایک سرخ اور تینوں کثرت استعمال سے بدرنگ سی ہو رہی تھیں۔

داماسو جب کمرے میں واپس آیا تو وہ بیٹھی کسی سوچ میں غرق تھی۔

''اور ان کا کیا فائدہ ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

داماسو نے کندھے اچکائے: ''بلیرڈ کھیلنے کے کام آئیں گے۔''

اس نے بنڈل کو دوبارہ ڈوری سے باندھا اور دوسری چیزوں، ٹارچ، چاقو اور ساختہ کنجی، کے ہمراہ رنگ کی تہہ میں رکھ دیا۔ آنا کپڑے تبدیل کیے بغیر دیوار کی جانب منہ کر کے بستر میں لیٹ گئی۔ داماسو نے صرف اپنی پتلون اتاری۔ بستر میں لیٹ کر سگریٹ پیتے ہوئے وہ صبح کاذب کی بکھری ہوئی سرسراہٹ میں اپنی مہم کے خدوخال کا جائزہ لینے لگا، یہاں تک کہ اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی ابھی جاگ رہی ہے۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں،'' وہ بولی۔

آنا کی آواز، جو عموماً دھیمی ہوتی تھی، غصے اور عناد کی بدولت اس وقت بھاری ہوگئی تھی۔ داماسو نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور ٹکڑے کو فرش پر مسل کر بجھا دیا۔

''وہاں کچھ اور تھا ہی نہیں،'' داماسو نے آہ بھری۔ ''میں تقریباً گھنٹہ بھر اندر رہا۔''

''اگر تمہیں کوئی گولی مار دیتا تو؟'' اس نے پوچھا۔

داماسو خوف سے کانپ اٹھا۔ ''لعنت ہو تم پر،'' اس نے اپنی انگلیوں کے جوڑ پلنگ کے ڈنڈے پر مارتے ہوئے کہا۔ وہ نیچے فرش پر سگریٹ اور دیا سلائی تلاش کرنے لگا۔

''تم گدھوں کی طرح بے حس ہو،'' آنا نے کہا۔ ''اتنا تو سوچا ہوتا کہ میں یہاں سو نہیں پا رہی۔ سڑک پر کوئی آواز آتی تھی جو لگتا تھا جیسے ابھی کوئی تمہاری لاش لے کر اندر داخل ہوگا۔'' اس نے آہ بھر کر اضافہ کیا:

''اور اس سارے عذاب سے حاصل کیا ہوا؟ بلیرڈ کی تین گیندیں؟''

''دراز میں صرف پچیس سومنٹ کا سکہ پڑا تھا۔''

''تو پھر کچھ بھی لے کر نہ آتے۔''

''مشکل کام تو اندر داخل ہونے کا تھا،'' داماسو نے کہا۔ ''وہاں سے بالکل خالی ہاتھ لوٹ آتا؟''

''کچھ اور اٹھا لاتے!''

''وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا،'' داماسو نے کہا۔

''جتنی چیزیں بلیرڈ ہال میں ہوتی ہیں اور کہاں ہوتی ہوں گی۔''

''ہاں، لگتا یہی ہے،'' داماسو نے کہا۔ ''لیکن اس بار اندر داخل ہو کر تلاش کرنا اور ہر چیز کو دیکھنا شروع کرو تو پتا چلتا ہے کہ وہاں کوئی ٹکے کے مول کی چیز بھی نہیں۔''

وہ دیر تک خاموش لیٹی رہی۔ داماسو کو لگا جیسے وہ آنکھیں کھولے، اپنی یادداشت کے اندھیرے میں کسی قیمتی چیز کو تلاش کر رہی ہو۔

''ہاں شاید!'' وہ بولی۔

داماسو نے سگریٹ سلگالیا۔ رات کی پی ہوئی شراب کا نشہ امر کے بعد لہر بن کر اس کے جسم سے زائل ہو رہا تھا، اور اسے دوبارہ اپنے اعضا کے وزن، حجم اور فرائض منصبی کا احساس ہونے لگا تھا۔ ''وہاں ایک بلّی تھی،'' آخر اس نے کہا۔ ''ایک بہت بڑی سفید بلّی۔'' آنا نے بستر میں کروٹ لی۔ اپنا پھولا ہوا پیٹ اپنے خاوند کے پیٹ کے ساتھ لگا دیا اور ٹانگ اس کے گھٹنوں کے درمیان رکھ دی۔ اس کے پاس سے پیاز کی بُو رہی تھی۔

''بہت ڈر لگا تھا؟'' آنا نے پوچھا۔

''مجھے؟''

''ہاں تمہیں،'' آنا نے کہا۔ ''سنا ہے مردوں کو بھی ڈر لگتا ہے۔''

اسے احساس ہوا کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ ''ہاں، تھوڑا سا، اس نے کہا۔ مجھے اتنے زور کا پیشاب آ رہا تھا کہ برداشت کرنا مشکل تھا۔''

آنا نے اسے چوما مگر اس نے جواباً کچھ نہ کیا۔ تب اس احساس کے باوجود کہ وہ اپنے جرم کا اعتراف کرنے لگا ہے، جو خطرے سے خالی بات نہ تھی، تاہم بغیر کسی تاسف کے، اس نے تمام واقعہ، تفصیل کے ساتھ آنا کو سنایا، یوں جیسے کسی پرانے سفر کی یاد تازہ کر رہا ہو۔

طویل خاموشی کے بعد آنا نے کہا:

''تھا تو پاگل پن ہی!''

''بس شروع کرنے کی ہمت چاہیے،'' داماسو نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا۔ ''اور پھر پہلی کوشش کے لحاظ سے معاملہ برا تو نہیں رہا۔''

سورج کی تپش دیر سے شروع ہوئی۔ آنا داماسو کے بیدار ہونے سے بہت پہلے جاگ چکی تھی۔ داماسو نے چند منٹ کے لیے اپنا سر صحن میں لگے نلکے کی ٹونٹی کے نیچے لگائے رکھا حتیٰ کہ پانی کی دھار سے وہ پوری طرح بیدار ہو گیا۔ اس کا کمرہ بہت سارے ایک جیسے مگر الگ الگ کمروں میں سے ایک تھا۔ صحن میں جو تمام کمروں کا مشترکہ تھا، کپڑے سکھانے کی رسی بندھی ہوئی تھی۔ عقبی دیوار کے پاس والے حصے میں، جسے ٹین کی ایک چادر صحن سے الگ کرتی تھی، آنا نے کھانا پکانے اور استریاں گرم کرنے کے لیے ایک سفری چولھا، اور کھانا کھانے اور کپڑے استری کرنے کے لیے ایک چھوٹی میز رکھی ہوئی تھی۔ اپنے خاوند کو قریب آتا دیکھ کر اس نے استری کیے ہوئے کپڑے ایک طرف رکھ دیے اور استریاں چولھے پر سے اتار دی تاکہ کافی

گرم کر سکے۔ آنا اپنے خاوند سے عمر میں بڑی تھی، اس کی جلد کی رنگت پیلی تھی اور حرکات وسکنات میں ایسے لوگوں کی سی نرم روی اور اہلیت تھی جن کا حقیقت سے روزانہ واسطہ رہتا ہو۔

سر درد کی دھند میں سے اسے احساس ہوا کہ آنا نظروں ہی نظروں میں اس سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس وقت تک داماسو نے صحن میں دوسرے لوگوں کی آوازوں کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

''ان سب نے صبح سے اور کوئی بات ہی نہیں کی،'' آنا اسے کافی دیتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''مرد لوگ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہاں گئے ہیں۔''

داماسو نے خود دیکھا، صحن میں سے مرد اور بچے غائب تھے۔ کافی پیتے ہوئے وہ خاموشی سے ان عورتوں کی گفتگو سننے اور سمجھنے کی کوشش میں لگا رہا جو رسی پر کپڑے لٹکا رہی تھیں۔ آخر اس نے سگریٹ سلگایا اور باورچی خانے سے باہر نکل آیا۔

''تیریسا!'' اس نے پکارا۔

جسم کے ساتھ چپکے ہوئے گیلے کپڑے پہنے ایک لڑکی نے اس کی آواز کا جواب دیا۔ 'ذرا احتیاط سے بات کرنا،'' آنا نے سرگوشی کی۔ لڑکی چل کر داماسو کے قریب آئی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' داماسو نے پوچھا۔

''رات کو بلیرڈ ہال میں چوری ہوئی ہے۔ چور سب کچھ لے گئے۔''

لڑکی کو جیسے تمام تفصیلات کا علم تھا۔ اس نے وضاحت سے بتایا کہ چوروں نے رات کس طرح ہال میں یکے بعد دیگرے ساری چیزیں اکھاڑیں، حتیٰ کہ بلیرڈ کھیلنے کی بھاری میز بھی وہ اتنے تیقن سے بات کر رہی تھی کہ خود داماسو کو لگا جیسے اسے ہر بات کا صحیح علم ہو۔

''لعنت ہے!'' باورچی خانے میں لوٹتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

آنا دانت بھینچ کر گنگنانے لگی۔ داماسو اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش میں کرسی دیوار کے ساتھ اگا کر بیٹھ گیا۔ تین ماہ قبل، جب وہ بیس برس کا ہوا تھا، اس کی لکیر جیسی مونچھ کی بدولت، جس کی نگہداشت وہ نہ صرف ایثار کے پوشیدہ جذبے کے تحت بلکہ کچھ کچھ شفقت سے کرتا تھا، اس کا چیچک کے داغوں سے بھرا چہرہ قدرے پختہ لگنے لگا تھا۔ تب سے اس نے خود کو بالغ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا، لیکن آج صبح جبکہ کل رات کے واقعے کی یاد اس کے سر درد کی دلدل میں تیرتی پھر رہی تھی، اسے یہ بھی معلوم نہ ہو پا رہا تھا کہ بلوغت تو کجا، وہ زندگی کے کس مقام سے اپنے آپ کو زندہ تصور کرنا شروع کرے۔

استری ختم کرنے کے بعد آنا نے کپڑوں کو ایک جیسی قامت کے دو ڈھیروں میں بانٹا اور باہر جانے

کے لیے تیار ہونے لگی۔

''زیادہ دیر نہ لگانا،'' داماسو نے کہا۔

''نہیں، روز سے زیادہ نہیں۔''

وہ اس کے پیچھے کمرے میں آیا۔ ''تمہاری چار خانے والی قمیص وہاں رکھی ہے،'' آنا نے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ آج دھاریوں والی قمیص نہ پہنو۔'' آنا نے اپنے خاوند کی بلی جیسی شفاف آنکھوں میں دیکھا۔ ''کیا پتا کل کسی کی نظر تم پر پڑ گئی ہو!''

داماسو نے ہتھیلیوں کا پسینا پتلون پر رگڑ کر صاف کیا۔ ''نہیں، مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔''

''پکا پتا تو نہیں،'' آنا نے دوہرایا۔ وہ دونوں بازوؤں پر کپڑوں کا ایک ایک بنڈل اٹھائے ہوئے تھی۔ ''ویسے بھی تمہیں آج باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ کچھ دیر رکو، میں باہر کا چکر لگا کر آتی ہوں، جیسے مجھے کسی بات سے کوئی غرض نہیں۔''

قصبے میں لوگوں کی زبانوں پر کسی اور بات کا ذکر ہی نہ تھا۔ آنا کو بار بار اسی ایک واقعے کی مختلف بلکہ ایک دوسرے کی تردید کرتی ہوئی تفصیلات سننی پڑیں۔ لوگوں کے دُھلے ہوئے کپڑے ان کے حوالے کرنے کے بعد وہ ہر سنیچر کی طرح مارکیٹ جانے کی بجائے، سیدھی چوک کی جانب ہو لی۔

بلیرڈ ہال کے سامنے اس کے خیال کے برعکس کم لوگ تھے۔ کچھ لوگ بادام کے درخت کے نیچے کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔ شامیوں نے دوپہر کے کھانے کے بعد دسترخوان اٹھا دیا تھا، اور دکانیں اپنے کینوس کے سائبانوں کے نیچے اونگھتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ ایک شخص ہوٹل کے ملاقات کے کمرے میں جھولنے والی کرسی میں ٹانگیں پھیلائے اور منہ کھولے سویا تھا۔ دوپہر کی گرمی میں ہر چیز مفلوج سی لگتی تھی۔

آنا بلیرڈ ہال کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتی گئی اور جب وہ گودی کے مقابل زمین کے خالی قطعے پر سے گزر رہی تھی تو اسے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ تب اسے وہ بات یاد آئی جو داماسو نے اسے بتائی تھی، اور یہ وہ بات تھی جس کا علم تو سب کو ہوگا مگر یہ بلیرڈ ہال کے گاہکوں کے سوا کسی کے ذہن میں نہ رہی ہوگی۔ بلیرڈ ہال کا عقبی دروازہ زمین کے ایک خالی قطعے پر کھلتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے بازو پھولے ہوئے پیٹ کے اوپر باندھے، لوگوں سے باتوں میں لگ گئی۔ اس کی نظریں اس دروازے پر گڑی تھیں جسے رات کو توڑا گیا تھا۔ تالا تو اپنی جگہ موجود تھا لیکن ایک طرف کا کنڈا ایسے اکھیڑ لیا گیا تھا جیسے کسی کا دانت نکالا جاتا ہے۔ کچھ دیر تک آنا اس نقصان کا جائزہ لیتی رہی جو اس تنہا اور معمولی سی کوشش کے نتیجے میں ہوا تھا، اور ترحم کے احساس کے ساتھ اسے اپنے خاوند کا خیال آیا۔

''کون تھا؟'' اس نے پوچھا۔

اس میں اِدھر اُدھر دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

لوگوں نے جواب دیا، ''کسی کو معلوم نہیں۔ سنا ہے کوئی اجنبی تھا۔''

''ہاں، اجنبی ہی ہو سکتا ہے،'' اس کے عقب میں کھڑی ایک عورت بولی۔ ''اس قصبے میں تو کوئی چور نہیں ہے۔ یہاں تو ہر کوئی دوسرے کو جانتا ہے۔''

آنا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ ''ہاں، یہ تو ہے،'' اس نے کہا اور ہلکے سے مسکرائی۔ وہ پسینے میں تر بتر تھی۔ اس کے نزدیک ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا جس کی گردن کی پشت پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔

''کیا وہ سب کچھ لے گئے؟'' آنا نے پوچھا۔

''دو سو پیسو، اور بلیرڈ کی گیندیں،'' بوڑھے نے جواب دیا۔ وہ قدرے غیر معمولی دلچسپی سے آنا کو دیکھ رہا تھا۔ ''آئندہ سے ہمیں آنکھیں کھول کر سونے کی عادت ڈالنی پڑے گی۔''

آنا نے نظریں پھیر لیں۔ ''ہاں، یہ تو ہے،'' اس نے دوسری بار کہا۔ سر کے اوپر رومال باندھ کر وہ چل پڑی۔ چلتے وقت وہ ذہن سے یہ خیال نکالنے سے قاصر رہی کہ وہ بوڑھا اسے گھورے جا رہا ہے۔

خالی قطعے پر جمع لوگ پندرہ منٹ تک تو باتمیز انداز میں بات چیت کرتے رہے جیسے دروازے کے عقب میں کسی کا جنازہ رکھا ہو۔ پھر وہ سب اضطراب کے عالم میں واپس مڑ کر چوک کی جانب چل دیے۔

بلیرڈ ہال کا مالک، قصبے کے میئر اور دو پولیس والوں کے ساتھ، ہال کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ ٹھگنا اور گول مٹول آدمی تھا، اس کی پتلون پیٹ کے دباؤ کے باعث اپنی جگہ پر ٹکی ہوئی تھی اور عینک ایسی تھی جیسے عموماً بچے تاروں سے بنالیا کرتے ہیں، لیکن وہ قصبے کا بے حد معزز آدمی گردانا جاتا تھا۔

ہجوم نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی آنا اس کا بیان سنتی رہی، حتیٰ کہ ہجوم آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگا۔ تب، گرمی سے مضمحل وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی، جس کے گرد اس کے شور مچاتے ہوئے پڑوسی جمع تھے۔

بستر میں دراز داما سو سو بار اس سوال پر غور کر چکا تھا کہ پچھلی رات آنا نے سگریٹ پیے بغیر اتنی دیر تک اس کا انتظار کیسے کر لیا تھا۔ اسے مسکراتے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوتے اور سر پر سے پسینے میں بھیگا رومال اتارتے دیکھ کر اس نے تقریباً ان پیا سگریٹ کچے فرش پر بجھا کر سگریٹ کے اور بہت سے بجھے ہوئے ٹکڑوں کے درمیان ڈال دیا، اور بڑھتے ہوئے اضطراب کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔

''تو کیا پتا چلا؟''

آنا بستر کے نزدیک گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

''پتا یہ چلا کہ تم چوری کرنے کے علاوہ جھوٹ بھی بولتے ہو،'' اس نے کہا۔

''کیسے؟''

''ایسے کہ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ دراز میں کچھ بھی نہیں تھا۔''

داماسو کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

''کچھ تھا ہی نہیں۔''

''وہاں دوسو پیسو تھے،'' آنا نے کہا۔

''بالکل جھوٹ،'' وہ زور سے بولا۔ وہ بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور دوبارہ رازدارانہ لہجے میں بات کرنے لگا۔ ''صرف پچیس سینٹ تھے۔''

اس نے آنا کو اپنی بات کا یقین دلا دیا۔ ''روک بہت بدمعاش آدمی ہے،'' داماسو نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ ''اس کی خواہش یہ ہے کہ میں جا کر اس کا جبڑا توڑوں۔'' آنا زور سے ہنس پڑی۔

''بے وقوف مت بنو۔''

داماسو بھی ہنسنے لگا۔ جس وقت وہ شیو بنا رہا تھا، آنا نے اسے وہ تمام باتیں بتائیں جو وہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ پولیس والے کسی اجنبی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ''کہتے ہیں وہ جمعرات کو قصبے میں وارد ہوا تھا اور کل رات گودی کے اردگرد گھومتا ہوا دیکھا گیا تھا،'' وہ بولی۔ ''لیکن اب پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا ہے۔'' داماسو اس اجنبی کے بارے میں سوچنے لگا جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا، ایک لمحے کے لیے اسے یقین ہو گیا کہ واقعی وہ اجنبی ہی اصل مشتبہ کردار ہے۔

''شاید وہ قصبے سے چلا ہی گیا ہو،'' آنا نے کہا۔

ہمیشہ کی طرح داماسو کو تیار ہونے میں تین گھنٹے لگے۔ اولین کام نفاست سے مونچھوں کی مناسب حد تک تراش کا تھا۔ پھر صحن میں نلکے کے نیچے غسل۔ آنا اسی دلچسپی کے ساتھ جس میں اس رات سے لے کر جب اس نے پہلی بار داماسو کو دیکھا تھا، آج تک کسی چیز کے باعث کوئی کمی نہیں آئی تھی، اس کے بالوں میں کنگھی کرنے کے دشوار اور پُرمشقت عمل کا نظروں سے قدم بہ قدم تعاقب کرتی رہی۔ آنا نے جب اسے گھر سے باہر جانے سے قبل سرخ چارخانے والی قمیص پہنے، آئینے میں اپنا معائنہ کرتے دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے وہ خود عمر رسیدہ اور ناقص ہو چکی ہو۔ داماسو نے کسی مشاق باکسر کی سی چستی کے ساتھ آنا کو دو چار جھوٹ موٹ کے مکّے لگانے کی ادا دکھائی۔ آنا نے اسے کلائیوں سے پکڑ لیا۔

''پاس خرچ کے لیے بھی کچھ ہے؟''

''ارے میں امیر آدمی ہوں،'' داماسو نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔'' میرے پاس دوسو پیسو ہیں۔''

آنا نے دیوار کی طرف منہ کر کے اپنی چولی میں سے کچھ مڑے ہوئے نوٹ نکالے اور ان میں سے ایک پیسو کا نوٹ داماسو کو تھماتے ہوئے بولی: ''یہ رکھ لو بڑے آئے ویلنٹیسو!''

اس رات داماسو اپنے چند دوستوں کے ہمراہ چوک میں تھا۔ اتوار کے روز گردونواح کے دیہات سے جو لوگ مال اسباب فروخت کرنے قصبے کے بازار میں آتے تھے، وہ آلو کے قتلے اور لاٹری کے ٹکٹ بیچنے والے اسٹالوں کے درمیان اپنے سائبان نصب کر رہے تھے۔ شام کے اوئل ہی سے ان کے خراٹوں کی آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔ داماسو کے دوستوں کو بلیرڈ ہال میں چوری کا اتنا افسوس نہ تھا جتنا ریڈیو پر بیس بال کے مقابلوں کی کمنٹری کے نہ سن پانے کا تھا۔ بلیرڈ ہال بند ہونے کی وجہ سے وہ کمنٹری سے محروم ہو گئے تھے۔ بیس بال کے بارے میں باتیں کرتے کرتے وہ سنیما ہال میں چلے گئے۔ انہوں نے یہ بھی دریافت نہ کیا، اور نہ ان میں سے کسی کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ کون سی فلم چل رہی ہے۔

کانتن فلاس کی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ بالکنی کی پہلی قطار میں بیٹھا داماسو بے شرمی سے ہنسے جا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے جذبات سے صحت یاب ہو رہا ہو۔ وہ جون کی ایک خوش کن رات تھی، اور فلم کے لمبے خاموش وقفوں میں جب پروجیکٹر کی دودھیا شعاع کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، بغیر چھت کے اس ہال میں ستاروں کی خاموشی اپنا بوجھ ڈالتی محسوس ہونے لگتی۔

اچانک اسکرین پر ہلتے ہوئے نقش مدھم ہو کر تھم گئے اور آرکسٹرا کے عقب سے شور سنائی دیا۔ بتیوں کے اچانک جل اٹھنے کی چکا چوند میں داماسو کو یوں لگا جیسے اس کی چوری کا راز فاش ہو گیا ہو اور اس پر سرعام الزام لگایا جا رہا ہو۔ اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن یک دم اس نے دیکھا، آرکسٹرا کے قریب سامعین جیسے مفلوج سے ہو گئے تھے، اور پولیس کا ایک سپاہی کسی شخص کو اپنی مٹھی کے گرد لپٹی ہوئی پیٹی کے تانبے کے وزنی بکوے سے بے رحمی کے ساتھ مارے جا رہا تھا۔ مار کھانے والا ایک دیو قامت کالا تھا۔ عورتوں نے چیخ پکار شروع کر دی، اور پولیس والا، جو کالے کو پیٹ رہا تھا، عورتوں کی چیخوں سے بلند آواز میں چلایا: ''یہ چور ہے! چور!'' کالے نے لڑھک کر کرسیوں کی دو قطاروں کے درمیان رینگنا شروع کر دیا لیکن پولیس نے اس کا تعاقب نہ چھوڑا اور دو سپاہی اس کے پیچھے بھاگتے اور اس کے گردوں پر ضربیں لگاتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ اسے کمر سے قابو کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تب اس سپاہی نے جو اسے پیٹی سے مار رہا تھا، اس کی

کلائیاں کمر کے پیچھے رسی سے باندھ دیں اور تین سپاہی اسے دھکیلتے ہوئے دروازے کی طرف لے گئے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ داماسو کو تب ہی پتا چلا جب وہ اس کے قریب سے گزرے کالے آدمی کی قمیص پھٹ چکی تھی اور اس کا چہرہ دھول، پسینے اور خون کے آمیزے سے لتھڑا ہوا تھا۔ وہ سسکیاں بھر رہا تھا اور پولیس والوں کو قاتل اور خونی کے القاب سے پکار رہا تھا۔ تب پروجیکٹر دوبارہ چلا دیا گیا اور فلم جاری ہوگئی۔

داماسو دوبارہ نہیں ہنسا۔ اس نے باقی کی فلم ٹکڑوں میں دیکھی جن کا ایک دوسرے سے کم ہی تعلق تھا، اور وہ لگاتار سگریٹ پھونکتا رہا، یہاں تک کہ ہال کی بتیاں جلا دی گئیں اور حاضرین نے ایک دوسرے کی جانب یوں دیکھا جیسے حقیقت سے خوف زدہ ہوں۔ ''اچھی فلم تھی،'' کسی نے جو داماسو کے قریب تھا، کہا۔ داماسو نے اسے مڑ کر نہ دیکھا۔

''کانتن فلاس اچھا ایکٹر ہے،'' اس نے جواب دیا۔

لوگوں کی رو کے ساتھ بہتے بہتے وہ دروازے تک آ گیا۔ چھابڑیوں پر خورد ونوش کا سامان بیچنے والے گھروں کو جا رہے تھے۔ گیارہ کے بعد کا عمل تھا لیکن بازار میں بہت سے لوگ کھڑے اس انتظار میں تھے کہ فلم دیکھنے والے باہر آئیں تا کہ ان سے کالے کی گرفتاری کی تفصیل دریافت کی جا سکے۔

اس رات کمرے میں داخل ہوتے وقت داماسو اتنا محتاط تھا کہ آنا کو جو آدھی سوئی ہوئی تھی، اس کی موجودگی کا پتا اس وقت چلا جب وہ بستر میں لیٹ کر دوسرا سگریٹ پی رہا تھا۔

''کھانا چولھے پر رکھا ہے،'' وہ بولی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے،'' داماسو نے جواب دیا۔

آنا نے آہ بھری اور بیدار ہوئے بغیر کہا، ''میں خواب دیکھ رہی تھی کہ نورا مکھن سے پتلیاں بنا رہی ہے۔'' پھر یک دم اسے احساس ہوا کہ وہ سونے کی نیت سے نہیں لیٹی تھی تاہم سو گئی تھی۔ وہ بستر میں پلٹی، چہرہ داماسو کی جانب موڑا اور خیرہ ہو کر اپنی آنکھیں ملنے لگی۔

''وہ اجنبی پکڑا گیا ہے،'' آنا نے کہا۔

داماسو نے بولنے سے قبل ذرا توقف کیا۔

''کس نے خبر دی ہے؟''

''انہوں نے اسے سینما ہال میں سے پکڑا ہے،'' وہ بولی۔ ''سب لوگ وہیں گئے ہوئے ہیں۔''

آنا نے اجنبی کی گرفتاری کی غلط سلط روداد داماسو کو سنائی۔ داماسو نے اس کی تصحیح کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

''ہائے بے چارہ!'' آنا نے آہ بھری۔

''بے چارہ کیوں؟'' داماسو غصے میں آتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا دل تب خوش ہوتا، اگر اس کی جگہ میں شکنجے میں ہوتا؟''

آنا اس کی طبیعت کے اتار چڑھاؤ سے خوب واقف تھی، اس لیے خاموش رہی۔ پو پھٹنے تک وہ اسے بستر میں لیٹے، سگریٹ پیئے اور دمے کے مریضوں کی طرح سانس لیتے محسوس کرتی رہی۔ ایک بار اسے لگا جیسے وہ بستر سے نکلا اور کسی غیر واضح تلاش میں، جس میں وہ بصارت سے زیادہ حس لامسہ سے کام لیتا معلوم ہو رہا تھا، کمرے کی تمام چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا، پھر پندرہ منٹ سے زیادہ دیر تک بستر کے نیچے کی زمین کھرچتا رہا۔ پھر آنا نے اندھیرے میں اسے کپڑے تبدیل کرتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ ہر کام حتی الامکان خاموشی سے کر رہا تھا، یہ جانے بغیر کہ آنا، اس سارے عمل کے دوران، اسے یہ احساس دلا کر کہ وہ سو رہی ہے، اس کی لگاتار مدد کر رہی تھی۔ آنا کے ذہن میں کوئی قدیم، خوابیدہ حس بیدار ہوتی اور وہ جان گئی کہ داماسو پچھلی رات فلم دیکھنے گیا ہوا تھا اور یہ بھی سمجھ گئی کہ اس نے گیندیں ابھی ابھی بستر کے نیچے کیوں دفن کی ہیں۔

سوموار کو جب بلیرڈ ہال کھلا، تو پرجوش گاہکوں کے ایک ہجوم نے اس پر ہلا بول دیا۔ بلیرڈ کی میز جامنی کپڑے سے ڈھکی رکھی تھی جیسے وہ منظر کسی بلیرڈ ہال کا نہیں بلکہ جنازہ گاہ کا ہو۔ دیوار پر ایک اعلان چسپاں تھا: ''گیندیں ختم، بلیرڈ ہضم۔'' لوگوں نے اندر آ کر اس اعلان کو یوں پڑھا جیسے وہ اخبار کی کوئی خبر ہو۔ چند ایک تو اس کے سامنے کھڑے کافی دیر تک ناقابل فہم عقیدت کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے رہے۔

داماسو بلیرڈ ہال میں داخل ہونے والے اولیں گاہکوں میں سے تھا۔ اپنی زندگی کا ایک حصہ وہ ان بنچوں پر بیٹھے گزار چکا تھا جو ہال میں تماشائیوں ک لیے مخصوص تھیں، اور دروازہ کھلتے ہی وہ وہاں موجود تھا۔ آج ہال میں موجود ہونا البتہ اتنا ہی مشکل، لیکن اتنا ہی غیر ارادی کام تھا جتنا تعزیت کے لیے کہیں جانا۔ اس نے کاؤنٹر کی دوسری جانب کھڑے مالک کی کمر تھپتھپائی اور کہا۔

''کتنی اذیت کی بات ہے، روک!''

مالک نے افسردگی سے سر ہلایا۔ اس کے ہونٹوں پر دکھی سی مسکراہٹ تھی۔ آہ بھر کر اس نے جواب دیا، ''ہاں بھئی، وہ تو ہے۔'' اور وہ دوبارہ گاہکوں کو مشروبات فراہم کرنے میں لگ گیا، جبکہ داماسو کونے میں دھرے اسٹول پر کاؤنٹر کے سامنے بیٹھا جامنی کفن میں لپٹی بلیرڈ کی میز کے بارے میں سوچ بچار کرتا رہا۔

''کیسی عجیب بات ہے،'' اس نے کہا۔

''ہاں،'' ایک اور شخص نے، جو داماسو کے برابر والے اسٹول پر بیٹھا تھا، اس سے اتفاق کیا۔ ''لگتا

ہے جیسے یہ ماتم کا ہفتہ ہو۔"

جب گاہکوں کی اکثریت دوپہر کے کھانے کے لیے گھر جا چکی، تو داماسو نے رکارڈوں کی مشین میں چونّی ڈالی اور میکسیکو کے ایک گیت کا انتخاب کیا جس کی جگہ اسے مشین کے کارڈ پر زبانی یاد تھی۔ روک میز کرسیاں اٹھا اٹھا کر ہال کی پچھلی دیواروں کے ساتھ رکھنے لگا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" داماسو نے پوچھا۔

"تاش کے لیے میزیں لگا رہا ہوں،" روک نے کہا۔ "جب تک نئی گیندیں نہیں آتیں، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔"

دونوں ہاتھوں میں ایک ایک کرسی اٹھائے رک رک کر چلتا ہوا وہ کسی نئے نئے رنڈوے کی طرح لگ رہا تھا۔

"کب آرہی ہیں گیندیں؟" داماسو نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ایک مہینہ لگ جائے گا۔"

"اس وقت تک تو پرانی گیندیں بھی برآمد ہو چکی ہوں گی،" داماسو نے کہا۔

روک نے چھوٹی چھوٹی میزوں کی قطاروں کو تحسین کی نظر سے دیکھا۔ "نہیں، وہ نہیں ملیں گی،" اس نے ماتھے کا پسینہ آستین سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "کالے کو ہفتے کے دن سے بھوکا پیاسا رکھا ہوا ہے مگر وہ بتا کر ہی نہیں دیتا کہ گیندیں کہاں ہیں۔" اس نے پسینے سے دھندلے عینک کے شیشوں میں سے داماسو کو غور سے دیکھا۔

"مجھے یقین ہے اس نے دریا میں پھینک دی ہیں۔"

داماسو نے دانتوں میں اپنے ہونٹ دبا لیے۔

"اور دو سو پیسو؟"

"وہ بھی،" روک نے کہا۔ "اس کے پاس سے صرف تیس ہی برآمد ہوئے ہیں۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ داماسو شاید کبھی بھی اس احساس کی وضاحت نہ کر پاتا کہ اس ایک نظر نے جیسے ان دونوں کے درمیان ایک مجرمانہ سا تعلق قائم کر دیا۔ اس دوپہر آنا نے غسل خانے کی کھڑکی میں سے داماسو کو مکّے بازوں کی طرح ناچتے ہوئے گھر لوٹتے دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے کمرے کے اندر آ گئی۔

"سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے،" داماسو نے کہا۔ "بڈھے نے صبر شکر کر کے نئی گیندوں کا آرڈر بھی دے

دیا ہے۔اب صرف اس وقت تک انتظار کرنے کی ضرورت ہے جب تک لوگ یہ قصہ بھول نہیں جاتے۔''

''اور کالے کا کیا بنے گا؟''

''کیا بنے گا؟'' داماسو نے کندھے اچکائے۔''اگر اس کے پاس سے گیندیں برآمد ہوئیں تو اسے رہا کرنے کے سوا کیا چارہ رہ جائے گا؟''

کھانے کے بعد وہ دونوں گھر کے سامنے والے دروازے کے آگے بیٹھ کر ہمسایوں سے باتیں کرتے رہے حتی کہ سینما ہال کا لاؤڈ سپیکر بند ہوگیا۔ بستر میں دراز ہوتے وقت داماسو پر جوش تھا۔

''ابھی ابھی مجھے ایک نہایت زبردست کام کا خیال آیا ہے۔'' اس نے کہا۔

آنا کو لگا جیسے وہ سورج غروب ہونے کے وقت سے اسی کام کے بارے میں سوچ بچار کر رہا تھا۔

''میں ایک قصبے سے دوسرے، اور دوسرے سے تیسرے تک سفر کرتا رہوں گا،'' داماسو نے بات جاری رکھی،''اور ایک سے بلیرڈ کی گیندیں چرا کر دوسرے میں بیچتا جاؤں گا۔ ہر قصبے میں بلیرڈ ہال تو ہوتا ہی ہے۔''

''یہاں تک کہ کوئی تمہیں گولی مار دے گا۔''

''کیسی گولی؟'' اس نے کہا۔''وہ سب تو فلموں میں ہوتا ہے۔'' کمرے کے درمیان میں کھڑا وہ اپنے ہی جوش وجذبے سے بے حال ہوا جا رہا تھا۔آنا کپڑے بدلنے لگی۔ وہ بظاہر لاتعلقی سے لیکن دراصل گہری ہمدردانہ توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''میں سوٹوں کی ایک پوری قطار خریدوں گا،'' داماسو نے ایک دیوار سے دوسری دیوار تک پھیلی ہوئی ایک خیالی الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،'' یہاں سے وہاں تک اور پچاس جوڑی جوتے۔''

''اگر خدا کو منظور ہوا تو،'' آنا نے کہا۔

داماسو سنجیدگی سے آنا کو دیکھنے لگا۔

''تمہیں میرے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں،'' اس نے کہا۔

''ان کا میرے حالات سے دور کا بھی واسطہ نہیں،'' آنا نے جواب دیا۔اس نے لیمپ بجھا دیا، دیوار کے ساتھ لگ کر بستر پر لیٹ گئی اور واضح تلخی سے بولی،'' جب تم تیس برس کے ہوگے تو میں سینتالیس کی ہوجاؤں گی۔''

''فضول باتیں مت کرو،'' داماسو نے کہا۔

وہ اپنی جیبوں میں دیا سلائی ڈھونڈ رہا تھا۔''تمہیں لوگوں کے کپڑوں سے کشتی لڑنے کی ضرورت

نہیں رہے گی،" اس نے قدرے چکرا کر کہا۔ آنا نے اس کے لیے ماچس کی تیلی جلائی اور اس وقت تک شعلے کو جلتا دیکھتی رہی جب تک وہ بجھ نہ گیا۔ تب اس نے تیلی زمین پر پھینک دی۔ داماسو بستر میں لیٹا، باتیں کرتا رہا۔

"پتا ہے بلیرڈ کی گیندیں کس چیز سے بنتی ہیں؟"

آنا نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ہاتھی دانت سے،" وہ کہتا رہا۔" اور پتا ہے، وہ دنیا میں اتنی کم ہیں کہ انہیں منگوانے میں ایک مہینا لگتا ہے۔"

"سو جاؤ،" آنا نے قطع کلامی کی۔" مجھے صبح پانچ بجے اٹھنا ہے۔"

داماسو اب اپنے روزمرہ کے معمول کی جانب لوٹ چکا تھا۔ تمام دن وہ بستر میں لیٹے لیٹے گزارتا اور فیلو لے کے بعد باہر جانے کے لیے تیار ہونے لگتا۔ رات کو وہ بلیرڈ ہال میں بیٹھ کر بیس بال کی کمنٹری سنا کرتا۔ جتنے جوش و خروش سے وہ نت نئے منصوبے سوچتا تھا، اتنے ہی جوش و خروش سے انہیں فراموش بھی کر دیا کرتا تھا۔

سنیچر کے دن اس نے اپنی بیوی سے پوچھا،" تمہارے پاس کچھ رقم ہے؟"

"گیارہ پیسو ہیں،" اس نے کہا، اور نرمی کے ساتھ اضافہ کیا،" مکان کا کرایہ۔"

"میں تمہارے ساتھ ایک سودا کرتا ہوں۔"

"کیا؟"

"وہ رقم مجھے ادھار دے دو۔"

"ہمیں کرایہ ادا کرنا ہے۔"

"بعد میں دے دیں گے۔"

آنا نے نفی میں سر ہلایا۔ داماسو نے اس کی کلائی دبوچ کر اسے اٹھنے سے روک دیا۔ وہ میز کے پاس بیٹھی تھی، جہاں ابھی دونوں نے ناشتہ ختم کیا تھا۔

"چند دنوں کی بات ہے،" اس نے پریشان ملائمت سے اس کا بازو تھپتھپایا۔" گیندیں بک جائیں گی تو ریل پیل ہو جائے گی۔"

آنا راضی نہ ہوئی۔

اس رات داماسو اُسے فلم دکھانے لے گیا اور سارا وقت اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھے رہا حتیٰ کہ

اس وقت بھی جب وہ وقفے کے دوران میں اپنے دوستوں سے گفتگو میں مصروف تھا۔ فلم بھی انہوں نے توجہ سے نہ دیکھی۔ فلم ختم ہوئی تو داماسو بے تاب سا تھا۔

''تب تو مجھے کہیں ڈاکا مارنا پڑے گا،'' اس نے کہا۔

آنا نے کندھے اچکا لیے۔

''جو بھی پہلا شخص مجھے نظر آیا میں اس کا بھیجا نکال دوں گا۔'' فلم سے باہر آنے والے مجمع میں داماسو اُسے پیچھے سے دھکیل رہا تھا۔'' اور قتل کے جرم میں مجھے جیل بھیج دیا جائے گا۔'' آنا اندر ہی اندر ہنستی رہی مگر ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اگلی صبح، ایک طوفانی رات گزرنے کے بعد داماسو صریحی سرعت سے، اور آنا کو خوفزدہ کرنے کی نیت سے، باہر جانے کے لیے تیار ہوا۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ غرایا۔

''میری واپسی کی توقع نہ رکھنا۔''

آنا خفیف سا ڈر محسوس کیے، بغیر نہ رہ سکی۔

''خدا کرے تمہارا سفر اچھا کٹے،'' اس نے بلند آواز میں دعا دی۔

دروازہ دھڑ سے بند ہونے کے وقت سے داماسو کے لیے اتوار کا خالی اور نہ ختم ہونے والا دن شروع ہوا۔ بڑے بازار میں سجے چمک دار برتن، اور رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس عورتیں، جو اپنے بچوں کو ہمراہ لیے آٹھ بجے کی عبادت کے لیے گرجے کی طرف روانہ تھیں، چوک کو ایک خوش کن تاثر دے رہی تھیں، لیکن گرمی کے باعث فضا میں گھٹن صبح سویرے ہی شروع ہو چکی تھی۔

داماسو نے سارا دن بلیرڈ ہال میں گزارا۔ صبح کے وقت لوگ گروہوں میں بیٹھے تاش کھیلتے رہے اور دوپہر کے کھانے سے قبل تھوڑی دیر کے لیے ہال میں گاہکوں کا خاصا ہجوم ہو گیا۔ لیکن یہ بات مسلم تھی کہ لوگوں کی نظر میں بلیرڈ ہال کی کشش ختم ہو گئی تھی۔ صرف سورج ڈھلنے پر جب بیس بال کی کمنٹری شروع ہوئی، تب بلیرڈ ہال کی تھوڑی بہت پرانی چہل پہل اور زندگی دوبارہ دیکھنے میں آئی۔ بلیرڈ ہال کے بند ہونے پر داماسو کو احساس ہوا کہ اس کے پاس جانے کو کوئی جگہ نہیں ہے اور جو کہ میں نے تمام زندگی چڑ چکی ہے۔ اس نے گھاٹ کے متوازی سڑک پر چلنا شروع کر دیا۔ کہیں دور سے خوش کن موسیقی کی آواز آ رہی تھی: وہ اس جانب بڑھتا گیا۔ سڑک کے اختتام پر ایک بہت وسیع لیکن خالی ناچ گھر تھا، جس کی کاغذ کے پھولوں سے سجاوٹ کی گئی تھی جن کے رنگ اڑ چکے تھے اس ہال کے عقب میں لکڑی کے بنے پلیٹ فارم پر ایک بینڈ تھا۔ میک اپ کی دم گھونٹنے والی بو ہوا میں تیر رہی تھی۔

داماسو جا کر کاؤنٹر پر بیٹھ گیا۔ جب گانا ختم ہوا، مجیرے بجانے والا لڑکا ناچنے والوں کے درمیان پھر

پھر کر ان سے سکے اکٹھے کرنے لگا۔ ایک لڑکی اپنے ہم رقص کو ہال کے فرش پر اکیلا چھوڑ کر داماسو کی جانب بڑھی۔

''اور، جان من، کیا خبریں ہیں؟''

داماسو نے بیٹھنے کے لیے اسے اپنے ساتھ کی جگہ پیش کی۔ شراب فروش، چہرے پر پوڈر لگائے اور کان میں کارنیشن کا پھول اڑسے، ان کے پاس آیا۔ باریک اور تیز آواز میں اس نے پوچھا۔

''کیا پیو گے؟''

لڑکی نے مڑ کر داماسو کی جانب دیکھا۔

''ہم کیا پئیں گے؟''

''کچھ نہیں۔''

''چلو میں پلا دیتی ہوں۔''

''نہیں، یہ بات نہیں،'' داماسو نے کہا: ''مجھے بھوک لگی ہے۔''

''ہائے،'' شراب فروش نے آہ بھر کر کہا۔ ''اتنی خوبصورت آنکھوں والے بھی بھوکے؟''

داماسو اور وہ لڑکی دونوں اٹھ کر ہال کے دوسرے سرے پر کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ جسم کی بناوٹ کے لحاظ سے لڑکی بہت ہی کم عمر لگ رہی تھی، لیکن سرخی پوڈر اور بناؤ سنگھار کی وجہ سے اس کی اصل عمر کا پتا لگانا ناممکن تھا۔ کھانا کھانے کے بعد داماسو لڑکی کے پیچھے پیچھے اندھیرے برآمدے کے عقب میں ایک کمرے میں چلا گیا جہاں باہر سوئے ہوئے جانوروں کے سانس لینے کی آواز ان کے کانوں میں آ رہی تھی۔ بستر پر ایک شیر خوار بچہ لیٹا ہوا تھا جس کے جسم پر رنگ برنگے چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے۔ لڑکی نے وہ چیتھڑے اٹھا کر لکڑی کے ایک صندوق میں ڈال دیے اور بچے کو ان کے اوپر لٹا کر صندوق فرش پر رکھ دیا۔

''چوہے اسے کاٹ کھائیں گے،'' داماسو نے کہا۔

''نہیں، وہ اسے نہیں کاٹتے۔''

تب لڑکی نے جو سرخ لباس پہن رکھا تھا اسے اتار کر دوسرا بڑے بڑے پیلے پھولوں والا لباس پہن لیا جس کا گلا خاصا کھلا اور نیچا تھا۔

''اس بچے کا باپ کون ہے؟'' داماسو نے دریافت کیا۔

''خدا جانے، کہہ کر وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ ''میں ابھی آتی ہوں۔''

داماسو نے دروازے کی چٹخنی چڑھائے جانے کی آواز سنی۔ کپڑے پہنے پہنے بستر پر دراز ہو کر اس

نے یکے بعد دیگرے کئی سگریٹ پھونک ڈالے۔ ہال میں بجنے والے ڈھولوں کی دھمک سے بستر کی کہانیاں تک جھجھنا رہی تھیں۔ اسے پتا نہ چلا کہ اسے کس وقت نیند آ گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی، موسیقی بند ہو جانے کے سبب کمرہ پہلے کی نسبت بڑا اور کھلا کھلا لگ رہا تھا۔

لڑکی بستر کے قریب کھڑی اپنا لباس اتار رہی تھی۔

''کیا وقت ہوا ہے؟''

''چار بجے ہوں گے،'' لڑکی نے کہا۔ ''بچہ رویا تو نہیں؟''

''نہیں، میرے خیال میں تو نہیں،'' داماسو نے جواب دیا۔

لڑکی بستر میں اس کے ساتھ بہت ہی قریب لیٹ گئی۔ اس کی قمیص کے بٹن کھولتے ہوئے وہ ایسی نگاہوں سے جو پوری طرح داماسو پر مرکوز نہ تھیں، اسے گھورتی رہی۔ داماسو کو احساس ہوا کہ لڑکی نے خاصی شراب پی رکھی ہے۔ اس نے بتی بجھانے کی کوشش کی۔

''رہنے دو،'' لڑکی نے کہا۔ ''میں تمہاری آنکھوں کو دیکھتے رہنا چاہتی ہوں۔''

تڑکے کے بعد سے کمرہ ایسی آوازوں سے بھر گیا جیسی عموماً دیہاتوں میں آیا کرتی ہیں۔ بچہ رونے لگا۔ لڑکی اسے اٹھا کر بستر میں لے آئی اور دودھ پلانے لگی۔ اس دوران میں وہ ایک سہل سی لوری بھی گنگناتی رہی حتیٰ کہ وہ تینوں دوبارہ سو گئے۔ داماسو کو پتا ہی نہ چلا کہ سات بجے کے قریب لڑکی بیدار ہو کر کمرے سے باہر گئی تھی اور بچے کو کہیں چھوڑ آئی تھی۔

داماسو کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ رات بھر میں ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں سویا۔

''کس لیے؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کالے کو دیکھنے جس نے گیندیں چرائی تھیں،'' لڑکی نے کہا۔ ''آج وہ اسے کہیں اور لے جا رہے ہیں۔''

داماسو نے سگریٹ سلگایا۔

''بے چارہ!'' لڑکی نے آہ بھری۔

''بے چارہ کیوں؟'' داماسو نے کہا۔ ''اسے چوری کرنے کو کس نے کہا تھا؟''

لڑکی نے ایک لمحے کو اپنا سر اس کے سینے میں چھپا لیا۔ پھر آہستہ سے بولی:

''وہ چور نہیں ہے۔''

''کون کہتا ہے؟''

"مجھے پتا ہے،" لڑکی نے کہا۔ "جس رات بلیرڈ ہال میں چوری ہوئی، وہ گلوریا کے ساتھ تھا۔ حتیٰ کہ اس سے اگلے روز بھی وہ شام پڑنے تک اسی کے کمرے میں تھا۔ لیکن پھر پتا چلا کہ اسے سینما ہال میں سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

"تو گلوریا نے پولیس کو بتایا کیوں نہیں؟"

"کالے نے بتایا تھا۔ لیکن قصبے کا میئر گلوریا کے کمرے میں آیا، اس کا سارا سامان اُلٹ پلٹ کر دیا اور اسے دھمکی دی کہ اسے بھی شریک جرم کے طور پر دھر لیا جائے گا۔ آخر کار بیس پیسو دے کر بے چاری نے اپنی جان چھڑائی۔"

آٹھ بجے داماسو اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہیں رہ جاؤ،" لڑکی نے کہا۔ "آج دوپہر تمہارے لیے مرغا ذبح کر کے پکاؤں گی۔"

داماسو نے کنگھی کو اپنی پتلون کی جیب میں اُڑسنے سے پہلے ہتھیلی پر دو تین بار جھٹکا۔ "مشکل سے،" اس نے لڑکی کو کلائیوں سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔ لڑکی نے ابھی ابھی منہ دھویا تھا اور وہ واقعی بہت کم عمر تھی۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں کی وجہ سے اس کے چہرے پر بے بسی کا تاثر تھا۔ وہ بازو داماسو کی کمر کے گرد حمائل کیے کھڑی رہی۔

"نہیں، یہیں رہ جاؤ،" لڑکی نے اصرار کیا۔

لڑکی شرما کر داماسو سے الگ ہو گئی۔

"مسخرہ!" اس نے کہا۔

آنا اس صبح تھکی ہوئی تھی، لیکن قصبے میں پھیلا ہوا جوش و خروش متعدی بیماری کی طرح اسے بھی لگ گیا۔ سابقہ دنوں کی نسبت اس ہفتے کی دھلائی اس نے زیادہ تیزی سے اکٹھی کی اور گھاٹ پر کالے کی روانگی کا منظر دیکھنے کے لیے چل دی۔ لوگوں کا بے صبرا ہجوم دُخانی کشتیوں کے قریب منتظر تھا، جو روانہ ہونے والی تھیں۔ داماسو بھی وہیں تھا۔

آنا نے انگلیوں سے اس کے گردوں کے پاس ٹہوکا دیا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" داماسو نے چونک کر پوچھا۔

"تمہیں خدا حافظ کہنے آئی تھی،" آنا نے کہا۔

داماسو نے نزدیک کے ایک کھمبے کو کس کر مکا لگایا۔

''لعنت ہو تم پر،'' اس نے کہا۔

سگریٹ سلگا کر خالی پیکٹ اس نے دریا میں پھینک دیا۔ آنا نے ایک نیا بھرا ہوا پیکٹ اپنی اسکرٹ کے اندر سے نکال کر داماسو کی قمیص کی جیب میں ڈال دیا۔

''مجال ہے جو تم نے زندگی سے کچھ سیکھا ہو،'' داماسو نے کہا۔

آنا زور سے ہنسی۔

تھوڑی دیر کے بعد کالے کو لا کر عرشے پر کھڑا کر دیا گیا۔ اسے چوک کے عین درمیان میں سے لے جایا گیا تھا اور اس کی کلائیاں کمر کے پیچھے رسّی سے بندھی ہوئی تھیں جسے پولیس کے ایک سپاہی نے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ دو اور سپاہی بندوقیں اٹھائے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کالے کا اوپر کا دھڑ ننگا تھا، نچلا ہونٹ پھٹا ہوا تھا اور کسی مکئے باز کی طرح اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ وہ منفعل وقار کے ساتھ ہجوم کے مذاق اور فقروں کو نظر انداز کر رہا تھا۔ بلیرڈ ہال کے دروازے پر، جہاں اس تماشے کے دونوں حصے دیکھنے کے لیے زیادہ ہجوم جمع تھا، ہال کا مالک، خاموشی سے سر ہلاتے ہوئے، کالے کو گزرتا دیکھ رہا تھا۔ باقی لوگ ایک طرح کے اشتیاق سے اس پر نظر جمائے ہوئے تھے۔

کشتی فوراً ہی روانہ ہو گئی۔ کالا عرشے پر کھڑا تھا: اس کے ہاتھ پاؤں تیل کے ایک بڑے سے ڈرم کے ساتھ باندھ دیے گئے تھے۔ جب دریا کے درمیان میں پہنچ کر کشتی نے آخری بار سیٹی بجائی اور مڑی تو کالے کی کمر چمک اٹھی۔

''بے چارہ،'' آنا نے سرگوشی کی۔

''جرائم پیشہ، حرام خور،'' آنا کے قریب ہی کسی نے پولیس والوں کو گالی دی۔ ''کسی انسان کا جسم کتنی دیر تک دھوپ کی تپش سہہ سکتا ہے؟''

داماسو نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ آواز ایک بے حد موٹی عورت کی تھی۔ وہ چوک کی طرف چل دیا۔ ''تم زیادہ ہی بکواس کرتی ہو،'' اس نے آنا کے کان میں سرگوشی کی۔ ''چلا چلا کر سب کو ساری کہانی کیوں نہیں سنا دیتیں؟'' وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی بلیرڈ ہال تک آئی۔

''گھر چل کر کپڑے تو تبدیل کر لو،'' اس سے جدا ہوتے وقت آنا نے کہا۔ ''فقیروں جیسے لگ رہے ہو۔''

کالے کے واقعے کی بدولت بلیرڈ ہال کے اندر بہت سے جوشیلے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ روک ان سب کو ایک ساتھ مشروبات فراہم کرنے کی کوشش میں کئی میزوں کے آرڈر اکٹھے لے رہا تھا۔ داماسو منتظر رہا کہ کب روک اس کے قریب سے گزرے۔

''میری مدد کی ضرورت ہے؟'' داماسو نے پوچھا۔
روک نے بیئر کی آدھی درجن بوتلیں اس کے سامنے رکھ دیں۔ گلاس بوتلوں کے اوپر اوندھے رکھے تھے۔
''خدا تمہارا بھلا کرے،'' روک نے کہا۔
داماسو بوتلیں اٹھا کر مختلف میزوں تک لے گیا اور دوپہر کے کھانے کے وقت تک، جب گاہک آخر کار گھروں کو روانہ ہو گئے، لوگوں کے آرڈر لیتا اور بوتلیں لاتا لے جاتا رہا۔ جب وہ گھر پہنچا، آنا نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ اس نے پی رکھی ہے۔ اس نے داماسو کا ہاتھ اٹھا کر اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر رکھا۔
''یہاں محسوس کرو،'' اس نے کہا۔ ''کچھ حرکت محسوس ہوئی؟''
داماسو نے کسی جذبے یا شوق کا اظہار نہ کیا۔
''اندر وہ لاتیں چلا رہا ہے،'' آنا نے کہا۔ ''ساری رات یہی کرتا رہتا ہے۔''
لیکن اس نے کوئی ردعمل نہ دکھایا۔ اپنے آپ میں گم، دوسرے روز وہ صبح سویرے ہی گھر سے باہر نکل گیا اور آدھی رات کے بعد لوٹا۔ پورا ہفتہ یوں ہی گزرا۔ جو چند لمحے وہ گھر میں بسر کرتا ان میں بھی بستر میں لیٹا سگریٹ پھونکتا رہتا اور گفتگو سے گریز کرتا۔ آنا نے بھی اپنے کام میں انہماک بڑھا دیا۔ ان دونوں کے تعلق کے آغاز میں بھی ایک موقعے پر اس نے اسی طرح کا رویہ اختیار کر لیا تھا، لیکن تب آنا اسے اچھی طرح نہیں جانتی تھی اور اسے معلوم نہیں تھا کہ ایسے حالات میں داماسو کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ اس وقت داماسو نے اس کے پیٹ پر چڑھ کر اسے اتنی زور زور سے مکّے مارے تھے کہ وہ لہولہان ہو گئی تھی۔
اس بار وہ انتظار کرتی رہی۔ رات کو وہ لیمپ کے نزدیک سگریٹوں کا ایک پیکٹ رکھ دیا کرتی، کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ داماسو بھوک پیاس برداشت کر سکتا ہے مگر اسے سگریٹ کی طلب کی سہار نہیں۔ بالآخر جولائی کے وسط میں ایک روز داماسو شام پڑتے ہی گھر لوٹ آیا۔ آنا اسے دیکھ کر سخت مضطرب ہوئی۔ اس کے اتنی جلدی گھر واپس آنے کا مطلب یہ تھا کہ اسے کوئی پریشانی لاحق ہے جس کے بارے میں وہ آنا سے بات کرنا چاہتا ہے۔ دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا، لیکن بستر میں داخل ہونے سے پہلے داماسو کھویا کھویا لگ رہا تھا اور نرمی سے باتیں کر رہا تھا۔ یک لخت اس نے کہا:
''میں جانا چاہتا ہوں۔''
''کہاں؟''
''کہیں بھی۔''
آنا نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ رسالوں کے سرورق جنہیں اس نے خود رسالوں سے

اتار کر دیواروں پر چسپاں کیا تھا اور جن پر مختلف فلم اسٹاروں کی تصویریں تھیں، اب پھیکے اور بدرنگ ہو چکے تھے۔ اب اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ ان میں سے کتنے مرد بستر پر سے روزانہ لگاتار دیکھے جاتے رہنے کی وجہ سے اب غائب ہو چکے ہیں اور جاتے جاتے اپنی تصویروں ک رنگ بھی ساتھ لے گئے ہیں۔

''مجھ سے اکتا گئے ہو؟'' آنا نے پوچھا۔

''نہیں: یہ بات نہیں۔ اس قصبے سے اکتا گیا ہوں۔''

''باقی تمام قصبے بھی اسی جیسے ہیں۔''

''گیندیں بھی نہیں بیچ سکتا۔''

''گیندوں کی فکر چھوڑو، آنا نے کہا۔'' جب تک خدا نے مجھے کپڑوں سے کشتی لڑنے کی طاقت دے رکھی ہے، تمہیں کوئی خطرہ مول لیتے پھرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' پھر اس نے نرمی سے اضافہ کیا، ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے یہ کام کیا کیوں؟''

بولنے سے پہلے داماسو نے سگریٹ ختم کیا۔

''وہ اتنا آسان کام تھا کہ مجھے تعجب تھا کہ کسی اور کو کیوں نہیں سوجھا؛'' اس نے کہا۔

''پیسے کی خاطر تو ٹھیک تھا؛'' آنا نے اعتراف کیا؛ ''لیکن کوئی اور گیندیں چرانے کی حماقت نہ کرتا۔''

''وہ تو میں نے سوچے بغیر ہی کیا تھا؛'' داماسو نے کہا۔ ''میں واپس آنے لگا تھا جب مجھے گیندیں کاؤنٹر کے پیچھے ایک ڈبے میں رکھی دکھائی دیں اور میں نے سوچا اتنی محنت کے بعد خالی ہاتھ کیوں واپس جاؤں۔''

''یہی تمہاری غلطی تھی؛'' آنا نے کہا۔

داماسو کو کچھ اطمینان کا احساس ہوا۔ ''اور نئی گیندیں آ ہی نہیں سکتیں؛'' وہ بولا۔ '' بلکہ اب تو یہ پتا چلا ہے کہ وہ اور بھی مہنگی ہوگئی ہیں اس لیے روک نے آرڈر ہی منسوخ کر دیا ہے۔'' اس نے ایک اور سگریٹ سلگایا، اور جیسے جیسے وہ باتیں کرتا گیا، اسے اپنے دل پر سے تیرہ خیالات کا بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔

اس نے آنا کو بتایا کہ ہال کا مالک بلیرڈ کی میز ہی فروخت کرنے کے درپے ہے۔ میز زیادہ قیمتی نہیں تھی۔ نوآموز کھیلنے والوں کی بے ڈھنگی حرکتوں سے میز کا کپڑا کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا اور اس پر رنگارنگ کپڑوں کے پیوند لگے ہوئے تھے۔

میز کو مکمل نئے کپڑے کی ضرورت تھی۔ ہال کے گاہکوں کے لیے، جو بلیرڈ کھیلتے کھیلتے بوڑھے ہوئے تھے، اس دوران میں سوائے بیس بال کی کمنٹری سننے کے اور کوئی شغل نہیں تھا۔

''سو،'' داماسو نے اپنا بیان ختم کرتے ہوئے کہا، ''نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے تمام قصبے کی حق تلفی

کی ہے۔"

"اور کچھ حاصل بھی نہیں ہوا۔"

"اگلے ہفتے بیس ہال کے مقابلے بھی ختم ہو جائیں گے،" داماسو نے کہا۔

"یہ تو اتنی پریشانی کی بات نہیں،" آنا نے کہا۔"یہ سوچو کہ اس بے چارے کالے کا کتنا برا حشر ہوا ہے!"

جب وہ داماسو کے کندھے سے لگی بستر پر دراز تھی، جیسے اس کے ساتھ تعلقات کے اوائل میں کبھی ہوا کرتی تھی، اسے معلوم تھا کہ اس کا خاوند کیا سوچ رہا ہے۔ اس نے اس کے سگریٹ ختم کرنے کا انتظار کیا، تب محتاط آواز میں بولی:

"داماسو۔"

"ہاں، کیا بات ہے؟"

"گیندیں واپس کر دو۔"

اس نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔

"میں خود کئی دن سے یہی سوچ رہی ہوں،" اس نے کہا۔"مگر یہ پتا نہیں چل رہا کہ کیسے کروں۔"

انہوں نے طے کیا کہ گیندوں کو کسی ایسی جگہ رکھ دیا جائے جہاں لوگوں کا عام گزر ہو۔ مگر پھر آنا نے سوچا کہ اس حرکت سے بلیرڈ بال کا مسئلہ تو حل ہو جائے گا مگر کالے کا معاملہ یوں ہی اٹکا رہے گا۔ پولیس والے پتا نہیں گیندوں کی برآمدگی سے کیا مطلب نکالیں اور کالے آدمی کو شک کا ذرا سا بھی فائدہ نہ دیں۔ اور یہ بات بھی نظرانداز نہیں کی جا سکتی کہ گیندیں کسی ایسے آدمی کے ہاتھ بھی لگ سکتی ہیں جو انہیں واپس کرنے کی بجائے خود بیچ کھانے کا ارادہ کر لے۔

"اگر یہ کام کرنا ہی ہے تو بہتر یہی ہو گا اسے ٹھیک سے کیا جائے،" آنا نے بات مکمل کی۔

انہوں نے فرش کھود کر گیندیں نکالیں۔ آنا نے انہیں اخبار کے کاغذوں پر لپیٹا، ایسے کہ باہر کا کاغذ کی تہوں سے پیکٹ کے اندر ملفوف اشیا کی شکل کا اندازہ نہ کیا جا سکے، اور انہیں صندوق کے اندر رکھ دیا۔

"مناسب موقعے کا انتظار ضروری ہے،" آنا نے کہا۔

لیکن اس مناسب موقعے کا انتظار کرتے کرتے ہفتوں گزر گئے۔ ۲۰ راگست کی رات کو گیندوں کے چوری ہونے کے دو ماہ بعد، جب داماسو نے روک کو دیکھا تو وہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا پنکھے سے مچھروں کو بھگانے میں مصروف تھا۔ ریڈیو بند ہونے کے باعث اُس کی تنہائی اور زیادہ شدید لگ رہی تھی۔

''میں نے تمہیں کیا بتایا تھا؟'' روک نے یوں جیسے اپنی پیشین گوئی کے پورا ہونے پر مسرور ہو، داماسو سے کہا۔ ''دیکھ لو، کاروبار کا کباڑا ہو گیا ہے!''

داماسو نے رکاڈوں کی مشین میں ایک سکہ ڈالا۔ گانے کی اونچی آواز اور مشین کے رنگوں کی نمائش داماسو کی نظر میں گویا اس کی اپنی وفاداری کا پر شور ثبوت تھے۔ لیکن اس کا تاثر یہ تھا کہ یہ بات روک کے ذہن میں نہیں آتی تھی۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور الٹے سیدھے دلائل سے روک کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جوں ہی وہ کوئی دلیل دیتا، روک جذباتی ہوئے بغیر اور اپنے ہاتھ کے پنکھے کی انکل پچو حرکت کا تواتر قائم رکھے اس کی دلیل کی دھجیاں اڑا دیتا۔

''کچھ نہیں کیا جا سکتا،'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''بیس بال کے مقابلے قیامت تک تو جاری نہیں رہ سکتے۔''

''ہو سکتا ہے گیندیں برآمد ہو جائیں۔''

''نہیں ہوں گی۔''

''وہ کالا انہیں کھا تو نہیں گیا ہوگا۔''

''پولیس نے ہر جگہ تلاشی لے لی تھی،'' روک نے زچ کر دینے والے یقین کے ساتھ کہا۔ ''اس نے انہیں دریا برد کر دیا ہے۔''

''معجزہ بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''بدبختی گھونگے کی رفتار سے چلتی ہے۔ تم معجزوں پر ایمان رکھتے ہو؟''

''ہاں، کبھی کبھار،'' داماسو نے کہا۔

جب داماسو وہاں سے روانہ ہوا، اس وقت تک فلم ختم نہیں ہوئی تھی۔ لاؤڈ سپیکر پر طویل اور ٹوٹے پھوٹے مکالمے تاریک ہوتے ہوئے قصبے میں گونج رہے تھے۔ چند سکونت گاہیں جو ابھی کھلی تھیں عارضی سی لگ رہی تھیں۔ داماسو نے چند قدم سینما ہال کی طرف اٹھائے لیکن پھر مڑ کر ناچ گھر کی طرف چل دیا۔

ناچ کے ہال میں بینڈ ایک اکیلے گاہک کے لیے، جس کے ساتھ دو عورتیں تھیں، دھن بجا رہا تھا۔ باقی سب لوگ معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے دیواروں کے ساتھ یوں لگے بیٹھے تھے جیسے ڈاک کا انتظار کر رہے ہوں۔ داماسو بھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور اس نے شراب فروش لڑکے کو اشارہ کیا کہ اسے ایک بیئر لا دے۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے سانس لینے کے لیے رک رک کر بوتل ہی سے بیئر پیتا رہا اور اس شخص کو جو دو عورتوں کے ساتھ فرش پر ناچ رہا تھا، یوں دیکھتا رہا جیسے شیشے کی اوٹ سے دیکھ رہا ہو۔ وہ شخص قد میں ان دونوں عورتوں سے چھوٹا تھا۔

آدھی رات کو وہ تمام عورتیں جو فلم دیکھنے گئی ہوئی تھیں، آ پہنچیں۔ مردوں کا ایک گروہ ان کے تعاقب میں تھا۔ داماسو کی دوست لڑکی جوان کے ہمراہ تھی، انہیں چھوڑ کر داماسو کے ساتھ آ بیٹھی۔

داماسو نے اس کی جانب نہ دیکھا۔ وہ اب تک بیئر کی نصف درجن بوتلیں پی چکا تھا اور اس شخص کو گھورے جارہا تھا جو اب تین عورتوں کے ساتھ ناچ رہا تھا، لیکن ناچ کے دوران ان عورتوں کی نسبت اپنے پاؤں کی پیچیدہ حرکات پر زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ وہ خوش دکھائی دے رہا تھا، اور یہ ظاہر تھا کہ اگر اس کے پاس ٹانگوں اور بازوؤں کے ساتھ ساتھ ایک دُم بھی ہوتی تو وہ اور زیادہ خوش ہوتا۔

''مجھے یہ آدمی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

''تو اس کی طرف مت دیکھو،'' لڑکی نے کہا۔

لڑکی نے بھی اپنے لیے شراب کا گلاس منگوایا۔ فرش ناچنے والے جوڑوں سے بھرنے لگا، لیکن تین عورتوں کے ساتھ ناچنے والے شخص نے اپنا ناچ جاری رکھا، جیسے وہ ہال میں اکیلا ہو۔ ایک بار ناچ میں مڑتے ہوئے اس کی آنکھیں داماسو سے چار ہوئیں، اور وہ اور زیادہ شدومد سے ناچنے لگا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور اس کے خرگوش جیسے دانت نظر آنے لگے۔ داماسو پلک جھپکانے بغیر اسے گھورتا رہا، حتیٰ کہ اس شخص کو بھی سنجیدگی اختیار کرنا پڑی اور اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔

''اس کا خیال ہے کہ وہ بہت خوش ہے،'' داماسو نے کہا۔

''وہ واقعی بہت خوش ہے،'' لڑکی نے کہا۔ ''وہ جب بھی قصبے میں آتا ہے، دوسرے سفری تاجروں کی طرح یہاں کی موسیقی کے تمام اخراجات برداشت کرتا ہے۔''

داماسو نے اپنی نظریں اس شخص کی طرف سے ہٹا کر لڑکی کی طرف کیں۔

''تو تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟'' اس نے کہا۔ ''اس کے پاس چلی جاؤ۔ جہاں تین کے لیے جگہ ہے، چار کے لیے بھی بن جائے گی۔''

داماسو کی بات کا جواب دیے بغیر لڑکی ناچ کے فرش کی طرف دیکھنے لگی اور گلاس سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتی رہی۔ زرد لباس اس کے شرمیلے پن کو اور نمایاں کر رہا تھا۔

اگلا ناچ داماسو اور لڑکی نے مل کر ناچا۔ جب ناچ ختم ہوا تو داماسو اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ ''میں تو بھوک سے مری جارہی ہوں،'' لڑکی بولی، اور داماسو کا ہاتھ پکڑ کر اسے کاؤنٹر کی جانب لے چلی۔ ''تمہیں بھی تو کھانا کھانا ہے۔'' وہ خوش وخرم آدمی دوسری جانب سے اپنی تین عورتوں کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔

''اے، سنو،'' داماسو نے اسے پکارا۔

وہ داماسو کی طرف دیکھ کر بغیر مسکرایا۔ داماسو نے اپنی ساتھی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس آدمی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

''مجھے تمہارے دانتوں کی نمائش نہیں لگانی۔''

آدمی کا رنگ سفید پڑ گیا مگر وہ مسکراتا رہا۔

''مجھے خود بھی،'' اس نے جواب دیا۔

پیشتر اس کے کہ لڑکی اسے روک سکتی، داماسو نے کس کر ایک مکا اس آدمی کے جبڑے پر ٹکا دیا۔ وہ آدمی فرش کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ کسی اور گاہک نے مداخلت نہ کی۔ ان تینوں عورتوں نے داماسو کو کمر سے جکڑ لیا اور چیخنے چلانے لگیں۔ داماسو کی دوست اسے دھکیل کر ہال کی دوسری جانب لے گئی۔ وہ آدمی فرش پر سے اٹھا۔ مکے کی بدولت اس کا منہ ٹیڑھا ہو رہا تھا۔ وہ بندر کی طرح اچھلتا ہوا فرش کے وسط میں جا پہنچا اور بینڈ کو حکم دیا کہ موسیقی دوبارہ شروع کریں۔

دو بجے کے قریب ہال تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ وہ تمام عورتیں جنہیں رات کے لیے گاہک نہیں ملے تھے، اب بیٹھ کر کھانا کھانے لگی تھیں۔ داماسو کی دوست پھلیوں، تلے ہوئے گوشت اور چاولوں کی ایک قاب لے کر میز پر آئی اور چمچ سے سارے کا سارا کھانا خود کھانے لگی۔ داماسو مدہوش سا بیٹھا اسے تکتا رہا۔ لڑکی نے چمچ میں بھر کر ایک لقمہ اس کی طرف بڑھایا۔

''منہ کھولو۔''

داماسو نے ٹھوڑی جھکا کر سینے پر ٹکالی اور نفی میں سر ہلایا۔

''یہ عورتوں کی خوراک ہے۔ مردوں کی نہیں۔''

کھڑے ہونے کے لیے داماسو کو ہاتھوں سے میز کا سہارا لینا پڑا۔ جب اس کا جسمانی توازن درست ہوا، شراب فروش بازو سینے پر باندھے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''لو اسی پیسو تمہارے ذمے نکلتے ہیں،'' وہ بولا۔ ''شراب مفت کی نہیں تھی۔''

داماسو نے اسے ایک جانب دھکیل دیا۔

''مجھے ہیجڑے اچھے نہیں لگتے۔''

لڑکے نے اسے آستین سے دبوچ لیا، لیکن لڑکی کے اشارہ کرنے پر چھوڑ دیا، اور بولا:

''تمہیں ابھی بہت سی چیزوں کا مزہ معلوم نہیں ہے۔''

داماسو لڑکھڑاتا ہوا باہر آیا۔ دریا کی سطح پر چاند کی پراسرار چمک دیکھ کر اُس کے ذہن میں تابندگی کی

ایک لکیر سی ابھری، لیکن فوراً ہی غائب بھی ہوگئی۔ قصبے کے دوسرے سرے پر، اپنے گھر کے آگے پہنچ کر، اپنے دروازے کو دیکھ کر اسے یقین ہوگیا کہ وہ نیند میں چل کر وہاں پہنچا ہے۔ اس نے سر کو دو تین بار جھٹکا اور پریشانی کے عالم میں اسے سرعت سے یہ احساس ہوا کہ اسے اگلا ہر قدم احتیاط کے ساتھ اٹھانا ہے۔ دروازے کو اس نے نہایت آہستگی سے دھکیلا تاکہ قبضوں کی چرچراہٹ کی آواز نہ آئے۔

آنا کو احساس ہوا کہ وہ صندوق میں کچھ تلاش کر رہا ہے۔ لیمپ کی روشنی سے بچنے کے لیے اس نے بستر میں اپنا رخ دیوار کی جانب کر لیا، لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ اس کا خاوند کپڑے نہیں بدل رہا ہے۔ تب جیسے اس کے ذہن میں وجدان کا کوندا لپکا اور وہ بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ داماسو صندوق کے قریب ٹارچ اور گیندوں کا پیکٹ ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا۔

داماسو نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

آنا بستر میں سے کود کر باہر آئی۔ ''تم پاگل ہوگئے ہو،'' وہ بڑبڑائی اور دروازے کی طرف دوڑی۔ جلدی سے اس نے کنڈی چڑھا دی۔ داماسو نے ٹارچ اپنی پتلون کی جیب میں اڑیسی، ساتھ ہی چھوٹا چاقو اور چند ریتیاں بھی جیب میں رکھیں، اور پیکٹ کو بغل میں دبائے دروازے کی جانب بڑھا۔ آنا دروازے سے پیٹھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی۔

''میرے جیتے جی تم باہر نہیں جاسکتے،'' وہ آہستہ سے بولی۔

داماسو نے اسے ایک طرف دھکیلنے کی کوشش کی۔ ''پرے ہٹو،'' اس نے کہا۔ آنا نے دروازے کے پاکھے کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا۔ پلکیں جھپکائے بغیر دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ ''تم بالکل گدھے ہو،'' آنا نے سرگوشی کی۔ ''خدا نے تمہیں خوبصورتی تو دے دی مگر دماغ دیتے وقت سخت کنجوسی سے کام لیا۔'' داماسو نے اسے بالوں سے پکڑ لیا اور اس کی کلائی مروڑنے لگا۔ آنا کا سر جھک گیا۔ بھنچے ہوئے دانتوں کے ساتھ داماسو نے اسے دھمکایا، ''میں نے کہا ہے پرے ہٹ جاؤ۔'' آنا نے سر موڑ کر آنکھ کے کون سے اسے یوں دیکھا جیسے ہل میں جتا ہوا بیل دیکھتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے آنا کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے کوئی جسمانی ضرر نہیں پہنچایا جاسکتا، اور وہ اپنے خاوند سے زیادہ طاقت ور ہے، لیکن داماسو نے اس کے بالوں کو اتنے بل دیے کہ اس کا گلا آنسوؤں سے رندھ گیا۔

''تم بچے کو مار ڈالو گے،'' آنا نے کہا۔

کچھ گھسیٹتے اور کچھ بازوؤں میں اٹھائے ہوئے وہ آنا کو بستر تک لے گیا۔ لیکن جب اس نے اسے چھوڑا تو وہ اس کی کمر پر سوار ہوگئی، اور اپنی ٹانگوں سے اسے جکڑ لیا۔ وہ دونوں بستر پر گر گئے۔ دونوں کا سانس

پھول رہا تھا۔ ''میں چیخنا شروع کردوں گی،'' آنا نے سرگوشی میں کہا۔ ''تم یہاں سے ہلے تو میں چیخنا شروع کردوں گی۔'' داماسو غصے میں پھنکار رہا تھا۔ اس نے گیندوں کا پیکٹ اٹھا کر آنا کے گھٹنے پر مارا۔ آنا کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکلی اور اس کی ٹانگوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، لیکن داماسو کو دروازے تک جانے سے روکنے کے لیے وہ اس کی کمر سے چمٹ گئی۔ پھر اس نے التجا اور منت سماجت شروع کردی، ''میں قسم کھاتی ہوں میں کل خود گیندیں وہاں لے جاؤں گی،'' وہ کہہ رہی تھی، ''اور وہاں ایسے چھوڑ کر آؤں گی کہ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔'' دروازے کی جانب گھسٹتے گھسٹتے داماسو اس کے ہاتھوں پر گیندوں کے پیکٹ سے ضربیں لگاتا رہا۔ وہ ایک لحظے کے لیے اپنی گرفت ڈھیلی کرتی تاکہ چوٹ کے درد پر قابو پا سکے، لیکن پھر اس سے چمٹ جاتی اور التجائیں کرنے لگتی۔

''میں یہاں تک کہہ دوں گی کہ گیندیں میں نے چرائی تھیں،'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''میری اس حالت میں کوئی مجھے جیل میں نہیں ڈالے گا۔''

بالآخر داماسو نے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ ''سارا قصبہ تمہیں دیکھ لے گا،'' آنا نے کہا۔ ''تم اتنے بے وقوف ہو کہ تمہیں یہ بھی پتا نہیں کہ آج پورے چاند کی رات ہے۔'' پیشتر اس کے کہ وہ چٹخنی کھولتا، آنا نے ایک بار پھر اسے پکڑ لیا اور آنکھیں بند کر کے اس کی گردن اور چہرے پر مکے مارنے لگی۔ ساتھ ہی وہ چیخ بھی رہی تھی، ''وحشی! درندہ!'' جب داماسو نے مکوں کی بوچھاڑ سے اپنا چہرہ بچانا چاہا تو آنا نے لپک کر ایک ہاتھ سے چٹخنی کو قابو میں کر لیا اور دوسرے سے کس کر مکا اس کے سر پر لگایا۔ داماسو جب وار سے بچنے کے لیے جھکا تو چٹخنی اس کے شانے کی ہڈی سے ٹکرا کر یوں گونجی جیسے کھڑکی کے شیشے سے ٹکرائی ہو۔

''کتیا،'' وہ زور سے چیخا۔

اس لمحے اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ وہ کتنا شور کر رہا ہے۔ ہاتھ کی پشت سے اس نے زور سے آنا کو کنپٹی پر مارا اور اس کے درد سے کراہنے اور پورے جسم کے زور کے ساتھ دیوار سے ٹکرانے کو محسوس کیا، لیکن مڑ کر اسے دیکھے بغیر، دروازہ کھلا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

درد اور تکلیف سے بے سدھ آنا فرش پر پڑی اپنے پیٹ میں کچھ ہونے کی منتظر رہی۔ دیواروں کی دوسری جانب سے ہمسایوں نے اسے آواز دی جیسے کہیں قبر کے اندر سے بول رہے ہوں۔ اس نے اپنے رونے کی آواز روکنے کی خاطر ہونٹ کاٹ لیے۔ تب وہ فرش سے اٹھی اور کپڑے بدلے۔ اس کے ذہن میں بھی یہ خیال نہ گزرا، جیسے ماضی میں بھی ایک بار ایسے ہی ایک موقع پر نہیں گزرا تھا، کہ داماسو ہنوز کمرے کے باہر کھڑا اپنے آپ کو یہ احساس دلانے میں مصروف ہوگا کہ اس کا منصوبہ ناکام ہو چکا ہے اور وہ آنا کے تھوڑی

دیر میں چیختے پکارتے ہوئے باہر آنے کا منتظر ہوگا۔ آنا نے پرانی غلطی کا اعادہ کیا اور اپنے خاوند کے پیچھے باہر بھاگنے کی بجائے جوتے کپڑے پہن کر دروازہ بند کیا اور بستر پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

دروازہ بند ہو جانے پر داماسو کو اندازہ ہوا کہ وہ واپس نہیں جا سکے گا۔ کتوں کے شوروغوغا نے گلی کے آخر تک اس کا تعاقب کیا مگر اس کے بعد وحشت ناک خاموشی چھا گئی۔ وہ اپنے قدموں کی آواز کے خوف سے فٹ پاتھ پر چلنے سے گریز کر رہا تھا جو اس خوابیدہ قصبے میں مہیب اور انجانی لگ رہی تھی، لیکن بلیرڈ ہال کے عقبی دروازے کے مقابل زمین کے خالی قطعے تک پہنچنے تک اس نے کسی احتیاط کا مظاہرہ نہیں کیا۔

اس بار اسے اپنی ٹارچ استعمال کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ دروازہ جہاں سے ٹوٹا تھا صرف وہیں سے ٹھیک کیا گیا تھا۔ اینٹ کے حجم اور شکل کا لکڑی کا ٹکڑا نکال کر ایک نیا ٹکڑا دروازے میں نصب کر کے وہی پرانی کنڈی اور قبضہ دوبارہ وہاں لگا دیا گیا تھا۔ باقی سب کچھ وہی تھا۔ داماسو نے بائیں ہاتھ سے تالے کو کھینچا اور ریتی کو کنڈی کے ان قبضوں کے درمیان پھنسا دیا جو نئے نہیں تھے، اور قدرے زور سے، لیکن تشدد کے بغیر، ریتی کو موڑ کر گیئر کی طرح جھٹکے دینے لگا۔ حتیٰ کہ لکڑی غمگین سی آواز کے ساتھ پھٹ کر ریزہ ریزہ ہوگئی اور قبضے باہر نکل آئے۔ دروازے کو دھکیلنے سے قبل اس نے اسے تھوڑا سا اونچا اٹھا لیا تا کہ اس کے فرش پر رگڑے جانے کی آواز مدھم پڑ جائے۔ دروازہ اس نے صرف آدھا کھولا۔ اپنے جوتے اتار کر گیندوں کے پیکٹ کے ساتھ اندر گھسا دیے اور چاندنی سے روشن کمرے کی اندر داخل ہو گیا۔

اس کے عین مقابل بوتلوں اور خالی ڈبوں سے بھرا ہوا ایک نیم تاریک برآمدہ تھا۔ آگے، چھت کے شیشے میں سے چھن کر آئی چاندنی میں بلیرڈ کی میز پڑی تھی، اس کے بعد الماریوں کی پشت تھی اور سب سے آخر میں، صدر دروازے کے سامنے چھوٹی چھوٹی کرسیوں اور میزوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہر چیز، سوائے چاندنی کے سیلاب اور خاموشی کے خستہ پن کے، پچھلی بار کی طرح تھی۔

اس بار اس نے اکھڑی ہوئی اینٹوں کے بارے میں بھی احتیاط نہ کی۔ کھلے دروازے کے درمیان اس نے اپنے جوتے رکھ دیے اور چاندنی کو عبور کر کے ٹارچ جلائی اور کاؤنٹر کے عقب میں اس چھوٹے سے ڈبے کو تلاش کرنے لگا جس میں گیندیں رکھی جاتی تھیں۔ یہ تمام کام وہ بغیر کسی احتیاط کے کر رہا تھا۔ ٹارچ کی ادھر اُدھر گھومتی ہوئی روشنی میں اس نے گرد آلود شیشیاں، گھوڑے کی رکاب اور مہمیز، موٹر کے تیل میں لتھڑی ہوئی گول کر کے رکھی ہوئی ایک قمیص اور آخر کار وہ ڈبا دیکھا جس میں گیندیں رکھی جاتی تھیں۔ ڈبا عین اسی جگہ پڑا تھا جہاں پچھلی بار تھا۔ ٹارچ کی روشنی کو حرکت دیتے ہوئے وہ کاؤنٹر کے آخر تک لے گیا۔ وہاں وہی بلی تھی۔

بغیر کسی اسرار کے بلی نے اسے ٹارچ کی روشنی کے مقابل دیکھا۔ داماسو نے روشنی کی شعاع اس پر

مرکوز رکھی حتیٰ کہ اسے قدرے خوف کے ساتھ یاد آیا کہ دن کے وقت اس نے کبھی بلی کو اس جگہ بیٹھے نہیں دیکھا۔ اس نے شعاع کو جھٹکا دے کر اور بلی کو ''ہش'' کہہ کر بھگانے کی کوشش کی، مگر اس جانور پر اس حرکت کا مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔ تب یک لخت اس کے ذہن میں ایک خاموش سا دھما کہ ہوا اور بلی اس کے ذہن سے یکسر محو ہوگئی۔ جب تک وہ یہ باور کر سکتا کہ کیا واقعہ رونما ہوا ہے، ٹارچ اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی اور وہ گیندوں کے پیکٹ کو سینے سے لگائے کھڑا تھا۔ ہال کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔

''خوب!''

اس نے روک کی آواز پہچان لی۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑا ہوگیا۔ اس کے گردوں میں گہری تھکن اتری آئی تھی۔ روک کمرے کے عقب سے چلتا ہوا اس کی جانب آیا: وہ زیر جامہ پہنے ہوئے تھا، اس کے ہاتھ میں لوہے کا سریا تھا اور اس کی آنکھیں بجلی کی روشنی سے چندھیائی ہوئی تھیں۔ بوتلوں اور خالی ڈبوں والے برآمدے میں، جہاں سے داماسو گزر کر آیا تھا، ایک جھولنے والا بستر لٹکا ہوا تھا۔ یہ بستر پچھلی بار وہاں موجود نہیں تھا۔

داماسو سے تیس قدم کے فاصلے پر پہنچ کر روک تھوڑا سا اچھلا اور اپنا دفاع کرنے کے انداز میں کھڑا ہوگیا۔ داماسو نے اپنا ہاتھ، جس میں گیندیں تھیں، کمر کے پیچھے چھپا لیا۔ روک نے ناک سکیڑی اور سر آگے نکال کر عینک کے بغیر داماسو کو پہچاننے کی کوشش کی۔

''تم؟'' وہ چلایا۔

داماسو کو لگا جیسے کوئی لامتناہی بات آخر اپنے انجام کو پہنچ گئی ہو۔ روک سر کو جھکا کر چلتا ہوا داماسو کے قریب آیا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا، اور نقلی دانتوں کے بغیر اس کا چہرہ کسی عورت کا لگ رہا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ نہیں،'' داماسو نے جواب دیا۔

اس نے جسم کی خفیف، غیر محسوس سی حرکت سے پہلو بدلا۔

''یہ تمہارے پاس کیا ہے؟''

داماسو ایک قدم پیچھے ہٹا۔ ''کچھ نہیں،'' وہ بولا۔ روک کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ کانپنے لگا۔ ''یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟'' وہ چیخ کر بولا اور سریا ہاتھ میں اٹھائے اس کی طرف بڑھا۔ داماسو نے پیکٹ اس کے حوالے کر دیا۔ روک نے بائیں ہاتھ سے پیکٹ پکڑ لیا اور انگلیوں سے اسے جانچنے لگا۔ وہ اب بھی چوکس تھا۔ تب آخرکار اسے پتا چل گیا۔

''یہ ناممکن ہے!'' اس نے کہا۔

وہ اتنا حیرت زدہ تھا کہ اس نے سریا کاؤنٹر پر رکھ دیا اور تھوڑی دیر کے لیے داماسو کی موجودگی کو بھول کر پیکٹ کو کھولنے میں لگ گیا۔ خاموشی سے وہ گیندوں کو دیکھتا رہا۔

''میں انہیں واپس رکھنے آیا تھا،'' داماسو نے کہا۔

''یقیناً،'' روک بولا۔

داماسو کا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ شراب کا اثر اس کے جسم سے یکسر زائل ہو چکا تھا: اس کی زبان پر بجری سے گاد باقی تھی اور ذہن میں اکیلے پن کا مبہم احساس تھا۔ ''تو یہ تھا وہ معجزہ!'' روک نے گیندوں کو دوبارہ کاغذ میں لپیٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنے بے وقوف بھی ہو سکتے ہو۔'' جب اس نے سر اوپر اٹھایا تو اس کے چہرے کا تاثر بدل چکا تھا۔

''اور میرے وہ سو پیسو؟''

'دراز خالی تھی،'' داماسو نے کہا۔ روک نے غور سے، خالی منہ چلاتے ہوئے داماسو کو دیکھا اور مسکرایا۔

''اچھا تو دراز خالی تھی،'' اس نے کئی بار دوہرایا۔ ''دراز میں کچھ نہیں تھا؟'' اس نے سریا پھر پکڑ لیا۔

''اس واقعے کی اطلاع تو میئر کو فوراً ملنی چاہیے۔''

داماسو نے اپنی ہتھیلیوں کا پسینا پتلون پر رگڑ کر خشک کیا۔

روک مسکراتا رہا۔

''وہاں دو سو پیسو تھے،'' اس نے کہا۔ ''اور اب وہ رقم تمہاری چمڑی ادھیڑ کر نکالی جائے گی۔ اس لیے نہیں کہ تم نے چوری کی تھی بلکہ اس لیے کہ تم جیسا احمق آج تک پیدا نہیں ہوا۔''

☆☆

گابریئل گارسیا مارکیز
ترجمہ: افضال احمد سید

ایک پیش گفتہ موت کی روداد

جس دن اسے قتل کیا جانے والا تھا، سانتیاگو نصر ساڑھے پانچ بجے اس کشتی کا انتظار کرنے کے لیے بیدار ہوا جس پر بشپ آ رہا تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ عماراتی لکڑی والے درختوں کے جھنڈ سے گزر رہا ہے جہاں ہلکی بوندیں پڑ رہی ہیں اور ایک لمحے کے لیے وہ اپنے خواب میں خوش تھا، مگر جب وہ جاگا، اس نے خود کو چڑیوں کی بیٹ سے مکمل طور پر لتھڑا ہوا پایا۔ وہ ہمیشہ درختوں کے بارے میں خواب دیکھتا تھا، ''پلاسیدالینیسیر و اس کی ماں، نے ستائیس سال بعد اس ناخوش آئند سوموار کی تفصیل یاد کرتے ہوئے مجھے بتایا۔'' ایک ہفتے پہلے اس نے خواب دیکھا تھا کہ وہ ٹین کے ورق سے بنے ہوائی جہاز میں تنہا ہے اور بادام کے باغوں میں کسی درخت سے ٹکرائے بغیر اڑ رہا ہے،'' اس نے مجھے بتایا۔ پلاسیدالینیسیر وکو دوسروں کے خوابوں کی، اگر وہ نہار منہ سنائے جاتے، درست تعبیر بتانے میں بجا طور پر ایک نیک نامی حاصل تھی۔ مگر وہ اپنے بیٹے کے ان دو خوابوں میں، یا درختوں کے دوسرے خوابوں میں جو اس نے اپنے قتل سے پہلے والی صبحوں میں اسے سنائے تھے، کسی بدشگونی کو محسوس نہیں کر سکی تھی۔

نہ سانتیاگو نصر ہی پیش گوئی کو جان سکا۔ وہ کپڑوں سمیت، کم اور بے حال سویا، اور سر درد اور الوداعی جرعے کی تلچھٹ اپنی زبان پر لیے نیند سے جاگا، اور اس نے انہیں شادی کی رنگ رلیوں کے، جو آدھی رات کے بعد تک مچتی رہی تھیں، قدرتی اثر سے وابستہ کیا۔ اس کے علاوہ ان بہت سے لوگوں کو جن سے وہ چھ بج کر پانچ منٹ پر اپنا گھر چھوڑنے سے لے کر ایک گھنٹے بعد تک، جب وہ سور کی طرح کاٹ کر رکھ دیا گیا، راستے میں ملا، یاد تھا کہ وہ ذرا خواب آلود مگر خوش مزاجی میں تھا، اور اس نے ان سب سے ایک بے پروایانہ انداز میں کہا تھا کہ یہ ایک بہت خوبصورت دن ہے۔ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا اشارہ موسم کی کیفیت کی طرف تھا۔ دوبارہ یاد کرتے ہوئے بہت سے افراد نے اس بات پر اتفاق کیا کہ وہ ایک روشن صبح تھی، کیلوں کے باغ سے سمندری ہوا آ رہی تھی، جیسا کہ اس وقت کی ایک پرکیف فروری میں توقع کی جا سکتی تھی۔ مگر زیادہ تر لوگ متفق

تھے کہ ابر آلود نشیبی آسمان اور رکے ہوئے پانی کی درشت بو کی وجہ سے موسم ماتم انگیز تھا۔ اور بدقسمتی کے اس لمحے میں ایک نم نم پھوار، جیسی سانتیا گو نصر نے اپنے خواب کے باغوں میں دیکھی تھی، پڑ رہی تھی۔ میں ماریا الیہاندرینا، سروانتس کی حوار یانہ آغوش میں شادی کے ہنگامے سے بحال ہونے میں مشغول تھا اور اطلاعی گھنٹیوں کی فریاد سے یہ سوچتے ہوئے بیدار ہوا کہ انہیں بشپ کے اعزاز میں بے قرار کر دیا گیا ہے۔

سانتیا گو نصر بغیر کلف لگی سفید لینن کی قمیص اور پتلون میں جیسی کہ اس نے گزشتہ دن شادی میں پہنی تھیں، ملبوس تھا۔ اگر بشپ نہ آ رہا ہوتا تو وہ اپنا خاص خاکی لباس اور ٹخنے سے اونچے گھوڑ سواری کے جوتے پہنتا تھا جو اس نے اپنے باپ سے آرٹ کی تھی اور جس کا اس نے ہوشیاری سے، مگر زیادہ خوش طالعی کے بغیر نظم و نسق چلایا تھا۔ قصبے سے باہر وہ اپنی بیلٹ پر میگنم ۳۵۷ء باندھتا تھا اور اس کی خود چڑھی گولیاں، اس کے کہنے کے بموجب کسی گھوڑے کو درمیان سے کاٹ کر رکھ سکتی تھیں۔ تیتروں کے موسم میں وہ اپنا شکرے سے شکار کرنے کا سازوسامان بھی ساتھ لے جاتا۔ صندوق خانے میں ایک مالنچر شونا اور ۳۰۶ء رائفل، ایک ہالینڈ میگنم ۳۰۰ رائفل، دوہری طاقت کے دور بینی دید پیش والی ہارنیٹ ۲۲ اور ونچسٹر ریپیٹر موجود تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنے باپ کی طرح اسلحہ تکیے کے غلاف میں چھپا کر سوتا تھا، مگر اس دن گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے گولیاں نکال کر نائٹ ٹیبل کی دراز میں ڈال دی تھیں۔ وہ کبھی اسے بھرا ہوا نہیں چھوڑتا تھا، اس کی ماں نے مجھے بتایا۔ میں یہ جانتا تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ بندوقیں ایک جگہ رکھتا تھا اور گولیاں دوسری جگہ کافی فاصلے پر تاکہ کوئی بے مقصد بھی انہیں گھر کے اندر بھرنے کی ترغیب کا شکار نہ ہو سکے۔

یہ ایک ہوش مندانہ روش تھی، جو اس کے باپ نے اس صبح سے ہمیشہ کے لیے قائم کی جب ایک خدمت گار لڑکی نے تکیہ نکالنے کے لیے غلاف کو جھٹکا اور پستول فرش سے ٹکرا کر چل گیا اور گولی کمرے کی الماری کو تباہ کرتی ہوئی نشست کے کمرے کی دیوار میں سے ہو کر پڑوس کے مکان کے کھانے کے کمرے سے گھن گرج کے ساتھ گزری، اور ایک قد آدم وکی کو چوک کے بالمقابل مرکزی محراب پر، پلاسٹر کے غبار میں تبدیل کر دیا۔ سانتیا گو نصر نے جو اس وقت خردسال تھا، کبھی اس حادثے کو فراموش نہیں کیا۔ اس کی ماں کے پاس اس کا آخری عکس اس کا شب خوابی کے کمرے سے تیزی کے ساتھ گزرنا تھا۔ اس نے غسل خانے میں دواؤں کی چھوٹی الماری میں آہستگی سے اسپرین تلاش کرتے ہوئے اپنی ماں کو جگا دیا تھا، اس کی ماں نے بتی جلائی اور اس کو پانی کا ایک گلاس اپنے ہاتھ میں لیے جائے در سے نمودار ہوتے ہوئے دیکھا، جیسا کہ وہ اسے تا ابد یاد رکھے گی۔ سانتیا گو نصر نے اسے خواب کے متعلق بتایا، مگر اس نے درختوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

''پرندوں کا خواب میں نظر آنا اچھی صحت کی علامت ہے،'' وہ بولی۔

اس کی ماں نے اسی جھولے میں اسی کروٹ سے اسے دیکھا تھا، جس میں میں نے اسے بڑھاپے کی آخری روشنیوں میں افتادہ پایا، جب میں نے حافظے کے شکستہ آئینے کے اتنے منتشر ٹکڑوں کو باہم پیوست کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس فراموش قصبے کو مراجعت کی۔ پوری روشنی میں وہ بہ زحمت شکلوں کا اندازہ کر پاتی تھی، اور اپنی کنپٹیوں پر چند شفا بخش پتیاں اس دائمی سر درد کی وجہ سے رکھے ہوئے تھے جو اس کا بیٹا شب خوابی کے کمرے سے آخری بار گزرتے ہوئے اس کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اٹھنے کی کوشش میں جھولے کے معرے کی رسیاں اپنی مٹھی میں جکڑے ہوئے، وہ اپنی کروٹ پر تھی، اور آدھے سایوں میں بپتسمے کے حوض کی وہی بو تھی جس نے جرم کی صبح مجھے چونکا دیا تھا۔

ابھی میں چوکھٹ پر نمودار بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے مجھے سانتیا گونصر کی یاد سے خلط ملط کر دیا۔ وہ وہیں کھڑا تھا، پلاسیدالینیر و نے مجھے بتایا، وہ سفید لینن کا لباس پہنے تھا جسے اس نے سادہ پانی میں دھویا تھا، کیوں کہ جلد اتنی حساس تھی کہ کلف کے شور کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جھولے میں دیر تک بیٹھی کاہو کے بیج چباتی رہی، یہاں تک کہ اس کا یہ اشتباہ کہ اس کا بیٹا لوٹ آیا ہے، رفع ہو گیا۔ پھر اس نے آہ بھری: وہی میری زندگی کا سہارا تھا۔

میں نے سانتیا گونصر کو اس کی ماں کے حافظے میں دیکھا۔ گزشتہ جنوری کے آخری ہفتے میں وہ اکیس سال کا ہو گیا تھا، وہ چھریرا اور پریدہ رنگ تھا، اور اس کے عرب پپوٹے اور گھنگریالے بال اپنے باپ پر تھے۔ وہ ایک غرض مندی کی شادی تھی، جس میں مسرت کا کوئی موقع نہیں آیا، اکلوتی اولاد تھا مگر تین سال پہلے اپنے باپ کی اچانک موت تک وہ اس کے ساتھ خاموش نظر آتا تھا اور اپنی تن تنہا ماں کے ساتھ ویسا ہی خوش نظر آنا جاری رکھے ہوئے تھا، یہاں تک کہ اس کی موت کا سوموار آ گیا۔ اس نے اپنی جبلت اپنی ماں سے پائی تھی۔ اپنے باپ سے اس نے بہت ابتدائی عمر میں آتشیں اسلحے کا چابکدستی سے استعمال، گھوڑوں سے عشق اور اونچے اڑنے والے شکاری پرندوں پر پوری مہارت حاصل کی تھی، مگر پلاسیدالینیر و کے سامنے نہیں، تا کہ وہ اپنے آپ کو جدا محسوس نہ کرے۔ دونوں باپ بیٹے قصبے میں کبھی ہتھیار بند نہیں نظر آئے اور صرف ایک بار وہ اپنے تربیت کردہ پرندے ایک خصوصی بازار میں شکار کے مظاہرے کے لیے لائے تھے۔ اس کے باپ کی موت نے اسے اپنی تعلیم کو ثانوی اسکول کے خاتمے پر ترک کرنے پر مجبور کر دیا تھا، تا کہ وہ موروثی پرورش گاہ کی ذمے داری اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر سنبھال سکے۔ اپنے اوصاف میں سانتیا گونصر خوش وخرم، صلح جو اور کشادہ دل تھا۔ جس دن اسے قتل کیا جانے والا تھا، اس کی ماں نے اسے سفید کپڑوں میں دیکھ کر سوچا کہ وہ اپنے دنوں کے اندازے میں غلطی کر گیا ہے۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ آج سوموار ہے، پلاسیدالینیر و نے مجھے بتایا۔ مگر اس نے اپنی ماں سے وضاحت کی کہ وہ کلیسائی وضع میں اس لیے ملبوس ہے کہ شاید اس بشپ کی انگشتری کا بوسہ لینے کا موقع مل جائے۔ اس کی ماں نے دلچسپی کا

کوئی اظہار نہیں کیا۔ وہ تو کشتی سے اترے گا بھی نہیں، اس نے کہا۔ وہ لوگوں کو حسب دستور فرضی برکتیں دے گا، اور جس راستے سے آیا ہے اس پر لوٹ جائے گا۔ اسے اس قصبے سے نفرت ہے۔

سانتیا گونصر جانتا تھا کہ یہ حقیقت ہے مگر کلیسا کا جاہ وجلال اس کے لیے ایک نا قابل مزاحمت سحر تھا۔ یہ فلموں کی طرح ہے، اس نے مجھ سے ایک بار کہا تھا۔ بشپ کی آمد سے متعلق واحد شے جس سے اس کی ماں غرض رکھتی تھی، سانتیا گونصر کا بارش میں بھیگنے سے بچنا تھا۔ کیونکہ اس نے اسے سوتے میں چھینکتے ہوئے سنا تھا۔ اس نے اسے اپنے ساتھ ایک چھتری لے جانے کا مشورہ دیا۔ مگر وہ الوداع کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ یہ آخری موقع تھا جب اس کی ماں نے اسے دیکھا۔

وکتوریا گزمان، باورچن، غیر متذبذب تھی کہ اس دن بلکہ فروری کے پورے مہینے میں بارش نہیں ہوئی تھی۔ اس کے برخلاف اس نے مجھے بتایا جب میں اس کی موت سے تھوڑے عرصے پہلے اس سے ملنے گیا، دھوپ سے ہر چیز اگست سے پہلے ہی تپنے لگی تھی۔ اور ہانپتے ہوئے کتوں کے درمیان دوپہر کے کھانے کے لیے خرگوشوں کے ٹکڑے کر رہی تھی جب سانتیا گونصر باورچی خانے میں داخل ہوا۔ وہ ہمیشہ ایک فاسد رات کے چہرے کے ساتھ اٹھتا تھا۔ وکتوریا گزمان نے کسی تاثر کے بغیر یاد کیا۔ دیوینا فلور اس کی لڑکی نے جو بلوغت کو پہنچ رہی تھی، سانتیا گونصر کو گنے کی شراب ملی کوہستانی کافی کا ایک مگ پیش کیا تا کہ وہ پچھلی رات کا بوجھ برداشت کر سکے۔ وسیع وعریض باورچی خانہ آگ کی سرگوشیوں اور اپنے رین بسیروں میں سوئی ہوئی مرغیوں کے ساتھ ایک پراسرار فضا رکھتا تھا۔ سانتیا گونصر نے ایک اور اسپرین نکالی اور خاموشی سے سوچتے ہوئے اپنی نظریں ان دوعورتوں سے ہٹائے بغیر جو اسٹوو پر خرگوشوں کے شکم چاک کر رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے گھونٹوں کے ساتھ کافی پینے بیٹھ گیا۔ اپنی عمر کے باوجود وکتوریا گزمان ابھی تک ساخت میں تھی۔ لڑکی ابھی ذرا شوریدہ سر، اپنے غدود کی سرگرمی سے مست نظر آتی تھی۔ سانتیا گونصر نے اسے کلائی سے پکڑا جب وہ خالی مگ اس سے لینے آئی۔

تمہارے بل نکلنے کا وقت آ رہا ہے، اس نے دیوینا فلور سے کہا۔ وکتوریا گزمان نے اسے خون آلود چھری دکھائی۔

اسے چھوڑ دو، اس نے سانتیا گونصر کو سختی سے حکم دیا۔ جب تک میں زندہ ہوں تم اس چشمے کی ایک بوند بھی نہیں چکھ سکو گے۔

وہ ابراہیم کے ہاتھوں اپنے عنفوان شباب میں گمراہ ہوئی تھی۔ اس نے اس کے ساتھ پرورش گاہ کے اصطبلوں میں کئی سال تک درپردہ اختلاط جاری رکھا تھا۔ جب مہر ومحبت ختم ہوئی تو وہ وکتوریا گزمان کو ایک گھریلو خادمہ بنانے کے لیے لے آیا۔ دیوینا فلور جو کسی بعد کے مرد سے تھی، جانتی تھی کہ وہ سانتیا گونصر کے

دزدانہ بستر کے لیے مقدر ہے، اور یہ خیال اسے ایک پیش از وقت اذیت میں ڈال دیتا تھا۔ اس جیسا آدمی پھر کبھی پیدا نہیں ہوا۔ فربہ اور پژمردہ دوسری یاریوں کے نتیجے میں پیدا ہوئے بچوں میں گھری ہوئی دیوینا فلور نے مجھے بتایا۔ وہ بالکل اپنے باپ پر پڑا تھا۔ وکٹوریا گزمان نے اسے جواب دیا، لعنتی مگر وہ سانتیا گونصر کی اس وقت کی دہشت زدگی یاد کرتے ہوئے جب اس نے خرگوش کی انتڑیوں کو جڑ سے نکال باہر کیا تھا اور ابلتی ہوئی اوجھڑی کتوں کے آگے پھینک دی تھی، خوف کے امر سے نہیں بچ سکی۔

''جنگلی مت بنو، اس نے کہا تھا، سمجھ لو کہ یہ ایک انسانی وجود تھا۔ وکٹوریا گزمان کو تقریباً بیس سال یہ سمجھنے میں لگے کہ بے مدافعت جانوروں کو شکار کرنے کا عادی شخص بھی اچانک ایسی دہشت کا اظہار کر سکتا تھا۔ میرے خدا، اس نے حیرت سے کہا، یہ سب کچھ کیسا انکشاف تھا۔ مگر اس کے باوجود جرم کی صبح اس کے پاس اتنے ملتوی شدہ غصے جمع تھے کہ وہ سانتیا گونصر کے ناشتے کو تلخ کرنے کے لیے کتوں کو دوسرے خرگوشوں کی انتڑیاں کھلاتی چلی گئی۔ وہ اسی عمل میں تھے جب تمام قصبہ اس دخانی کشتی کے جس پر بشپ آ رہا تھا، زمین کو کپکپا دینے والے شور سے جاگ اٹھا۔

ان کا گھر ایک سابقہ گودام تھا، جس میں دو منزلیں، تختوں کی دیواریں اور ٹین کی نوک دار چھت تھی جس پر گدھ بیٹھے گودی کے آخور کی نگہبانی کیا کرتے تھے۔ یہ ان دنوں میں تعمیر ہوا تھا جب دریا اتنا قابلِ استعمال تھا کہ بہت سے بجرے، بلکہ چند بڑے جہاز بھی دہانے کی دلدلوں سے سمندر تک اسی راستے سے جاتے تھے۔ ابراہیم نصر جس زمانے میں خانہ جنگیوں کے خاتمے پر آخری عربوں کے ساتھ آیا، دریا کی گزرگاہ بدل جانے کی وجہ سے جہاز آنے بند ہو گئے تھے اور گودام متروک ہو چکا تھا۔ ابراہیم نصر نے اسے ارزاں قیمت پر درآمدی اشیا ذخیرہ کرنے کے خیال سے خریدا تھا، مگر اس نے اس جگہ کا یہ استعمال کبھی نہیں کیا۔ جب وہ شادی کرنے جا رہا تھا، اس نے اسے رہنے کے لیے ایک مکان میں تبدیل کر دیا۔ زمینی منزل پر اس نے ایک بڑا کمرہ بنایا جو ہر طرح کے کام کے لیے تھا اور عقب میں چار جانوروں کا اصطبل، نوکروں کی کوٹھریاں اور ایک دہقانی باورچی خانہ بنایا جس کی گودی کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں سے پانی کی سڑاند ہر وقت آتی رہتی تھی۔ واحد شے جو اس نے کمرے میں صحیح وسالم چھوڑی تھی، کسی تباہ شدہ جہاز سے بازیاب ہوا چکر دار سیڑھیوں کا زینہ تھا۔ اوپر کی منزل پر جہاں پہلے کسٹم کے دفاتر تھے اس نے شب خوابی کے دو بڑے کمرے اور پانچ چھوٹے چھوٹے کمرے ان بہت سے بچوں کے لیے بنائے جو وہ پیدا کرنا چاہتا تھا اور ایک چوبی بالکنی بنائی جو چوک میں بادام کے درختوں پر کھلتی تھی اور جہاں پلاسید الیسیر و مارچ کی سہ پہروں میں اپنے آپ کو تنہائیوں پر دلاسا دینے کے لیے بیٹھے رہنے والی تھی۔ صدر دروازہ اس نے سامنے کی طرف رکھا تھا اور خراد کی ہوئی سلاخوں والی دو تمام قد کھڑکیاں بنائی تھیں۔ اس نے

گھوڑے کے نکلنے کے قابل ذرا اونچائی کے ساتھ ایک عقبی دروازہ تھا اور گودی کے پرانے پل کا ایک حصہ میر استعمال میں رکھا تھا۔ عقبی دروازہ شروع ہی سے زیادہ مستعمل تھا نہ صرف اس بنا پر کہ یہ جانوروں کی ناندوں اور باورچی خانے کے لیے قدرتی داخلہ تھا، بلکہ اس لیے بھی کہ چوک کا چکر لگائے بغیر گودی کو جانے والی سڑک پر کھلتا تھا۔ سامنے کا دروازہ تقریبات کے سوا بند اور آگل چڑھا رہتا تھا۔ تاہم کسی اور دروازے کے بجائے، جو لوگ اسے قتل کرنے جا رہے تھے اسی پر سنتیا گونصر کا انتظار کر رہے تھے، اور وہیں سے سانتیا گونصر بشپ کو خیر مقدم کرنے باہر نکلا، حالانکہ اس طرح اسے گودی تک پہنچنے کے لیے گھر کے گرد پورا چکر لگانا پڑا تھا۔

کوئی بھی اس مہلک اتفاق کو نہیں سمجھ سکا۔ تفتیشی جج نے جو ریوہاچا سے آیا تھا، تسلیم کرنے کی جرأت کیے بغیر اسے ضرور محسوس کیا ہوگا، کیونکہ اس کی معقول وضاحت پیش کرنے میں اس کی دلچسپی رپورٹ عیاں تھی۔ چوک کی طرف کھلنے والے دروازے کا چوتی والے ناولوں کے سے 'خونی دروازے' کے نام سے، کئی بار تذکرہ آیا۔ اصل میں صرف پلاسید الیسیر و کی تشریح قابل قبول معلوم ہوتی تھی۔ جس نے اس سوال کا مادرانہ حکمت سے جواب دیا تھا، میرا بیٹا جب اچھا لباس پہنے ہوتا کبھی عقبی دروازہ استعمال نہیں کرتا تھا۔ یہ ایک ایسی سامنے کی بات محسوس ہوئی کہ تفتیش کرنے والے نے اسے حاشیے کے طور پر درج کیا اور رپورٹ میں شامل نہیں کیا۔

وکتوریا گزمان اپنے طور پر جواب میں قطعی تھی کہ نہ وہ اور نہ اس کی بیٹی یہ جانتی تھی کہ وہ سانتیا گونصر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر اپنی عمر کے ایک دور میں اس نے اعتراف کیا کہ جس وقت سانتیا گونصر باورچی خانے میں کافی پینے آیا تھا، وہ دونوں اس بات سے واقف ہو چکی تھیں۔ یہ اطلاع انہیں ایک عورت سے ملی تھی جو پانچ بجے تھوڑا سا دودھ مانگنے آئی۔ اس نے اس کے ساتھ ساتھ قتل کا سبب اور وہ جگہ بھی جہاں وہ انتظار کر رہے تھے، بتا دی تھی۔ میں نے اسے خبردار نہیں کیا، کیونکہ میں سمجھی کہ یہ بدمستوں کی باتیں ہیں، اس نے مجھے بتایا۔ تاہم دیوینا فلور نے ایک بعد کی ملاقات میں جب اس کی ماں کو گزرے ہوئے مدت ہو چکی تھی۔ مجھ سے اعتراف کیا کہ وکتوریا گزمان نے سانتیا گونصر کو اس لیے کچھ نہیں بتایا تھا کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ چاہتی تھی کہ وہ قتل کر دیا جائے۔ اور خود اس نے سانتیا گونصر کو اس لیے متنبہ نہیں کیا کہ اس وقت وہ خودمختارانہ فیصلہ کرنے کی اہلیت سے عاری ایک سہمی ہوئی بچی سے زیادہ نہیں تھی اور سب سے بڑھ کر اس پر خوف غالب آ گیا جب سانتیا گونصر نے اس کی کلائی ایک ایسے یخ اور سنگلاخ ہاتھ سے پکڑ لی جو اسے کسی مرے ہوئے آدمی کا ہاتھ محسوس ہوا تھا۔

سانتیا گونصر سایہ دار گھر سے، بشپ کی کشتی سے اٹھتے ہوئے شادمانی کے شور میں تیز قدم نکلا۔ دیوینا فلور، اس کوشش میں کہ کہیں وہ کھانے کے کمرے میں خوابیدہ پرندوں کے پنجروں کے درمیان، یا نشست کے کمرے

میں بید کے فرنیچر اور فرن کے آویزاں گملوں تک اس سے پہلے نہ پہنچ جائے۔ اس سے آگے بھاگی، مگر آگل اتارتے ہوئے اس بار وہ سفاک شکرے کے پنجے سے نہیں بچ سکی۔ اس نے میری سموچی فرج دبوچ لی تھی۔ دیوینا فلور نے مجھے بتایا۔ جب وہ مجھے گھر کے کسی کونے میں پکڑ لیتا، ہمیشہ یہی کیا کرتا تھا، مگر اس دن میں نے غیر معمولی حیرت نہیں بلکہ رو پڑنے کی ایک شدید طلب محسوس کی۔ وہ ہٹ گئی تاکہ سانتیا گونصر باہر نکل جائے، نیم وا دروازے سے اس نے صبح کی برف سی روشنی میں چوک کے بادام کے درختوں کو دیکھا، مگر اس میں کسی اور چیز کو دیکھنے کی جرأت نہیں تھی۔ پھر کشتی نے ترم ترم کرنا بند کر دیا اور مرغوں نے بانگیں دینی شروع کیں۔ دیوینا فلور نے مجھے بتایا۔ ہنگامہ اتنا تھا کہ مجھے یقین کرنا مشکل تھا کہ قصبے میں اتنے مرغے ہو سکتے ہیں اور میں نے سمجھا کہ وہ بشپ کی کشتی پر آ رہے ہیں۔ اس آدمی کے لیے جو کبھی اس کا نہیں تھا وہ صرف اتنا کر سکتی تھی کہ دروازہ پلاسید الیسیر و کے احکام کے خلاف اس کی ہنگامی واپسی کے لیے آگل چڑھائے بغیر رہنے دیتی۔ کسی نے جس کی کبھی شناخت نہیں ہو سکی، ایک لفافہ دروازے کے اندر ڈال دیا تھا، جس میں کاغذ کے ایک پرزے پر سانتیا گونصر کو خبردار کیا گیا تھا کہ وہ اسے قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں اور اس تحریر میں مقام، محرک اور منصوبے کی دیگر تفصیلوں کا بے کم و کاست انکشاف تھا۔ پیغام فرش پر تھا جب سانتیا گونصر اپنے گھر سے نکلا مگر اس پر اس کی نظر نہیں پڑی۔ دیوینا فلور، یا اور کسی نے بھی اسے بہت بعد میں دیکھا جب جرم پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

چھ بجے تھے اور سڑک پر بتیاں ابھی تک جل رہی تھیں۔ بادام کے درختوں کی شاخوں اور چند بالکنیوں میں عروسی آرائشیں ہنوز آویزاں تھیں اور یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ وہ بشپ کے اعزاز میں لگائی گئی ہیں اور بیرونی زینوں تک جہاں بینڈ اسٹینڈ تھا، سنگ فرش کیا ہوا چوک خالی بوتلوں اور عوامی جشن کے ہر نوع کے ملبے کی وجہ سے بے ترتیبی کا انبار نظر آ رہا تھا۔ جب سانتیا گونصر نکلا کئی آدمی کشتی کے شور سے سرعت پذیر ہو کر گودی کی طرف بھاگ رہے تھے۔

صرف اس مقام پر جہاں چوک میں کلیسا کی ایک طرف دودھ کی دکان تھی، دو آدمی تھے جو سانتیا گونصر کا اسے قتل کرنے کے لیے انتظار کر رہے تھے۔ کلوتیلدے آرمتیا دکان کی مالک طلوع آفتاب کی تمتماہٹ میں اسے دیکھنے والی پہلی ہستی تھی اور اس کو یہ خیال سا آیا کہ سانتیا گونصر المونیم کے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ وہ قتل ہونے سے پہلے ہی کسی روح کی طرح نظر آ رہا تھا۔ کلوتیلدے آرمنتا نے مجھے بتایا۔ وہ لوگ جو اسے قتل کرنے جا رہے تھے، اخبار میں لپٹنے ہوئے چھروں کو اپنے سینے سے جکڑے بچوں پر سوئے ہوئے تھے اور کلوتیلدے آرمنتا ان کی نیند ٹوٹ جانے کے خوف سے اپنی سانس روکے ہوئے تھی۔

وہ دونوں جڑواں تھے، پیدرو اور پابلو ویکاریو وہ چوبیس سال کے تھے، اور اس حد تک مماثل کہ انہیں الگ

الگ شناخت کرنا دشوار تھا۔ ان کے چہرے کے نقوش تیکھے مگر خوشگوار تھے، رپورٹ میں لکھا تھا۔ میں نے بھی جو انہیں گرامر اسکول سے جانتا تھا، یہی لکھا ہوتا۔ وہ اس وقت بھی رات کی عروسی تقریب کے سیاہ سوٹوں میں تھے جو کریبین کے لیے بہت بوجھل اور پرتکلف تھے اور وہ عیش وعشرت کی اتنی ساعتوں کے بعد فرض سمجھکر شیو بنا لینے پر بھی، تباہ حال لگ رہے تھے۔ اگرچہ انہوں نے شادی کی شام سے شراب نوشی جاری رکھی تھی، تیسرے دن کے اختتام پر وہ نشے میں نہیں تھے، بلکہ کسی حد تک اجڑی ہوئی نیند کے ساتھ خواب میں چلتے نظر آ رہے تھے۔ کلوتیلدے آرمینا کی دکان پر تین گھنٹے کے انتظار کے بعد وہ صبح کی باد اولیں کے ساتھ سو گئے اور یہ پہلی نیند تھی جو جمعہ کے دن سے انہیں نصیب ہوئی۔ کشتی کی پہلی آواز پر وہ بہ مشکل جاگے تھے۔ مگر جب سانتیا گونصر اپنے گھر سے نکلا وجدان نے انہیں مکمل بیدار کر دیا۔ اس وقت ان دونوں نے مڑے ہوئے اخبار کو سنبھالا اور پیدرو ویکاریو کھڑا ہونے لگا۔

''خدا کے لیے، کلوتیدے آرمتا نے بہت آہستہ سے کہا، اسے کسی اور وقت پر چھوڑ دو، حضور بشپ کے احترام ہی میں سہی۔''

''یہ روح القدس کا ایک نفس تھا، وہ اکثر دوہرایا کرتی۔ بے شک یہ ایک امر ربانی تھا، مگر اس کی تاثیر صرف لمحاتی تھی۔

اس کی آہٹ سنتے ہی ویکاریو بھائیوں نے ردعمل کیا اور وہ جو کھڑا ہو چکا تھا، پھر سے بیٹھ گیا۔ دونوں نے سانتیا گونصر کا جب وہ چوک کو طے کر رہا تھا، اپنی نگاہوں سے تعاقب کیا۔ انہوں نے اسے تاسف سے زیادہ دیکھا، کلوتیلدے آرمتا نے کہا۔ راہباؤں کے اسکول کی لڑکیوں نے اپنی یتیموں کی وردی میں چوک کو اسی لمحے بے نظمی سے آہستہ دوڑ کر پار کیا۔

پلاسید الیسیر وکی بات درست تھی: بشپ کشتی سے نہیں اترا۔ گودی پر حکام اور اسکول کے بچوں کے علاوہ بہت سے لوگ اور تھے، ہر طرف خوب پھولے ہوئے مرغوں کے ٹوکرے نظر آ رہے تھے جو بشپ کے لیے تحفے کے طور پر لائے گئے تھے۔ کیونکہ مرغ کی کلغیوں کا سوپ اس کی مرغوب خوراک تھی۔ بار کرنے کے پل پر اتنی سوختنی لکڑیاں جمع تھیں کہ کشتی میں انہیں بھرنے کے لیے کم از کم دو گھنٹے درکار ہوتے۔ مگر وہ رکی نہیں۔ وہ دریا کے موڑ پر ایک اژدہے کی طرح نتھنے پھلاتی نمودار ہوئی، موسیقاروں کے بینڈ نے بشپ کا ترانہ شروع کیا اور مرغوں نے اپنی ٹوکریوں میں بانگیں دے دے کر قصبے کے دوسرے سارے مرغوں کو برانگیختہ کر دیا۔

ان دنوں افسانہ آمیز پیڈل وہیلر جو لکڑیوں کے جلنے سے چلتی تھیں۔ معدوم ہونے کے قریب تھیں اور جو خدمت میں باقی رہ گئی تھیں، ان میں خودنواز پیانو یا عروسی خاص کمرے نہیں تھے اور وہ بہ مشکل بہاؤ کے خلاف

سفر کی اہل تھیں۔ مگر یہ کشتی نئی تھی اور اس میں اک کے بجائے دو چمنیاں تھیں جن پر آرم بینڈوں کی طرح پرچم رنگے گئے تھے۔ اور پشت پر تختوں سے بنے ہوئے پہیے نے اسے ایک بحری جہاز کی سی کارکردگی عطا کردی تھی۔ بالائی عرشے پر کپتان کے کیبن سے متصل، بشپ اپنی سفید عبا اور اپنے اسپانوی خدم وحشم کے ساتھ موجود تھا۔ یہ کرسمس کا زمانہ تھا، میری بہن مارگوت نے کہا اس کے بقول ہوا یہ کہ گودی سے گزرتے ہوئے کشتی کی سیٹی نے دبی ہوئی بھاپ کی ایک بوچھاڑ ماری اور جو لوگ کنارے کے قریب تھے، انہیں شرابور کردیا۔ یہ ایک بے ثبات فریب نظر تھا۔ بشپ نے گودی کے پل پر جمع ہجوم کے مقابل، ہوا میں صلیب کا نشان بنانا شروع کیا اور اس کے بعد کسی خیر وشر کے بغیر کٹھ پتلی کی طرح ایسا کرتا چلا گیا، یہاں تک کہ کشتی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ اور جو کچھ بچ رہا وہ مرغوں کا شور تھا۔

سانتیا گونصر کے لیے خود کو فریب خوردہ محسوس کرنے کی معقول وجہ تھی۔ اس نے فادر کارمین امادور کی صلائے عام پر لکڑیوں کے کئی گٹھر نذر کیے تھے، اور اس کے علاوہ اس نے خود نہایت اشتہا انگیز کلغیوں والے فربہ آختہ مرغوں کا انتخاب کیا تھا۔ میری بہن مارگوت کو جو گودی کے پل پر سانتیا گونصر کے ساتھ تھی، وہ جشن کو جاری رکھنے کی خواہش کے ساتھ خوش نظر آیا تھا، ہر چند کہ اسپرین نے اسے تسکین نہیں دی تھی، وہ پژمردہ نہیں نظر آرہا تھا، اور صرف یہ سوچ رہا تھا کہ شادی کی تقریب پر کیا خرچ ہوا ہوگا، اس نے مجھے بتایا کہ ستو بید یا نے جوان کے ساتھ تھا، ایسی رقموں کا انکشاف کیا جن سے اس کی حیرت اور بڑھ گئی۔ وہ میرے اور سانتیا گونصر کے ساتھ چار بجے سے ذرا پہلے تک کھل کر شراب پیتا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ شب بسری کے لیے اپنے والدین کے پاس نہیں گیا، بلکہ اس نے اپنے دادا کے ہاں محفل جمائی۔ وہاں اسے ان اعداد کا سراغ ملا جو تقریب کے اخراجات کا اندازہ لگانے کے لیے درکار تھے۔ اس نے شمار کیا کہ مہمانوں کے لیے چالیس ترکی مرغیاں اور گیارہ خصی سور ذبح کیے گئے تھے اور چار بچھڑے بھی جو نوشے نے عوامی چوک پر لوگوں کی تواضع میں بھونے جانے کے لیے مخصوص کیے تھے۔ اس نے شمار کیا کہ غیر قانونی طور پر درآمد کردہ الکحل کے ۲۰۵ صندوق خالی ہوئے تھے اور گنے کی شراب کی تقریباً دو ہزار بوتلیں ہجوم میں بانٹی گئی تھیں۔ امیر و غریب، ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس نے کسی نہ کسی طرح اس بے نظیر پر رونق ضیافت میں شرکت نہ کی ہو۔ سانتیا گونصر بہ آواز بلند خواب دیکھنے لگا۔

''میری بھی شادی اسی طرح ہوگی، لوگوں کی زندگیاں اسے بیان کرنے میں ناکافی پڑ جائیں گی۔''

میری بہن نے فرشتے کو پاس سے گزرتے ہوئے محسوس کیا: اس نے ایک بار پھر فلورا میگل کی خوش نصیبی کے بارے میں سوچا، جسے زندگی میں اتنا کچھ حاصل تھا اور جو سانتیا گونصر کو بھی اس سال کرسمس میں حاصل کرنے جا رہی تھی۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ اس سے بہتر شکار نہیں مل سکتا تھا، اس نے مجھے بتایا۔ ذرا سوچو خوش

شکل، وعدہ وفا، اور اکیس سال کی عمر میں ذاتی جائیداد کا مالک۔ جب ہمارے یہاں کساوا کے کلوجے بنے ہوتے وہ اسے ہمارے گھر پر ناشتے کے لیے بلایا کرتی تھی، اور اس صبح میری ماں وہی تیار کر رہی تھی۔ سانتیا گونصر نے اشتیاق کے ساتھ اس کی دعوت قبول کی۔

''میں کپڑے بدل کر تمہارے ہاں آتا ہوں، اس نے کہا اور پھر اسے خیال آیا کہ وہ اپنی گھڑی نائٹ ٹیبل پر چھوڑ آیا ہے۔ کیا وقت ہوا ہوگا؟''

میں پندرہ منٹ کے اندر تمہارے گھر پر ہوں گا، اس نے میری بہن سے کہا۔

میری بہن نے ضد کی کہ وہ اسی وقت ساتھ چلے، کیوں کہ ناشتہ تیار ہو چکا تھا۔ یہ عجیب اصرار تھا، کرستو بیدویا نے مجھے بتایا۔ یہاں تک کہ بعد میں کئی بار مجھے گمان ہوا کہ مارگوت جانتی تھی کہ وہ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں اور وہ اسے تمہارے گھر میں چھپالینا چاہتی تھی۔ سانتیا گونصر نے بہر حال اسے رضامند کرلیا۔ وہ اتنی دیر میں ڈیوائن فیس پر بچھڑوں کو خصی کرنے کے لیے جانے کو گھڑ سواری کا لباس پہننا چاہتا تھا۔ اس نے میری بہن سے اسی موج میں اجازت لی جس میں اس نے اپنی ماں کو الوداع کہا تھا اور کرستو بیدویا کے ہم دوش چوک کی طرف بڑھ گیا۔ یہ آخری موقع تھا کہ میری بہن نے اس کو دیکھا۔

گودی میں کئی لوگ جانتے تھے کہ سانتیا گونصر کو قتل کیا جانے والا ہے۔ دون لزار و آپونتے نے جو اکادمی کرنل کی حیثیت سے سبک دوشی کا لطف اٹھانے کے ساتھ ساتھ گیارہ سال سے قصبے کا میئر بھی تھا، اسے ہاتھ لہرا کر خوش آمدید کہا۔ میں نے واقعی یقین کرلیا تھا کہ اب وہ کسی خطرے کی زد میں نہیں ہے، اس نے مجھے بتایا۔ فادر کارمین امادور بھی پریشان نہیں تھا۔ جب میں نے اسے بہ حفاظت دیکھا، میں نے سمجھا کہ سب کچھ ایک بے ضرر افواہ تھی، اس نے مجھے بتایا کسی نے بھی یہ نہیں پوچھا کہ کیا سانتیا گونصر کو متنبہ کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ اسے خبر نہ پہنچائی گئی ہو۔

میری بہن مارگوت سچ مچ ان چند لوگوں میں سے تھی جو اس وقت تک نہیں جانتے تھے کہ وہ اسے قتل کرنے جا رہے ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا، میں اسے گھر لے جاتی، چاہے مجھے اس کو سور کی طرح باندھ کر لے جانا پڑتا۔ اس نے تفتیشی افسر کو بیان دیا۔ یہ حیرت کی بات تھی کہ اسے معلوم نہیں تھا، مگر اس سے زیادہ تعجب اس پر تھا کہ میری ماں بھی نہیں جانتی تھی جو ہر بات کو گھر کے کسی اور فرد سے پہلے جان جاتی تھی، اس کے باوجود کہ اسے کلیسا کے اجتماع کے لیے بھی گھر سے باہر نکلے برسوں گزر چکے تھے۔ میں اس کی اس صلاحیت سے اس وقت آگاہ ہوا تھا جب میں نے اسکول جانے کے لیے جلد اٹھنا شروع کیا۔ صبح کی خاکستری روشنی میں، زرد اور پراسرار جیسی کہ وہ ان دنوں ہوا کرتی تھی، صحن کو ایک خانہ ساز جھاڑو سے صاف کرتے ہوئے اور کافی کے گھونٹوں

کے درمیان وہ ہمیں بتانا شروع کرتی کہ دنیا میں کیا ہوا جب ہم سو رہے تھے۔ وہ قصبے کے اندر لوگوں، خاص طور پر اپنے ہم عمروں سے خبر رسانی کے خفیہ سلسلے بنائے ہوئے معلوم ہوتی تھی، اور کبھی کبھی وہ ہمیں ان واقعوں کی اطلاع سے حیرت زدہ کردیتی جو اس وقت تک پیش نہیں آئے تھے اور جنہیں وہ صرف اپنی غیب دانی کی استطاعت ہی سے جان سکتی تھی۔ اس صبح مگر اس نے اس سانحے کی دھڑکن نہیں سنی جو رات کو تین بجے سے پرورش پا رہا تھا۔ اس نے صحن میں جھاڑو دینا ختم کیا تھا اور جب میری بہن مارگوت بشپ کا استقبال کرنے باہر نکلی، اس نے اسے کساوا پیستے ہوئے دیکھا۔ مرغوں کی بانگیں سنی جا سکتی تھیں۔ میری ماں اس دن کو یاد کرتے ہوئے کہنے کی عادی ہے۔ اس نے کبھی دور سے آتی ہوئی ان آوازوں کو بشپ کی آمد سے منسوب نہیں کیا۔ وہ انہیں شادی کے جشن کی باقیات سمجھتی رہی۔

ہمارا گھر خاص چوک سے کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے آموں کے باغ میں تھا۔ میری بہن مارگوت گودی تک دریا کے کنارے کنارے چلتی ہوئی گئی تھی، اور لوگ بشپ کی آمد پر اتنے پرجوش تھے کہ وہ کسی اور بات پر توجہ نہیں دے سکے۔ انہوں نے بیماروں کو خدا سے شفا حاصل کرنے کے لیے محرابی دروازوں میں کھڑا کیا تھا۔ اور عورتیں اپنے آنگنوں سے ترکی مرغ اور شیر خوار سور اور ہر طرح کی خوردنی اشیا لیے دوڑی چلی آ رہی تھیں اور دوسرے کنارے سے پھولوں سے سجے ڈونگے پہنچ رہے تھے۔ مگر جب بشپ زمین پر قدم رکھے بغیر چلا گیا، دوسری دبی ہوئی خبر سنسنی خیزی کے درجہ کمال کو پہنچ گئی۔ تب میری بہن مارگوت نے اس کے بارے میں مفصل اور سفاک انداز میں جانا۔ انجلا ویکاریو وہ خوش شکل لڑکی جو ایک دن پہلے بیاہی گئی تھی، اپنے والدین کے گھر لوٹا دی گئی تھی، کیونکہ اس کے شوہر نے دریافت کیا تھا کہ وہ کنواری نہیں ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ میں مرنے والی ہوں، میری بہن نے کہا۔ مگر جو بھی ہوا، انہوں نے اس داستان کو جتنا الٹا پلٹا، کوئی مجھے یہ نہیں بتا سکا کہ غریب سانتیا گو نصر کس طرح اس بکھیڑے میں پڑ کر اپنی جان سے گیا۔ صرف ایک بات جو سب قطعی طور پر جانتے تھے، یہ تھی کہ انجلا ویکاریو کے بھائی اسے قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

میری بہن اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرتی ہوئی گھر واپس آئی۔ اس نے میری ماں کو اتوار کے نیلے پھولوں والے کرتے میں، کہ کہیں بشپ ہم سے ملنے آ ہی جائے، ملبوس دیکھا: وہ میز لگاتے ہوئے غیر مرئی محبت کے بارے میں ایک فادو گا رہی تھی۔ میری بہن نے غور کیا کہ معمول سے ایک پلیٹ زیادہ ہے۔

''یہ سانتیا گو نصر کے لیے ہے، میری ماں نے کہا۔ انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم نے اسے ناشتے پر بلایا ہے۔''

''اسے ہٹا لیں، میری بہن نے کہا۔''

پھر اس نے میری ماں کو بتایا۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ اسے پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے، اس نے مجھے بتایا۔ یہ ہمیشہ کی طرح تھا: آپ اسے کچھ بتانا شروع کریں اور اس سے پہلے کہ کہانی آدھی بھی ہو، وہ جان جائے گی کہ آخر میں کیا ہوا۔ وہ بری خبر میری ماں کے لیے ایک مسئلہ بن گئی۔ بپتسمہ دیتے وقت سانتیا گو نصر کا نام اس کے نام پر رکھا گیا تھا اور اس کی دینی ماں تھی، مگر وہ پیورا ویکاریو واپس کی گئی دلہن کی ماں کی بھی قرابت دار تھی۔ اس کے باوجود خبر سنتے ہی میری ماں نے اونچی ایڑی کے جوتے پہنے اور کلیسائی شال اوڑھی جو وہ صرف عزاداری کے لیے نکلتے وقت اوڑھتی تھی۔ میرا باپ جس نے بستر سے ہر بات سن لی تھی، شب خوابی کے لباس میں نمودار ہوا اور متوحش ہو کر پوچھنے لگا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ اپنی عزیز دوست پلاسیدا کو اطلاع دینے، اس نے جواب دیا۔ یہ نامناسب ہے کہ ہر آدمی جان لے کہ وہ اس کے بیٹے کو قتل کرنے جا رہے ہیں اور ماں ہو کہ اسے معلوم ہی نہ ہو۔

ہمارے ویکاریو سے بھی برابر کے تعلقات ہیں، میرے باپ نے کہا۔

آدمی کو ہمیشہ مرنے والوں کا ساتھ دینا چاہیے۔ اس نے کہا۔

میرے چھوٹے بھائی شب خوابی کے دوسرے کمروں سے نکل کر آنے لگے۔ سب سے چھوٹے نے المیے کی فضا سے متاثر ہو کر رونا شروع کر دیا۔ میری ماں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی: زندگی میں ایک بار اس نے اپنے شوہر کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی۔

''ایک منٹ رکو، میں کپڑے بدل لوں،'' میرے باپ نے کہا۔

وہ سڑک پر نکل آئی: صرف میرا بھائی جیمے، جو اس وقت سات برس سے زیادہ کا نہیں ہوگا، اسکول جانے کے لیے کپڑے بدل چکا تھا۔

''تم اس کے ساتھ جاؤ،'' میرے باپ نے حکم دیا۔

جیمے اس کے پیچھے بھاگا، یہ جانے بغیر کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور وہ کہاں جا رہی ہے اور ماں کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی جا رہی تھی۔ جیمے نے مجھے بتایا۔ بدمعاش، وہ زیر لب کہہ رہی تھی، یہ گندے جانور کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس میں کچھ نہ کچھ شرارت نہ ہو۔ اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ بچے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے۔ انہوں نے ضرور سوچا ہوگا کہ میں پاگل ہوگئی ہوں۔ اس نے مجھے بتایا۔ ایک ہی بات یاد ہے کہ دور سے بہت سے لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں، جیسے شادی کی تقریب پھر سے شروع ہوگئی ہو اور ہر کوئی چوک کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے قدم تیز کر دیے، ایک عزم کے ساتھ جس کی جب کسی کی زندگی خطرے میں ہو، وہ اہل تھی، یہاں تک مخالف سمت سے آتے ہوئے کسی آدمی نے اس کی دیوانگی پر ترس کھایا۔

''زحمت مت کرو، لوئیزا سانتیا گا، وہ گزرتے ہوئے چلایا۔ انہوں نے اسے قتل کر دیا ہے۔''

میلان کنڈیرا
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

کوئی نہیں ہنسے گا

''مجھے تھوڑی اور وائن دینا''، کلارا نے کہا، اور میں اس خیال سے غیر متفق نہ تھا۔ ہم دونوں کے لئے سلیوووتس وائن کی نئی بوتل یوں بھی کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، اور اس بار تو اس کا معقول جواز بھی موجود تھا۔ اس روز مجھے اپنی ایک تحقیقی مقالے کے آخری حصے کی اشاعت پر معاوضے کی خاصی بڑی رقم موصول ہوئی تھی۔ جسے بصری فنون کا ایک پیشہ ورانہ رسالہ قسطوار شائع کر رہا تھا۔

اس مقالے کو شائع کرانا آسان کام ثابت نہیں ہوا تھا۔ میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ خاصا مناظراتی اور متنازعہ تھا۔ میرے پچھلے مقالے اسی باعث ''جریدۂ بصری فنون'' نے، جس کے مدیران عمر رسیدہ اور محتاط لوگ تھے، رد کر کے لوٹا دیے تھے، اور پھر وہ اس کے مدمقابل ایک کم اہم رسالے میں ہی شائع ہو سکتے تھے، جس کے مدیر نسبتاً جوان لوگ تھے اور زیادہ قدامت پرست نہ تھے۔

ڈاکیے نے یونیورسٹی میں رقم کے لفافے کے ساتھ ایک اور خط بھی پہنچایا تھا۔ ایک غیر اہم خط، صبح کے اس مبارک لمحے میں میں نے اس پر سرسری سی نظر ہی ڈالی ہوگی۔ مگر اب گھر پر، جب آدھی رات ہونے کو تھی اور وائن قریب قریب ختم ہو چکی تھی، میں نے اسے، ہم دونوں کی تفریحِ طبع کی خاطر، میز سے اٹھایا۔

''معزز کامریڈ، اور اگر آپ کی طرف سے اجازت ہو تو، میرے رفیق .... میرے رفیق!'' میں نے بلند آواز میں کلارا کو پڑھ کر سنایا۔ ''یہ خط لکھنے پر مجھے، ایک شخص کو جس سے آپ کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی، معاف کیجیے گا۔ میں یہ خط آپ سے یہ درخواست کرنے کے لیے لکھوا رہا ہوں کہ آپ منسلکہ مضمون کو پڑھ لیجیے۔ یہ سچ ہے کہ میں آپ سے واقفیت نہیں رکھتا، لیکن ایسے شخص کے طور پر آپ کا احترام کرتا ہوں جس کی آرا، مشاہدات اور اخذ کردہ نتائج حیران کن حد تک میری اپنی تحقیق کے نتائج سے مطابقت رکھتے ہیں۔ میں اس امر پر مکمل طور پر متعجب ہوں۔ چنانچہ، مثال کے طور پر اگرچہ میں آپ کے اخذ کردہ نتائج اور آپ کے نہایت اعلیٰ تقابلی تجزیے کی سامنے آدب سے سر جھکاتا ہوں' لیکن اس خیال کی جانب پرزور انداز میں توجہ دلائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ چیک آرٹ ہر دور میں عوام سے قریب رہا ہے۔ میں نے یہ رائے آپ کا مقالہ پڑھنے سے پیشتر ظاہر کی تھی۔ میں اسے نہایت آسانی سے ثابت کر سکتا ہوں، کیونکہ' دیگر

چیزوں کے علاوہ میرے پاس گواہ بھی موجود ہیں۔ تاہم یہ ایک غیر اہم بات ہے، کیونکہ آپ کا مقالہ۔۔۔ اس کے بعد میرے علم و فضل کی مزید ستائش کی گئی تھی، اور پھر ایک درخواست: کیا میں اس کے لکھے ہوئے مضمون پر تبصرہ لکھ سکتا ہوں، یعنی اس مضمون کے معیار کے بارے میں ''جریدۂ بصری فنون'' کے مدیر کے نام ایک نوٹ، کیونکہ وہ لوگ چھ مہینے سے اس مضمون کو رد کرتے آرہے ہیں۔ انھوں نے اسے بتایا تھا کہ میری رائے اس بارے میں فیصلہ کن ہوگی، چنانچہ میں اس مضمون کے مصنف کی آخری امید بن گیا تھا۔ مکمل تاریکی میں روشنی کی واحد کرن۔

ہم دونوں نے مسٹرز یتورتسکی کا خوب مذاق اڑایا، جس کے اشرافیہ جیسے نام نے ہمیں مسحور کرلیا تھا۔ لیکن یہ سب محض مذاق تھا، مذاق جس سے کسی کو نقصان پہونچانا مقصود نہ تھا۔ کیونکہ اس نے مجھ پر مدح و ستائش کے جو ڈونگرے برسائے تھے انھوں نے نہایت عمدہ وائن کے ساتھ مل کر میری طبیعت میں ایک گداز پیدا کر دیا تھا۔ مجھ میں اس قدر گداز پیدا ہو گیا تھا کہ مجھے تمام دنیا سے الفت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن تمام دنیا سے زیادہ، خاص طور پر کلارا سے کیونکہ وہ اس وقت میرے ساتھ بیٹھی تھی، جب کہ باقی پوری دنیا میری نظروں سے اوجھل، ورشووتس محلے میں واقع میرے تنگ فلیٹ کی دیواروں سے دوسری طرف تھی۔ اور چونکہ اس وقت میرے پاس دنیا کو نوازنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ اس لیے کلارا نوازا، کم از کم وعدوں سے۔

کلارا ایک اچھے خاندان کی بیس سالہ لڑکی تھی۔ اور میں کیا کہہ گیا؟ اچھے خاندان کی؟ اعلیٰ ترین خاندان کی! اس کا باپ منیجر رہ چکا تھا۔ اور سن پچاس کی دہائی میں اسے بالائی بورژوا طبقے کا نمائندہ قرار دے کر پراگ سے خاصی دور چیلاکووتس کے گاؤں میں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کی بیٹی کا پارٹی ریکارڈ خراب تھا۔ اور وہ پراگ کے ایک بڑے ملبوسات کے کارخانے میں درزن کے طور پر کام کرتی تھی۔ تعصب میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ میں نہیں مانتا کہ باپ کے صاحب جائداد ہونے سے اس کی اولاد کے جینز پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں، آج کون نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور کون امرا کے طبقے سے؟ سب کچھ اس قدر گڈمڈ ہو چکا ہے اور چیزیں ایک دوسرے سے اپنی جگہیں اس حد تک مکمل طور بدل چکی ہیں کہ بعض اوقات تو سماجیاتی اصطلاحات میں کسی بھی چیز کو سمجھنا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے۔ اس وقت اپنے سامنے ایک طبقاتی دشمن کو بیٹھا دیکھ کر اسے ذرا بھی طبقاتی دشمن محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس کے برعکس میں تو اپنے سامنے ایک حسین درزن کو بیٹھا دیکھ رہا تھا اور اس کے دل میں اپنے لیے زیادہ پسندیدگی پیدا کرنے کی کوشش میں خوش دلی کے ساتھ اسے ملازمت کے فوائد سے آگاہ کر رہا تھا جو اپنے تعلقات استعمال کر کے دلوانے کا میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اس جیسی حسین لڑکی کے لیے سلائی مشین کے سامنے بیٹھے رہ کر اپنا حسن گنوا دینا انتہائی مہمل بات ہوگی، اور میں نے فیصلہ کیا کہ اسے ماڈل بننا چاہیے۔

کلارا نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی اور ہم نے وہ رات نہایت مسرور افہام و تفہیم میں گزاری۔

۲۔ آدمی زمانۂ حال سے اس قدر گذرتا ہے کہ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔ جس تجربے سے وہ دراصل گذر رہا ہوتا ہے اس کے بارے میں اسے صرف اندازہ لگانے اور قیاس آرائی کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ بعد میں، جب اس کی آنکھوں سے پٹی کھولی جاتی ہے، تب کہیں وہ مڑ کر ماضی پر نظر ڈالتا ہے اور تب اسے پتہ چلتا ہے کہ کس تجربے سے گذرا تھا اور مفہوم کیا تھا۔

اس رات میں سمجھ رہا تھا کہ اپنی کامیابی کا جام نوش کر رہا ہوں، اور مجھے گمان تک نہ تھا کہ یہ دراصل میری بربادی کا آغاز ہے۔

اور چونکہ مجھے گمان نہ تھا، اس لئے اگلی صبح میں بہت اچھے موڈ میں بیدار ہوا، اور اگرچہ کلارا ابھی میرے پہلو میں لیٹی گہرے سانس لے رہی تھی، میں نے اس خط کے ساتھ منسلک مضمون نکالا اور خوش طبع بے نیازی سے اس پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے لگا۔

اس کا عنوان تھا: ''میکولش آلیش: چیک ڈرائنگ کا ماہر فن استاذ'' اور یہ سچ مچ اس آدھے گھنٹے کی توجہ کا بھی مستحق نہ تھا جو میں نے اس پر صرف کی۔ یہ محض پیش پا افتادہ باتوں کا ایک بے ہنگم ڈھیر تھا جس میں کسی تسلسل کا پتہ نہ تھا اور اس کے ذریعے کسی اوریجنل خیال کو پیش کرنے کی نیت کا نام و نشان تک دکھائی نہ دیتا تھا۔

یہ بات واضح تھی کہ یہ مضمون خاص لغویت پر مبنی تھا۔ اسی دن ''جریدۂ بصری فنون'' کے مدیر ڈاکٹر کلوسک نے (جو ویسے ایک غیر معمولی طور پر کینہ جو شخص تھا) فون پر میری رائے کی مزید تصدیق کر دی، اس نے مجھے یونیورسٹی میں فون کیا: ''تمہیں میاں زیتورتسکی کا مقالہ مل گیا؟ ـــــ تو ٹھیک ہے، اسے نمٹا دو۔ پانچ لکچرر پہلے ہی اس کی خاصی حجامت کر چکے ہیں، پھر بھی وہ جھاڑ کے کانٹے کی طرح پیچھے پڑا ہوا ہے، اس کے دماغ میں کہیں سے یہ بات گھس گئی ہے کہ تمہاری رائے ہی اس بارے میں مستند ہوگی۔ اسے دو جملوں میں بتا دو کہ جو کچھ اسے لکھا وہ بکواس ہے، تم جانتے ہو یہ کس طرح کیا جاتا ہے، تمہیں زہر آلود باتیں کرنا خوب آتا ہے۔ بس، اس کے بعد ہم سب سکون سے رہ سکیں گے۔''

لیکن میرے اندر کسی چیز نے احتجاج کیا: بھلا میں مسٹر زیتورتسکی کے جلاد کے فرائض کیوں انجام دوں؟ کیا اس کام کے لئے ایڈیٹر کی تنخواہ مجھے ملتی ہے؟ اس کے علاوہ، مجھے یہ بھی یاد تھا کہ ''جریدۂ بصری فنون'' نے میرا مقالہ ضرورت سے زیادہ احتیاط پسندی کے بعد رد کر دیا تھا، مزید یہ کہ مسٹر زیتورتسکی کا نام میرے ذہن میں کلارا، سلیووتس کی بوتل اور اس حسین شام سے مضبوطی سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اور آخری بات یہ، میں اس سے انکار نہیں کروں گا، یہ ایک انسانی کمزوری ہے۔ میں ایسے لوگوں کو جو مجھے میری رائے کو اسناد کا درجہ دیتے تھے، اپنے ہاتھ کی ایک انگلی پر گن سکتا تھا میں بھلا اس واحد مداح کو کیونکر ہاتھ سے جانے دوں؟

میں نے گفتگو کو چالاکی کے ساتھ مبہم انداز میں ختم کیا، جو کلوسک کے خیال میں وعدہ اور میرے خیال میں معذرت تھی۔ میں نے ریسیور اس مصمم ارادے کے ساتھ رکھا کہ مسٹر زیتورتسکی کے مضمون پر تبصرہ کبھی تحریر نہیں کروں گا۔ اس کے بجائے میں نے دراز میں سے لکھنے کا کاغذ نکالا اور مسٹر زیتورتسکی کے نام ایک خط لکھا، جس میں اس کے نام کے بارے میں کوئی رائے دینے سے احتراز کیا، اور یہ کہہ کر معذرت کی کہ انیسویں صدی کے آرٹ کی بات آرا کو عموماً گمراہ اور سنکی پن پر مبنی خیال کیا جاتا ہے، چنانچہ میری مداخلت خصوصاً ''جریدۂ بصری فنون'' کے مدیروں کے سلسلے میں۔ اس کے لیے کارآمد سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے مسٹر زیتورتسکی کو دوستانہ بسیار گوئی سے لاد دیا، لیکن اس میں میری طرف سے اس کے کام کی کسی طرح کی ستائش تلاش کرنا ناممکن تھا۔

خط کو لیٹر باکس میں ڈالتے ہی میں مسٹر زیتورتسکی کو بھول گیا۔ لیکن مسٹر زیتورتسکی مجھے بالکل نہیں بھولا۔

۳

ایک دن جب میں اپنا لیکچر ختم کرنے کو تھا۔ میں کالج میں آرٹ کی تاریخ کا مضمون پڑھاتا ہوں۔ کہ دروازے پر دستک ہوئی، یہ ہمارے شعبے کی سیکریٹری، میری تھی، ایک مہربان پختہ عمر کی خاتون، جو کبھی کبھی میرے لیے کافی بنا دیتی ہے اور جب فون پر ناپسندیدہ نسوانی آوازیں سنائی دیں تو کہہ دیتی ہے کہ میں باہر گیا ہوا ہوں۔ اس نے دروازے میں سر ڈال کر بتایا کہ کوئی صاحب مجھے تلاش کر رہے ہیں۔

میں صاحبوں سے قطعی خوفزدہ نہیں ہوتا، چنانچہ میں نے طالب علموں سے معذرت کی اور خوش طبعی کے ساتھ باہر راہداری میں نکل آیا۔ پھٹیچر سا کالا سوٹ اور سفید قمیص پہنے ایک پستہ قد آدمی نے جھک کر مجھے سلام کیا۔ اس نے نہایت احترام کے ساتھ مجھے اطلاع دی کہ وہ زیتورتسکی ہے۔

میں اپنے مہمان کو ایک خالی کمرے میں لے گیا، اسے بٹھانے کے لیے کرسی پیش کی، اور خوشگوار انداز میں اس سے ہر ممکن موضوع پر باتیں کرنے لگا، مثلاً یہ اس سال گرمی کتنی پڑ رہی ہے اور پراگ میں کون کون سی نمائشیں چل رہی ہیں۔ مسٹر زیتورتسکی شائستہ انداز میں میری باتوں سے اتفاق ظاہر کرتا رہا، لیکن جلد ہی میرے کہے ہوئے ہر فقرے کو اپنے مضمون پر منطبق کرنے لگا جو ہم دونوں کے درمیان غیر مرئی طور پر ایک ناقابل مزاحمت مقناطیس کی طرح پڑا تھا۔

''آپ کے مضمون پر تبصرہ لکھنے سے زیادہ مجھے کسی اور بات سے خوشی نہیں ہو سکتی،'' آخرکار میں نے کہا، ''لیکن جیسا کہ میں خط میں وضاحت کر چکا ہوں، انیسویں صدی کے چیک آرٹ پر میری رائے مستند نہیں سمجھی جاتی، اور اس کے علاوہ جریدے کے مدیر حضرات سے میرے تعلقات خراب ہیں، جو مجھے ایک سخت گیر جدیدیت پسند خیال کرتے ہیں، چنانچہ میرے لکھے ہوئے مثبت تبصرے سے آپ کو صرف نقصان ہی پہنچ سکتا ہے۔''

''اوہ! آپ کس قدر منکسر مزاج ہیں،'' مسٹر زیتورتسکی نے کہا، ''آپ جیسا ماہرِ فن خود اپنے مقام کے متعلق

اس قدر غلط فہمی میں کیونکر مبتلا ہو سکتا ہے! جریدے کے ادارتی دفتر والوں نے مجھے خود بتایا ہے کہ سب کچھ آپ کے تبصرے پر منحصر ہے۔ اگر آپ میرے مضمون پر اچھی رائے دے دیں تو وہ اسے شائع کر دیں گے۔ آپ میری واحد امید ہیں۔ یہ مضمون میرے تین سال کے مطالعے اور تین سال کی محنت کا حاصل ہے۔ سب کچھ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔

آدمی اپنے بہانے کتنی بے احتیاطی اور غیر ہنر مندی سے بناتا ہے! میری سمجھ میں نہ آیا کہ مسٹر زیتور تسکی کو کیا جواب دوں۔ میں نے یونہی اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں مجھے نہ صرف چھوٹے شیشوں والی قدیم اور معصوم عینک دکھائی دی بلکہ اس کی پیشانی پر پڑا ہوا اک طاقتور، گہرا عمودی بل بھی نظر آیا۔ مستقبل بینی کے ایک مختصر سے لمحے میں میری ریڑھ کی ہڈی میں کپکپی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہ بل، انتہائی مرکوز اور ہٹ دھرم، نہ صرف اس عقلی کرب کی غمازی کرتا تھا جس سے اس کا مالک میکولاش آلیش کی ڈرائنگوں کے سلسلے میں گزرا تھا۔ بلکہ ایک مضبوط قوت ارادی بھی ۔ میں اپنی حاضر دماغی کھو بیٹھا۔ اور کوئی ہوشیاری کا بہانہ تلاش نہ کر سکا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ میں تبصرہ لکھنے والا ہوں نہیں، لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ مجھ میں یہ بات اس قابلِ رحم پستا قد آدمی کے منہ پر کہنے کی ہمت نہیں۔

تب میں مسکرانے لگا اور میں نے کسی مبہم چیز کا وعدہ کر لیا۔ مسٹر زیتور تسکی نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ جلد ہی دوبارہ آئے گا۔ ہم مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

چند دن بعد وہ واقعی آ گیا۔ اس روز تو میں نے ہوشیاری سے اس ملاقات کو ٹال دیا لیکن اس کے اگلے روز مجھے بتایا گیا کہ وہ مجھے یونیورسٹی میں ایک بار پھر ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ برا وقت میری طرف بڑھ رہا ہے، میں جلدی سے میری کے پاس گیا تاکہ مناسب قدم اٹھائے جا سکیں۔

''میری ڈیئر، میری تم سے التجا ہے، اگر یہ آدمی دوبارہ میری تلاش میں آئے تو اس سے کہہ دینا کہ میں کسی تحقیق کے سلسلے میں جرمنی گیا ہوں اور ایک مہینے میں لوٹوں گا۔ اور ایک بات اور جان لو: میری کلاسیں، جیسا کہ تمہیں معلوم ہے منگل اور بدھ کو ہوتی ہیں۔ میں انہیں خفیہ طور پر بدل کر جمعرات اور جمعہ کو کر لیتا ہوں۔ صرف طلبہ کو اس کے بارے میں معلوم ہوگا، اور کسی کو مت بتانا، اور ٹائم ٹیبل کو بھی جوں کا توں رہنے دینا۔ مجھے قاعدوں کی خلاف ورزی کرنی ہی ہوگی۔''

۴

بے شک مسٹر زیتور تسکی جلد ہی ایک بار پھر میری تلاش میں آیا اور جب سیکریٹری نے اسے اطلاع دی کہ میں اچانک جرمنی چلا گیا ہوں تو اس کی حالت قابلِ رحم ہو گئی، ''لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ مسٹر کلیما کو میرے بارے میں تبصرہ لکھنا ہے۔ وہ اس طرح کیسے جا سکتے ہیں؟'' ''میں نہیں جانتی'' میری نے کہا۔ ''لیکن وہ مہینے بھر میں لوٹ آئیں

گے۔'' ''ایک مہینہ اور۔۔۔'' مسٹر زیتورتسکی کراہا: ''اور آپ کو جرمنی میں ان کا پتہ معلوم نہیں؟'' ''نہیں'' میری بولی۔
چنانچہ میرا ایک مہینہ سکون سے گذرا لیکن وہ مہینہ میری توقع سے جلد گذر گیا اور مسٹر زیتورتسکی ایک بار پھر دفتر کے باہر آ کھڑا ہوا۔ ''نہیں، وہ اب تک واپس نہیں آئے،'' میری نے کہا، اور بعد میں جب وہ کسی سلسلے میں مجھ سے ملی تو استدعا کے لہجے میں پوچھنے لگی، ''تمہارا وہ چھوٹا ملاقاتی پھر آیا تھا، اب میں آخر اس سے کیا کہوں؟'' ''میری، اس سے کہہ دو کہ مجھے یرقان ہو گیا ہے اور میں جینا کے ایک ہسپتال میں داخل ہوں۔'' ''ہسپتال میں!'' جب میری نے چند روز بعد مسٹر زیتورتسکی کو اطلاع دی تو وہ چلاّیا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ انہیں میرے بارے میں تبصرہ لکھنا ہے!'' ''مسٹر زیتورتسکی!'' سیکریٹری نے ملامت آمیز لہجے میں کہا، ''مسٹر کلیما کہیں غیر ملک میں سخت بیمار پڑے ہوئے ہیں اور آپ کو سوائے اپنے تبصرے کے کسی چیز کا خیال نہیں!'' مسٹر زیتورتسکی یہ سن کر دبک گیا اور رخصت ہوا، لیکن وہ ہفتے بعد پھر دفتر میں موجود تھا۔'' میں نے مسٹر کلیما کے نام ایک رجسٹرڈ خط جینا بھیجا تھا۔ وہ چھوٹی سی جگہ ہے، وہاں ایک ہی ہسپتال ہوگا، لیکن خط میرے پاس واپس آ گیا۔'' ''تمہارا چھوٹا ملاقاتی مجھے پاگل کیے دے رہا ہے،'' اگلے روز میری نے مجھ سے کہا۔ ''مجھ پر بگڑ نا مت، میں اس سے اور کیا کہتی؟ میں نے کہہ دیا کہ تم واپس آ گئے ہو۔ اب تم اس سے خود ہی نمٹنا۔''

میں میری پر بگڑا نہیں۔ وہ جو کچھ کر سکتی تھی وہی اس نے کیا۔ علاوہ ازیں، میں خود کو کسی بھی طرح ہارا ہوا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ پکڑا نہیں جاؤں گا۔ میں تمام وقت روپوشی کی حالت میں رہتا۔ جمعرات اور جمعہ کو خفیہ طور پر لیکچر دیتا، اور ہر منگل اور بدھ کو اسکول کے سامنے والے ایک مکان کے دروازے سے مسٹر زیتورتسکی کا نظارہ کر کے خوش ہوتا جو اسکول کے باہر میرے نکلنے کا منتظر کھڑا رہا کرتا۔ مجھے باؤلر ہیٹ پہننے اور داڑھی لگانے کی خواہش محسوس ہوتی۔ میں خود کو شرلاک ہومز یا ان دیکھا آدمی محسوس کرتا جو نظر آئے بغیر چل پھر رہا ہو۔ میں خود کو چھوٹا سا لڑکا محسوس کرتا۔

لیکن ایک دن مسٹر زیتورتسکی اس پہریداری سے تھک گیا اور میری پر ٹوٹ پڑا۔ ''آخر مسٹر کلیما کہاں لیکچر دیتے ہیں؟'' ''ٹائم ٹیبل وہاں لگا ہوا ہے،'' میری نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جہاں ایک بڑے سے تختے پر سارے لیکچروں کی تفصیل مثالی انداز میں درج تھی۔

''وہ تو میں دیکھ رہا ہوں،'' مسٹر زیتورتسکی نے ٹس سے مس ہوئے بغیر کہا۔ 'لیکن مسٹر کلیما یہاں نہ منگل کو لیکچر دیتے ہیں نہ بدھ کو۔ کیا وہ بیمار ہیں؟''

''نہیں'' میری ہچکچاتے ہوئے بولی اور تب وہ شخص میری پر برس پڑا۔ اس نے ٹائم ٹیبل کے کنفیوژن پر اسے ملامت کی۔ اس نے طنزیہ لہجے میں دریافت کیا کہ وہ کس طرح اس بات سے بے خبر ہو سکتی ہے کہ کس وقت کون سا

استاد کہاں ہوگا۔ وہ میری پر چلایا۔ اس نے کہا کہ وہ کامریڈ اسسٹنٹ کلیما کی شکایت کرے گا جو لیکچر نہیں دے رہے ہیں۔ جو انہیں دینے چاہئیں۔ اس نے پوچھا کہ آیا ڈین اپنے دفتر میں ہے۔

بدقسمتی سے ڈین اپنے دفتر میں موجود تھا۔ مسٹر زیتورسکی دروازہ کھٹکھٹا کر اندر چلا گیا۔ دس منٹ بعد وہ میری کے دفتر میں واپس آیا اور میرے فلیٹ کا پتہ دریافت کیا۔

''نمبر ۲۰، اسکالنک اسٹریٹ، لیتومیشل'' میری نے کہا۔ ''پراگ میں مسٹر کلیما کا عارضی پتہ ہے جسے وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔۔۔'' ''میں آپ سے کامریڈ کلیما کے پراگ کے فلیٹ کا پتہ پوچھ رہا ہوں، پستہ قد آدمی لرزتی ہوئی آواز میں چیخا۔

نہ جانے کس طرح میری اپنی حاضر دماغی کھو بیٹھی۔ اس نے اسے میرے فلیٹ، میری چھوٹی سی پناہ، میرے پیارے سے بھٹ کا پتہ دے دیا، جہاں مجھے پکڑا جانا تھا۔

۵

ہاں، میرا مستقل پتہ میتومیشل کا ہے، میری ماں، میرے دوست اور میرے باپ کی یادیں وہیں مقیم ہیں، جب بھی موقع ملتا ہے، میں پراگ سے بھاگ نکلتا ہوں اور گھر، اپنی ماں کے چھوٹے سے فلیٹ میں بیٹھ کر لکھا کرتا ہوں۔ تو اس طرح ہوا کہ میں نے اپنی ماں کے فلیٹ کو اپنا مستقل پتہ لکھوا دیا اور پراگ میں کوئی مناسب بیچلر فلیٹ حاصل نہ کر سکا، جیسا کہ قاعدے سے میرے لیے کرنا ضروری تھا، بلکہ ورشوتش کے علاقے میں واقع ایک مکمل طور پر پرائیویٹ خانے میں ایک کمرے پر مشتمل فلیٹ میں رہنے لگا، جس کے وجود کو میں اپنے امکان بھر چھپا کر رکھتا تھا۔ میں نے اپنے پتے کو کہیں رجسٹر نہیں کرایا تھا تاکہ میرے ناپسندیدہ مہمانوں کی میری متعدد عارضی نسوانی ہم نشینوں سے (جن کی آمد و رفت، میں اقرار کرتا ہوں، نہایت بے قاعدہ تھی) غیر ضروری ملاقاتیں نہ ہوں۔ اور ٹھیک اسی وجہ سے اس اقامت خانے میں میری شہرت زیادہ اچھی نہ تھی۔ مزید یہ کہ جب کبھی میں لیتومیشل گیا ہوا ہوتا تو کئی بار اپنا چھوٹا سا کمرا دوستوں کو مستعار دے دیا کرتا، جو وہاں بے حد پرلطف وقت گذارتے اور اقامت خانے میں رہنے والے کسی شخص کو ایک پل بھی سونے نہ دیتے۔ ان تمام باتوں نے وہاں کے کئی مکینوں کو سخت چراغ پا کر دیا تھا۔ اور انھوں نے میرے خلاف ایک خاموش جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ بعض موقعوں پر انہوں نے مقامی کمیٹی کو میرے خلاف منفی رائے ظاہر کرنے پر اکسایا تھا اور یہاں تک کہ اقامت خانے کے دفتر میں میرے خلاف شکایت بھی داخل کر رکھی تھی۔

ان دنوں کلارا کو چیلاکووتس کے دوردست محلے سے اپنے کام پر جانے میں دقت ہوتی تھی، چنانچہ جب وہ رات کو میرے پاس ہی ٹھہرنے لگی تھی۔ پہلے پہل وہ متذبذب انداز میں کبھی کبھار وہاں رات گذارتی، پھر اس نے اپنا ایک جوڑا وہاں لا رکھا، پھر کئی جوڑے، اور بہت جلد مرے دو سوٹ الماری کے ایک کونے میں سمٹ گئے اور میرا چھوٹا سا کمرہ

ایک زنانہ خواب گاہ میں بدل گیا۔

میں کلارا کو سچ مچ پسند کرتا تھا، وہ خوبصورت تھی، مجھے خوشی محسوس ہوتی جب ہم اکٹھے باہر نکلتے اور لوگ ہمیں مڑمڑ کر دیکھا کرتے، وہ مجھ سے کم از کم تیرہ سال چھوٹی تھی، جس سے طالب علموں میں میری عزت بڑھ گئی تھی، میرے پاس اس کا اچھی طرح خیال رکھنے کی ہزار وجوہ تھیں۔ لیکن میں یہ بات ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ رہ رہی ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ اقامت خانے میں ہمارے بارے میں چہ میگوئیاں اور افواہیں پھیل جائیں گی، مجھے ڈر تھا کہ کوئی میرے نیک دل مالک مکان پر ہلہ بول دے گا۔ جو سال کا بیشتر حصہ پراگ سے باہر گزارتا، اپنے کام سے کام رکھتا اور میرے معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھتا تھا، مجھے ڈر تھا کہ ایک روز وہ ناخوشی کے عالم میں اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ میرے پاس آئے گا اور مجھ سے، اپنی نیک نامی کی خاطر، اس نوجوان خاتون کو وہاں سے رخصت کر دینے کو کہے گا۔

کلارا کو خفیہ ہدایت تھی کہ کسی کے لیے دروازہ نہ کھولے۔

ایک روز وہ کمرے میں اکیلی تھی۔ وہ ایک دھوپ بھرا دن تھا اور کمرے میں حبس سا تھا۔ اور میرے دیوان پر، قریب قریب ننگی لیٹی، چھت کا جائزہ لینے میں محو تھی جب اچانک دروازے پر زور کی دستک سنائی دی۔

اس میں کوئی چونکنے والی بات نہ تھی۔ میرے پاس گھنٹی نہ تھی، اس لیے جو بھی آتا اسے دروازہ کھٹکھٹانا ہی پڑتا۔ چنانچہ کلارا نے اس شوروغل سے متاثر نہ ہونے کا فیصلہ کیا اور چھت کا معائنہ کرتی رہی۔ لیکن دروازہ پیٹنے کا عمل ختم نہ ہوا، بلکہ اس کے برعکس نہایت مستقل مزاجی سے جاری رہا۔ اب کلارا کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ ایک ایسے شخص کو دروازے کے باہر ایستادہ تصور کرنے لگی جو آہستگی سے اور معنی خیز انداز میں اپنی جیکٹ کا کالر اونچا کر رہا ہے، اور جو کچھ دیر بعد اس پر جھپٹ کر سوال کرے گا کہ اس نے دروازہ کھولنے میں اتنی دیر کیوں لگائی، وہ کیا چیز چھپا رہی ہے، اور آیا وہ رجسٹرڈ ہے۔ ایک احساس جرم نے اسے آلیا، اس نے اپنی نظریں چھت سے ہٹائیں اور سوچنا شروع کیا کہ اپنے کپڑے کہاں اتارے تھے۔ لیکن دروازہ اتنی تن دہی سے متواتر پیٹا جا رہا تھا کہ اپنے اضطراب میں اسے کھونٹی لگی میری برساتی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آسکا۔ اس نے خود کو برساتی میں لپیٹ لیا اور دروازہ کھول دیا۔

اسے کسی سوالیہ چہرے والے خطرناک شخص کے بجائے ایک پستہ قد آدمی دکھائی دیا جو تعظیماً جھک کر بولا، "کیا مسٹر کلیما گھر پر ہیں؟" "نہیں ہیں" "اوہ، یہ تو برا ہوا" چھوٹے آدمی نے کہا اسے پریشان کرنے پر اس سے معذرت کی۔ "بات یہ ہے کہ مسٹر کلیما کو میرے بارے میں ایک تبصرہ لکھنا ہے۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، اور اس کام کو جلدی کرنا ضروری ہے اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں کم از کم ان کے نام ایک پیغام چھوڑ سکتا ہوں۔"

کلارا نے اسے کاغذ پنسل دے دی، اور اس شام میں نے پڑھا کہ میکولاش الیش کے بارے میں لکھے گئے

مضمون کی تقدید صرف میرے ہاتھوں میں ہے اور یہ کہ مسٹر زیتورتسکی نہایت احترام کے ساتھ میرے تبصرے کا منتظر ہے اور وہ مجھ سے یونیورسٹی میں ملنے کی دوبارہ کوشش کرے گا۔

۶

اگلے دن میری نے مجھے بتایا کہ کس طرح مسٹر زیتورتسکی نے اسے دھمکایا تھا، پھر جا کر اس کی شکایت کی تھی، اس کی آواز کپکپا رہی تھی اور وہ رو پڑنے کو تھی'' میں طیش میں آ گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ بیچاری سیکریٹری جواب تک میرے آنکھ مچولی کے کھیل پر ہنستی رہی تھی (اگر چہ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ اس نے جو کچھ کیا وہ لطف اندوزی کی خاطر نہیں بلکہ میری مروت میں کیا تھا)، اب تکلیف محسوس کر رہی تھی اور قابل فہم طور پر اپنی تکلیف کا منبع مجھے سمجھ رہی تھی۔ جب میں نے ان تمام چیزوں میں اپنے پتے کے انکشاف، دس منٹ تک فلیٹ کا دروازہ پیٹے جانے اور کلارا کے خوفزدہ ہونے کو بھی شامل کر کے دیکھا تو میرا غصہ جلال کی حد تک جا پہونچا۔

جس وقت میں میری کے دفتر میں، بے چینی سے ہونٹ کاٹتا، اپنا خون کھولاتا، انتقام کے متعلق سوچتا، ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا، ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا اور مسٹر زیتورتسکی نمودار ہوا۔

مجھے دیکھ کر خوشی کی جھلملاہٹ سی اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ اس نے جھک کر مجھے سلام کیا۔ وہ ذرا جلدی آ گیا تھا، یعنی اس سے پہلے کہ میں اپنے انتقام کے منصوبے پر اچھی طرح غور کر سکتا۔

اس نے پوچھا کہ آیا مجھے پچھلے روز اس کا چھوڑا ہوا پیغام مجھے مل گیا تھا۔

میں خاموش رہا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ ''مل گیا تھا'' میں نے جواب دیا۔

''تو کیا آپ مہربانی کر کے تبصرہ لکھ دیں گے؟''

میں نے اسے اپنے سامنے کھڑے دیکھا: نڈھال، ضدی، ملتجی۔ میں نے اس کے ماتھے کے عمودی بل کو دیکھا۔ دھات پر کندہ کی ہوئی لکیر، یک سوجنون کی علامت۔ میں نے اس عمودی لکیر کو غور سے دیکھا کہ یہ دو نقطوں کو ملانے والی سیدھی لکیر ہے، اور وہ دو نقطے ہیں اس کا مضمون اور میرا تبصرہ، اس جنونی سیدھی لکیر کی گرفت کے باہر اس کی زندگی میں سوائے ولیوں کی سی رہبانیت کے کچھ نہ تھا، اور ٹھیک اس وقت ایک معاندانہ ترکیب میرے ذہن میں آئی۔

''اتنا تو آپ سمجھتے ہوں گے کہ کل کے واقعے کے بعد میں آپ سے بات نہیں کر سکتا،'' میں نے کہا۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔''

''بننے کی ضرورت نہیں۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب آپکا اس سے انکار کرنا غیر ضروری ہوگا۔''

''میں آپ کی بات نہیں سمجھا'' چھوٹے آدمی نے اپنی بات پھر دہرائی، لیکن اس بار زیادہ فیصلہ کن لہجے میں۔

میں نے خوش طبعی کا، تقریباً دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ''دیکھئے مسٹر زیتورتسکی، میں آپ کو قصوروار نہیں

ٹھہراتا۔ میں بھی عورتوں کے تعاقب میں رہتا ہوں اور آپ کی کیفیت کو سمجھ سکتا ہوں۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو خود کو ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ تنہا پا کر، خاص طور پر جب اس نے ایک مردانہ برساتی کے نیچے کچھ نہ پہن رکھا ہو، اسے راہ پر لانے کی کوشش کرتا۔''

''یہ بڑی زیادتی ہے!'' پستا قد آدمی پیلا پڑ گیا۔

''یہ سچ ہے، مسٹر زیتورتسکی۔''

''کیا خاتون نے یہ بات بتائی ہے؟''

''اس کے اور میرے درمیان کوئی راز نہیں۔''

''کامریڈ اسسٹنٹ، یہ بہت بڑی زیادتی ہے! میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں میری ایک بیوی ہے! میرے بچے ہیں!'' پستا قد آدمی نے ایک قدم آگے بڑھایا، اور مجھے ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔

''یہ تو آپ کے لیے اور بھی برا ہے، مسٹر زیتورتسکی۔''

''اور بھی برا ہے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''

''میرا خیال ہے شادی شدہ ہونا عورتوں کا تعاقب کرنے کے معاملے میں ایک خامی ہے۔''

''اپنی بات کو واپس لیجئے!'' مسٹر زیتورتسکی نے دھمکانے کے انداز میں کہا۔

''اچھا، ٹھیک ہے،'' میں نے اس سے اتفاق کیا، ''شادی شدہ ہونا اس معاملے میں ہمیشہ رکاوٹ نہیں بنتا اس کے برعکس کبھی کبھی یہ ہر چیز کا پردہ بھی بن جاتا ہے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں آپ سے بالکل ناراض نہیں اور آپ کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ صرف ایک بات ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ آپ ایک ایسے شخص سے تبصرہ لکھوانا چاہتے ہیں جس کی عورت کو آپ نے پٹانے کی کوشش کی، یہ کیونکر؟''

''کامریڈ اسسٹنٹ! اکیڈمی آف سائنسز کے 'جریدۂ بصری فنون' کے مدیر ڈاکٹر کلوسک میرے مضمون پر آپ کا تبصرہ چاہتے ہیں۔ اور آپ کو یہ تبصرہ لکھنا ہوگا۔''

''تبصرہ یا عورت۔ آپ دونوں کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔''

''یہ کس طرح کا طرزِ عمل ہے، کامریڈ؟'' مسٹر زیتورتسکی نے سخت طیش کے عالم میں چلا کر کہا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مسٹر زیتورتسکی نے سچ مچ کلارا کو پٹانے کی کوشش کی ہو۔ غصے سے سلگتے ہوئے میں نے چیخ کر کہا، ''تمہاری یہ جرأت کہ مجھ پر چلاؤ! تمہیں تو میری سیکریٹری کے سامنے مجھ سے معافی مانگنی چاہیے۔''

میں نے مسٹر زیتورتسکی کی طرف پیٹھ موڑ لی اور وہ ہکا بکا سا لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل گیا۔

''افوہ!'' میں نے ایک ایسے جنرل کے انداز میں آہ بھری جس نے سخت مقابلے کے بعد کوئی لڑائی جیت لی ہو،

اور میری سے کہا: ''شاید اب وہ مجھ سے تبصرہ لکھوانے کا خیال چھوڑ دے گا۔''

میری مسکرائی، پھر لمحے بھر بعد ہچکچاتے ہوئے بولی، ''آپ آخر تبصرہ کیوں نہیں لکھنا چاہتے؟''

''کیونکہ میری ڈیئر، اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ پرلے درجے کی بکواس ہے۔''

''تو آپ اپنے تبصرے میں یہی کیوں نہیں لکھ دیتے کہ یہ بکواس ہے۔''

''میں کیوں لکھوں؟ میں لوگوں کی عداوت کیوں مول لیتا پھروں۔۔۔'' لیکن اتنا کہتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ مسز زیتورتسکی اس کے باوجود میرے دشمن ہو چکے ہیں، اور تبصرہ نہ لکھنے کی میری کوشش ایک بے مقصد اور لغو جد و جہد تھی۔ بدقسمتی سے میں نہ اب اسے روک سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔

میری ایک مہربان مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی جیسے عورتیں بچوں کی حماقت کو دیکھا کرتی ہیں۔ تب دروازہ کھلا اور مسز زیتورتسکی ایک بازو اوپر اٹھائے وہاں دکھائی دیا۔ ''مجھے نہیں، معافی آپ کو مانگنی ہوگی!'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں چلایا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

۷

مجھے اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ کب، اسی دن یا اس کے چند دن بعد، اقامت خانے کے پوسٹ باکس میں ہمیں ایک لفافہ ملا جس پر کوئی پتہ نہیں لکھا ہوا تھا۔

اندر ٹیڑھی میڑھی، تقریباً قدیم انداز کی، لکھائی میں ایک خط تھا:

محترم خاتون،

میرے شوہر کی ہتک کے سلسلے میں براہ کرم اتوار کو میرے گھر آیئے۔

میں پورا دن گھر پر ہوں گی۔ اگر آپ نہ آئیں تو مجھے مجبوراً اقدامات کرنے ہوں گے۔

آنا زیتورتسکی، ۱۴ دالمیلو وا اسٹریٹ، پراگ ۳۔

کلارا خوفزدہ ہو گئی اور میرے قصور کے بارے میں کچھ کہنے لگی۔ میں نے ہاتھ لہرا کر اعلان کیا کہ زندگی کا کام تفریح بہم پہنچانا ہے، اور اگر زندگی اس سلسلے میں کاہلی کا مظاہرہ کرتی ہے تو ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس کام میں اس کی تھوڑی بہت مدد کریں۔ آدمی کو مسلسل واقعات کے تیز رفتار گھوڑوں پر سواری کرنی چاہئے کیوں کہ ان کے بغیر وہ ریت میں قدم گھسیٹنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ مسٹر یا مسز زیتورتسکی سے اس کی کبھی ملاقات نہیں ہوگی، اور جس واقعے کے رہوار کی پیٹھ میں چھلانگ لگا کر جم گیا ہوں اسے اپنا ایک ہاتھ پیچھے باندھ کر بھی قابو میں لا سکتا ہوں۔ صبح جس وقت ہم اقامت خانے سے نکل رہے تھے، چوکیدار نے ہمیں روکا۔ چوکیدار ہمارا دشمن نہیں تھا۔ میں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے اسے ایک بار پچاس کراؤن کا نوٹ رشوت میں دیا تھا اور اب

تک اس خوشگوار اطمینان میں زندگی بسر کر رہا تھا کہ اس نے میرے بارے میں کچھ نہ جاننا سیکھ لیا ہے، اور اس آگ میں تیل چھڑکنے سے احتراز کرتا ہے جو میرے دشمنوں نے وہاں جلا رکھی تھی۔

''کل ایک میاں بیوی آپ کو تلاش کر رہے تھے،'' اس نے بتایا۔

''کس قسم کے لوگ تھے؟''

''ایک چھوٹے قد کا آدمی تھا اور اس کی عورت ساتھ تھی۔''

''عورت کس حلیے کی تھی؟''

''اس سے دوسرا اونچی۔ انتہائی پھرتیلی۔ تناور عورت۔ ہر قسم کی باتیں پوچھ رہی تھی۔'' وہ کلارا کی طرف مڑا۔'' زیادہ تر آپ کے بارے میں۔ کہ آپ کون ہیں اور نام کیا ہے۔''

''میں کیا بتاتا؟ مجھے کیا خبر مسٹر کلیما سے ملنے والے کون کون ہیں؟ میں نے اس سے کہہ دیا کہ ہر رات کوئی اور آتا ہے۔''

''شاباش!'' میں نے قہقہہ لگایا اور جیب سے دس کراؤن کا نوٹ نکالا۔''بس اسی طرح کے جواب دیتے رہنا''۔

''ذرومت،'' بعد میں میں نے کلارا سے کہا۔''نہ تم اتوار کو کہیں جاؤ گی اور نہ کوئی تمھیں پا سکے گا۔''

اتوار آیا اور گزر گیا' اتوار کے بعد پیر اور منگل اور بدھ' کچھ بھی نہیں ہوا۔''دیکھو'' میں نے کلارا سے کہا۔ لیکن پھر جمعرات کا دن آیا۔ میں اپنے خفیہ لکچر میں اپنے طالب علموں کو بتا رہا تھا کہ کس طرح اور کیسے بے غرضانہ رفاقت کے ماحول میں فاؤوئوں (Fauvists) نے رنگوں کو ان کے سابقہ امپریشنسٹ کردار کی قیود سے رہائی دلائی' کہ اسی وقت میری نے دروازہ کھولا اور سرگوشی میں مجھ سے کہا''اس مسٹر زیتورتسکی کی بیوی آئی ہے۔''''لیکن میں تو یہاں نہیں ہوں'' میں نے کہا''اسے ٹائم ٹیبل دکھا دو۔''''دکھایا تھا' لیکن اس نے آپ کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو اسے آپ کی برساتی اسٹینڈ پر لٹکی دکھائی دے گئی۔ اسی وقت اسسٹنٹ پروفیسر زیلینی وہاں آگئے اور انھوں نے اسے بتا دیا کہ یہ آپ کی ہی برساتی ہے۔ اب وہ راہداری میں آپ کے انتظار میں بیٹھی ہے۔''

اگر قسمت زیادہ منظم انداز سے میرا تعاقب کر سکتی ہے تو ممکن ہے میں ایک کامیاب شخص ہوتا۔ بند گلی ایک ایسی شئے ہے جہاں میرے تخیل کو مہمیز ملتی ہے اور بہترین ترکیبیں سوجھتی ہیں۔ میں نے اپنے ایک پسندیدہ طالب علم سے کہا:

مہربانی کر کے میرا ایک کام کر دو۔ میرے دفتر میں جاؤ، اسٹینڈ پر لٹکی ہوئی برساتی پہنو اور اسکول سے باہر نکل جاؤ۔ راہداری میں بیٹھی ایک عورت تمھیں روک کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گی کہ تم کلیما ہو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ

اس کا کسی قیمت پر اقرار مت کرنا۔''

طالب علم گیا اور کوئی چوتھائی گھنٹے میں لوٹ آیا۔ اس نے بتایا کہ مشن کامیابی سے پورا ہوا، مطلع اب صاف ہے اور عورت اسکول کی عمارت سے جا چکی ہے۔

چنانچہ اس بار میں جیت گیا لیکن پھر جمعہ کا دن آیا، اور سہ پہر کے وقت کلارا پتے کی طرح کانپتی ہوئی اپنے کام سے واپس آئی۔

ملبوسات کے کارخانے کے صاف ستھرے دفتر میں جو شائستہ آدمی گاہکوں سے ملاقات کیا کرتا تھا، اس نے کارگاہ کی طرف کھلنے والا دروازہ کھولا جہاں کلارا اور پندرہ دوسری درزنیں سلائی مشین پر سلتی ہوئی جھکی ہوئی کام میں مصروف تھیں، اور اونچی آواز میں کہا:

''کیا تم میں سے کوئی نمبر ۵، پشکن اسٹریٹ پر رہتی ہے؟''

کلارا جان گئی کہ اسی کو تلاش کیا جا رہا ہے، کیونکہ ۵، پشکن اسٹریٹ میرے ہی اقامت خانے کا پتا تھا۔ لیکن احتیاط نے اسے بولنے سے باز رکھا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا میرے ساتھ رہنا ایک راز ہے اور اس سے کوئی واقف نہیں۔

''دیکھا، میں ان خاتون سے کیا کہہ رہا تھا؟'' جب کسی لڑکی نے جواب میں کچھ نہ کہا تو شائستہ شخص بولا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ کلارا کو بعد میں معلوم ہوا کہ ٹیلی فون پر ایک زنانہ آواز نے اسے پہلے کارخانے کے ملازمین کی فہرست کی چھان بین کرنے پر مجبور کیا اور پھر چوتھائی گھنٹے تک اس بات پر اصرار کرتی رہی کہ اس کارخانے میں کام کرنے والی لڑکیوں میں سے ایک نمبر ۵، پشکن اسٹریٹ پر رہتی ہے۔

مسز زیتورتسکی کا سایہ ہمارے پرسکون کمرے پر پھیل گیا۔

''لیکن اسے یہ کہاں سے پتہ چلا کہ تم وہاں کام کرتی ہو؟ یہاں تو کوئی تمہیں جانتا نہیں!''

میں نے زور سے کہا۔

ہاں، مجھے یقین تھا کہ ہمیں کوئی نہیں جانتا۔ میں کسی ایسے سنکی شخص کی طرح رہتا تھا جس کا خیال ہو کہ وہ اونچی دیوار کے پیچھے ہے اور اسے کوئی نہیں دیکھ رہا، لیکن تمام وقت ایک تفصیل اس کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے یہ اونچی دیوار شفاف کانچ کی بنی ہوئی ہے۔

میں نے چوکیدار کو رشوت دیکر آمادہ کر لیا تھا کہ اس کے یہاں میرے ساتھ رہنے کی بات کسی پر ظاہر نہ کرے، میں نے کلارا کو خود کو چھپائے رکھنے کی نہایت تکلیف دہ اور جھنجھلا دینے والے طریقے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا، جب کہ اس مکان میں رہنے والے تمام لوگ اس کے بارے میں جانتے تھے۔ صرف اتنا ہوا تھا کہ ایک بار وہ دوسری

منزل پر رہنے والی ایک عورت سے بے احتیاطی سے بات کر بیٹھی تھی، اور سب لوگ جان گئے تھے کہ وہ کہاں کام کرتی ہے۔ ہمیں شبہ تک نہ ہوا تھا کہ اتنے دنوں سے ہم سب کی نظروں کے عین سامنے وہاں رہ رہے تھے۔ ہمارے دشمنوں سے اگر کوئی چیز چھپی ہوئی تھی تو بس کلارا کا نام، اور چھوٹی سی تفصیل کہ وہ وہاں میرے ساتھ اپنا نام رجسٹر کرائے بغیر رہ رہی تھی۔ یہی دو آخری راز تھے جن کی اوٹ میں چھپ کر، فی الحال ہم، مسٹر زیتورتسکی کو جل دینے میں کامیاب ہو گئے تھے جس نے اپنا حملہ اس قدر مصمم اور منظم انداز میں کیا تھا کہ میں دہشت زدہ رہ گیا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ معاملہ بہت دشوار ہوگا۔ میری کہانی کے گھوڑے کی زین اچھی طرح کسی جا چکی تھی۔

۸

یہ جمعے کا ذکر ہے۔ اور سنیچر کو جب کلارا کام پر سے واپس آئی تو اس پر پھر کپکپی طاری تھی۔ مسز زیتورتسکی اپنے شوہر کو ساتھ لے کر کارخانے پہونچی تھی۔ اس نے اپنی آمد کی پہلے سے اطلاع کر دی تھی اور مینیجر سے اجازت، حاصل کر لی کہ وہ دونوں کارگاہ کے اندر جا کر درزنوں کے چہروں کا معائنہ کر سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس درخواست نے کامریڈ مینیجر کو حیرت میں ڈال دیا تھا، لیکن مسز زیتورتسکی کا انداز ہ ایسا تھا کہ اس سے انکار ممکن نہیں تھا۔ اس نے مبہم سے انداز میں کسی توہین کا، اور زندگی کے تباہ ہو جانے کا، اور عدالتی چارہ جوئی کا ذکر کیا۔ برابر میں مسٹر زیتورتسکی تیوری چڑھائے خاموش کھڑا رہا۔

انہیں دروازہ کھول کر کارگاہ میں لایا گیا۔ درزنوں نے بے پرواہی سے سر اٹھا کر دیکھا، اور کلارا نے اس پستا قد آدمی کو پہچان لیا، اس کی رنگت زرد پڑ گئی اور وہ خود کو چھپانے کی عیاں کوشش میں جلدی سے سلائی کے کام میں لگ گئی۔

''یہ لیجیے،'' مینیجر نے خفیف طنز آمیز شائستگی کے ساتھ اس اکڑے ہوئے جوڑے سے کہا۔ مسز زیتورتسکی نے بھانپ لیا کہ اسے کو آگے بڑھنا ہوگا، اور اپنے شوہر سے بولی، ''اب دیکھو!'' مسٹر زیتورتسکی نے تیوری چڑھا کر چاروں طرف دیکھا۔ ''ان میں سے کوئی ہے؟'' مسز زیتورتسکی نے سرگوشی میں پوچھا۔

چشمہ لگا کر بھی مسٹر زیتورتسکی اس بڑے سے کمرے کو ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہا تھا، جس کا جائزہ لینا یوں بھی آسان نہ تھا کیونکہ اس میں ہر طرف کپڑے کی کترنوں کے ڈھیر پڑے تھے اور افقی سلاخوں سے سلے ہوئے کپڑے لٹک رہے تھے، اور ہمہ وقت پہلو بدلتی ہوئی درزنیں اپنے چہرے دروازے کی طرف کیے قطار میں نہیں بلکہ بے ترتیبی سے ادھر ادھر رخ کیے بیٹھی تھیں، وہ آگے پیچھے، اوپر نیچے ہر طرف متواتر حرکت کر رہی تھیں۔ چنانچہ مسٹر زیتورتسکی کو ایک ایک قدم بڑھاتے ہوئے گردن موڑ موڑ کر ایک ایک چہرے کو دیکھنا پڑ رہا تھا کہ کوئی رہ نہ جائے۔

جب عورتوں کو اندازہ ہوا کہ انہیں دیکھا جا رہا ہے، اور دیکھنے والا بھی اس قدر بھدا اور غیر دلکش آدمی ہے تو انہیں ہلکی سے ہتک محسوس ہوئی، اور ان کے طنزیہ فقرے اور بڑبڑاہٹیں سنائی دینے لگیں۔ ان میں سے ایک، جو تنومند نوعمر

لڑکی تھی، گستاخی سے بول اٹھی:

''یہ پورے پراگ میں اس چوہے کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے جس نے اسے حاملہ کر دیا،''

عورتوں کی پرشور اور پھکو فقرے بازی نے میاں بیوی کو گھیر لیا، وہ پہلے تو دل شکستہ سے کھڑے رہے، پھر ایک عجیب قسم کے وقار سے تن گئے۔

''میڈم!'' گستاخ لڑکی مسز زیتورتسکی سے مخاطب ہو کر ایک بار پھر بولی،'' آپ اپنے بیٹے کا اچھی طرح خیال نہیں رکھتیں! میں تو اسے پیارے سے ننھے کو کبھی گھر سے باہر قدم نہ رکھنے دوں۔''

''اور ٹھیک سے دیکھو!'' اس نے اپنے شوہر سے سرگوشی کی، اور وہ افسردہ جھینپے ہوئے انداز میں ایک ایک قدم آگے بڑھتا رہا جیسے اسے دونوں طرف سے مار پڑ رہی ہو، لیکن اس کے باوجود اس کے انداز میں ایک مضبوطی تھی اور اس نے ایک بھی چہرے کو دیکھے بغیر نہ چھوڑا۔

اس تمام عرصے میں منیجر مبہم سے انداز میں مسکراتا رہا وہ اپنی ملازم عورتوں کو جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ان منہ پھٹ دررنوں کا کچھ نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ اس نے ان کے شور وغل کو نہ سننے کا ناٹک کرتے ہوئے مسٹر زیتورتسکی سے سوال کیا،'' آپ مہربانی کر کے مجھے یہ بتائیں کہ آپ جس عورت کی تلاش میں ہیں وہ کس حلیے کی ہے؟''

مسٹر زیتورتسکی منیجر کی طرف مڑا اور آہستہ آہستہ نہایت سنجیدہ لہجے میں بولا،'' وہ خوبصورت تھی ۔۔ بہت خوبصورت تھی ۔۔''

اس دوران کلارا ایک کونے میں بیٹھی تھی اور اس کی برہمی، جھکا ہوا سر اور کام میں اس کی ہٹیلی محویت اسے منہ پھٹ لڑکیوں سے الگ ظاہر کر رہی تھی۔ اف! اس نے خود کو چھپانے اور غیر اہم ظاہر کرنے کا کتنا غلط طریقہ اختیار کیا تھا! اور اب مسٹر زیتورتسکی اس سے ذرا ہی دور تھا، منٹ بھر بعد اس کی نظر اس کے چہرے پر پڑنے والی تھی۔

''یہ تو کافی نہیں ہے، اگر آپ کو صرف اتنا ہی یاد ہے کہ وہ خوبصورت تھی،'' شائستہ کامریڈ منیجر نے مسٹر زیتورتسکی سے کہا۔'' خوبصورت عورتیں تو بہت سی ہیں۔ وہ لمبی تھی یا چھوٹی؟''

''لمبی،'' مسٹر زیتورتسکی نے کہا۔

''اس کے بال کالے تھے یا سنہرے؟''

مسٹر زیتورتسکی نے لمحے بھر سوچا اور پھر کہا،'' سنہرے۔''

کہانی کا یہ حصہ حسن کی قوت کے بارے میں ایک حکایت کے طور پر کام آ سکتا ہے۔ جب مسٹر زیتورتسکی نے کلارا کو پہلی بار میرے گھر پر دیکھا تھا تو اس قدر چکا چوند ہو گیا تھا کہ اس نے دراصل اسے دیکھا ہی نہ تھا۔ حسن نے اس کی نظروں کے سامنے ایک پردہ تان دیا تھا جس کے پار دیکھا نہ جا سکتا تھا۔ روشنی کا پردہ، جس کے پیچھے وہ یوں چھپی

ہوئی تھی جیسے کسی نقاب میں۔

حقیقت یہ ہے کہ کلارا نہ لمبی ہے نہ سنہرے بالوں والی۔ صرف حسن کی داخلی عظمت نے اسے مسٹر زیتورتسکی کی نگاہوں میں لمبا قد عطا کر دیا تھا اور وہ دمک جو حسن سے پھوٹتی ہے، اس کی بدولت اس کے بال سنہرے ہو گئے تھے۔

اس طرح جب پستا قد آدمی آخرکار اس کونے میں پہنچا جہاں کلارا ایک بھورے رنگ کا سوتی لبادہ پہنے، ایک قمیص کی سلائی میں مشغول بیٹھی تھی تو وہ اسے پہچان نہ سکا، کیونکہ دراصل اس نے کلارا کو کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔

۹

جب کلارا اس واقعے کا بے ربط اور مشکل سے سمجھ میں آنے والا بیان مکمل کر چکی تو میں نے کہا، ''دیکھو، ہماری قسمت اچھی ہے۔''

لیکن کلارا سسکیوں کے درمیان مجھ سے بولی، ''کیسی قسمت؟ اگر وہ مجھے آج نہیں ڈھونڈ سکے تو کل ڈھونڈ نکالیں گے۔''

''ذرا بتاؤ، کس طرح؟''

''وہ مجھے یہاں، تمھارے گھر آ کر پکڑ لیں گے۔''

''میں کسی کو اندر آنے ہی نہیں دوں گا۔''

''اور اگر انہوں نے پولیس کو بھیج دیا تو؟''

''ارے چھوڑو بھی میں کہہ دوں گا کہ یہ مذاق تھا۔ اور آخر ہنسی مذاق ہی تو تھا یہ۔''

''آج کل مذاق کا زمانہ نہیں ہے، آج کل ہر چیز سنجیدہ شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وہ کہیں گے کہ میں نے اس کی شہرت داغدار کرنے کی کوشش کی۔ اسے دیکھ کر کون کہے گا کہ وہ کسی عورت کو پٹانے کی کوشش کر سکتا ہے؟''

''تم ٹھیک کہتی ہو، کلارا،'' میں نے کہا،'' وہ غالباً تمہیں قید میں ڈال دیں گے لیکن دیکھو کاریل ہاولیچیک بورووسکی بھی جیل گیا تھا اور کہاں تک پہنچا، تم نے اس کے بارے میں اسکول میں پڑھا ہوگا۔''

''بک بک بند کرو!'' کلارا نے کہا۔ ''تم جانتے ہو میرے ساتھ بہت برا ہونے والا ہے۔ مجھے نظم وضبط کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونا پڑے گا اور یہ بات میرے رکارڈ پر آ جائے گی اور میں کبھی اس کارخانے سے نکل نہیں سکوں گی۔ ویسے بھی، میں پوچھنا چھاہتی ہوں کہ اس ملازمت کا کیا بنا جو مجھے دلوانے کا تم نے وعدہ کیا تھا۔ اب میں رات کو تمھارے گھر پر نہیں سو سکتی۔ مجھے ہمیشہ ڈر سا لگا رہے گا کہ وہ مجھے پکڑنے آ رہے ہیں۔ آج میں چیلا کووِتس واپس جا رہی ہوں۔'' یہ تو ایک گفتگو تھی۔

سہ پہر کو شعبے میں ہونے والی ایک میٹنگ کے بعد میری ایک اور گفتگو ہوئی۔ شعبے کے چیئر مین نے، جو سفید

بالوں والا آرٹ کا مورخ اور دانشمند آدمی تھا، مجھے اپنے دفتر میں آنے کی دعوت دی۔

''امید ہے کہ تم جانتے ہوں گے کہ تم نے اپنا تازہ ترین مقالہ چھپوا کر اپنا خود بھلا نہیں کیا ہے،'' وہ مجھ سے بولا۔

''ہاں، مجھے معلوم ہے،'' میں نے جواب دیا۔

''ہمارے کئی پروفیسر کا خیال ہے کہ اس میں کہی ہوئی باتوں کا ان پر اطلاق ہوتا ہے، اور ڈین سمجھتا ہے کہ میں اس کے خیالات پر حملہ کیا گیا ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''کچھ بھی نہیں،'' پروفیسر نے جواب دیا، ''لیکن بطور لیکچرر تمہاری تین سال کی مدت پوری ہو رہی ہے اور اس جگہ کو پر کرنے کے لیے امیدواروں میں مقابلہ ہوگا۔ کمیٹی کی روایت رہی ہے کہ خالی ہونے والی جگہ کسی اپنے شخص کو دی جائے جو اسکول میں پہلے بھی پڑھا چکا ہو، لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارے معاملے میں یہ روایت برقرار رہے گی؟ مگر خیر، میں نے اس سلسلے میں بات کرنے کے لئے تمہیں نہیں بلایا ہے۔ اب تک میں تمہارے حق میں بولتا آیا ہوں کہ تم باقاعدگی سے لیکچر دیتے ہو، طالب علموں میں مقبول ہو اور انہیں کچھ نہ کچھ پڑھاتے ہو۔ لیکن اب اس کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ڈین نے مجھے مطلع کیا ہے کہ پچھلے تین مہینوں سے تم نے کوئی لیکچر نہیں دیا ہے۔ اور کسی وجہ کے بغیر۔ صرف یہی بات تمہیں ملازمت سے برطرف کروانے کے لیے کافی ہے۔''

میں نے پروفیسر کو سمجھایا کہ میں نے ایک لیکچر بھی ناغا نہیں کیا، یہ سب محض ایک مذاق تھا، اور میں نے اسے زیتورسکی اور کلارا کا پورا قصہ سنا دیا۔

''بہت خوب، میں تمہاری بات مان لیتا ہوں،'' پروفیسر بولا۔ ''لیکن میرے ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ آج پورا اسکول کہہ رہا ہے کہ تم کوئی لیکچر نہیں دیتے اور کچھ نہیں کرتے۔ اس پر یونین میٹنگ میں بھی بات ہو چکی ہے اور کل وہ لوگ یہ معاملہ بورڈ آف ریجنٹس کے پاس لے گئے ہیں۔''

''لیکن انھوں نے پہلے مجھ سے بات کیوں نہیں کی؟

''تم سے کیوں بات کرتے؟ ہر چیز ان کے سامنے واضح ہے۔ اب تمہاری پوری سابقہ کارکردگی کا جائزہ لے رہے ہیں، اور تمہارے ماضی اور حال کے درمیان ربط تلاش کر رہے ہیں۔''

میرے ماضی میں انہیں کیا غلط چیز مل سکتی ہے؟ آپ تو خود جانتے ہیں کہ مجھے اپنا کام کس قدر پسند ہے۔ میں نے کبھی کام سے جی نہیں چرایا۔ میرا ضمیر صاف ہے۔''

''ہر انسانی وجود کے کئی پہلو ہوتے ہیں،'' پروفیسر نے کہا۔ ''ہم میں ہر ایک کے ماضی کو ایک جتنی آسانی کے ساتھ کسی محبوب رہنما یا کسی بدنام مجرم کی سوانح حیات کا حصہ بنایا جا سکتا ہے۔ ذرا اپنے آپ پر غور سے نظر ڈالو یہ کوئی

نہیں کہہ رہا ہے کہ تم اپنے کام کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ صرف تمہارے فرار کے لیے ایک بہانہ ہو۔ تم اکثر میٹنگوں میں نہیں آتے، اور جب آتے ہو تو زیادہ تر خاموش رہتے ہو۔ کوئی نہیں جانتا کہ تمہارے خیالات کیا ہیں۔ مجھے خود یاد ہے کہ کئی بار جب کوئی سنجیدہ موضوع زیر بحث تھا، تم نے اچانک کوئی مذاق کر ڈالا جس سے سب کو خفت ہوئی۔ بیشک یہ خفت فوراً ہی فراموش کر دی گئی، لیکن آج جب اسے ماضی میں سے برآمد کیا جائے گا تو اس میں ایک خاص اہمیت پیدا ہو جائے گی۔ یا پھر یاد کرو کہ کتنی بار مختلف عورتیں تمہیں ڈھونڈتی ہوئی یونیورسٹی پہونچی اور تم نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اور اب تمہارا تازہ ترین مقالہ جس کے بارے میں کوئی بھی شخص اگر چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ یہ مشکوک قضیوں پر مبنی ہے۔ یہ سب میں مانتا ہوں الگ الگ حقائق ہیں، لیکن ذرا آج کے قصور کی روشنی میں ان پر نظر ڈالو، یہ سب اکٹھے ہو کر تمہارے کردار اور رویے کے بارے میں ایک اہم شہادت کی مجموعی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔''

''لیکن کون سا قصور؟ ہر چیز کی اتنی سیدھی سادھی وضاحت موجود ہے! تمام حقوق بالکل سادہ اور صاف ہیں!''

''رویوں کے مقابلے میں حقوق بہت کم اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی افواہ یا احساس کی تردید کرنا اتنا ہی بے سود ہے جتنا بی بی مریم کی پاکبازی پر کسی کے عقیدے کے بارے میں دلیل بازی کرنا۔ تم محض ایک عقیدے کا شکار ہوئے ہو، کامریڈ اسسٹنٹ!''

''آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بڑی حد تک صحیح ہے،'' میں نے کہا، ''لیکن اگر میرے خلاف احساسات کسی عقیدے کی طرح بیدار ہو گئے ہیں تو میں عقیدے کا مقابلہ عقل سے کروں گا۔ میں ہر ایک کے سامنے ان تمام چیزوں کی وضاحت کروں گا جو پیش آئی ہیں۔ اگر لوگ سچ مچ انسان ہیں تو وہ ان پر ہنسیں گے۔''

''جیسے تمہاری خوشی۔ لیکن بعد میں یا تو تم اس نتیجے پر پہونچو گے کہ لوگ انسان نہیں ہیں، یا پھر اس پر کہ تم نہیں جانتے کہ انسان کیسے ہوتے ہیں۔ وہ بالکل نہیں ہنسیں گے۔ اگر تم ہر چیز جس طرح پیش آئی ہے ان کے سامنے رکھ دو، تو یہ ظاہر ہوگا کہ ایک طرف تم نے ٹائم ٹیبل کے مطابق اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی۔ یعنی وہ کام نہیں کیا جو تمہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور یہ ظاہر ہوگا کہ تم نے ایک ایسے آدمی کی ہتک کی جو تمہاری مدد کا طلبگار تھا اور یہ ظاہر ہوگا کہ تمہارے نجی معاملات گڑبڑ ہیں، کہ تم نے کسی لڑکی کو بغیر رجسٹریشن کے اپنے ساتھ رکھ رکھا ہے، جس کا اثر یونین کی خاتون چیرمین پر بہت ناموافق ہوگا۔ پورا معاملہ الجھ جائے گا اور خدا جانے کیا کیا افواہیں جنم لیں گی۔ وہ جو بھی افواہیں ہوں، ان لوگوں کے یقیناً بہت کام آئیں گی جو تمہارے خیالات کے باعث پہلے سے اشتعال میں ہیں لیکن صرف اس بنا پر تمہاری مخالفت کرنے سے شرما رہے ہیں۔''

میں جانتا تھا کہ پروفیسر مجھے ڈرانے یا دھوکہ دینے کی کوشش نہیں کر رہا ہے۔ لیکن اس معاملے پر اس کی باتوں کو میں نے خبطی کی بڑ خیال کیا اور اسکی تشکیک کے آگے ہتھیار نہ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ مسز زیتورتسکی والے ہنگامے نے مجھ

پر سردی کی ایک لہر طاری کر دی تھی، لیکن مجھے پوری طرح تھکا یا نہیں تھا۔ اس گھوڑے پر سواری کا فیصلہ میرا اپنا تھا، اس لیے میں اسے اجازت نہ دے سکتا تھا کہ وہ میرے ہاتھ سے لگام چھین کر مجھے جہاں اس کا جی چاہے لے جائے۔ میں اس سے زور آزمائی کرنے کو تیار تھا اور گھوڑے نے بھی اس سے گریز نہیں کیا۔ میں گھر پہونچا تو مجھے اپنے پوسٹ باکس میں ایک سامان ملا جس میں مجھے مقامی کمیٹی کی میٹنگ میں حاضر ہونے کی ہدایت کی گئی تھی، اور مجھے ذرا بھی شبہ نہ تھا کہ یہ کس سلسلے میں ہے۔

۱۰

میں غلط نہیں سمجھا تھا۔ مقامی کمیٹی، جس کی میٹنگ ایک ایسی جگہ ہو رہی تھی جہاں پہلے ایک اسٹور رہ چکا تھا، ایک لمبی میز کے گرد بیٹھی تھی۔ جب میں داخل ہوا تو کمیٹی کے ارکان کے چہروں پر افسردگی سی چھا گئی۔ کھچڑی بالوں، اندر کو دبی ہوئی تھوڑی اور چشمے والے ایک شخص نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا اور اس شخص نے کاروائی شروع کی۔ اس نے مجھے مطلع کیا کہ مقامی کمیٹی کچھ دنوں سے مجھ پر نظر رکھے ہوئی ہے اور اسے بہت اچھی طرح اندازہ ہے کہ میری نجی زندگی خاصی بے قاعدہ ہے، اور یہ کہ اس باعث محلے میں میرا اچھا تاثر قائم نہیں ہو رہا ہے، یہ کہ میرے اقامت خانے کے کرایہ دار میرے بارے میں اس سے پہلے بھی ایک بار شکایت کر چکے ہیں۔ جب وہ میرے کمرے میں ہونے والے شور وغل کے باعث رات بھر سو نہ سکے تھے اور یہ کہ سب کچھ اس بات کے لیے کافی تھا کہ مقامی کمیٹی میرے بارے میں ایک خاص طرح کا تاثر قائم کر لے۔ اور اب اس سے بڑھ کر کامریڈ مادام زیتورتسکی نے، جو ایک سائنسی کارکن کی بیوی ہے، کمیٹی سے مدد طلب کی ہے، چھ مہینے پہلے مجھے اس کے شوہر علمی مضمون کے بارے میں ایک تبصرہ تحریر کرنا تھا اور میں نے ایسا نہیں کیا، جبکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس مضمون کی تقدیر میرے تبصرے پر منحصر ہے۔

''آپ اسے علمی مضمون کہہ رہے ہیں!'' میں نے دبی ہوئی تھوڑی والے آدمی کی بات کاٹتے ہوئے کہا، ''یہ صرف چربہ سازی اور پیوندکاری کا مجموعہ ہے۔''

''بہت دلچسپ، کامریڈ،'' سنہری بالوں والوں والی ایک تیس سالہ عورت گفتگو میں شامل ہو گئی اس کے چہرے پر ایک چمکدار مسکراہٹ گویا مستقل طور پر چسپاں تھی۔ ''مجھے ایک سوال پوچھنے کی اجازت دیجیے: آپ کا شعبہ کیا ہے؟''

''آرٹ کے نظریہ کی تنقید۔''

''اور کامریڈ زیتورتسکی؟''

''مجھے معلوم نہیں۔ شاید وہ بھی اسی قسم کا کام کرنے کی کوشش میں ہیں۔''

''دیکھا!'' سنہری بالوں والی عورت فتح مندانہ انداز میں دوسرے ارکان کی طرف مڑی، کامریڈ کلیما اپنے شعبے

میں کام کرنے والے ساتھی کارکن کو اپنا کامریڈ نہیں بلکہ حریف سمجھتے ہیں۔ آج کل تمام انٹلکچوئل لوگ اسی طرح سوچتے ہیں۔"

"میں اپنی بات جاری رکھوں گا،" دبی ہوئی تھوڑی والے شخص نے کہا۔ "کامریڈ زیتورتسکی نے ہمیں بتایا ہے کہ اس کا شوہر آپ سے ملنے آپ کے فلیٹ پر آیا جہاں اس کی ملاقات خاتون سے ہوئی۔ بتایا گیا کہ اس خاتون نے بعد میں مسٹر زیتورتسکی پر الزام لگایا کہ وہ اسے جنسی طور پر پریشان کرنے کا خواہاں تھا۔ کامریڈ مادام زیتورتسکی کے پاس چند دستاویزات تھیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ اس کا شوہر اس طرح کے کام کی اہلیت نہیں رکھتا۔ وہ اس خاتون کا نام جاننا چاہتی ہے جس نے اس کے شوہر پر یہ الزام لگایا، اور معاملے کو کاروائی کے لیے عوامی کمیٹی کے شعبۂ نظم وضبط کے پاس بھجوانا چاہتی ہے کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ اس الزام سے اس کے شوہر کی شہرت متاثر ہوئی ہے۔"

میں نے ایک بار پھر اس مضحکہ خیز معاملے کو مختصر کرنے کی کوشش کی۔ "بات سنیے، کامریڈز،" میں نے کہا، "یہ معاملہ ایسا نہیں کہ اس پر اتنی توجہ صرف کی جائے۔ یہ کسی کی شہرت کے داغدار ہونے کا معاملہ نہیں۔ اس کا مضمون اتنا گیا گزرا تھا کہ کوئی اور شخص بھی اس کے حق میں سفارش نہ کرتا۔ اور اگر اس خاتون اور مسٹر زیتورتسکی کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی بھی ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ باقاعدہ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا جائے۔"

"خوش قسمتی سے، کمیٹی کی میٹنگ کے انعقاد کی بابت فیصلہ آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے، کامریڈ،" دبی ہوئی تھوڑی والے شخص نے کہا۔ "اور اب جب آپ اتنے اصرار سے کہہ رہے ہیں کہ مسٹر زیتورتسکی کا مضمون بہت کمزور ہے، تو ہمیں اس پورے معاملے کو ایک انتقامی کاروائی کے طور پر دیکھنا ہوگا۔ کامریڈ مادام زیتورتسکی نے ہمیں ایک خط پڑھوایا جو آپ نے اس کے شوہر کا مضمون پڑھنے کے بعد لکھا تھا۔"

"ہاں۔ مگر میں نے اس خط میں اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا کہ وہ مضمون کیسا ہے۔" "یہ درست ہے۔ لیکن آپ نے یہ ضرور لکھا تھا کہ آپ کو اس کی مدد کر کے خوشی ہوگی، اس خط سے صاف اشارہ ملتا ہے کہ آپ کامریڈ زیتورتسکی کے مضمون کو احترام کے قابل سمجھتے ہیں۔ اور آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ محض پیوندکاری پر مشتمل ہے۔ آپ نے یہ بات اس کے منہ پر کیوں نہیں کہی؟" "کامریڈ کلیما منافق ہیں،" سنہری بالوں والی عورت بولی۔

اس موقعے پر ایک عمر رسیدہ عورت، جس پر مستقل رعشہ طاری تھا، گفتگو میں شامل ہوئی (اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے وہ بے غرضانہ خیر سگالی کے ساتھ دوسروں کی زندگیوں کا جائزہ لینے کی عادی ہو) اس نے فوراً معاملے کے اصل مرکز کی نشاندہی کی۔ "ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ وہ عورت کون تھی جس سے آپ کے گھر پر مسٹر زیتورتسکی کی ملاقات ہوئی۔"

اب میں کسی غلط فہمی کے بغیر بالکل صاف صاف سمجھ گیا کہ معاملے کی مضحکہ خیز سنگینی کو ختم کرنا میرے بس سے

باہر ہے، اور اس سے نمٹنے کا میرے پاس ایک ہی طریقہ ہے: سراغوں کو مبہم بنانا، ان لوگوں کو کلارا سے دور لے جانا انہیں اس طرح سے بھٹکا کر غلط راستے پر ڈال دینا جیسے چکور بھیڑیے کو بھٹکا کر اپنے گھونسلے سے دور لے جاتا ہے، اور اپنے بچوں کو بچانے کے لیے اس کے سامنے اپنا جسم پیش کر دیتا ہے۔

''بڑا عجیب قصہ ہے، مجھے اس کا نام یاد نہیں،'' میں نے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ جس عورت کے ساتھ رہتے ہوں اس کا نام بھی نہ جانتے ہوں؟'' مستقل رعشہ زدہ عورت نے اعتراض کیا۔

''ایک وقت تھا جب میں یہ سب تفصیلات لکھ لیا کرتا تھا، لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ یہ حماقت ہے، اس لیے لکھنا چھوڑ دیا۔ اور آدمی اپنی یادداشت پر بھروسہ کرنا بہت دشوار ہے۔''

''کامریڈ کلیما، شاید عورتوں سے آپ کے تعلقات بہت مثالی قسم کے ہیں۔'' سنہری بالوں والی عورت نے کہا۔

''دیکھیے شاید مجھے یاد آجائے، لیکن اس کے لیے مجھے اپنے دماغ پر زور ڈالنا ہوگا۔ کیا آپ لوگ مجھے بتا سکتے ہیں کہ مسٹر زیتورتسکی میرے گھر کب آئے تھے؟''

''وہ تاریخ تھی۔۔۔ ایک منٹ ٹھہریے،'' دبی ہوئی تھوڑی والے آدمی نے اپنے کاغذوں پر نگاہ ڈالی۔ ''چودہ تاریخ، بدھ کے دن۔''

''بدھ۔۔۔۔ چودہ تاریخ۔۔۔۔ ٹھہریے۔۔۔'' میں نے اپنا سر تھام لیا اور کچھ دیر سوچا۔ ''ہاں، یاد آگیا وہ ہیلینا تھی۔'' میں نے دیکھا کہ وہ سب میرے الفاظ کو بڑے اشتیاق سے سن رہے ہیں۔

''ہیلینا کون؟''

''کیا؟ معاف کیجیے گا، مجھے اس کا خاندانی نام معلوم نہیں۔ میں اس سے پوچھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ دراصل، صاف بات یہ ہے کہ مجھے یہ بھی یقین نہیں کہ اس کا نام واقعی ہیلینا تھا۔ میں اسے ہیلینا اس لیے کہتا تھا کہ اس کا شوہر مجھے سرخ بالوں والے مینے لاؤس سے مشابہ معلوم ہوتا تھا۔ مگر بہرحال اسے اس نام سے پکارا جانا کافی پسند تھا۔ منگل کی شام کو ایک وائن کی دکان میں میری اس سے ملاقات ہوئی اور جب اس کا مینے لاؤس کونیاک لینے بار تک گیا تو مجھے اس سے کچھ دیر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ اگلے دن میرے کمرے پر آئی پوری سہ پہر وہیں رہی۔ صرف شام کو میں چند گھنٹوں کے لیے اسے چھوڑ کر گیا کیونکہ یونیورسٹی میں ایک میٹنگ تھی۔ جب میں واپس آیا تو وہ بے حد برہم تھی کیونکہ کسی پستہ قد آدمی نے اس پر دست درازی کی تھی۔ اور اسے گمان تھا کہ اسے میں نے ایسا کرنے پر اکسایا تھا: اس نے سخت برا مانا تھا اور اب وہ مجھ سے مزید واقفیت پیدا کرنے پر تیار نہ تھی۔ اور اس طرح دیکھا آپ نے، میں اس کا اصل نام تک معلوم نہ کر سکا۔''

''کامریڈ کلیما، خواہ آپ سچ کہہ رہے ہو یا جھوٹ،'' سنہری بالوں والی عورت نے کہا، ''ایک بات میرے لیے مکمل طور پر ناقابل فہم ہے، وہ یہ کہ آپ جیسا شخص ہماری آئندہ نسل کو تعلیم کس طرح دے سکتا ہے۔ کیا ہماری زندگی آپ کو اس کے سوا کسی چیز پر نہیں اکساتی کہ آپ عورتوں کو پٹانے اور استعمال کرنے کے کام میں لگے رہیں؟ آپ یقین رکھیں کہ ہم اپنی یہ رائے متعلقہ حلقوں تک ضرور پہونچائیں گے۔''

''چوکیدار نے کسی ہیلینا کا ذکر نہیں کیا،'' مستقل رعشہ والی عمر رسیدہ عورت بول اٹھی، ''لیکن یہ ضرور بتایا کہ ملبوسات کے کارخانے میں، کام کرنے والی ایک لڑکی بغیر رجسٹریشن کرائے، ایک مہینے سے آپ کے ساتھ رہ رہی ہے۔ یہ بات مت بھولیے کامریڈ، کہ آپ ایک اقامت خانے میں رہ رہے ہیں۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ آپ کسی کو یوں اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں؟ کیا آپ نے اس جگہ کو قحبہ خانہ سمجھ رکھا ہے؟''

اچانک میری نگاہ کے سامنے وہ دس کراؤن چمکے جو میں نے چند دنوں پہلے چوکیدار کو رشوت کے طور پر دیے تھے، اور جان لیا کہ محاصرہ مکمل ہو چکا ہے۔ مقامی کمیٹی کی رکن عورتوں نے اپنی بات جاری رکھی، ''اگر آپ اس کا نام نہیں بتانا چاہتے تو پولیس خود معلوم کر لے گی۔

II

زمین میرے پیروں تلے سے کھسکی جا رہی تھی۔ یونیورسٹی میں مجھے وہ معاندانہ ماحول رفتہ رفتہ محسوس ہونے لگا جس کا تذکرہ پروفیسر نے کیا تھا۔ فی الحال مجھے کسی انٹرویو کے لیے نہیں بلایا گیا، لیکن کہیں کہیں مجھے بات چیت میں کوئی اشارہ محسوس ہو جاتا، اور کبھی کبھی میری کوئی بات کہہ بیٹھتی کیونکہ شعبے کے استاد اس کے دفتر میں آ کر کافی پیتے تھے اور بات چیت کرنے میں زیادہ احتیاط سے کام نہ لیتے تھے۔ چند روز بعد شعبے کی کمیٹی کا، جو ہر طرف سے شہادتیں جمع کر رہی تھیں، اجلاس ہونے والا تھا۔ میں نے تصور کیا کہ اس کے ارکان مقامی کمیٹی کی رپورٹ پڑھ چکے ہیں، یعنی وہ رپورٹ جس کے بارے میں میں صرف اتنا جانتا تھا کہ یہ خفیہ ہے اور میں اس سے رجوع نہیں کر سکتا۔

زندگی میں ایسے لمحے آتے ہیں جب انسان مدافعانہ انداز میں پسپا ہونے لگتا ہے، جب اسے میدان چھوڑنا پڑتا ہے، جب اسے کم اہم مورچوں کو زیادہ اہم مورچوں کی خاطر تج دینا پڑتا ہے۔ لیکن جب معاملہ بالکل آخری مورچے پر پہنچ جائے، تب آدمی کو رک کر اپنے قدم مضبوطی سے گاڑ لینے پڑتے ہیں، اگر وہ اپنی زندگی کو ساکن ہاتھوں اور جہاز کی غرقابی کے احساس کے ساتھ نئے سرے سے شروع نہ کرنا چاہتا ہو۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا وہ واحد اہم ترین مورچہ میری محبت ہے۔ ہاں، ان پریشان کن دنوں میں مجھے یکلخت احساس ہونے لگا تھا کہ میں اپنی نازک اور بدقسمت درزن سے محبت کرتا ہوں، جسے زندگی نے زدوکوب بھی کیا تھا اور جس کے ناز بھی اٹھائے تھے، اور یہ کہ میں اس کے ساتھ پوری طرح پیوست ہوں۔

اس روز کلارا مجھے میوزیم پر ملی۔ گھر پر نہیں۔ کیا آپ اب بھی گھر کو گھر سمجھتے ہیں؟ کیا شیشے کی دیواروں والے کمرے کو گھر کہتے ہیں؟ ایسا کمرہ جس کا دوربینوں سے جائزہ لیا جا رہا ہو؟ ایسا کمرہ جہاں آپ اپنی محبوبہ کو ممنوعہ اشیاء سے زیادہ چھپا کر رکھنے پر مجبور ہوں؟

گھر گھر نہیں رہا تھا۔ وہاں ہم خود کو بلا اجازت گھسا ہوا محسوس کرتے جنہیں کسی بھی لمحے پکڑا جا سکتا ہو۔ راہداری میں قدموں کی چاپ ہمیں خوفزدہ کر دیتی، ہم ہر وقت کسی کے آ کر زور زور سے دروازہ پیٹنے کی توقع کرتے رہتے۔ کلارا اب چیلا کو وِس کے محلے سے کام پر آیا جایا کرتی اور ہمیں تھوڑی دیر کے لیے اپنے غیر لگنے والے گھر میں ملنے کی خواہش نہ ہوتی۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک آرٹسٹ دوست سے رات کو اس کا اسٹوڈیو استعمال کرنے کی اجازت لے لی تھی۔ اس روز وہاں کی چابی مجھے پہلی بار ملی تھی۔

اس طرح ہم دونوں نے خود کو وینوہرادی کے علاقے میں ایک اونچی چھت کے نیچے، ایک وسیع و عریض کمرے میں پایا جہاں صرف ایک چھوٹا سا دیوان تھا اور ایک بہت بڑی ترچھی کھڑکی جس میں سے پورے پراگ کی روشنیاں دکھائی دیتی تھیں۔ دیواروں سے ٹکا کر رکھی ہوئی بہت سی پینٹنگز، کمرے کی بے ترتیبی اور ایک بے پروا آرٹسٹ کی مفلسی کے درمیان میرا آزادی کا مبارک احساس پھر سے لوٹ آیا۔ میں دیوان پر پھیل کر لیٹ گیا، اور کاگ کھولنے والا پیچ کش پھنسا کر وائن کی بوتل کھولی۔ میں خوش دلی اور آزادی سے خوب باتیں کر رہا تھا اور ایک حسین شام اور رات کی امید میں تھا۔

لیکن وہ دباؤ، جو مجھے اب محسوس نہیں ہو رہا تھا، کلارا پر اپنے پورے بوجھ کے ساتھ آ پڑا تھا۔ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ کلارا کس طرح بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اور انتہائی فطری انداز میں میرے کمرے میں رہا کرتی تھی۔ لیکن اب، جب ہم نے خود کو تھوڑی دیر کے لیے کسی اور کے اسٹوڈیو میں پایا، تو وہ بجھ سی گئی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ "یہ بہت توہین آمیز ہے" اس نے کہا۔

"کیا توہین آمیز ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کہ ہمیں کسی اور کا فلیٹ مانگنا پڑ رہا ہے۔"

"اس میں کیا توہین آمیز بات ہے کہ ہم نے کسی اور کا فلیٹ مانگ لیا ہے؟"

"کیونکہ اس میں کوئی توہین آمیز بات ہے،" اس نے جواب دیا۔

"لیکن ہم اور کچھ کر بھی تو نہیں سکتے۔"

"ہاں،" اس نے جواب دیا، "لیکن مانگے ہوئے فلیٹ میں خود کو ایک طوائف جیسا محسوس کرتی ہوں۔"

"او خدایا! تم خود کو مانگے ہوئے فلیٹ میں طوائف جیسا کیوں محسوس کرتی ہو؟ طوائفیں تو زیادہ تر اپنے فلیٹوں

میں کاروبار کرتی ہیں، نہ کہ مانگے ہوئے فلیٹوں میں۔۔۔"

لیکن عقل کی مدد سے اس غیر عقلی احساس کی موٹی دیوار پر حملہ کرنا بے سود تھا، جس پر نسوانی ذہن، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، مشتمل ہوتا ہے۔ ہماری گفتگو ابتداء ہی سے غیر خوش آئند تھی۔

میں نے کلارا کو وہ سب کچھ بتایا جو پروفیسر نے مجھ سے کہا تھا، وہ سب کچھ بتایا جو مقامی کمیٹی میں پیش آیا تھا، اور اسے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ اگر ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑتے تو آخر میں جیت ہماری ہوگی۔

کلارا کچھ دیر خاموش رہی اور پھر اس نے مجھے قصوروار قرار دیا۔

"کیا تم مجھے ان درزنوں کے گھیرے سے باہر نکال سکتے ہو؟"

میں نے اسے بتایا کہ کم سے کم عارضی طور پر برداشت سے کام لینا ہوگا۔

"دیکھا،" کلارا بولی، "تم وعدہ کر لیتے ہو اور پھر اسے پورا کرنے کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ اب میں کسی اور کی مدد سے وہاں سے نکل نہیں پاؤں گی، کیونکہ تمہاری وجہ سے میری شہرت خراب ہوگئی ہے۔"

میں نے کلارا کو یقین دلایا کہ مسٹر زیتورتسکی والا معاملہ اس کو ذرا بھی نقصان نہیں پہونچا سکتا۔

"میری یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا،" کلارا نے کہا، "کہ تم تبصرہ لکھ کیوں نہیں دیتے۔ اگر تم تبصرہ لکھ دو تو ایک دم سکون ہو جائے گا۔"

"اب بہت دیر ہو چکی ہے،" میں نے کہا، "اگر اب میں نے تبصرہ لکھا تو وہ لوگ کہیں گے کہ میں انتقاماً اس مضمون کو رگید رہا ہوں، اور مزید طیش میں آجائیں گے۔"

"تو رگیدنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم اس کے حق میں تبصرہ لکھ دو!"

"یہ میں نہیں کر سکتا، کلارا،" وہ مضمون لغویت کا پلندا ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ تم اچانک اتنے سچے کیسے بن گئے؟ جب تم نے اس چھوٹے آدمی کو یہ بتایا تھا کہ جریدے والے تمہاری رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تو کیا یہ جھوٹ نہیں تھا؟ اور جب تم نے کہا کہ اس نے مجھے پٹانے کی کوشش کی تھی تو کیا یہ جھوٹ نہیں تھا؟ اور جب تم نے ہیلینا کو ایجاد کیا تو کیا یہ جھوٹ نہیں تھا؟ جب اتنے سارے جھوٹ بول سکتے ہو تو ایک اور جھوٹ بولنے سے، تعریفی تبصرہ لکھ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ یہی ایک راستہ ہے جس سے معاملات سیدھے ہو سکتے ہیں۔"

"دیکھو کلارا،" میں نے کہا، "تم سمجھتی ہو کہ جھوٹ بس جھوٹ ہوتا ہے، اور بظاہر تمہاری بات درست معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ میں کچھ بھی ایجاد کر سکتا ہوں، کسی کو بے وقوف بنا سکتا ہوں، عملی مذاق کر سکتا ہوں، اور

میں خود کو جھوٹا محسوس نہیں کرتا اور نہ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے۔ یہ سارے جھوٹ اگر تم انہیں یہی نام دینے پر مصر ہو، مجھے اسی طرح پیش کرتے ہیں جیسا دراصل میں ہوں۔ یہ جھوٹ بول کر میں کسی بناوٹ سے کام نہیں لے رہا ہوتا، ان کے ذریعے دراصل میں سچ بول رہا ہوتا ہوں۔ لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں میں جھوٹ نہیں بولسکتا، وہ چیزیں جن میں میں اندر تک اترا ہوا ہوں، جن کے معنی کو میں اپنی گرفت میں لایا ہوں، جن سے میں محبت کرتا ہوں اور جن کے بارے میں سنجیدہ ہوں۔ یہ ناممکن ہے، مجھ سے اینا کرنے کو مت کہو، میں ایسا کر ہی نہیں سکتا۔''

ہم ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکے۔

لیکن مجھے کلارا سے سچ مچ محبت تھی اور میں نے اپنے بس بھر سب کچھ کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ اس کے پاس مجھے ملامت کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ اگلے دن میں نے مسز زیتورتسکی کے نام ایک خط لکھا اور اس میں کہا کہ تیسرے دن دو بجے دوپہر کو اپنے دفتر میں اس کا انتظار کروں گا۔

۱۲

اپنی دہشت ناک باقاعدگی کے ساتھ مسز زیتورتسکی نے ٹھیک معینہ وقت پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کو کہا۔

تب میں نے آخر کار اسے دیکھا۔ وہ لمبے قد کی عورت تھی، بہت لمبے قد کی، پتلے دہقانی چہرے اور زردی مائل نیلی آنکھوں والی۔ ''اپنا کوٹ وغیرہ اتار دیجیے،'' میں نے کہا، اور اس نے بازو کی عجیب حرکت سے اپنا لمبا، گہرے رنگ کا کوٹ اتارا جو کمر پر سے تنگ تھا اور عجیب نمونے کا سلا ہوا تھا، ایک ایسا کوٹ جسے دیکھ کر خدا جانے کیوں قدیم گریٹ کوٹ کا خیال آتا تھا۔

میں فوری حملہ نہیں کرنا چاہتا تھا، پہلے میں اپنی حریف کے پتے دیکھنا چاہتا تھا۔ جب مسز زیتورتسکی بیٹھ گئی تو میں ادھر ادھر کی بات کر کے اسے بولنے پر اکسایا۔

''مسٹر کلیما،'' اس نے سنجیدہ آواز میں، لیکن کسی جارحیت کے بغیر، کہا، ''آپ جانتے ہیں میں آپ سے کیوں ملنا چاہتی تھی۔ میرے شوہر نے ہمیشہ آپ کا اپنے شعبے کے ماہر اور ایک باکردار شخص کے طور پر احترام کیا ہے۔ ہر چیز آپ کے تبصرے پر منحصر تھی اور آپ یہ تبصرہ نہیں لکھنا چاہتے تھے۔ میرے شوہر کو یہ مقالہ لکھنے میں تین سال لگے ہیں۔ اس نے آپ سے زیادہ دشوار زندگی گذاری ہے۔ وہ ٹیچر تھا، ہر روز پراگ سے بیس میل دور آیا جایا کرتا تھا۔ پچھلے سال میں نے اسے یہ ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا تھا تا کہ وہ اپنی پوری توجہ تحقیق پر لگا سکے۔''

''مسٹر زیتورتسکی بارو زگار نہیں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔''

''پھر ان کی گذر بسر کیسے ہوتی ہے؟''

''فی الحال مجھے زیادہ محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ یہ تحقیق، مسز کلیما، میرے شوہر کے دل کی لگن ہیں۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح ایک ایک چیز کا مطالعہ کیا۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ اس نے کتنے صفحے بار بار لکھے۔ وہ ہمیشہ کہتا ہے کہ سچا محقق وہ ہے جو تین صفحے لکھے اور تین صفحوں کے سوا باقی سب کو ضائع کر دے۔ اور پھر ہر چیز سے بڑھ کر یہ عورت۔ یقین کیجیے، مسز کلیما، میں اپنے شوہر کو جانتی ہوں، مجھے یقین ہے کہ اس نے یہ حرکت نہیں کی، پھر اس عورت نے اس پر الزام کیوں لگایا؟ میں اسے نہیں مان سکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ میرے اور شوہر کے منہ پر یہ بات کہہ دے۔ میں عورتوں کو جانتی ہوں، شاید وہ آپ سے بہت محبت کرتی ہے اور آپ اس کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ شاید وہ آپ میں حسد کا جذبہ ابھارنا چاہتی ہو۔ لیکن مجھ پر یقین کیجیے، مسز کلیما، میرے شوہر کی ہرگز یہ مجال نہیں ہو سکتی۔''

میں مسز زیتورتسکی کی بات سن رہا تھا اور اچانک میرے ساتھ ایک عجیب سی بات ہوئی، میں اس احساس سے بیگانہ ہو گیا کہ وہ عورت ہے جس کی وجہ سے مجھے یونیورسٹی چھوڑنی پڑ رہی ہے اور جس کی وجہ سے میرے اور کلارا کے درمیان رنجش پیدا ہو گئی ہے۔ اور جس کے سبب میرے اتنے دن غصے اور کوفت کے عالم میں گزرے ہیں۔ اس واقعے سے اس کا تعلق جس میں ہم دونوں نے اپنا اپنا غم انگیز کردار ادا کیا، اچانک مبہم، اتفاقی، حادثاتی معلوم ہونے لگا، جیسے اس میں ہم دونوں کا کوئی قصور نہ ہو۔ ایک دم میری سمجھ میں آ گیا کہ یہ محض ہمارا فریب نظر ہے کہ ہم واقعات کے گھوڑوں پر سواری کرتے اور انہیں اپنی راہ پر چلاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سرے سے ہماری کہانیاں ہی نہیں ہوتیں بلکہ کہیں اور سے، باہر سے، ہم پر لادی جاتی ہیں، یہ کسی بھی طرح ہماری نمائندگی نہیں کرتیں، یہ جو راہ اختیار کرتی ہیں ان کے سلسلے میں ہمیں قصوروار ٹھہرایا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ ہمیں لے اڑتی ہیں، کیونکہ انہیں دوسری قوتیں کنٹرول کرتی ہیں، نہیں، میری مراد ماورائے فطرت قوتوں سے نہیں، بلکہ انسانی قوتوں سے ہے، ان افراد کی قوتیں، جو ایک جگہ جمع ہو کر بھی ایک دوسرے سے اجنبی رہتے ہیں۔

جب میں نے مسز زیتورتسکی کی آنکھوں میں دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے یہ آنکھیں میرے حرکت کے نتائج کو نہیں دیکھ سکتیں، جیسے یہ آنکھیں کچھ دیکھ ہی نہیں رہیں، جیسے یہ محض اس کے چہرے پر تیر رہی ہیں، اس چہرے پر محض چپکی ہوئی ہیں۔

''شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں مسز زیتورتسکی،'' میں نے صلح جوئی کے لہجے میں کہا، ''شاید میری دوست نے سچ نہیں بولا تھا، لیکن آپ جانتی ہیں کہ جب کسی مرد میں حسد کا جذبہ جاگ اٹھے تو کیا ہوتا ہے۔۔۔ میں نے اس کی بات پر یقین کر لیا اور اس ریلے میں بہہ گیا۔ ایسا کسی کے بھی ساتھ ہو سکتا ہے۔''

''ہاں یقیناً،'' مسز زیتورتسکی نے کہا، اور یہ ظاہر تھا کہ اس کے دل سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہے۔ ''یہ اچھا

ہے کہ آپ خود ہی اس بات کو محسوس کر رہے ہیں۔ ہمیں خوف تھا کہ کہیں آپ اس عورت کی بات پر یقین نہ کرتے ہوں۔ یہ عورت تو میرے شوہر کی ساری زندگی کی نیک نامی کو برباد کر سکتی تھی۔ میں اس کے خلاف اثرات کی بات نہیں کر رہی۔ لیکن میرا شوہر آپ کے خیالات کی قسم کھاتا ہے۔ مدیروں نے اسے یقین دلایا تھا کہ سب کچھ آپ کی رائے پر منحصر ہے۔ میرے شوہر کو یقین ہے کہ اگر اس کا یہ مقالہ چھپ جائے تو اسے آخر کار ایک سائنسی کارکن تسلیم کر لیا جائے گا۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں، اب جب کہ سارا معاملہ صاف ہو گیا، کیا آپ اس کے لیے تبصرہ لکھ دیں گے؟ اور کیا آپ اسے جلدی لکھ سکتے ہیں؟''

اب وہ لمحہ آیا جب میں اپنا انتقام لے سکتا اور اپنے غصے کی آگ کو بجھا سکتا تھا اگر چہ اس موقعے پر مجھے غصہ محسوس نہیں ہو رہا تھا، اور جب میں نے مسز زیتور تسکی کو جواب دیا تو اس لیے کہ اس سے فرار کی کوئی راہ نہ تھی۔ ''مسز زیتور تسکی، تبصرے کے سلسلے میں ایک مسئلہ ہے۔ میں آپ سے اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ کس طرح پیش آیا۔ میں لوگوں کے منہ پر ناخوش گوار باتیں کہنا پسند نہیں کرتا۔ یہ میری کمزوری ہے۔ میں مسز زیتور تسکی سے ملنے سے گریز کرتا رہا، اور میرا خیال تھا وہ بھانپ جائیں گے کہ میں کیوں ایسا کر رہا ہوں۔ ان کا مضمون بہت کمزور ہے۔ اس کی کوئی سائنسی قدر و قیمت نہیں۔ کیا آپ کو میری بات کا یقین آ رہا ہے؟''

''میرے لیے اس بات پر یقین کرنا مشکل ہے۔ نہیں، آپ کی بات پر یقین نہیں کر سکتی،'' مسز زیتور تسکی نے کہا۔

''سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ تحریر اوریجنل نہیں ہے۔ ذرا سمجھنے کی کوشش کیجیے، محقق کا کام یہ ہے کہ کسی نئے نتیجے پر پہونچے، محقق ان باتوں کو نقل نہیں کر سکتا جو ہم پہلے سے ہی جانتے ہیں، جو دوسرے لوگوں نے پہلے سے ہی لکھ رکھی ہے۔''

''میرے شوہر نے کسی کی نقل نہیں کی۔''

''مسز زیتور تسکی، آپ نے یقیناً اپنے شوہر کا مضمون پڑھ رکھا ہوگا۔۔۔'' میں آگے بولنا چاہتا تھا لیکن مسز زیتور تسکی نے میری بات کاٹ دی۔ ''نہیں، میں نے نہیں پڑھا۔'' مجھے حیرت ہوئی۔ ''تو آپ پڑھ کر خود دیکھ لیجیے۔''

''میں دیکھ نہیں سکتی،'' مسز زیتور تسکی نے کہا۔ ''مجھے صرف روشنی اور سائے ہی دکھائی دیتے ہیں میری آنکھیں خراب ہیں۔ میں نے پانچ سال سے ایک سطر بھی نہیں پڑھی، لیکن مجھے یہ جاننے کے لیے کہ میرا شوہر ایماندار آدمی ہے یا نہیں، کچھ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات دوسرے طریقوں سے بھی پہچانی جا سکتی ہے۔ میں اپنے شوہر کو جانتی ہوں، جیسے ماں اپنے بچوں کو جانتی ہے، میں اس کے بارے میں ہر بات جانتی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے ایمانداری سے کرتا ہے۔''

مجھے اس سے بدتر حالات سے گزرنا پڑا۔ میں نے مسز زیتورتسکی کو مینتے چک، پیچیر کا اور میچک کے وہ پیراگراف پڑھ کر سنائے جن کے خیالات اور نظریات مسٹر زیتورتسکی نے اپنی مضمون میں پیش کر دیے تھے۔ یہ دانستہ چربہ سازی کا سوال نہیں تھا بلکہ ان ماہرین فن کے سامنے ایک غیر شعوری نیاز مندی کا اظہار تھا جن کے خیالات نے مسٹر زیتورتسکی کے اندر مخلصانہ اور شدید احترام کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ لیکن کوئی بھی شخص ان پیراگرافوں کا تقابل کر کے آسانی سے سمجھ سکتا تھا کہ کوئی سنجیدہ علمی جریدہ مسٹر زیتورتسکی کے مضمون کو شائع نہیں کر سکتا۔

میں نہیں جانتا کہ مسز زیتورتسکی نے میری توضیحات کو کتنے غور سے سنا، اور کس حد تک سمجھا، وہ انکسار کے ساتھ کرسی پر بیٹھی رہی، کسی سپاہی کے سے انکسار اور تابعداری کے ساتھ، جیسے اس بات کا علم ہو کہ اسے کسی حالت میں اپنا مورچہ نہیں چھوڑنا ہے۔ اس کام میں ہمیں کوئی آدھ گھنٹہ لگا۔ مسز زیتورتسکی کرسی سے اٹھی، اپنی شفاف آنکھیں مجھ پر جما دیں اور دبی ہوئی آواز میں مجھ سے معذرت چاہی، لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس کا اپنے شوہر پر بھروسہ اب بھی قائم ہے، اور یہ میرے دلائل کی، جو اس کے لیے مبہم اور ناقابل فہم تھے، مزاحمت نہ کر پانے کے لیے اپنے سوا کسی کو قصوروار نہیں سمجھتی۔ اس نے اپنی فوجی وضع کی برساتی پہن لی اور میں جان گیا کہ یہ عورت جسمانی اور روحانی طور پر سپاہی ہے، ایک افسردہ اور وفادار سپاہی، لانگ مارچوں سے تھکا ہوا سپاہی، ایسا سپاہی جو شکست کھا کر بھی اپنا وقار کھوئے بغیر واپس لوٹتا ہے۔

اس کے جانے کے بعد اس کی تھکن، اس کی وفاداری اور افسردگی کا کچھ حصہ میرے دفتر میں باقی رہ گیا۔ میں اچانک اپنے آپ کو اور اپنے دکھوں کو بھول گیا۔ اس لمحے میں جس دکھ کے نرغے میں تھا وہ کہیں زیادہ پاکیزہ تھا، کیونکہ اس کا منبع میری ذات میں نہیں بلکہ باہر کہیں، بہت دور واقع تھا۔

۱۳

''تو اب تمہیں کسی بات سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں،'' میں نے ڈالماشین کی وائن کی دکان میں کلارا کو مسز زیتورتسکی کے ساتھ ہونے والی پوری گفتگو سنانے کے بعد کہا۔

''مجھے تو ویسے بھی کسی بات کا ڈر نہیں،'' کلارا نے ایسے اعتماد کے ساتھ کہا جس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔

''کیا مطلب، کسی بات کا ڈر نہیں؟ تمہاری ہی وجہ سے تو مجھے مسز زیتورتسکی سے ملنا پڑا''

''تم نے اچھا کیا کہ اس سے مل لیے کیونکہ تم نے ان لوگوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بہت ظالمانہ تھا۔ ڈاکٹر کلوسک کا کہنا ہے کہ کسی بھی ذہین آدمی کے لیے تمہارے اس رویے کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔''

''تم کلوسک سے کب ملیں؟''

''میں مل چکی ہوں،'' کلارا نے کہا۔

''اور تم نے اسے سب کچھ بتا دیا؟''

''کیوں؟ تو کیا یہ کوئی راز ہے؟ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم اصل میں کیا ہو۔''

''ہوں۔''

''تمہیں بتاؤں تم کیا ہو؟''

''ضرور۔''

''ایک عام قسم کے کلبی۔''

''یہ تم نے کلوسک سے سنا ہوگا۔''

کلوسک سے کیوں؟ کیا تمہارا خیال ہے میں خود یہ بات نہیں سمجھ سکتی؟ اصل میں تمہارا خیال یہ ہے کہ مجھ میں اتنی اہلیت نہیں کہ تمہارے بارے میں خود اپنی رائے قائم کر سکوں۔ تم لوگوں کو نکیل ڈال کر چلانا چاہتے ہو۔ تم نے مسٹر زیتور تسکی سے تبصرہ لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔''

''میں نے اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔''

''یہ تو ایک بات ہوئی۔ پھر تم نے مجھ سے ملازمت دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ تم نے مجھے مسٹر زیتور تسکی کے لیے ایک بہانے کے طور پر استعمال کیا اور مسٹر زیتور تسکی کو میرے لیے بہانے کے طور پر۔ لیکن اتنا یقین رکھو کہ ملازمت مجھے مل جائے گی۔''

''کلوسک کے ذریعے سے؟ میں نے طنزیہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کی۔

''تمہارے ذریعے سے نہیں۔ تم نے اپنا اتنا کچھ داؤ پر لگا دیا ہے اور تم جانتے تک نہیں کہ تم کیا کچھ ہار چکے ہو۔''

''اور تم جانتی ہو؟''

''ہاں۔ یونیورسٹی تمہارے معاہدے کی تجدید نہیں کرے گی، اگر تمہیں کسی گیلری میں کلرک کی نوکری بھی مل جائے تو تم خوش قسمت ہو گے۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب تمہاری اپنی غلطی کا نتیجہ ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں تمہیں ایک مشورہ دوں، آئندہ ہمیشہ ایمانداری سے کام لینا اور کبھی جھوٹ مت بولنا کیونکہ عورت جھوٹ بولنے والے مرد کی عزت نہیں کرتی۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی، مجھ سے (یہ ظاہر تھا کہ آخری بار) ہاتھ ملایا، مڑی اور چلی گئی۔

کچھ دیر بعد ہی مجھے خیال آیا (اگرچہ میرے چاروں طرف سرد خاموشی کا گھیرا تھا) کہ میری کہانی دراصل المیہ نہیں بلکہ طربیہ کہانیوں کے زمرے سے تعلق رکھتی ہے۔

اور اس خیال نے مجھے کسی قدر تسکین پہنچائی۔

ژاں پال سارتر
انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی

دیوار

انہوں نے ہمیں ایک بڑے اجلے کمرے میں دھکیل دیا جہاں روشنی اتنی تیز تھی کہ میری پلکیں جھپکنے لگیں۔ پھر میری نظر ایک میز اور اس کے پیچھے بیٹھے ہوئے چار غیر فوجیوں پر پڑی جو کاغذات دیکھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے قیدیوں کا ایک گروہ تھا۔ جس میں شامل ہونے کے لیے ہمیں سارا کمرہ عبور کرنا پڑا۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جنہیں میں جانتا تھا اور کچھ ایسے جو یقیناً غیر ملکی ہوں گے۔ میرے سامنے جو دو قیدی تھے ان کی رنگت گوری اور کھوپڑیاں گول تھیں اور وہ ہم شکل لگ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ فرانسیسی ہیں۔ ان میں جو چھوٹا تھا وہ اعصابی تشنج کے باعث اپنی پتلون بار بار اوپر چڑھا رہا تھا۔

یہ سلسلہ کوئی تین گھنٹے جاری رہا۔ مجھے چکر آرہے تھے اور اپنا سر خالی خالی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن کمرہ خوب گرم تھا اور یہ بات مجھے خاصی خوشگوار لگ رہی تھی۔ کیونکہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے ہم مسلسل کانپ رہے تھے۔ سنتری یکے بعد دیگرے قیدیوں کو میز تک لاتے اور وہ چاروں اہل کاران کا نام اور پیشہ پوچھتے۔ زیادہ تر وہ ان سوالوں کے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ بس کبھی کبھار ایک آدھ بات اور پوچھ لیتے، جیسے: ''گولا بارود کا ذخیرہ اڑانے میں تمہارا ہاتھ تھا؟'' یا ''نو تاریخ کی صبح تم کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟'' وہ جواب نہیں سن رہے تھے یا کم از کم سنتے ہوئے نہیں لگ رہے تھے۔ وہ لحہ بھر کو چپ ہوتے اور بالکل سامنے دیکھنے لگتے۔ اس کے بعد وہ پھر لکھنے لگتے۔ انہوں نے ٹام سے پوچھا کہ یہ درست ہے کہ وہ انٹرنیشنل بریگیڈ کا رکن ہے۔ ٹام انہیں اس کے برعکس نہیں بتا سکتا تھا، کہ اس کی جیب سے کاغذات برآمد ہو چکے تھے۔ انہوں نے حوان سے کچھ نہیں پوچھا لیکن وہ جب وہ اپنا نام بتا چکا تو وہ تادیر لکھتے رہے۔

میرا کسی پارٹی سے تعلق نہیں ہے۔ سیاست سے میرا واسطہ کبھی نہیں رہا۔''

انہوں نے جواب نہیں دیا۔ حوان بولتا رہا: ''میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں قربانی کا بکرا بننا نہیں چاہتا۔''

اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ایک سنتری نے اسے خاموش کرایا اور اپنے ساتھ لے گیا۔ اب میری باری تھی۔

''پابلو ابیتا تمھارا نام ہے؟''

''ہاں''

سوال کرنے والے نے کاغذوں پر نظر ڈالی اور مجھ سے پوچھا۔''رامون گریس کہاں ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں۔''

تم نے چھ سے انیس تاریخ تک اسے اپنے گھر میں چھپائے رکھا۔''

''نہیں''

انہوں نے ایک منٹ تک لکھا اور پھر سنتری مجھے باہر لے گئے۔راہداری میں ٹام اور حوان دو سنتریوں کے درمیان منتظر تھے۔ہم چلنے لگے۔ٹام نے ایک سنتری سے پوچھا،''تو؟''

''تو کیا؟''سنتری نے کہا۔

''یہ جرح تھی یا فیصلہ؟''

''فیصلہ''سنتری نے کہا۔

''ہمارے لیے کیا تجویز ہوا ہے؟''

سنتری نے سرد مہری سے جواب دیا،''سزا تمہاری کوٹھری میں سنائی جائے گی۔''

حقیقت میں ہماری کوٹھری اسپتال کے تہہ خانوں میں سے ایک تھی جو گزرتی ہوئی ہوا کے باعث ہولناک حد تک سرد تھی۔ہم رات بھر کانپتے رہے تھے اور دن میں بھی حالت کچھ بہتر نہ تھی۔گزشتہ پانچ دن میں نے ایک خانقاہ کی کوٹھری میں گزارے تھے۔کوٹھری کیا تھی، بس دیوار میں قرونِ وسطیٰ کے زمانے کا ایک سوراخ تھا۔چونکہ قیدی گنجائش سے کہیں زیادہ تھے لہذا ہمیں کہیں بھی بند کر دیا جاتا تھا۔مجھے اپنی کوٹھری یاد نہیں تھی۔وہاں سردی نے مجھے زیادہ آزار نہیں دیا تھا لیکن میں تنہا تھا، اور تنہائی وقت گزرنے کے ساتھ کھلنے لگتی ہے۔اس تہہ خانے میں مجھے رفاقت میسر تھی۔حوان بہت کم کم بات کرتا تھا۔وہ ڈرا ہوا تھا اور اتنا نوعمر تھا کہ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔لیکن ٹام خاصا باتونی تھا اور پھر ہسپانوی بھی اچھی نہیں جانتا تھا۔

''تہہ خانے میں ایک بنچ اور چار چار پائیاں تھیں۔سنتری، ہمیں چھوڑ کر رخصت ہوئے تو ہم خاموشی سے انتظار کرنے لگے۔ایک طویل لمحے کے بعد ٹام بولا،''ہم پھنس گئے ہیں۔''

''میرا خیال بھی یہی ہے،''میں نے کہا۔''لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس لڑکے کو کچھ کہیں گے۔''

''اس کے خلاف ان کے پاس کچھ نہیں،''ٹام نے کہا۔''اس کا قصور صرف یہ کہ اس کا بھائی ملیشیا کا رکن ہے۔''

میں نے حوان کی طرف دیکھا۔وہ ہماری گفتگو سے بے خبر بیٹھا تھا۔ٹام بولتا رہا،''تمہیں معلوم ہے وہ سرگوسا

میں کیا کر رہے ہیں؟ قیدیوں کو سڑک پر لٹا کے ٹرکوں سے کچل ڈالتے ہیں۔ مجھے یہ بات ایک مراکشی بھگوڑے نے بتائی ہے۔ کہتے ہیں اس طرح گولیوں کی بچت ہوتی ہے۔"

"لیکن پٹرول تو نہیں بچتا،" میں نے کہا۔

مجھے ٹام پر غصہ آ رہا تھا، اسے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔

"اور پھر نگرانی کے لیے،" اس نے بات جاری رکھی، "سڑک کے کنارے افسر بھی چلتے رہتے ہیں۔ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے سگریٹ پیتے رہتے ہیں۔ تمہارے خیال میں وہ لوگوں کو ایک دم ہلاک کر دیتے ہیں؟ ارے نہیں! وہ انہیں چیخ پکار کرنے دیتے ہیں، بعض اوقات تو ایک ایک گھنٹے تک۔ اس مراکشی نے بتایا کہ پہلی بار تو اسے ابکائی آتے آتے رہ گئی تھی۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ وہ یہ عمل یہاں بھی دہرائیں گے،" میں نے کہا، "تاوقتیکہ ان کے پاس واقعی گولیوں کی قلت نہ ہو۔"

روشنی، ہوا کے لیے بنے چار دروازوں اور اس بڑے گول سوراخ سے آتی تھی جو انہوں نے چھت میں بائیں طرف کو بنا رکھا تھا اور جس میں سے آسمان نظر آتا تھا۔ اس سوراخ کے راستے، جو عام طور پر ایک ڈھکنے سے بند رہتا تھا، کیونکہ تہہ خانے میں پھینکا جاتا تھا۔ سوراخ کے بالکل نیچے کوئلے کے چورے کا بہت بڑا ڈھیر تھا جو اسپتال کو گرم رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن چنانچہ جنگ آزادی پر مریض کہیں اور منتقل کر دیے گئے تھے، لہٰذا کوئلہ بغیر استعمال ہوئے وہیں پڑا رہا اور بعض اوقات بارش میں بھیگتا بھی رہا کیونکہ وہ سوراخ پر ڈھکنا رکھنا بھول گئے تھے۔

ٹام کپکپانے لگا۔ "خدایا! میں تو ٹھٹھر رہا ہوں،" اس نے کہا۔ "سردی پھر شروع ہو گئی۔"

وہ اٹھ کر ورزش کرنے لگا۔ اس کی ہر حرکت کے ساتھ کم سے کم اس کے سفید اور بالوں بھرے سینے پر کھل کھل جاتی تھی۔ پھر وہ پیٹھ کے بل لیٹا ٹانگیں ہوا میں اٹھائے خیالی سائیکل چلانے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا نچلا دھڑ کانپ رہا تھا۔ ٹام بھاری بھرکم تھا لیکن اس میں چربی بہت تھی۔ میں سوچا کہ نرم گوشت کے اس پہاڑ میں رائفل کی گولیاں یا سنگینوں کی تیز نوکیں جلد ہی ایسے اتر جائیں گی جیسے مکھن کے ڈلے میں۔ وہ دبلا پتلا ہوتا ہو تو میں کبھی اس طرح نہ سوچ سکتا تھا۔

گو مجھے سردی نہیں لگ رہی تھی لیکن میں اپنے بازو اور شانے محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ بعض اوقات میرا تاثر یہ ہوتا کہ میری کوئی شے کھو گئی ہے اور میں اپنا کوٹ ڈھونڈھنے لگتا۔ مجھے یاد آتا کہ انہوں نے مجھے کوٹ نہیں دیا تھا۔ یہ بات بڑی تکلیف دہ تھی۔ وہ ہمارے کپڑے اتروا کر اپنے سپاہیوں کو دے دیتے تھے، اور ہمارے بدن پر صرف قمیصیں اور کینوس کی وہ پتلونیں جو اسپتال کے مریض بھری گرمیوں میں پہنتے تھے، چھوڑ دیتے تھے۔ کچھ دیر بعد ٹام اٹھا اور

میرے برابر بیٹھ گیا۔ وہ بھاری بھاری سانسیں لے رہا تھا۔

''کچھ گرمی آئی؟''

''نہیں۔ لیکن میری سانسیں پھول گئیں ہیں۔

شام آٹھ بجے کے قریب دو فلانجسٹوں کے ساتھ ایک میجر آیا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذوں کا ایک دستہ تھا۔ اس نے سنتری سے پوچھا: ''ان تینوں کے نام کیا ہیں؟''

''اسٹائن بوک، ابیجتا اور میربل،'' سنتری نے کہا۔

میجر نے چشمہ لگایا اور فہرست دیکھنے لگا۔ ''اسٹائن بوک ۔۔۔ اسٹائن بوک ۔۔ ہاں ۔۔۔ تمہیں سزائے موت دی گئی ہے۔ تمہیں کل صبح گولی ماری جائے گی۔'' وہ فہرست دیکھتا رہا۔ ''اور ان دونوں کو بھی۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے!'' حوان نے کہا۔ ''مجھے نہیں ۔۔۔''

میجر نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''حوان میربل،'' اس نے کہا۔

''ہاں۔ تمہارا نام فہرست میں ہے،'' میجر بولا۔ ''تم سزا یافتہ ہو۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا ہے،'' حوان نے کہا۔

میجر نے اپنے کندھے اچکائے اور ٹام کی اور میری طرف متوجہ ہوگیا۔

''تم باسک (Basque) ہو؟''

''باسک کوئی نہیں ہے۔''

وہ مشتعل نظر آنے لگا۔ ''مجھے بتایا گیا ہے کہ یہاں تین باسک ہیں۔ میں ان کی تلاش میں اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ پھر تو ظاہر ہے تمہیں پادری کی ضرورت نہیں ہے؟''

ہم نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔

وہ بولا: ''تھوڑی دیر میں ایک بیلجیئن ڈاکٹر آرہا ہے۔ اسے تمہارے ساتھ شب گزاری کی اجازت دی گئی ہے۔'' اس نے فوجی سلام کیا اور رخصت ہولیا۔

''میں نے تم سے کیا کہا تھا؟'' ٹام بولا۔ ''وہی ہوا نا؟''

''ہاں،'' میں نے کہا۔ ''لڑکے کے لیے بہت سخت سزا ہے یہ۔''

یہ بات میں نے شائستہ نظر آنے کو کہی تھی لیکن لڑکا مجھے پسند نہیں تھا۔ اس کا چہرہ بہت دبلا تھا اور خوف و کرب نے اسے مسخ کر دیا تھا، تمام نقوش بگاڑ ڈالے تھے۔ تین روز قبل وہ ایک طرحدار قسم کا لڑکا تھا اور ایسا برا بھی نہ تھا، لیکن

اب کسی بڈھی پری کی طرح نظر آرہا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ اب کبھی جوان نہ ہو سکے گا، خواہ وہ اسے آزاد ہی کیوں نہ کردیں۔ اس پر ترس کھانا مشکل نہیں تھا لیکن ترس مجھے اکتا دیتا ہے بلکہ دہلا دیتا ہے۔ لڑکے نے کچھ اور نہیں کہا تھا لیکن وہ سفید پڑ گیا تھا، اس کا چہرا اور ہاتھ دونوں سفید تھے۔ وہ دوبارہ بیٹھ گیا اور گول گول دیدوں سے زمین کو تکنے لگا۔ ٹام نرم دل تھا۔ وہ اس کا بازو پکڑنا چاہتا تھا لیکن لڑکے نے سختی سے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے منہ بنایا۔

''اسے چھوڑ دو،'' میں نے ہلکی آواز میں کہا۔ تم دیکھ رہے ہو وہ گھگھیا رہا ہے۔''

ٹام نے افسوس کرتے ہوئے اسے جانے دیا۔ وہ اسے تسلی دینا چاہتا تھا کہ اس طرح اس کا وقت گزر جاتا اور اسے اپنی موت کے بارے میں سوچنے کی تحریص نہ ہوتی۔ لیکن مجھے اس بات پر ناگواری محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کبھی موت کے بارے میں نہیں سوچا تھا کیونکہ سوچنے کی کوئی وجہ ہی نہیں ملی تھی، لیکن اب وجہ موجود تھی اور موت کے بارے میں سوچنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ٹام باتیں کرنے لگا۔ ''کہو، تم نے کسی کو مارا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ اس نے مجھے بتانا شروع کیا کہ اگست کے آغاز سے اس نے اب تک چھ آدمی مارے ہیں۔ اسے صورتحال کا احساس نہیں تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ احساس کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ خود مجھے بھی صورت حال کا پورا ادراک نہیں تھا۔ میں حیران تھا کہ موت کا کرب کیسا ہوگا۔ میں گولیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے ان کی جلتی ہوئی باڑھ کے اپنے جسم پر پڑنے کا تصور کیا۔ اس سب کا حقیقی سوال سے کوئی تعلق نہ تھا، لیکن میں پرسکون تھا۔ سمجھنے کو ہمارے پاس پوری رات پڑی تھی۔ کچھ دیر بعد ٹام خاموش ہو گیا۔ میں اسے کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سفید پڑ چکا ہے اور بالکل لاش نظر آرہا ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا، ''خوف نے کام دکھانا شروع کر دیا۔'' اندھیرا تقریباً چھا گیا تھا۔ ہوا کے روزنوں اور کوئلے کے ڈھیر سے چھنتی ہوئی مدھم روشنی نے، عین اس جگہ جہاں چھت کے سوراخ کا عکس پڑ رہا تھا۔ ایک بڑا سا دھبہ بنا دیا تھا۔ میں اس سوراخ سے ایک ستارا دیکھ سکتا تھا۔ رات اجلی اور برفانی ہوگی میں نے سوچا۔

دروازہ کھلا اور دو سنتری اندر آئے۔ ان کے پیچھے ایک گورا آدمی تھا جس نے بھوری وردی پہن رکھی تھی۔ اس نے ہمیں فوجی انداز سے سلام کیا۔

''میں ڈاکٹر ہوں،'' اس نے کہا۔ ''مجھے ان صبر آزما لمحوں میں تمہاری مدد کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔''

اس کی آواز موافق اور نمایاں تھی۔ میں نے کہا، ''یہاں کیا کرنے آئے ہو؟''

''میں تم لوگوں کے تصرف میں ہوں۔ تمہارے آخری لمحوں کو آسان بنانے کے لیے میں کچھ کر سکتا ہوں اس سے دریغ نہیں کروں گا۔''

''ہمارے پاس ہی کیوں آئے ہو؟ اور لوگ بھی ہیں۔ اسپتال ان سے بھرا پڑا ہے۔'' ''میں یہاں بھیجا گیا

ہوں،'' اس نے مبہم انداز سے جواب دیا۔ ''تم تمبا کو نوشی کرنا پسند کرو گے؟'' وہ جلدی سے بولا، ''میرے پاس سگریٹ ہے اور سگار بھی۔''

اس نے ہمیں برطانوی سگریٹ اور سگار پیش کیے لیکن ہم نے انکار کر دیا۔ میں نے اسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور وہ جھنجھلایا ہوا سا نظر آنے لگا۔ میں نے اس سے کہا، ''تم یہاں رحم کھانے نہیں آئے ہو۔ اور پھر میں تمہیں جانتا ہوں۔ جس دن میں گرفتار ہوا تھا میں نے تمہیں بیرکوں کے سامنے فاشسٹوں کے ساتھ دیکھا تھا۔''

میں ابھی کچھ اور کہتا لیکن اچانک ایک حیران کن بات پیش آئی۔ اس ڈاکٹر کی موجودگی میرے لیے مزید دلچسپی کا باعث نہ رہی۔ عام طور پر جب میں کسی کے پیچھے پڑتا ہوں تو آسانی سے نہیں چھوڑتا، لیکن بولنے کی خواہش مجھ سے مکمل طور پر رخصت ہو گئی تھی۔ میں نے کندھے اچکاتے ہوئے اپنا منہ پھیر لیا۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنا سر اٹھایا۔ وہ عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا۔ سنتری چٹائی پر بیٹھے تھے۔ پیدرو، جو لمبا اور دبلا تھا، اپنے انگوٹھے گھما رہا تھا جبکہ دوسرا نیند کے ڈر سے اپنا سر بار بار جھٹک رہا تھا۔

''تمہیں روشنی چاہیے؟'' پیدرو نے اچانک ڈاکٹر سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں'' میرے خیال میں بالکل بے حس تھا لیکن برا یقیناً نہیں تھا۔ اس کی سرد نیلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ اس کا واحد گناہ صرف تخیل کا فقدان ہے۔ پیدرو باہر گیا اور ایک تیل کا لیمپ لے کر آیا جو اس نے بینچ کے کونے پر رکھ دیا۔ لیمپ میں روشنی کم اور دھواں زیادہ تھا۔ لیکن کچھ نہ ہونے سے بہر حال بہتر تھا۔ گزشتہ رات انہوں نے ہمیں اندھیرے میں ہی رکھا تھا۔ میں تا دیر روشنی کے دائرے کو دیکھتا رہا جو لیمپ چھت پر بنا رہا تھا۔ میں سحر زدہ سا ہو گیا۔ پھر اچانک میں جاگ اٹھا۔ روشنی کا دائرہ غائب ہو گیا اور میں نے خود کو ایک بھاری بوجھ تلے کچلا ہوا محسوس کیا۔ یہ موت کا خیال یا خوف نہیں تھا بلکہ ایک بے نام سی کیفیت تھی۔ میرے گال جل رہے تھے اور سر میں شدید درد تھا۔

میں نے خود کو بحال کیا اور اپنے دونوں دوستوں کی طرف دیکھا۔ ٹام نے اپنا چہرا ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔ مجھے اس کی صرف موٹی سفید گدی نظر آ رہی تھی۔ کم عمر جوان کا حال اور بھی ابتر تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ ڈاکٹر اٹھا اور اس کے کندھے پر اس طرح ہاتھ رکھا گویا اسے تشفی دینا چاہتا ہو لیکن اس کی آنکھیں منجمد رہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر کا ہاتھ جوان کے بازو سے چوری چوری سرک کر اس کی نبض پر ٹھہر گیا۔ جوان نے کوئی توجہ نہ دی۔ ڈاکٹر نے بے دھیانی سے اس کی نبض تین انگلیوں کے درمیان تھام لی۔ اس اثنا میں اس نے ذرا پرے کھسک کر اپنی پشت میری طرف کر لی تھی۔ لیکن میں نے پیچھے کی طرف جھانک کر اسے اپنی جیب سے گھڑی نکالتے دیکھ لیا۔ اس نے پل بھر گھڑی کو دیکھا، اس دوران اس کا ہاتھ نبض پر ہی رہا۔ ایک منٹ کے بعد اس نے ہاتھ چھوڑ دیا اور دوبارہ اپنی جگہ جا کر دیوار کے ساتھ کمر ٹکا دی۔ پھر، جیسے اسے کوئی بہت ضروری بات یاد آئی ہو جسے فوری لکھنا ضروری ہو، اس

نے اپنی جیب سے نوٹ بک نکال کر چند سطریں لکھیں۔ ''حرامی!'' میں نے غصے سے سوچا۔ ''ذرا میری نبض تو دیکھے، منہ پر تھپڑ دے ماروں گا۔''

وہ میرے نزدیک نہیں آیا لیکن میں نے اسے تکتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے سر اٹھایا اور اس پر جوابا نظر ڈالی۔ اس نے غیر ذاتی انداز میں مجھ سے کہا، ''تمہیں یہاں سردی نہیں لگتی؟'' اسے سردی لگ رہی تھی اور وہ نیلا پڑ چکا تھا۔

''مجھے سردی نہیں لگتی،'' میں نے اسے بتایا۔

اس نے اپنی نظر مجھ پر گاڑ دیں۔ اچانک میں سمجھ گیا اور میرے ہاتھ اپنے چہرے کی طرف بڑھے۔ میں پسینے میں شرابور تھا۔ اس تہہ خانے میں، سردیوں کے عین وسط میں، جھونکوں کے درمیان مجھے پسینہ آرہا تھا۔ میں نے اپنی انگلیاں بالوں میں پھرائیں جو پسینے میں آپس میں جڑ چکے تھے۔ اسی وقت میں نے محسوس کیا کہ میری قمیص نم ہے۔ اور میری جلد کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔ میں محسوس کیے بغیر ایک گھنٹے سے پسینے میں نہا رہا تھا، لیکن اس حرامی بیلجیئن نے کوئی بات نظر انداز نہیں کی تھی۔ اس نے میرے گالوں پر لڑھکتے ہوئے قطرے دیکھ لیے تھے اور سوچا تھا' یہ ہے دہشت کی مرضیاتی کیفیت کا اظہار۔ وہ اپنے کو فطری محسوس کر رہا تھا اور اسے اس بات پر فخر تھا کیونکہ اسے سردی لگ رہی تھی۔ میں اٹھ کر اس کے چہرے کو مسخ کر دینا چاہتا تھا لیکن جونہی میں نے خفیف سی حرکت کی، میرا تمام اشتعال اور شرم غائب ہو گئے اور میں بے حسی کے ساتھ بنچ پر گر گیا۔ میں نے اپنی گردن کو رومال سے رگڑ کر خود کو مطمئن کر لیا۔ کیونکہ اب میں پسینے کو اپنے بالوں سے گردن پر ٹپکتا محسوس کر رہا تھا اور یہ احساس ناخوشگوار تھا۔ میں نے یہ کام جلد ہی ترک کر دیا کیونکہ یہ بے سود تھا۔ میرا رومال پسینے میں تر تھا مگر پسینہ تھا کہ آئے چلا جا رہا تھا۔ میرے کولہو پر بھی پسینہ آرہا تھا اور میری گیلی پتلون بینچ سے چپکی ہوئی تھی۔

اچانک جوان بولا، ''تم ڈاکٹر ہو؟''

''ہاں،'' بیلجیئن نے کہا۔

''کیا مرنے سے تکلیف ہوتی ہے۔۔۔ بہت دیر تک؟''

''کیا؟ اس وقت۔۔۔ ارے نہیں!'' بیلجیئن نے پدرانہ انداز میں کہا، ''ذرا بھی نہیں۔ یہ عمل سرعت سے ختم ہو جاتا ہے۔'' اس کا انداز ایسا تھا گویا کسی نقد سودا خریدنے والے کو مطمئن کر رہا ہو۔

''لیکن میں۔۔۔ میں نے سنا ہے۔۔۔ بعض اوقات انہیں دوبارہ فائر کرنا پڑتا ہے۔''

''بعض اوقات،'' بیلجیئن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب پہلی باڑھ اعضاء رئیسہ تک نہ پہونچی ہو۔''

''تب انہیں اپنی رائفلیں دوبارہ بھر کے نئے سرے سے نشانہ لینا پڑتا ہے؟'' اس نے لمحے بھر کو سوچا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں اضافہ کیا: ''اس میں وقت لگتا ہے!''

اسے تکلیف سہنے سے بہت خوف آتا تھا وہ صرف اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور یہ اس کی عمر کا تقاضہ تھا۔ میں نے اس بارے میں زیادہ نہیں سوچا تھا۔ مجھے پسینہ آنے کے باعث تکلیف سہنے کا خوف نہیں تھا۔
میں اٹھ کر کوئلے کے ڈھیر تک گیا۔ ٹام نے اچھل کر مجھے نفرت بھری نظروں سے دیکھا۔ میرے جوتوں کی چرچراہٹ اسے بری لگ رہی تھی۔ میں نے سوچا کیا میرا چہرا بھی اتنا ہی مٹیالا لگ رہا ہے جتنا کہ اس کا۔ میں نے دیکھا کہ پسینہ اسے بھی آرہا ہے۔ آسمان پرشکوہ تھا۔ روشنی تاریک گوشے تک نہیں پہونچ رہی تھی اور میں صرف اپنا سر اٹھا کر دُبِ اکبر کو دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اب پہلے جیسی بات نہیں تھی۔ گزشتہ رات میں اپنی خانقاہ کی کوٹھری سے آسمان کا ایک بڑا سا ٹکڑا دیکھ سکتا تھا اور دن کا ہر حصہ میرے لیے ایک مختلف یاد لے کر آتا تھا۔ صبح کے وقت جب آسمان ٹھوس اور ہلکا نیلا ہوتا تو میں اوقیانوس ساحلوں کے بارے میں سوچتا۔ دوپہر کو میں سورج کو دیکھتا تو مجھے سیویل کا ایک بار یاد آتا جہاں میں ـ ـ ـ ـ پیا کرتا اور زیتون اور ہیرنگ مچھلی کھایا کرتا تھا۔ سہ پہروں کو میں سائبان میں ہوتا اور اس گہرے سائے کے بارے میں سوچتا جب ٹل فائنگ کے آدھے رنگ پر پھیل کر بقیہ آدھے کو دھوپ میں چمکتا چھوڑ دیتا ہے۔ ساری دنیا کو آسمان میں اس طرح منعکس دیکھنا واقعی بہت مشکل تھا۔ لیکن اب میں آسمان کو چاہے جتنا دیکھوں، میرے اندر کوئی چیز نہیں جاگتی تھی۔ وہ صورتحال مجھے زیادہ پسند تھی۔ میں واپس آکر ٹام کے پاس بیٹھ گیا۔
ایک طویل لمحہ گزر گیا۔

ٹام مدھم آواز میں بولنے لگا۔ اسے بولنا ہی تھا کہ اس کے بغیر وہ، اپنے ذہن میں خود کو پہچاننے کے قابل ہی نہ ہوتا۔ میرا خیال تھا وہ مجھ سے مخاطب ہے لیکن وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ بلا شبہ وہ مجھے دیکھنے سے خوف زدہ تھا۔ کہ میرا رنگ مٹیالا ہو گیا تھا اور میں پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ ہم دونوں یکساں تھے اور ایک دوسرے کے آئینے سے بدتر۔ وہ بیلجیئن کو دیکھنے لگا جو زندہ تھا۔

''کیا تمہاری سمجھ میں آرہا ہے؟'' اس نے پوچھا: ''میں تو کچھ بھی نہیں سمجھ رہا۔''
میں بھی مدھم آواز میں بولنے لگا۔ میں نے بیلجیئن کو دیکھا۔ ''کیوں؟ کیا بات ہے؟''
''ہمارے ساتھ جو ہونے جا رہا ہے، میں اسے سمجھ نہیں پا رہا۔''
ٹام کے پاس سے عجیب سی بو آرہی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ میں ـ ـ ـ کے بارے میں معمولی سے زیادہ حساس ہو رہا ہوں۔ میں نے کھیسیں نکال دیں۔ ''تھوڑی دیر میں سمجھ جاؤ گے۔''
''بات واضح نہیں ہے،'' وہ ڈھٹائی سے بولا: ''میں بہادر بننا چاہتا ہوں لیکن مجھے کم از کم یہ معلوم ہو۔ ـ ـ سنو،

وہ ہمیں صحن میں لے جائیں گے، ٹھیک؟ وہ ہمارے سامنے کھڑے ہوں گے۔ کتنے ہوں گے؟

"مجھے معلوم نہیں۔ پانچ یا آٹھ۔ اس سے زیادہ نہیں۔"

"اچھا، چلو آٹھ ہوں گے۔ کوئی چلا کر کہے گا، نشانہ لو!، اور میں اپنی طرف آٹھ رائفلوں کو نگراں دیکھوں گا۔ میں سوچوں گا کہ اس دیوارت میں کیسے گھس جاؤں۔ میں اپنی پیٹھ کا سارا زور اس پر ڈال دوں گا۔۔۔ اس تمام طاقت کے ساتھ جو میرے بدن میں ہے، لیکن دیوار کسی بدخواب کی طرح قائم رہے گی۔ میں یہ سب کچھ تصور کر سکتا ہوں۔ کاش تم جان سکتے، میں کتنا بہتر تصور کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے،" میں نے کہا، "اس کا تصور میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ تمہیں پتا ہے، وہ آدمی کو مسخ کرنے کے لیے آنکھوں اور منہ کا نشانہ لیتے ہیں،" اس نے بدطینتی سے اضافہ کیا۔ "میں ابھی سے زخم محسوس کر سکتا ہوں۔ پچھلے ایک گھنٹے سے میرے سر اور گردن میں درد اٹھ رہا ہے۔ سچ مچ کا نہیں، اس سے بدتر۔ یہی کچھ میں کل صبح محسوس کروں گا۔ اور پھر؟"

میں خوب سمجھتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے لیکن میں یہ دکھانا نہیں چاہتا تھا کہ میں سمجھ گیا ہوں۔ ٹیسیں مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی جو سارے بدن میں چھوٹے چھوٹے زخموں کے ہجوم کی طرح تھیں۔ میں اس حالت میں نباہ نہیں پا رہا تھا، لیکن میں بھی اسی طرح تھا کہ اسے کوئی اہمیت نہیں دے رہا تھا۔

"پھر" میں نے کہا، "پھر تم ڈیزی کے پھول اگا رہے ہوگے۔"

وہ خود کلامی کرنے لگا۔ وہ متواتر بیلجیین کو دیکھے جا رہا تھا۔

بیلجیین سنتا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا کرنے آیا تھا۔ اسے ہماری سوچوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ہمارے جسموں کو دیکھنے آیا تھا جو زندہ رہتے ہوئے بھی کرب سے مر رہے تھے۔

"یہ کسی بدخواب کی طرح ہے،" ٹام کہہ رہا تھا، "تم کچھ سوچنا چاہتے ہو۔ تمہارا تاثر ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ سب ٹھیک ہے اور تم سمجھ جاؤ گے، مگر سوچ پھسل جاتی ہے، تمہاری گرفت سے نکل کر کہیں دور چلی جاتی ہے۔ میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ بعد میں صرف خلا ہی خلا ہوگا، لیکن سمجھ نہیں پاتا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ بعض اوقات میں تقریباً سمجھ جاتا ہوں مگر پھر یہ گم ہو جاتا ہے اور میں پھر سے ٹیسوں، گولیوں اور دھماکوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں۔ میں مادہ پرست ہوں۔ یہ بات میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں۔ میں پاگل نہیں ہوا ہوں لیکن کوئی بات ہے ضرور۔ میں اپنی لاش دیکھ رہا ہوں۔ یہ مشکل نہیں ہے، جو شخص اپنی آنکھوں سے لاش دیکھ رہا ہے وہ میں خود ہوں۔ مجھے سوچنا ہے۔ سوچنا ہے کہ میں آئندہ کوئی چیز نہیں دیکھوں گا اور یہ دنیا دوسروں کے لیے چلتی رہے گی۔ پابلو، ایسا سوچنا ہماری فطرت میں نہیں ہے۔ یقین کرو، میں کچھ ہونے کے انتظار میں پوری ایک رات بیٹھا رہا ہوں۔ لیکن اب معاملہ اور ہے۔

موت ہمارے عقب میں رینگ آئے گی، پابلو، ہم اس کے لیے تیاری بھی نہیں کر سکیں گے۔''

''بکواس بند کرو،'' میں نے کہا،'' کیا تم چاہتے ہو کہ میں کسی پادری کو بلاؤں؟'' اس نے جواب نہیں دیا۔ خود کو پیغمبر دکھانے کا رجحان میں اس میں پہلے سے دیکھ چکا تھا۔ وہ بے لہجہ آواز میں بولتے ہوئے مجھے پابلو پکار رہا تھا۔ یہ بات مجھے پسند نہیں آئی مگر ایسا لگتا ہے کہ سارے آئرش ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مجھے یہ مبہم سا تاثر تھا کہ اس کے پاس سے پیشاب کی بو آرہی ہے۔ بنیادی طور پر مجھے ٹام سے کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ اکٹھے مرنے کے بہانے مجھے زیادہ ہمدردی ہونی چاہئے تھی۔ دوسروں کے ساتھ مرنے میں بات مختلف تھی، مثلاً رامون گریس کے ساتھ۔ لیکن ٹام اور حوان کے درمیان میں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ پھر بھی، یہ صورت حال مجھے زیادہ پسند تھی۔ رامون کے ساتھ میں بہت زیادہ متاثر ہو سکتا تھا۔ لیکن اس وقت میں پتھر بنا ہوا تھا اور پتھر ہی رہنا چاہتا تھا۔

وہ جنون کی سی حالت میں اپنے الفاظ چباتا رہا۔ وہ یقیناً سوچنے سے بچنے کے لیے بول رہا تھا۔ اس کے پاس سے مثانے کے کسی پرانے مریض کی طرح پیشاب کی بو آرہی تھی۔ فطری طور پر میں اس سے متفق تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا۔ وہی کچھ میں بھی کہہ سکتا تھا، یعنی یوں مرنا فطری نہیں ہے، اور چونکہ میں مرنے جا رہا تھا، مجھے کوئی چیز فطری نہیں لگ رہی تھی۔ نہ کوئلے کے چورے کا ڈھیر، نہ بنچ اور نہ پیدرو کا بدنما چہرہ۔ بس میں وہی باتیں نہیں سوچنا چاہتا تھا جو ٹام سوچ رہا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ہم رات بھر ہر پانچ منٹ بعد یہی باتیں بیک وقت سوچتے رہیں گے۔ میں نے پہلو کی جانب سے اس پر نظر ڈالی اور پہلی بار وہ مجھے عجیب لگا۔ اس نے موت اپنے چہرے پر اوڑھ رکھی تھی۔ میرا فخر مجروح ہو گیا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے سے میں ٹام کے ساتھ جیا تھا۔ میں نے اس کی باتیں سنی تھیں اور اس سے ناتیں کی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ ہم میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ لیکن اب ہم اتنے ہی یکساں لگ رہے تھے جتنے کہ دو جڑواں بھائی، محض اس لیے کہ ہمیں ایک ساتھ مرنا تھا۔ ٹام نے میری طرف دیکھے بغیر میرا ہاتھ تھام لیا۔

''پابلو، میں سوچتا ہوں۔۔ میں سوچتا ہوں آیا یہ واقعی سچ ہے کہ ہر چیز ختم ہو جاتی ہے۔''

میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا،'' اپنے پیروں کے درمیان تو دیکھو، سؤر۔''

اس کے پیروں کے درمیان ڈھیر سا غلیظ مائع تھا اور پتلون کی ٹانگوں سے قطرے ٹپک رہے تھے۔

''یہ کیا ہے؟ اس نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

''تم اپنی پتلون میں پیشاب کر رہے ہو،'' میں نے اسے بتایا۔

''یہ غلط ہے،'' اس نے مشتعل ہو کر کہا،'' میں پیشاب نہیں کر رہا۔ مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا۔''

بیلجیئن ہمارے قریب آیا۔ اس نے مصنوعی پریشانی سے پوچھا،'' کیا طبیعت خراب ہو رہی ہے؟''

ٹام نے جواب نہیں دیا۔ بیلجیئن نے غلیظ پانی کو دیکھا اور کچھ نہیں کہا۔

"مجھے معلوم نہیں یہ کیا ہے، ٹام نے سخت غصے سے کہا،" لیکن میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں میں خوفزدہ نہیں ہوں۔"

بیلجین نے جواب نہیں دیا۔ ٹام اٹھ کر ایک کونے میں پیشاب کرنے گیا۔ وہ اپنی پتلون کے بٹن بند کرتے ہوئے لوٹا اور کچھ بولے بغیر بیٹھ گیا۔ بیلجین یادداشتیں قلم بند کرتا رہا تھا۔

ہم تینوں اسے دیکھ رہے تھے کیونکہ وہ زندہ تھا۔ اس کی نقل وحرکت اور تفکرات ایک زندہ انسان کی نقل وحرکت اور تفکرات تھے۔ وہ تہہ خانے میں اسی طرح کپکپا رہا تھا جس طرح زندوں کو کپکپانا چاہیے۔ اسے ایک فرمابردار اور کھایا پیا جسم میسر تھا۔ ہم باقی لوگ اپنے جسموں کو بمشکل محسوس کر رہے تھے۔ کم از کم اس کی طرح تو نہیں کر رہے تھے۔ میں اپنی ٹانگوں کے درمیان پتلون کو چھو کر دیکھنا چاہتا تھا لیکن مجھ میں جرأت نہیں تھی۔ میں بیلجین پر نظریں گاڑے ہوئے تھا جو اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو رہا تھا، جو اپنے عضلات پر قابو رکھتا تھا، جو آنے والے کل کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ ہم اس پر نظریں گاڑے، خوں آشام پرندوں کی طرح اس کی زندگی چوس رہے تھے۔

آخر کار وہ چھوٹے حوان کے پاس گیا۔ کیا وہ اس کی گردن کسی پیشہ ورانہ مقصد کے لیے سہلانا چاہتا تھا، یا وہ ترس کھانے کی لحاتی کیفیت کے تابع تھا؟ اگر اس کا عمل ترس کھانے کے لیے تھا تو یہ رات بھر میں صرف ایک ہی بار تھا۔

وہ حوان کا سر اور گردن سہلانے لگا۔ لڑکے نے خود کو اس کے حوالے کر دیا۔ وہ اپنی نظریں اس پر گاڑے رہا۔ پھر اچانک اس نے بیلجین کا ہاتھ تھام لیا اور اسے عجیب طور سے دیکھنے لگا۔ اس نے بیلجین کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کوئی خوش کن بات نہ تھی۔ دو خاکستری چمٹے ایک موٹے اور سرخی مائل ہاتھ کو تھامے ہوئے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے اور یقیناً ٹام نے بھی اندازہ لگا لیا ہوگا، لیکن بیلجین قطعاً غافل تھا، وہ پدرانہ طور پر مسکراتا رہا۔ لحہ بھر کے بعد لڑکے نے اس موٹے سرخ ہاتھ کو اپنے منہ کے قریب لا کر اسے کاٹنے کی کوشش کی۔ بیلجین نے جلدی سے ہاتھ کھینچا اور لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا۔ ایک ثانیے کے لیے اس نے ہمیں دہشت سے دیکھا۔ وہ یقیناً اچانک سمجھ گیا ہوگا کہ ہم اس کی طرح انسان نہیں ہیں۔ مجھے ہنسی آگئی اور ایک سنتری اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرا سو رہا تھا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں بے عکس تھیں۔

میں بیک وقت سکون اور ضرورت سے زیادہ ہیجان محسوس کر رہا تھا۔ میں اس بارے میں اور سوچنا نہیں چاہتا تھا کہ علی الصباح کیا ہوگا یا موت کیسی ہوگی۔ اس کی کوئی تک نہیں تھی۔ مجھے صرف الفاظ میسر تھے یا پھر خالی پن۔ لیکن جونہی میں کسی اور بات کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرتا رائفلوں کی نالیں میری طرف اشارہ کرتی نظر آتیں۔ اپنی موت کا عالم مجھ پر غالباً بیس بار گزرا، ایک دفعہ تو میں نے سوچا کہ یہ آخری بار ہے۔ میں یقیناً ایک منٹ کو سو گیا ہوں

گا۔ وہ مجھے دیوار کی جانب کھینچ رہے تھے اور میں مزاحمت کر رہا تھا۔ میں رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر جاگ اٹھا اور ہیلچین کی طرف دیکھنے لگا، مجھے ڈر تھا کہ میں نیند میں چلایا ہوں گا۔ لیکن وہ اپنی مونچھیں سہلا رہا تھا، اس نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اگر میں چاہتا تو کچھ دیر سو سکتا تھا، میں اڑتالیس گھنٹے سے جاگ رہا تھا۔ میں اپنی برداشت کی آخری حد پر تھا۔

لیکن میں زندگی کے دو گھنٹے گنوانا نہیں چاہتا تھا: وہ پو پھٹے مجھے جگانے آئیں گے۔ میں نیند سے حواس باختہ ان کے پیچھے چل پڑوں گا اور بھرائی ہوئی آواز میں اُف بھی نہ کر سکوں گا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا، میں جانوروں کی طرح مرنا نہیں چاہتا تھا، میں سمجھنا چاہتا تھا۔ پھر مجھ پر بدخواب دیکھنے کا خوف طاری ہو گیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور ادھر ادھر چلنے لگا اور اپنے خیالات بدلنے کے لیے گزری ہوئی زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔ منتشر یادوں کا ایک ہجوم میرے پاس لوٹ آیا جو اچھی بھی تھیں اور بری بھی، یا کم از کم پہلے میں انہیں اسی طرح پکارتا تھا۔ میرے سامنے چہرے اور واقعات تھے۔ میں نے ایک کم عمر نوویئر کا چہرہ دیکھا، جسے ویلنسیا میں کلیسائی تعطیل کے موقع پر ایک سانڈ نے اپنے سینگوں سے چھید دیا تھا۔ اپنے ایک چچا کا چہرا دیکھا، رامون گریس کا چہرہ دیکھا۔ مجھے اپنی ساری زندگی یاد آ گئی۔ کس طرح میں ۱۹۲۶ء میں تین مہینے بے روزگار رہا تھا۔ کس طرح میں بھوک سے مرتے مرتے بچا تھا۔ مجھے وہ رات یاد آئی جو میں نے غرناطہ میں ایک بنچ پر گزاری تھی۔ میں نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ میں ناراض تھا، میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس یاد نے مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ میں کس دیوانگی سے مسرت، عورتوں اور آزادی کے پیچھے بھاگتا تھا۔ کیوں؟ میں اسپین کو آزاد کرانا چاہتا تھا۔ میں مارگل کا مداح تھا۔ میں انارکسٹ تحریک میں شامل تھا۔ میں عوامی اجتماعات میں تقریریں کرتا تھا۔ میں ہر بات کو اس سنجیدگی سے لیتا تھا کہ گویا کہ میں لافانی ہوں۔

اس لمحے مجھے لگا کہ میری ساری زندگی میرے سامنے ہے اور میں نے سوچا: ''یہ تو محض جھوٹ کا پلندا ہے۔'' میری زندگی بے مایہ تھی کیونکہ یہ ختم ہو گئی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ میں کس طرح چلنے کے قابل تھا۔ کس طرح لڑکیوں کے ساتھ ہنسنے کے لائق تھا۔ اگر مجھے ذرا بھی گمان ہوتا کہ میں اس طرح مروں گا تو میں اپنی چھنگلیا تک نہ ہلاتا۔ میری زندگی، کسی تھیلے کی طرح بند اور سر بمہر، میرے سامنے تھی۔ مگر اس تھیلے میں بند ہر شے نا تمام تھی۔ لحہ بھر کے لیے میں نے اسے پرکھنے کی کوشش کی۔ میں اپنے آپ سے کہنا چاہتا تھا، یہ ایک خوبصورت زندگی ہے۔ لیکن میں اس پر فیصلہ نہیں دے سکتا تھا، کہ یہ محض ایک سرسری خاکہ تھی۔ میں نے اپنا وقت ابدیت کی جعل سازی کرنے میں گنوایا تھا۔ میں کچھ نہیں سمجھ پایا تھا۔ مجھے کسی چیز کی کمی کا احساس نہیں تھا۔ بے شمار ایسی چیزیں تھیں جن کی کمی محسوس ہونی چاہیے تھی، میز انیلا کا ذائقہ یا گرما کے غسل جو میں کاویز کے نزدیک ایک چھوٹی سی کھائی میں کیا کرتا تھا، لیکن موت نے ہر چیز کا سحر توڑ دیا تھا۔

اچانک بیلجبین کو ایک نادر خیال آیا۔ ''دوستو!'' اس نے ہمیں بتایا، ''اگر فوجی انتظامیہ نے اجازت دی تو میں تمہارا پیغام بھجوانے کی ذمہ داری لیتا ہوں، جو تم سے محبت کرنے والوں کے لیے ایک یادگار ہوگی۔

ٹام بڑبڑایا، ''میرا کوئی نہیں ہے۔''

میں کچھ نہیں بولا۔ ٹام نے لمحہ بھر توقف کیا، پھر حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''تمہیں کونچا کو کچھ نہیں کہلوانا؟''

''نہیں۔''

اس تکلیف دہ ساز باز سے مجھے نفرت محسوس ہوئی۔ قصور میرا اپنا تھا۔ گزشتہ رات میں نے کونچا کے بارے میں بات کی تھی۔ مجھے اپنے آپ پر قابو رکھنا چاہئے تھا۔ میں اس کے ساتھ ایک سال رہا تھا۔ گزشتہ رات اسے پانچ منٹ ملنے کے لیے میں جان دے سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اس کے بارے میں بات کی تھی۔ یہ خواہش مجھ سے زیادہ طاقتور تھی۔ اب مجھے اس سے ملنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اب مجھے اس سے کچھ نہیں کہنا تھا۔ اب میں اسے اپنے بازوؤں میں بھی نہ لیتا۔ اپنے جسم نے مجھے دہشت زدہ کر دیا تھا، کہ وہ نیلا اور پسینے میں ڈوبا ہوتھا۔ اور مجھے اس بات کا یقین نہیں تھا کہ مجھے کونچا کے جسم سے دہشت نہیں ہوگی۔ کونچا کو جب معلوم ہوگا کہ میں مرگیا ہوں تو بین کرے گی اور مہینوں تک زندگی سے لطف اندوز نہیں ہوگی۔ مگر اس کے باوجود جسے مرنا تھا وہ تو میں ہی تھا۔ میں اس نرم، حسین آنکھوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ جب وہ مجھے دیکھتی تو اس میں سے کوئی چیز نکل کر مجھ تک پہونچتی تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ قصہ اب ختم ہو چکا ہے۔ اگر وہ اب مجھے دیکھتی تو اس کی نظر اس کی آنکھوں ہی میں رہتی، مجھ تک نہ پہنچ پاتی۔ میں تنہا تھا۔

ٹام بھی تنہا تھا مگر میری طرح نہیں۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ پر رکھے بیٹھا تھا اور ایک طرح کی مسکراہٹ کے ساتھ بنچ کو گھور رہا تھا۔ وہ حیرت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر لکڑی کو اس احتیاط سے چھوا جیسے کسی شیشے کو توڑنے سے خائف ہو۔ پھر اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچا اور جھرجھری لی۔ اگر میں ٹام ہوتا تو بنچ کو ہاتھ لگا کر کبھی دل نہ بہلاتا، یہ ایک اور آئرش حماقت تھی۔ لیکن اشیا کی مضحکہ خیز صورت کو میں نے بھی محسوس کیا۔ وہ ٹھوس کم تھی اور بابود زیادہ۔ یہ محسوس کرنے کے لیے کہ میں مرنے جارہا ہوں، میرے لیے بنچ، لیمپ یا کوئلے کے ڈھیر پر نظر ڈالنا کافی تھا۔ فطری طور پر میں اپنی موت کے بارے میں واضح انداز میں نہیں سوچ سکتا تھا، لیکن چیزوں پر اسے ہر کہیں دیکھ رہا تھا جو ایک خاص انداز سے پیچھے ہٹ کر اپنا فیصلہ برقرار رکھے ہوئے تھی، بالکل اسی طرح جیسے قریب المرگ آدمی کے سرہانے لوگ سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہیں۔ ٹام نے ابھی بنچ پر جسے چھوا تھا وہ اس کی اپنی موت تھی۔

اس کیفیت میں اگر کوئی آکر مجھے یہ بتاتا کہ خاموشی سے گھر جا سکتا ہوں، کہ وہ مجھے میری زندگی ثابت وسالم بخش دیں گے، تو میں سن ہو جاتا، جب آدمی ابدی ہونے کے وہم سے نکل آئے تو پھر چند گھنٹوں یا چند سالوں کے

انتظار میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ میرے پاس تھامنے کو کچھ نہ تھا۔ میں ایک طرح سے پرسکون تھا۔ لیکن یہ ایک دہشت انگیز سکون تھا، جس کی وجہ میرا جسم تھا کہ میں اس کی آنکھوں سے دیکھتا اور اسی کے کانوں سے سنتا تھا۔ میرا جسم اب میرے ساتھ نہیں تھا۔ وہ آپ ہی آپ پسینے میں ڈوب رہا تھا اور خود بخود کانپ رہا تھا۔ وہ اب میری شناخت سے باہر تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ کیا ہو رہا ہے، مجھے اس کو چھونا پڑتا تھا۔، اس پر نظر ڈالنی پڑتی تھی گویا وہ کسی اور کا جسم ہو۔ کبھی کبھار جب میں اسے محسوس کر سکتا تو مجھے اس شخص کی طرح اپنے ڈوبنے اور گرنے کا احساس ہوتا جس کا ہوائی جہاز نوک کے بل غوطہ لگا رہا ہو، یا پھر مجھے اپنا دل دھڑکتا محسوس ہوتا۔ لیکن اس بات سے مجھے تقویت نہیں ملتی تھی۔ میرے جسم سے آنے والا ہر اشارہ الٹا ہوتا۔ وہ بیشتر خاموش تھا اور مجھے ایک طرح کے بوجھ کے علاوہ کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا جیسے کوئی غلیظ وجود میرے مقابل ہو۔ میرا تاثر یہ تھا کہ میں کسی بہت بڑے کیڑے سے بندھا ہوا ہوں۔ ایک بار میں نے اپنی پتلون کو چھوا اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ گیلی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ نمی پسینے کی تھی یا پیشاب کی لیکن احتیاط کے طور پر میں کوئلے کے ڈھیر پر پیشاب کرنے گیا۔

بیلجیئن اپنی گھڑی نکال کر دیکھنے لگا۔ وہ بولا، ''ساڑھے تین بجے ہیں۔''

نطفہ حرام اس نے قصداً ایسا کیا ہوگا۔ ٹام اچھل پڑا۔ ہم نے غور نہیں کیا تھا، وقت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ رات کسی بے ہیئت تیرہ و تار ڈھیر کی طرح ہمیں گھیرے ہوئے تھی۔ مجھے تو اس کا آغاز بھی یاد نہیں تھا۔

کم عمر جوان نے رونا شروع کر دیا۔ وہ اپنے ہاتھ مروڑ مروڑ کر گڑگڑانے لگا، ''میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔'' وہ ہوا میں اپنے بازو لہراتا سارے تہہ خانے میں دوڑتا رہا۔ پھر سسکیاں لیتے ہوئے چٹائی پر گر گیا۔ تشفی دینے کی خفیف سی خواہش کے بغیر ٹام اسے ماتمی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اسے تشفی دینے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ لڑکا ہم سے زیادہ شور مچا رہا تھا لیکن وہ متاثر کم تھا۔ وہ اس بیمار شخص کی طرح تھا جو اپنی بیماری کے خلاف اپنا دفاع بخار کے ذریعے کرتا ہے۔ مگر جب بخار نہ ہو تو معاملہ کہیں زیادہ گمبھیر ہوتا ہے۔

وہ رو رہا تھا۔ میں صاف طور پر دیکھ سکتا تھا کہ وہ خود پر ترس کھا رہا تھا۔ وہ موت کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ میں آپ ایک لمحے کو، فقط ایک لمحے کو خود پر ترس ہوئے رونا چاہتا تھا۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ میں نے لڑکے پر نظر ڈالی۔ میں نے سسکیوں سے مرتعش اس کے دبلے بازوؤں کو دیکھا تو خود کو غیر انسانی محسوس کیا۔ میں اوروں پر ترس کھا سکتا تھا نہ خود پر۔ میں نے اپنے آپ سے کہا، ''میں اس آلائش سے پاک مرنا چاہتا ہوں۔''

ٹام اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ گول سوراخ کے بالکل نیچے گیا اور پو پھٹنے کے آثار دیکھنے لگا۔ میں پاک صاف مرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا اور صرف یہی سوچ رہا تھا۔ لیکن جب سے ڈاکٹر نے ہمیں وقت بتایا تو میں وقت کو اڑتا، قطرہ قطرہ بہتا محسوس کر رہا تھا۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ میں نے ٹام کی آواز سنی، ''ان کے قدموں کی آواز سن رہے ہو؟''

''ہاں۔''

فوجی صحن میں مارچ کر رہے تھے۔

یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ اندھیرے میں تو گولی نہیں ماری جا سکتی۔''

کچھ دیر بعد آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ میں نے ٹام سے کہا، ''دن نکل آیا ہے۔''

پیدرو جمائیاں لیتا ہوا اٹھا اور بڑھ کر لیمپ بجھا دیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا، ''بلا کی سردی ہے۔''

تہہ خانہ تمام خاکستری تھا۔ ہم نے دوری پر گولیوں کی آواز سنی۔

''کام شروع ہو رہا ہے،'' میں نے ٹام کو بتایا۔ ''انہیں یہ کام پچھواڑے کے احاطے میں کرنا ضروری ہے۔''

ٹام نے ڈاکٹر سے سگریٹ مانگا۔ مجھے سگریٹ درکار نہیں تھا۔ مجھے سگریٹ یا الکحل کی طلب نہیں تھی۔ اس لمحے کے بعد سے انہوں نے فائرنگ بند نہیں کی۔

''جو ہو رہا ہے تمہیں اس کا احساس ہے؟'' ٹام نے پوچھا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر خاموش رہا۔ اس نے دروازے پر نظریں جما رکھی تھیں۔ دروازہ کھلا اور ایک لیفٹیننٹ چار سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ٹام نے سگریٹ چھوڑ دیا۔

''اسٹائن بوک؟''

ٹام نے جواب نہیں دیا۔ پیدرو نے اس کی جانب اشارہ کیا۔

''حوان میربل؟''

''چٹائی پر ہے۔''

''اٹھو،'' لیفٹیننٹ نے کہا۔

حوان نے کوئی جنبش نہیں کی۔ دو سپاہیوں نے اس کے بازوؤں کے نیچے ہاتھ دے کر اسے اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ لیکن جونہی انہوں نے اسے چھوڑا وہ نیچے گر گیا۔

سپاہی ہچکچانے لگا۔

''یہ کوئی پہلا بیمار تو نہیں ہے،'' لیفٹیننٹ نے کہا۔ ''تم اسے لے چلو، اس کا بندوبست وہیں ہو جائے گا۔''

وہ ٹام کی جانب مڑا۔ ''چلو۔''

ٹام دو سپاہیوں کے درمیان باہر چلا گیا۔ باقی دو، لڑکے کو بغلوں اور ٹانگوں سے اٹھائے، پیچھے چل پڑے۔ وہ غشی میں نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ جب میں باہر نکلنے لگا تو

لیفٹیننٹ نے مجھے روک دیا۔

''تم ایپیتا ہو؟''

''ہاں۔''

تم یہیں ٹھہرو۔ وہ تمہیں لینے بعد میں آئیں گے۔''

وہ رخصت ہو گئے۔ بیلچین اور دونوں جیلر بھی چلے گئے۔ میں تنہا رہ گیا۔ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے، میں یہ سمجھ نہیں پایا۔ لیکن وہ یہ کام فوری طور پر نمٹا دیتے تو یہ بات زیادہ پسندیدہ ہوتی۔ میں فائرنگ کی آواز باقاعدہ وقفوں سے سن رہا تھا اور ہر فائرنگ کے ساتھ ہل جاتا تھا۔ میں چیخ چیخ کر اپنے بال نوچنا چاہتا تھا، لیکن میں نے دانت کچکچا کر ہاتھ جیبوں میں ڈال لیے، کہ میں پاک صاف رہنا چاہتا تھا۔

گھنٹے بھر بعد وہ مجھے لینے آئے اور پہلی منزل پر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے جو سگاروں کی بو سے بھرا تھا۔ کمرے میں دم گھونٹنے والی حرارت تھی۔ دو افسر گھٹنوں پر کاغذات رکھے، ہتھے والی کرسیوں پر بیٹھے تمبا کو نوشی کر رہے تھے۔

''ایپیتا تم ہو؟''

''ہاں۔''

رامون گریس کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

مجھ سے سوال کرنے والا پستہ وفربہ تھا۔ عینک کے پیچھے بھی اس کی نظریں سخت گیر تھیں۔ وہ مجھ سے بولا، ''ادھر آؤ۔''

میں اس کے پاس گیا۔ اسنے اٹھ کر میرے بازو پکڑ لیے اور ایسی نظروں سے مجھے گھورا جو زمین میں دھنسا دیتیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی پوری طاقت سے میرے بازوؤں پر چٹکی لی۔ لیکن یہ عمل مجھے آزار پہنچانے کے لیے نہیں تھا۔ یہ فقط ایک کھیل تھا۔ وہ مجھ پر حاوی ہونا چاہتا تھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ اسے اپنا متعفن سانس عین میرے چہرے پر چھوڑنا ہے۔ ہم لمحہ بھر اسی طرح رہے۔ میں تقریباً ہنستے ہنستے رہ گیا۔ مرنے والے آدمی کو ڈرانے کے لیے بہت کچھ درکار ہوتا ہے۔ سو یہ عمل بے سود رہا۔ وہ مجھے زور سے پیچھے دھکیل کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس نے کہا، ''اس کی زندگی کے مقابلے میں تمہاری اپنی زندگی ہے۔ اگر

تم اس کا ٹھکانا بتا دو تو تمہاری زندگی برقرار رہے گی۔''

گھڑسواری کے چابکوں اور بوٹوں کے ساتھ ٹھاٹ باٹ سے ملبوس ان لوگوں کو بھی مرنا تھا۔ جو مجھ سے کچھ دیر

بعد سہی، مگر بہت زیادہ دیر نہیں۔ وہ اپنے مڑے تڑے کاغذوں میں نام تلاش کرتے تھے، دوسروں کو مقید کرنے یا ان کا خاتمہ کرنے کے لیے ان کا پیچھا کرتے تھے۔ اسپین کے مستقبل یا دوسرے موضوعات پر اپنی رائے رکھتے تھے۔ مجھے ان کی چھوٹی مصروفیتیں سخت صدمہ انگیز اور جعلی لگتی تھیں۔ میں خود کو ان کی جگہ نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں انہیں پاگل گردانتا تھا۔ گھڑ سواری کے چابک سے اپنے جوتے تھپتھپاتے ہوئے پستہ قد آدمی ہنوز مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نپی تلی حرکات کا مقصد اسے ایک زندہ اور خوں آشام درندے کا روپ دیتا تھا۔

''تو؟ تم سمجھے؟''

مجھے معلوم نہیں کہ گریس کہاں ہے،'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا خیال تھا کہ وہ میڈرڈ میں ہے۔''

دوسرے افسر نے نکمے پن سے اپنا زردی مائل ہاتھ بلند کیا۔ یہ نکما پن بھی نپا تلا تھا۔ میں ان کے تمام چھوٹے چھوٹے منصوبے بھانپ گیا اور یہ جان کر سخت بے لطف ہوا کہ اپنے آپ کو اس طور بہلانے والے بھی ہوتے ہیں۔

''تمہارے پاس سوچنے کے لیے چوتھائی گھنٹہ ہے،'' اس نے آہستہ سے کہا۔ اسے لانڈری میں لے جاؤ اور پندرہ منٹ بعد واپس لاؤ۔ اگر یہ پھر بھی انکار کرتا ہے تو اسے موقعے پر ہی ختم کر دو۔''

انہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ گزشتہ رات میں نے انتظار میں گزاری تھی، پھر انہوں نے مجھے تہہ خانے میں ایک گھنٹہ منتظر رکھا تھا جب کہ انہوں نے اس دوران ٹام اور حوان کو گولی ماری تھی، اور اب وہ مجھے لانڈری میں قید کر رہے تھے۔ یقیناً انہوں نے اپنا منصوبہ ایک رات پہلے بنایا ہوگا۔ انہوں نے سوچا ہوگا، اعصاب آخر کار جواب دے جاتے ہیں۔ انہیں امید تھی کہ وہ اس طرح مجھے زیر کر لیں گے۔

وہ بڑی غلط فہمی میں تھے۔ میں لانڈری میں اسٹول پر بیٹھ گیا کیونکہ میں بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ میں سوچنے لگا، مگر ان کی تجویز کے بارے میں نہیں۔ یقیناً مجھے گریس کا ٹھکانہ معلوم تھا۔ وہ سہر سے چار کلو میٹر دور اپنے عم زادوں کے ہاں چھپا ہوا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ جب تک وہ مجھے تشدد کا نشانہ نہیں بنائیں گے میں اس کی پناہ گاہ کا پتا افشا نہیں کروں گا (مگر لگتا تھا وہ اس بارے میں نہیں سوچ رہے ہیں)۔ یہ سب کچھ بالکل منظم اور حتمی تھا اور میرے لیے کسی پہلو سے باعث دلچسپی نہ تھا۔ مجھے تو صرف اپنے رویے کی وجوہات سمجھنے میں دلچسپی تھی۔ مجھے گریس سے غداری کی نسبت مرنا قبول تھا۔ کیوں؟ میں اب رامون گریس کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے لیے میری دوستی سحر سے تھوڑی دیر قبل مر چکی تھی۔ عین اس وقت کو نچا کے لیے میری محبت نے دم توڑا تھا، عین اس وقت جب میری زندہ رہنے کی خواہش ختم ہو چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ گریس کے بارے میں میرے خیالات بہت ارفع تھے۔ وہ جری تھا، لیکن اس کی جگہ مرنے پر آمادگی کی یہ وجہ نہیں تھی۔ اس کی زندگی کی قیمت میری زندگی سے زیادہ نہیں تھی۔ کسی زندگی کی قیمت تھی ہی نہیں۔ انہیں تو آدمی کو دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کرنا تھا اور اس وقت تک گولیاں چلانا تھیں جب

تک وہ مر نہ جائے، خواہ وہ آدمی میں ہوں یا گریس یا کوئی اور، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جانتا تھا کہ اسپین کے نصب العین کے لیے میری نسبت وہ زیادہ کار آمد تھا، لیکن میں اسپین اور انارکی، سب کو جہنم رسید کر رہا تھا۔ میرے لیے کوئی چیز اہم نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں اڑا ہوا تھا۔ میں گریس کا ٹھکانا بتا کر اپنی جان بچا سکتا تھا، لیکن میں ایسا کرنے سے انکار کر رہا تھا۔

مجھے یہ بات کسی نہ کیسی وجہ سے مضحکہ خیز لگی۔ یہ ہٹ دھرمی تھی۔ میں نے سوچا، ''مجھے لازماً ضدی رہنا ہے!'' اور ایک پرلطف قسم کی شادمانی مجھ پر طاری ہوگئی۔

آخر کار وہ مجھے انہیں افسروں کے پاس واپس لے گئے۔ ایک چوہا میرے پاؤں کے نیچے سے بھاگا۔ مجھے تفریح کی سوجھی۔ میں نے ایک فلانجسٹ کی طرف منہ کر کے کہا، ''تم نے چوہا دیکھا؟''

اس نے جواب دیا۔ وہ بہت متین اور اپنے میں خاصا سنجیدہ تھا۔ مجھے ہنسی آرہی تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو روکا، کیونکہ مجھے خوف تھا کہ ایک بار ہنسا تو پھر رک نہ پاؤں گا۔ اس فلانجسٹ کے چہرے پر موچھیں تھیں۔ میں دوبارہ اس سے مخاطب ہوا، ''تمہیں اپنی موچھیں مونڈ دینی چاہییں، احمق۔'' یہ بات کہ وہ اپنے زندہ وجود کے بالوں کو اپنے چہرے پر حملہ آور ہونے دے رہا ہے، میرے خیال میں مضحکہ خیز تھی۔ اس نے بے یقینی سے مجھے لات رسید کی اور میں خاموش ہوگیا۔

''ہاں'' موٹے افسر نے کہا۔ ''تم نے سوچ لیا؟''

کسی نادر نوع کے کیڑوں کی طرح میں نے انہیں تجسس سے دیکھا۔ میں نے انہیں بتایا، ''مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہے۔ وہ قبرستان میں چھپا ہوا ہے۔ کسی تابوت خانے یا گورکنوں کے جھونپڑے میں۔

یہ ایک ڈھونگ تھا۔ میں انہیں اچھل کر کھڑے ہوتے اور اپنی پٹیاں کس کر تیزی سے احکامات صادر کرتے دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ''چلو، مولیز۔ لیفٹنٹ لوپیز سے پندرہ آدمی لے لو۔ تم...'' پستہ قد فربہ شخص سے بولا، ''اگر تم سچ بول رہے ہو تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ لیکن اگر ہمیں بے وقوف بنا رہے ہو تو تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔''

وہ بھگدڑ مچاتے ہوئے رخصت ہوئے اور میں فلانجسٹوں کی نگرانی میں سکون سے انتظار کرنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ ان کا کیا تماشا بنے گا، میں وقفے وقفے سے مسکراتا رہا۔ مجھے اپنے بے حس اور ـــــــ ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ میں چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ وہ قبروں کے پتھر اٹھا رہے ہیں اور ایک ایک کر کے تابوت خانوں کے دروازے کھول رہے ہیں۔ میں یہ صورت حال اپنے سامنے اس طرح پیش کر رہا تھا گویا میں کوئی اور ہوں۔ یہ قیدی ہٹ دھرمی سے ہیرو بن رہا ہے۔ یہ موچھوں والے تندرست فلانجسٹ اور ان کے وردی پوش آدمی قبروں کے درمیان دوڑ رہے

ہیں۔ یہ سب بے انتہا مضحکہ خیز تھا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ پستہ وفربہ شخص تنہا واپس آیا۔ میرا خیال تھا وہ مجھے ختم کرنے کا حکم دینے آیا ہے۔ اس کے باقی ساتھی یقیناً قبرستان ہی میں ٹھہر گئے ہوں گے۔

وہ افسر مجھے دیکھنے لگا۔ وہ ذرا بھی جھینپا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ ''اسے دوسرے لوگوں کے ساتھ بڑے صحن میں لے جاؤ،'' اس نے کہا، ''اس کی قسمت کا فیصلہ فوجی کارروائی کے بعد ایک باقاعدہ عدالت کرے گی۔''

میرا خیال نہیں تھا کہ میں اس کی بات سمجھ پایا ہوں۔ میں نے پوچھا، ''یعنی مجھے... گولی نہیں ماری جائے گی؟''

''بہر حال، فی الوقت نہیں۔ بعد میں کیا ہوتا ہے مجھے غرض نہیں۔''

میں اب بھی نہیں سمجھا تھا۔ میں نے پوچھا، ''مگر کیوں...؟''

اس نے جواب دیے بغیر اپنے کندھے اچکائے اور سپاہی مجھے باہر لے گئے۔ بڑے صحن میں کوئی سو کے قریب قیدی تھے جن میں عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے۔ میں گھاس کے مرکزی..................(پڑھنے میں نہیں آرہا ہے)..................

''انہوں نے مجھے دو بجے گرفتار کیا تھا،'' گارشیا نے کہا

''کیوں؟'' گارشیا کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

''معلوم نہیں،'' اس نے کہا، ''وہ ہر اس شخص کو گرفتار کر لیتے ہیں جو ان کی طرح نہیں سوچتا۔''

اس نے اپنی آواز مدھم کی، ''انہوں نے گریس کو پکڑ لیا ہے۔''

میں کانپ گیا۔ ''کب؟''

''آج صبح۔ اس کی غلطی نے سب برباد کر دیا۔ منگل کو اپنے عم زاد سے تکرار کے بعد وہ اس کے ہاں سے نکل آیا تھا۔ اسے پناہ دینے والے بے شمار لوگ تھے مگر وہ کسی کا کوئی احسان لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ میں ایبیا کے ہاں جا کر چھپ جاتا مگر وہ پکڑا گیا، سو میں قبرستان میں چھپ جاؤں گا۔''

''قبرستان میں؟''

''ہاں۔ کیسا بے وقوف آدمی! بلا شبہ وہ آج وہاں سے گزرے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ انہوں نے گورکنوں کے جھونپڑے میں اسے پا لیا۔ اس نے ان پر گولی چلائی اور انہوں نے اسے پکڑ لیا۔''

''قبرستان میں؟''

ہر چیز گھومنے لگی اور میں نے خود کو زمین پر بیٹھا پایا۔ مجھے اتنے زور کی ہنسی آئی کہ میرے آنسو نکل پڑے۔

☆☆☆

فرانز کافکا
ترجمہ: محمد عاصم بٹ

مقتل

''یہ ایک غیر معمولی آلہ ہے۔'' افسر نے مہم جو سے کہا اور آلے کا بنظر تحسین معائنہ کرنے لگا جو اس کے لیے غیر مانوس ہرگز نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تھا مہم جو نے اپنی منشاء کے خلاف محض لحاظ داری میں ایک سپاہی کی سزائے موت کا منظر دیکھنے کی دعوت قبول کی تھی جسے اپنے افسر کی نافرمانی اور اس سے اہانت آمیز رویہ روا رکھنے کے جرم میں اس انجام کو پہنچایا جا رہا تھا۔

بستی کے دیگر باسیوں نے بھی اس واقعہ میں زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ اس مختصر ریتلی وادی میں، جو تمام اطراف سے ننگے ٹیلوں میں گھرا ہوا ایک گہرا گڑھا معلوم ہوتی تھی، ایک افسر مہم جو ایک مجرم جو شکل سے احمق دکھائی دینے والا چوڑے دھانے اور پریشان حال بالوں والا انسان تھا اور ایک سپاہی کے علاوہ جو مجرم کے ٹخنو، کلائیوں اور گردن سے بندھی زنجیروں کو تھامے ہوئے تھا اور کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ یہ زنجیریں مجرم اور سپاہی کے درمیان مواصلاتی رابطے کا کام بھی کرتی تھیں۔ مجرم ایک تسلیم خو کتے کی مانند معلوم ہوتا تھا جسے دیکھ کر گماں ہوتا کہ اسے اردگرد پہاڑیوں میں چھوڑ دیا جائے گا اور ایسا محض سیٹی بجنے کے فوراً بعد ہوگا جو سزا کے شروع ہونے کا اشارہ ہوگی۔

مہم جو نے آلے میں چنداں دلچسپی ظاہر نہ کی اور واضح بے نیازی کے ساتھ مجرم کے عقب میں آگے پیچھے چکر کاٹنے لگا، افسر انتظامات کو حتمی صورت دینے لگا۔ کبھی آلے کو نیچے سے دیکھتا جو زمین میں اندر تک گڑا ہوا تھا۔ کبھی سیڑھی پر چڑھ کر بالائی پرزوں کا جائزہ لیتا۔ اصولی طور پر یہ ایک مستری کے کرنے کے کام تھے۔ تاہم وہ خود ہی جوش و خروش سے ان میں جتا ہوا تھا۔ غالباً اس لیے کہ وہ اس آلے سے گہری واقفیت رکھتا تھا یا کسی دوسری وجہ سے وہ کسی دوسرے پر اعتماد کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

''بالکل تیار ہے۔'' آخر کار اس نے پکار کر کہا اور سیڑھی سے نیچے کودا۔ وہ غیر معمولی طور پر لنگڑا رہا تھا اور پورا منہ کھولے ہانپ رہا تھا۔ اس سے دو عمدہ نسوانی رومال اپنی وردی کے کالر کے تلے دبا کر رکھے۔'' یہ وردیاں منطقہ حارہ کے علاقوں کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ مہم جو نے آلے سے متعلق کچھ تفتیش کرنے کے

بجائے جیسا کہ افسر توقع کر رہا تھا اس سے کہا۔

''بے شک۔'' افسر نے چکنے تیل آلودہ ہاتھوں کو پانی سے بھری بالٹی میں دھوتے ہوئے کہا، لیکن یہ وردیاں ہمیں اپنے گھروں کی یاد دلاتی ہیں۔ ہم اپنے گھروں کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ اس آلے پر ایک نظر ڈالیے۔ اس نے تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے مشین کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے ہر شے کو ہاتھ سے درست کرنا پڑا ہے۔ لیکن یہ مشین اپنے آپ کام کرے گی۔ مہم جو نے سر ہلایا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ افسر نے خود ہی ممکنہ اختلافات کا قیاس کر کے اپنی صفائی میں کہا۔ ''بعض اوقات اس میں گڑبڑی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے آج یہ ایسا کچھ نہیں کرے گی۔ تاہم ممکنات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس مشین کو اگلے بارہ گھنٹوں تک بغیر رکے چلنا چاہیے۔ اگر کچھ نقص پیدا ہوا بھی تو وہ زیادہ بڑا نہیں ہوگا۔ اس کا فوراً ہی سدباب کیا جاسکتا ہے۔ آپ بیٹھیں گے نہیں؟'' افسر نے بید کی کرسیوں کے انبار میں سے ایک مہم جو کے لیے گھسیٹ کر نکالی اور اسے پیش کی۔ وہ اس پیشکش کو رد نہیں کر سکا۔

اس کے برابر ہی ایک گڑھا تھا جس میں اس نے ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ وہ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ گڑھے میں ایک طرف کھدی ہوئی مٹی کو پشتے کی صورت میں ڈھیر کیا گیا تھا۔ دوسری جانب مشین ایستادہ تھی۔

''میں نہیں جانتا کہ افسران بالا نے اس آلے کے متعلق آپ کو کچھ وضاحت کی ہے یا نہیں۔'' افسر نے کہا۔ مہم جو نے مبہم انداز میں ہاتھ بلایا جس کا مطلب تھا کہ اسے ہی یہ کام کرنا ہوگا۔

''یہ آلہ۔'' افسر نے اس پر جھکتے ہوئے کہا'' ہمارے سابقہ افسر بالا نے ایجاد کیا تھا۔ میں نے ابتدائی آزمائشوں میں بھی ان کی معاونت کی۔ پھر تکمیل تک سارے عمل میں ان کے ساتھ رہا، لیکن اس ایجاد کا سہرا انہی کے سر بندھتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی ان کا تذکرہ سنا ہے؟''

''نہیں۔''

''اگر میں کہوں کہ یہ ساری منصوبہ بندی اسی کا کارنامہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ہم جو ان کے دوست ہیں، ہمیں ان کی وفات سے بہت پہلے اس حقیقت کا مکمل شعور تھا کہ ان کی منصوبہ بندی مکمل ترین ہے اور یہ کہ ان کے جانشین اپنے ذہنوں میں بھرے ہزاروں نئے منصوبوں کے باوجود کم از کم آئندہ کئی سالوں تک اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں بنا پائیں گے۔ ہماری یہ پیشین گوئی بالکل درست ثابت ہوئی۔ نئے افسران اعلیٰ کو اس سچائی کو ماننے بغیر چارہ نہیں ہے۔ افسوس کہ آپ سابقہ افسر اعلیٰ سے نہیں مل پائے۔ لیکن'' افسر نے کچھ توقف کیا پھر بولا۔'' شاید میں غیر ضروری بات کر رہا ہوں۔ یہ مشین ہمارے سامنے موجود ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے تین حصے ہیں جنہیں مختلف نام دیئے گئے ہیں۔ زیریں حصے کو بستر کہتے ہیں۔ اوپر والے

حصے کو ڈیزائنر اور درمیانی حصے کو جو اوپر نیچے گھومتا ہے، کھانچے دار سیراون کہتے ہیں۔''

''سیراون۔'' مہم جو نے لفظ دہرایا۔ وہ افسر کی گفتگو انہماک سے نہیں سن رہا تھا۔ اس بے سایہ وادی میں سورج کی چمک تیز تھی اور ذہن میں خیالات کو مجتمع کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ کندھوں پر لگی متعدد جھالروں اور چھاتی پر لگی بہت سی جیبوں والی اپنی چست وردی اور کوٹ میں ملبوس افسر خضوع وخشوع کے ساتھ اپنے مدعا کی وضاحت کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ پیچ کس سے یہاں وہاں پیچ بھی کستا جاتا۔

فوجی کی حالت مہم جو سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اس نے قیدی کی زنجیر کو اپنی کلائیوں میں لپیٹ لیا تھا۔ وہ اپنی رائفل کی ٹیک لیے بیٹھا تھا اور سر جھکائے بے نیاز معلوم ہوتا تھا۔ مہم جو کے لیے اس کی لاتعلقی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ افسر فرانسیسی میں گفتگو کر رہا تھا جبکہ فوجی اور قیدی دونوں اس زبان سے نابلد تھے۔ تاہم یہ بات غیر معمولی تھی کہ قیدی اس کے باوجود افسر کی گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ افسر کی گھومتی ہوئی انگلی کی سمت میں دیکھتا اور جب مہم جو سوال کرتا تو افسر کی طرح وہ بھی اپنے اردگرد تکنے لگتا۔

''ہاں وندانے دار سیراون۔'' افسر نے کہا ''یہ اس کے لیے موزوں نام ہے۔ اس میں سیراون کے دانتوں کی طرح سوئیاں لگی ہوئی ہیں۔ یہ مشین ایک سیراون کی مانند کام کرتی ہے۔ تاہم اسے سنبھالنے کے لیے اعلیٰ مہارت کی ضرورت ہے۔ خیر آپ جلد ہی سمجھ لیں گے۔ یہاں بستر پر مجرم کو لٹا دیا جاتا ہے۔ اصل میں میں چاہتا ہوں کہ مشین چلانے سے پہلے اس کے بارے میں آپ کو وضاحت سے بتاؤں۔ یوں آپ آئندہ ہونے والی کارروائی کو بہتر انداز میں سمجھ پائیں گے۔ ڈیزائنر میں ایک وندانے دار پہیا کچھ خراب ہے۔ چلتے ہوئے چرچراتا ہے۔ اتنا شور کرتا ہے کہ آپ کو اپنی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ بدقسمتی سے یہاں فالتو پرزوں کی دستیابی ایک مسئلہ ہے۔ خیر جیسا میں نے آپ کو بتایا ہے، مجرم کو بستر پر لیٹا دیتے ہیں۔ بستر روئی کی تہہ سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس کے مصرف کے بارے میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ یہاں مجرم کو اوندھے منہ لٹایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے بالکل برہنہ۔ اس کے ہاتھ پیروں اور گردن کو کس کر باندھنے کے لیے پٹیاں موجود ہیں۔ بستر کے سرہانے جہاں اوندھے لیٹے ہوئے مجرم کا سر ہوتا ہے، کپڑے کا ایک پارچہ ایسے لگایا گیا ہے کہ آسانی سے مجرم کے منہ میں گھس جائے۔ یہ انتظام اس لیے کیا جاتا ہے تا کہ اس کی چیخوں اور اسے اپنی زبان کو کاٹنے سے روکا جا سکے۔ ظاہر ہے مجرم کو مجبوراً کرا پڑتا ہے کہ وہ اسے منہ میں ڈالے۔''

''کیا یہ اون ہے؟'' مہم جو نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' افسر نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''آپ خود ہی دیکھ لیجیے۔'' اس نے مہم جو کا ہاتھ تھاما اور اسے بستر کی طرف لے چلا۔ ''یہ خاص طور پر تیار کی گئی ہے۔ اسی لیے یہ اتنی مختلف دکھائی دیتی ہے۔ میں آپ کو بتاتا

ہوں کہ یہ کس لیے ہے۔"

مشین میں مہم جو کی دلچسپی بڑھنے لگی تھی۔ اس نے آنکھوں کو سورج کی تیز روشنی سے بچاتے ہوئے مشین کو بغور دیکھا۔ یہ ایک عظیم الجثہ شے تھی۔ بستر اور ڈیزائنر ایک ہی حجم کے تھے اور دو تاریک چوبی الماریاں معلوم ہوتے تھے۔ ڈیزائنر بستر سے قریب دو میٹر اوپر ٹنگا ہوا تھا۔ ہر حصہ کناروں پر پیتل کی چار سلاخوں سے جڑا ہوا تھا جو سورج کی شعاعوں کو منعکس کر رہی تھیں۔ ان الماریوں کے بیچ سیراون سٹیل کی تار سے بندھا ہوا تھا۔ افسر خاموش ہو گیا تا کہ مہم جو کسی مداخلت کے بغیر آلے کا مشاہدہ کر سکے۔

"مجرم یہاں لیٹ جاتا ہے؟" مہم جو نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" افسر نے اپنی ٹوپی پیچھے کھسکائی اور ہاتھ کو گرم چہرے پر پھیرا۔ "ذرا غور سے سنیے۔ بستر اور ڈیزائنر دونوں میں برقی بیٹریاں لگی ہوئی ہیں جن کی مدد سے یہ اپنے آپ ہی کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جونہی مجرم کو پٹیوں سے باندھا جاتا ہے، مشین تھرتھرانے لگتی ہے۔ آپ نے اسپتالوں میں ایسی مشینیں دیکھی ہوں گی۔ اس مشین کے بستر پر تمام حرکات پہلے سے واضح طور پر طے شدہ ہوتی ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسے سیراون کی حرکات کی مناسبت سے چلنا ہوتا ہے۔ سیراون سزا کو حقیقی صورت دینے والا آلہ ہے۔"

"سزا کس طرح دی جاتی ہے؟" مہم جو نے پوچھا۔

"کیا آپ یہ بھی نہیں جانتے؟" افسر نے حیرت سے پوچھا اور ہونٹ کاٹنے لگا۔ "اگر میری توضیحات ناکافی رہی ہیں تو میں معذرت خواہ ہوں۔ میں واقعی آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل افسر اعلیٰ ہی پہلے یہ فریضہ انجام دیتے تھے۔ اب نیا افسر اس فرض سے کنی کتراتا ہے۔" مہم جو نے ہاتھ باندھ کر افسر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ تاہم اس نے باصرار اپنا بیان جاری رکھا: "اسی لیے تو آپ جیسے اہم مہمان کو بھی سزا دینے کے ہمارے اس نئے نظام کی وضاحت نہیں کی گئی۔ قریب تھا کہ افسر برانگیختہ ہو کر الم غلم بکنے لگے۔ تاہم پھر اس نے خود کو سنبھالا اور کہا" مجھے اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہے۔ خیر ہمارے طریقہ کار کی وضاحت کے لیے یہاں میں ہی بہترین آدمی ہوں۔ میرے پاس" اس نے کوٹ کی سامنے کی جیب کو تھپتھپایا۔ "ہمارے سابقہ افسران بالا کے تیار کردہ نقشے موجود ہیں۔"

"افسر بالا کے اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے خاکے" مہم جو نے پوچھا۔ "کیا انہوں نے ہر شے خود جوڑی تھی؟ کیا وہ سپاہی تھے یا مصنف یا کاریگر یا ادویات ساز یا نقشہ نویس؟"

"بے شک ایسا ہی تھا۔" افسر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس پر ایک بے حس اور بجھی ہوئی نگاہ

ڈالی۔ پھر اپنے ہاتھوں کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ وہ اتنے صاف نہیں تھے کہ ان سے کاغذات کو چھوا جائے۔ وہ بالٹی تک گیا اور انہیں نئے سرے سے دھویا۔ پھر ایک مختصر چرمی تھیلا نکالا اور کہا۔ ''یہ سزا سنگین نہیں ہوتی۔ مجرم نے جس فرمان کی خلاف ورزی کی ہوتی ہے اسے میراون کے ذریعے اس کے جسم پر گودہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شخص۔'' افسر نے مجرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے جسم پر لکھا جائے گا۔ اپنے افسران بالا کی تکریم کرو۔'' مہم جو نے مجرم کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا اور جیسے غور سے سب کچھ سن رہا تھا تاکہ جان سکے کہ کیا کہا جا رہا تھا۔ تاہم اس کے آپس میں بھینچے ہوئے ہونٹوں کی جنبش سے مترشح تھا کہ کچھ بھی اس کے پلے نہیں پڑا تھا۔

کئی سوال مہم جو کے ذہن میں تھے۔ تاہم اس نے مجرم کو دیکھتے ہوئے محض یہ پوچھا۔ ''کیا اسے اپنی سزا کا علم ہے؟''

''نہیں۔'' افسر نے کہا۔ وہ اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہتا تھا۔

مہم جو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''کیا واقعی اسے علم نہیں ہے کہ اسے کیسی سزا دی جا رہی ہے۔''

''نہیں۔'' افسر نے پھر سے کہا۔ پھر کچھ توقف کیا تاکہ مہم جو اپنے سوال کی مزید وضاحت کرے اور کہا۔ ''اس کو یہ سب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سزا اس کے جسم پر لکھی جائے گی۔'' تاہم اسے قیدی کی نگاہیں اپنی جانب مڑتی محسوس ہوئیں، جیسے وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا اس کے خیال میں یہ سب کچھ درست ہو رہا تھا؟

مہم جو نے پیشانی پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا ہوگا کہ اپنے دفاع میں اسے کیا کرنا چاہیے۔''

''اسے اپنے دفاع کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔'' افسر نے کہا اور اپنی نگاہوں کو پرے ہٹا لیا جیسے مہم جو کی طرف نہ دیکھ کر اسے اس خفت سے بچانا چاہتا ہو جو اس کے خیال میں ایسی بین باتوں کے بارے میں سوال پوچھ کر وہ محسوس کر رہا ہوگا۔

''لیکن اسے اپنے دفاع کا موقع تو ملنا ہی چاہیے۔'' مہم جو نے کہا اور اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

افسر نے محسوس کیا کہ مشین کے متعلق اسے زیادہ وضاحت سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ مہم جو کے پاس گیا۔ اسے بازو سے پکڑا اور ہاتھ کے اشارے سے مجرم کو پرے ہٹنے کو کہا جو بالکل سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ سپاہی نے آگے بڑھ کر زبردستی اسے پرے ہٹایا۔ افسر بولا میں بتاتا ہوں اصل بات کیا ہے۔ میں اس مقتل کا نامزد جج ہوں۔ میں سابقہ افسر اعلیٰ کا تمام تعزیری معاملات میں معاون رہا۔ میں اس

مشین کو کسی بھی دوسرے شخص سے بہتر سمجھتا ہوں۔ میرا اصول یہ ہے کہ جرم پر کبھی شک نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری عدالتیں اس اصول کو نہیں اپنا سکتیں۔ کیونکہ ان کے فیصلے کا انحصار مختلف آراء پر ہوتا ہے۔ ان کے فیصلے کی پرکھ کے لیے اعلیٰ عدالتیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ یہاں ایسا معاملہ نہیں ہے۔ کم از کم سابقہ افسر اعلیٰ کے دور میں یہ مسئلہ نہیں تھا۔ نئے افسر نے میرے فیصلوں پر جرح کا وطیرہ اپنا رکھا ہے۔ اب تک میں اسے پسپا کرتا رہا ہوں اور آئندہ بھی ایسا ہوگا۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں یہ سارا قصہ آپ کے گوش گزار کروں۔ یہ دیگر معاملات کی طرح بہت سادہ ہے۔ ایک کپتان نے آج صبح مجھ سے شکایت کی کہ یہ آدمی جسے اس کا ملازم متعین کیا گیا تھا اور جو روز اس کے دروازے کے باہر سوتا ہے، اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں سو رہا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ اس کا فرض ہے کہ گھڑی میں گھنٹہ بجنے پر اٹھے اور کپتان کے دروازے کو سلیوٹ کرے۔ یہ اس کا جبری فرض نہیں ہے۔ اسے ایک ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پہرے دار سنتری کا فرض بھی بجالانا ہے۔ اس لیے اسے ہر دو مواقع پر تیار رہنا چاہیے۔ گزشتہ رات کپتان نے فیصلہ کیا کہ دیکھے یہ شخص اپنا فرض دلجمعی سے پورا کرتا ہے یا نہیں۔ دو کا گھنٹہ بجا تو اس نے دروازہ کھولا۔ یہ شخص نیند میں مدہوش تھا۔ اس نے اپنا سواری کا چابک لہرایا اور زور سے اس کے چہرے پر مارا۔ تب اپنی غلطی کی معافی مانگنے کے بجائے یہ شخص اپنے مالک کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اسے جھنجھوڑا اور چیخا، یہ چابک پھینک دو۔ ورنہ میں تمہیں زندہ کھا جاؤں گا۔'' بس اتنا معاملہ ہے۔ گھنٹہ بھر پہلے کپتان میرے پاس آیا۔ میں نے اس کا بیان لکھا اور سزا سنائی۔ میں نے اس شخص کو زنجیروں میں جکڑ لیا۔۔ یہ سادہ سی کارروائی تھی۔ اگر میں پہلے اس شخص کو بلاتا اور تفتیش کرتا تو معاملہ الجھ بھی سکتا تھا۔ تب یہ مجھ سے جھوٹ بولتا۔ جونہی میں اس کے جھوٹ کا بھانڈا پھوڑتا یہ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے مزید جھوٹ بولتا۔ یوں یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ خیر میں نے اسے گرفتار کر لیا ہے اور اب اسے جانے نہیں دوں گا۔ لیکن شاید ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ سزا کو زیادہ موخر نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے تو ابھی آپ کو اس مشین کے عمل کی بھی وضاحت نہیں کی ہے۔''

اس نے مہم جو کو پھر سے کرسی کی طرف دھکیلا۔ پھر مشین کے اوپر گیا اور بولا۔ ''آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کھانچے دار سراون کی ساخت بالکل انسانی جسم جیسی ہے۔ یہ سراون مجرم کے دھڑ کے لیے ہے اور یہ ٹانگوں کے لیے۔ سر کے لیے یہ مختصر نوکدار سلاخ ہے۔ کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔'' وہ متانت سے مہم جو کی جانب جھکا۔ وہ اسے ممکنہ حد تک قابل فہم وضاحت پیش کرنا چاہتا تھا۔

سیراون کو دیکھ کر مہم جو کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ قانونی کارروائی کی تشریح اسے مطمئن نہیں کر پائی تھی۔ تاہم یہ بات قابل غور تھی کہ یہ ایک مقتل تھا۔ یہاں غیر معمولی اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔

پھر نظم وضبط قائم رکھنا بھی اہم ہے۔ اس نے سوچا نئی انتظامیہ سے البتہ اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں جو اس عمل کو ایک نئی طرز کے نظام سے بدلنا چاہتی تھی اور جسے افسر کا تنگ ذہن سمجھنے کے اہل نہیں تھا۔ خیالات کے اس بہاؤ نے اسے اگلا سوال پوچھنے کی ترغیب دی۔ ''کیا تعزیری کارروائی میں افسر اعلیٰ بھی آئیں گے۔''

''کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔'' افسر نے کہا۔ اس براہ راست سوال سے وہ کچھ ناخوش معلوم ہوتا تھا۔ اس کے انداز میں دوستانہ رویہ دھندلا گیا تھا۔ ''اسی لیے ہمیں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ اچھا تو نہیں لگتا لیکن مجبوری ہے کہ مجھے یہاں بات ختم کرنا پڑے گی۔ ابھی مشین کو صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں نقص ہے کہ یہ جلدی میلی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہی میں تمام تفصیلات سرسری انداز میں دہرا سکوں گا۔ فی الوقت صرف بنیادی باتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ مجرم بستر پر لیٹتا ہے تو یہ تھرتھرانے لگتا ہے۔ سیراون اس کے جسم پر جھک جاتا ہے۔ یہ خودکار طریقے پر کام کرتا ہے۔ اس کی سوئیاں جلد کو چھوتی ہیں۔ سب سے پہلے لوہے کا پٹہ مجرم کے گرد کسا جاتا ہے۔ اس کے بعد کارروائی شروع ہوتی ہے۔ ایک عام ناظر کو مختلف طرح کی سزاؤں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا۔ سیراون ہموار انداز میں ایک ہی طرح سے کام کرتا معلوم ہوتا ہے۔ جونہی یہ تھرتھراتا ہے، اس کی میخیں مجرم کی جلد میں گھسنے لگتی ہیں جو خود بھی بستر کی تھرتھراہٹ سے کانپ رہا ہوتا ہے۔ سیراون کو کانچ سے بنایا گیا ہے تاکہ سزا کے عمل کا مشاہدہ کیا جاسکے۔ کانچ میں سوئیاں پیوست کرنا ایک تکنیکی نوعیت کا مسئلہ تھا۔ لیکن مشین کو مختلف آزمائشوں سے گزارنے کے بعد ہم نے آخر اس کا حل تلاش کر لیا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کوئی مسئلہ اتنا بڑا نہیں ہوتا کہ حل نہ کیا جاسکے۔ اب ہر کوئی کانچ کے پردے میں سے دیکھ سکتا ہے کہ کیسے جسم پر تحریر کو دی جاتی ہے۔ کیا آپ کچھ اور نزدیک نہیں جائیں گے تاکہ سوئیوں کو اچھی طرح دیکھ سکیں۔''

مہم جو آہستگی سے اٹھا اور آگے بڑھ کر سیراون پر جھک گیا۔

''یہ دیکھیے۔'' افسر نے کہا ''یہاں بہت سے سانچوں میں دو طرح کی سوئیاں لگائی گئی ہیں۔ ہر لمبی سوئی کے ساتھ ایک چھوٹی سوئی بھی ہے۔ یہ سوئیاں گودنے کا کام کرتی ہیں۔ چھوٹی سوئیاں پانی کی دھار پھینکتی ہیں تاکہ خون دھل جائے اور تحریر صاف رہے۔ خون اور پانی ان چھوٹی نالیوں سے بڑی نالیوں میں آتا ہے اور پھر ایک نلی کے ذریعے نیچے گڑھے میں گر جاتا ہے۔'' اپنی انگلی سے افسر نے پانی اور خون کے بہنے کا صحیح راستہ بنایا۔ اس تصویر کو زیادہ مکمل کرنے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ نلی کے سرے کے نیچے رکھے جیسے نیچے آنے والے مواد کو کرنے سے روک رہا ہو۔

مہم جو نے اپنا سر پیچھے جھٹکا۔ وہ بیٹھنے کے لیے پیچھے ایک ہاتھ سے کرسی ٹٹول رہا تھا۔ خوف کی اس

کیفیت میں اس نے دیکھا کہ مجرم بھی افسر کی پیشکش کے ردعمل کے طور پر آگے جھک کر سیر اون کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوئے ہوئے سپاہی کو زنجیر سے آگے جھٹکا اور کانچ کے آلے پر جھک گیا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کی مضطرب نگاہیں یہ جاننے کی کوشش کررہی تھی کہ دونوں معزز افراد وہاں کیا دیکھ رہے تھے؟ لیکن چونکہ وہ افسر کے وضاحتی بیان کو نہ سمجھ سکا تھا، یہ ساری بات خاک بھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ خالی دماغ کے ساتھ اِدھر اُدھر جھانک رہا تھا۔ اس کی نگاہیں کانچ پر سرگرداں تھیں۔ مہم جو نے اسے پیچھے ہٹانا چاہا تو افسر نے ایک ہاتھ سے مہم جو کو روکا۔ دوسرے ہاتھ سے مٹی کا ڈھیلا اٹھایا اور سپاہی کو دے مارا۔ سپاہی نے جھٹکے سے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور مجرم کی گستاخی ملاحظہ کی۔ اپنی بندوق نیچے گرائی ایڑیاں زمین میں گاڑتے ہوئے مجرم کو اپنی طرف کھینچا جس سے وہ لڑکھڑایا اور نیچے گر گیا۔

''اسے اپنے پیروں پر کھڑا کرو۔'' افسر چیخا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ مجرم نے مہم جو کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی تھی۔ مہم جو ہنوز سیر اون پر جھکا ہوا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ مجرم کے ساتھ ہونے والے سلوک کو بھی ملاحظہ کر رہا تھا۔ ''اس پر نگاہ رکھو۔'' افسر نے دوبارہ چلا کر کہا۔ پھر خود بھی مشین کے گرد گھوم کر آیا۔ مجرم کو کندھوں کے نیچے سے پکڑا اور سپاہی کی مدد سے اسے اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ وہ اس کے بازوؤں میں کانپ رہا تھا۔

''میں معاملے کو سمجھ گیا ہوں۔'' افسر کو اپنی جانب مڑتے ہوئے دیکھ کر مہم جو نے کہا۔

''سب سے اہم بات یہ ہے۔'' افسر نے مہم جو کا بازو پکڑتے اور اوپر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈیزائنر میں دھرے لگے ہیں جو سیر اون کی حرکات کی نگرانی کرتے ہیں۔ یہ مشین سزا کی تحریر کی مناسبت سے کام کرتی ہے۔ میں ابھی تک سابقہ افسر اعلیٰ کی منصوبہ بندی سے استفادہ کر رہا ہوں۔ منصوبہ یہ ہے۔'' اس نے چرمی تھیلے میں سے چند کاغذات نکالے۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں انہیں آپ کو نہیں دے سکتا۔ یہ میرا گراں مایہ اثاثہ ہیں۔ آپ بیٹھ جائیں۔ میں انہیں آپ کے سامنے اس طرح کھولوں گا کہ آپ سب کچھ اچھی طرح دیکھ سکیں گے۔'' اس نے پہلا صفحہ پھیلایا۔ مہم جو کوئی توصیفی جملہ کہنا چاہتا تھا لیکن اسے وہاں جو کچھ دکھائی دیا، وہ ٹیڑھی میڑھی سطروں کو بھول بھلیاں کے سوا کچھ نہیں تھا جو ایک دوسرے کو کاٹ رہی تھیں۔ یہ کاغذ پر ہر طرف اس طرح پھیلی ہوئی تھیں کہ ان کے درمیان خلا بالکل مفقود تھا۔

''اسے پڑھیے۔'' افسر نے کہا۔

''میں اسے نہیں پڑھ سکتا۔'' مہم جو نے کہا۔

''یہ بالکل صاف لکھا ہے۔'' افسر نے کہا۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔'' مہم جو نے ٹال مٹول کے انداز میں کہا۔ ''تاہم میں اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''ہاں۔'' افسر نے قہقہہ لگایا اور کاغذ کو پرے لے گیا۔ ''یہ اسکول کے بچوں کی لکھی تحریر نہیں ہے۔ اسے بغور پڑھنے کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اسے ضرور سمجھ لیں گے۔ بیشک یہ مسودہ سہل الفہم نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مجرم کو ایک دم سے مار دیا جائے گا ایک خاص وقفہ۔ کے بعد، جو اوسطاً بارہ گھنٹوں پر محیط ہوتا ہے، یہ سب کچھ رونما ہوگا۔ قریب چھ گھنٹے کے بعد صورت حال میں اہم تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ اسی لیے اصل مسودے کے گرد بے شمار دائرے اور خط ہیں۔ اصل تحریر جسم پر ایک تنگ حلقے کی صورت میں لکھی جاتی ہے۔ جسم کے باقی حصے پر تزئین و آرائش کا کام ہوتا ہے۔ کیا سیراون اور مشین کے دوسرے حصوں کا کام آپ کو پسند آیا؟ آپ ذرا دیکھیے تو۔'' وہ سیڑھی پر چڑھ گیا۔ ایک چرخی کو گھمایا اور نیچے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ادھر دیکھیے۔ ادھر ایک طرف ہی رہیے۔''

سبھی مشین چلنے لگی۔ اگر چرخی میں کھڑکھڑاہٹ نہ ہوتی تو یہ واقعی معرکے کی چیز تھی۔ افسر نے چرخی کے شور سے برانگیختہ ہوتے ہوئے اس پر گھونسا مارا یہ پھر معذرت خواہانہ انداز میں بازو مہم جو کی جانب چھونے کے ارادے سے آگے جھکا۔ سپاہی نے افسر سے خاص اشارہ پاکر چاقو سے عقب سے اس کی قمیض اور پتلون کو چیر ڈالا حتیٰ کہ دونوں نیچے گر گئے۔ وہ اپنی برہنگی چھپانے کے لیے لباس کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ سپاہی نے کپڑوں کو ہوا میں بلند کیا اور لباس کی باقیات کو بھی اس کے جسم سے نوچ ڈالا۔ افسر نے مشین بند کی۔ فوری طور پر پیدا ہونے والی خاموش فضا میں مجرم کو سیراون کے نیچے لٹایا گیا۔ زنجیریں کھول کر اسے پٹیوں میں کسا گیا۔ مجرم اکہرے جسم کا مالک تھا۔ جونہی سوئیوں کی نوکیں اس کے جسم کو چھوئیں، اس کی جلد میں تھرتھراہٹ دوڑ گئی۔ جب سپاہی اس کے بائیں ہاتھ کو پٹوں میں جکڑ رہا تھا، اس نے تیزی سے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا۔ اس کا ہاتھ اس طرف اٹھا جدھر مہم جو کھڑا تھا۔ افسر ایک طرف کھڑا مہم جو کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات سے اس تعزیری کارروائی پر، جس کی تفصیل اس پر واضح کر دی گئی تھی، اس کا ردعمل جاننا چاہتا تھا۔ مشین کا پٹہ ٹوٹ گیا۔ شاید سپاہی نے اسے زیادہ کس کر باندھا تھا۔ افسر ہی کو مداخلت کرنا پڑی۔ سپاہی نے اسے دکھانے کے لیے پٹے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو اٹھایا۔

افسر اس کے قریب آیا اور بولا جبکہ اس کا چہرہ ابھی تک مہم جو کی طرف مڑا ہوا تھا۔ ''یہ ایک پیچیدہ مشین ہے۔ پرزوں کے ٹوٹنے اور ڈھیلا ہو کر کھل جانے کو روکا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان معمولی وقوعات سے اپنی عمومی رائے تبدیل کر لی جائے۔ اسی پٹے کو آسانی سے ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ ایک

زنجیر کو استعمال کرنا ہوگا۔ زنجیروں کو کستے ہوئے وہ دوبارہ بولا۔ ”مشین کا انتظام سنبھالنے کے لیے وسائل محدود کردیئے گئے ہیں۔ سابقہ افسر اعلیٰ کے دور میں اس مقصد کے لیے مختص رقم کو میں باآسانی استعمال کرسکتا تھا اس کا ایک گودام بھی تھا جہاں ہر طرح کی مرمت کے لیے فاضل پرزہ جات موجود تھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں فضول خرچ ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ ماضی میں تھا لیکن اب نہیں ہوں۔ نیا افسر اعلیٰ ہمارے پرانے طریقہ کار کو ہدف تنقید بنانے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ اس نے مشین کے لیے مختص رقم کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اگر میں نیا پٹہ منگواؤں تو وہ ثبوت کے طور پر پرانے پٹے کا تقاضہ کرے گا۔ پھر نیا پٹہ دس سے کم دنوں میں نہیں ملے گا اور وہ بھی خام مواد سے بنا ہوا جو ناقص ہوتا ہے۔ آپ ہی بتایئے ایک پٹے کے بغیر میں اس مشین کو کیسے چلاؤں؟ اس بارے میں کوئی نہیں سوچتا۔“

مہم جو نے اپنے طور پر سوچا ”دوسروں کے معاملات میں حتمی طور پر دخل درمعقولات کرنا ایک پیچیدہ بات ہے۔ وہ نہ تو اس قتل گاہ کا رکن تھا، نہ اس ریاست کا باشندہ جس کی یہ مقتل ملکیت ہے۔ اگر وہ اس کارروائی کی مذمت کرے یا واقعتاً اسے رکوانے کی کوشش کرے تو وہ اسے کہیں گے کہ وہ اجنبی ہے اور اسے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ وہ اس بات کا کوئی جواب نہیں دے پائے گا تاآنکہ وہ یہ تسلیم کرلے کہ اسے دخل اندازی کرنے کے رویے پر ندامت ہے۔ وہ محض ایک مبصر کے طور پر سفر کرتا ہے۔ دوسروں کے عدل سے متعلق رویوں کو بدلنے کی منشاء کے بغیر۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس معاملے سے اس کا کوئی مفاد وابستہ ہے۔ مجرم اس کے لیے مطلق اجنبی تھا۔ نہ اس کا ہم وطن تھا حتیٰ کہ نہ ہی اسے اس سے کوئی ہمدردی تھی۔ اسے اعلیٰ حکام کی تجویز پر یہاں بھیجا گیا تھا۔ اعزاز کے ساتھ اس کا استقبال ہوا تھا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اسے سزا کے مشاہدے کے لیے بطور خاص مدعو کیا گیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی رائے کو خاص اہمیت دی جائے گی۔ یہ بات اس لیے بھی درست مانی جاسکتی ہے کہ افسر بالا جیسا کہ اسے معلوم تھا، اس کارروائی کو مزید جاری رکھنے کے حق میں نہیں تھا اور نہ اس کا افسر کے ساتھ رویہ ہی ہمدردانہ تھا۔“

مہم جو نے افسر کو غصے میں چیختے ہوئے سنا۔ اس نے بروقت نمدے کو مجرم کے منہ میں نہیں ٹھونسا تھا۔ متلی کی شدت سے اس نے آنکھیں بھینچ لیں اور قے کردی۔ افسر نے بسرعت نمدے کو اس کے منہ سے نکالا اور اس کا سر گڑھے کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ تاہم دیر ہوچکی تھی۔ قے کا مواد مشین میں پھیل گیا۔

”ساری غلطی افسر اعلیٰ کی تھی۔“ افسر نے بے خیالی میں سامنے پیتل کی سلاخ کو ہلاتے ہوئے چلا کر کہا۔ ”مشین ایک خنزیر خانے کی طرح گندگی اور بدبودار ہے۔“ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے مہم جو پر اصل صورت حال واضح کرنے کی کوشش کی۔ ”نئے لوگ بہت نازک مزاج ہیں۔ میں گھنٹوں افسر اعلیٰ سے مغز

ماری کرتا رہا کہ مجرم کو سزا دینے سے پہلے پورا دن بھوکا رکھا جائے؟ انتظامیہ کی خواتین نے مجرم کو یہاں بھیجنے سے پہلے میٹھی گولیاں کھلائیں۔ یہ ساری عمر بدبودار مچھلی پر گزر اوقات کرتا رہا اور اب اسے میٹھی گولیاں کھلائی جارہی ہیں۔ میں اس کی مخالفت میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ آخر انتظامیہ مجھے نیا نمدا کیوں نہیں لے کر دیتی جس کے لیے میں پچھلے تین مہینوں سے التجا کر رہا ہوں۔ ایسا نمدا جسے پہلے ہی سیکڑوں افراد اپنے منہ میں لے اور اپنے آخر لمحوں میں چبا چکے ہوں، اسے منہ میں لیتے ہوئے کیا جی نہیں متلائے گا؟''

مجرم نے سر پیچھے گرا لیا۔ اب وہ پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ سپاہی مجرم کی قمیض سے مشین کو صاف کررہا تھا۔ افسر مبہم جو کی طرف مڑا جو کسی مبہم احساس کے تحت ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ افسر نے اسے ہاتھ سے پکڑا اور ایک طرف لے چلا۔

''میں تخلیے میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں'' اس نے کہا۔ ''کیا آپ چلیں گے۔''

''بیشک۔'' مبہم جو نے کہا اور جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''اس وقت تعزیری طریقہ کار اور کارروائی کا اس بستی میں کوئی حامی موجود نہیں ہے۔ میں اس کا واحد حامی ہوں اور سابقہ اعلیٰ افسر کی روایت کا واحد امین بھی۔ میں اس طریقہ کار میں مزید اضافے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ میں نے اس کو اسی حالت میں قائم رکھنے کے لیے اپنی ساری توانائی صرف کردی ہے۔ سابقہ اعلیٰ افسر کی زندگی میں یہ قصبہ اس کے طرف داروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے ارادے کی مضبوطی بہت معمولی حد تک میرے اندر آئی ہے۔ لیکن اصل میں اس کی طاقت کا ایک ایٹم بھی مجھے نہیں ملا۔ اب صورت یہ ہے کہ اس کے تمام طرف دار منظر سے غائب ہو چکے ہیں۔ اب بھی ان میں سے بہت سے باقی ہوں گے۔ لیکن وہ سامنے آنے پر تیار نہیں ہیں۔ اگر آپ کا آج کافی ہاؤس جانا ہو تو سنیے گا عوامی رائے کیا ہے؟ آپ کو شائد مبہم آراء ہی سننے کو ملیں گی، لیکن موجودہ افسر بالا اور اس کی خواتین کے لیے یہ سب کچھ بے کار ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ افسر اعلیٰ اور اس عورت کے باعث، جس سے وہ از حد متاثر ہے، کیا یہ شاہکار، یہ زندگی بھر کی کاوش (اس نے مشین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) رائیگاں نہیں جارہی ہے؟ کیا یہ سب کچھ ہونے دینا چاہیے؟ لیکن اب یہ سب باتیں بے کار ہیں۔ محض ایک اعلان ہوگا اور منصف کے طور پر میری حیثیت ختم ہو جائے گی۔ افسر اعلیٰ کے دفتر میں اجلاس ہو رہے ہیں اور مجھے ان میں مدعو نہیں کیا جاتا۔ آپ کے آج یہاں آنے میں بھی مجھے ان کی کوئی چال معلوم ہوتی ہے۔ وہ بزدل ہیں اور ایک اجنبی کو آڑ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

ماضی میں تعزیری کارروائی کتنے مختلف انداز میں ہوتی تھی۔ تقریب سے ایک روز پہلے ہی وادی

لوگوں سے کھچا کچھ بھر جاتی۔ وہ دور دور سے یہ تماشہ دیکھنے آتے۔ صبح سویرے افسر اعلیٰ اپنی عورتوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا۔ شہنائیاں سارے میں گونج اٹھتیں۔ یہ اطلاع دیتا کہ تیاری مکمل ہے۔ افسران کا اجتماع، جس میں غیر حاضر ہونے کی کبھی کسی کو جرأت نہیں ہوئی، مشین کے گرد اکٹھا ہو جاتا۔ بید کی کرسیوں کا ڈھیر اس ابنوہ کی نہایت مختصر باقیات میں سے ایک ہے۔ مشین بھی نئی صاف اور چمکدار تھی۔ ہر سزا کے موقع پر مجھے فالتو پرزے فراہم کیے جاتے۔ سیکڑوں تماشائیوں کے سامنے جو اپنے پنجوں کے بل ممکنہ حد تک اونچا ہونے کی کوشش کرتے، افسر اعلیٰ بذات خود مجرم کو سیرادن کے نیچے لٹاتا۔ آج جو کام ایک سپاہی انجام دیتا ہے تب وہ میرے ذمہ تھا۔ ایک امیر مجلس کا کام۔ اور یہ میرے لیے اعزاز تھا۔ پھر سزا شروع ہوتی۔ کوئی غیر موافق آواز مشین کے کام میں مخل نہ ہوتی۔ کچھ تو اسے دیکھنے کی بھی پرواہ نہ کرتے اور آنکھیں بند کر کے ریت پر لیٹ جاتے۔ انہیں یقین ہوتا کہ اب عدل ہوگا۔ گہرے سکوت میں مجرم کی آہوں کے سوا جو منہ میں ٹھنسے ڈھانے کے سبب بڑبڑاہٹ آمیز ہوتیں اور کچھ سنائی نہ دیتا۔ اب اس مشین میں اتنا زور نہیں رہا کہ کسی مجرم کو اتنا اونچا کراہنے پر مجبور کرے کہ منہ میں ٹھنسے نمدے کے باوجود اس میں سے بڑبڑاہٹ بلند ہو۔ ان دنوں لکھنے والی سوئیوں سے خاص طرح کا تیزابی محلول رستا تھا۔ جس کے استعمال کی اب ہمیں ممانعت ہے۔ خیر چھٹا گھنٹہ شروع ہوتا۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی کی اس منظر کو قریب سے مشاہدہ کرنے کی درخواست قبول کی جائے۔ افسر اعلیٰ خاص حکمت کے تحت یہ فرمان جاری کرتا کہ بچوں کو ترجیح دی جائے۔ مجھے اپنے منصب کی رعایت سے اسے دیکھنے کی سہولت حاصل تھی۔ اکثر اوقات کسی چھوٹے بچے کو بازو میں اٹھا کر میں آگے ہو جاتا۔ کیسے ہم مجرم کے چہرے پر تبدیلی ہیئت کے منظر میں محو ہوتے۔ کیسے ہمارے رخسار اس عدل کی افشانی سے بھیگ جاتے جس کا مظاہرہ وہاں ہوتا تھا۔ کیا خوب زمانے تھے!''

فرط جذبات میں وہ قطعی فراموش کر چکا تھا کہ کسی سے مخاطب ہے۔ اس نے مہم جو کو اپنی آغوش میں لیا اور سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔ مہم جو شدید گھبراہٹ کے ساتھ مضطربانہ افسر کے سر سے پرے دیکھ رہا تھا۔ سپاہی صفائی کا کام مکمل کر چکا اور تسلے میں ایک ڈھونگے سے چاول کی پتلی کھچڑی انڈیل رہا تھا۔ مجرم جو بھوک سے بے حال تھا، نے سپاہی کو کھچڑی انڈیلتے دیکھا تو اپنی زبان چاول تک پہنچانے کی کوشش کرنے لگا۔ سپاہی نے اسے واپس دھکیلا۔ کیونکہ کھچڑی اگلے ایک گھنٹے تک کی خوراک تھی۔ لیکن یہ بات نہایت غیر مناسب تھی کہ دوسرے تک پہنچنے سے پہلے سپاہی اپنے میلے ہاتھ تسلے میں ڈالے خود ہی کھچڑی کھا رہا تھا۔ افسر نے اپنے حواس مجتمع کیے۔

''میں آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا'' افسر بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ گزرے ہوئے دنوں کو اب معتبر

ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔ خیر مشین کام کر رہی ہے اور اپنے طور پر تا حال موثر ہے۔ اس کے باوجود کہ یہ اس وادی میں تنہا کھڑی رہتی ہے، یہ موثر ہے اب بھی لاش آخر میں خود بخود نیچے گڑھے میں جا گرتی ہے۔ حالانکہ اس کے گرد حسب سابق مکھیوں کی طرح سیکڑوں لوگ جمع نہیں ہوتے۔ ان دنوں ہمیں گڑھے کے گرد مضبوط بنگلہ لگانا پڑتا تھا۔ اب تو اسے اکھاڑے گئے بھی بہت عرصہ بیت گیا ہے۔''

مہم جو چہرے کو افسر کی طرف سے موڑے بلا مقصد ہی ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ افسر کو گمان ہوا شاید وہ وادی کی وسعت کا جائزہ لے رہا ہے۔ اس نے اسے ہاتھوں سے پکڑا اور موڑ کر اپنے سامنے لایا اور پوچھا۔ ''کیا آپ کو اس صورت حال پر ندامت محسوس ہو رہی ہے؟''

مہم جو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ افسر نے کچھ دیر اسے خاموش سے تکا۔ ٹانگوں کو پھیلائے ہاتھوں کو کولہوں پر رکھے، وہ ساکت کھڑا زمین کو گھور رہا تھا۔ پھر پر اعتماد مسکراہٹ کے ساتھ مہم جو کو دیکھا اور کہا۔'' جب افسر اعلیٰ نے آپ کو یہاں مدعو کیا تو میں آپ کے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ میں نے اسے آپ کو دعوت دیتے ہوئے سنا تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا چاہتا تھا؟ وہ اتنا با اختیار ہے کہ میرے خلاف کچھ بھی کر سکتا ہے، لیکن اس میں اتنی جرأت نہیں ہے۔ وہ آپ کی رائے کو میرے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے۔ ایک گراں قدر اجنبی کی رائے۔ اس نے بڑی احتیاط سے یہ سارا منصوبہ بنایا ہے۔ اس خطے پر یہ آپ کا دوسرا دن ہے۔ آپ سابقہ افسر اعلیٰ اور ان کے کام کے طریقہ کار سے واقف نہیں ہیں۔ آپ یورپی انداز فکر سے خوگر ہیں۔ شاید آپ اصولی طور پر سزائے موت ہی کے خلاف ہوں اور خصوصی طور پر موت دینے والے ان میکانکی آلات کے۔ آپ خود دیکھیں گے کہ اس تعزیری کارروائی کو عوام کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ یہ محض ایک ادنیٰ تقریب ہے جو ایک پرانی اور گھسی ہوئی مشین کی ہمراہی میں منعقد ہو رہی ہے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے۔ (جیسا خود اعلیٰ افسر بھی چاہتا ہے) کہ آپ میرے طریقہ کار کو یکسر رد کر دیں گے۔ بالفرض اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو آپ پھر بھی حقیقت کو نہیں چھپائیں گے۔ میں افسر اعلیٰ کے نقطہ نظر سے بات کر رہا ہوں۔ آپ اپنے خوب گتھے ہوئے نتائج پر اعتماد کرنے والے شخص ہیں۔ بالکل درست آپ نے بہت سے لوگوں کے عجیب رویوں کو دیکھا اور انہیں سمجھنا سیکھا ہے۔ سو امید ہے آپ ہمارے طریقہ کار کے خلاف کوئی سخت رائے قائم نہیں کریں گے جیسا آپ خود اپنے ملک میں ایسے کسی اقدام کے بارے میں سوچتے ہوں گے۔ افسر اعلیٰ کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک رسمی حتیٰ کہ ایک غیر محتاط رائے بھی کافی ہوگی۔ اسے حقیقی خیالات کی نمائندگی کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بس اس حد تک ہی وہ آپ کو سنے گا جس سے اس کا مقصد پورا ہو جائے۔ وہ آپ کو کائیاں سوالات

سے مشتعل کرنے کی کوشش کرے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کی عورتیں آپ کے گرد بیٹھ جائیں گی اور آپ کو کچھ ایسی بات کہیں گی جیسے یہ کہ ہمارے ملک میں تعزیری کارروائی مختلف انداز میں ہوتی ہے یا ہمارے ملک میں قیدی کو سزا دینے سے پہلے تفتیش کی جاتی ہے یا قرون وسطیٰ کے بعد سے ہم نے تشدد کی روایت ختم کردی وغیرہ وغیرہ۔ یہ بیانات اتنے بے ضرر ہیں کہ میرے طریقہ کار پر کوئی رائے ظاہر نہیں کرتے۔ افسر اعلیٰ بھلا ان بیانات پر کیا ردعمل ظاہر کرے گا؟ میں اسے تصور کرسکتا ہوں۔ ہمارے محترم افسر اعلیٰ دفعتاً اپنی کرسی پرے سرکائیں گے اور بالکنی کی طرف بڑھیں گے۔ لیکن میں دیکھ سکتا ہوں کہ اس کی عورتیں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہوں گی۔ میں اس کی آواز سن سکتا ہوں۔ عورتیں اسے طوفانی آواز کہتی ہیں۔ وہ کچھ یوں کہے گا کہ اس معروف مغربی سراغ رساں، جنہیں دنیا کے تمام قدیم روایت کو غیر انسانی قرار دیا ہے۔ ایسی اہم شخصیت سے یہ رائے ملنے کے بعد میرے لیے ممکن نہیں رہتا کہ اس کارروائی کو مزید جاری رکھنے کی اجازت دوں۔ سو آج سے میں فیصلہ کرتا ہوں کہ...... یا یہ ایسی ہی کوئی بات ہوگی۔ ہوسکتا ہے آپ دخل اندازی کریں کہ آپ نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور یہ کہ آپ نے میرے طریقہ کار کو غیر انسانی قرار نہیں دیا۔ بلکہ اس کے برعکس اپنے عمیق تجربے سے آپ نے سیکھا ہے کہ یہ انتہائی نفیس اور انسانی وقار کے عین مطابق ہے اور یہ بھی کہ آپ اس مشین کے معترف ہیں۔ لیکن تب بہت دیر ہوچکی ہوگی۔ آپ بالکنی پر ہی نہیں پہنچ پائیں گے۔ وہاں عورتوں کا جم غفیر ہوگا جو آپ کی توجہ اپنی جانب منعطف کرنے کی کوشش کرے گا۔ آپ چلانا چاہیں گے، لیکن ایک عورت کا ہاتھ آپ کے ہونٹوں پر آجائے گا اور میری اور سابقہ افسر اعلیٰ کی ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔''

مہم جو نے اپنی مسکراہٹ کو دبایا۔ اس نے نرمی سے کہا۔''آپ نے میری حیثیت کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ افسر اعلیٰ نے میرے سفارشی خطوط پڑھے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ میں تعزیری کارروائی کے تجزیے کا ماہر نہیں ہوں۔ بالفرض اگر مجھ سے رائے مانگی گئی تو یہ بالکل ایک عمومی رائے ہوگی۔ جو ایک عام شخص کی رائے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ کم از کم افسر اعلیٰ کی رائے سے کم ہی موثر ہوگی جو جیسا کہ میں سمجھ پایا ہوں، اس قتل گاہ میں اعلیٰ اور وسیع اختیارات رکھتا ہے۔ اگر آپ کے طریقہ کار سے متعلق اس کی رائے اچھی نہیں ہے جیسا کہ آپ کو یقین ہے تو مجھے خدشہ ہے کہ آپ کی روایت کا اختتام یقینی ہے اور اس مقصد کے لیے اسے میری کسی ہمدردانہ رائے کی ضرورت نہیں ہے۔''

کیا واقعی یہ بات افسر کے پلے پڑی تھی؟ نہیں وہ کچھ بھی نہیں سمجھا تھا۔ اس نے پرجوش انداز میں سر ہلایا۔ سرسری طور پر ایک طرف کھڑے مجرم اور سپاہی کو دیکھا۔ وہ دونوں چاولوں کی کھچڑی پر ٹوٹے پڑے

تھے۔ پھر مہم جو کے قریب آیا اور اس کے چہرے کو دیکھے بغیر اس کے کوٹ پر کسی جگہ اپنی نگاہ جما کر مدہم آواز میں بولا۔ ''آپ افسر اعلیٰ کو نہیں جانتے، لیکن میرا یقین کیجیے۔ میں نے یہاں آپ کے اثر و نفوذ کا غلط اندازہ نہیں لگایا۔ جب میں نے سنا کہ آپ بہ نفس نفیس اس کارروائی کو دیکھنے تشریف لا رہے ہیں تو مجھے بہت مسرت ہوئی۔ افسر اعلیٰ نے یہ سارا اہتمام مجھے زد پہنچانے کے لیے کیا ہے۔ لیکن میں صورت حال کو اپنے حق میں بدل دوں گا۔ آپ اس کارروائی کا نظارہ کرنے والوں کی سرگوشیوں اور مشتبہ نگاہوں سے پریشان ہونے کے بجائے جن سے احتراز ممکن نہیں ہے۔ یہاں میری معروضات سن رہے اور اطمینان سے سارے عمل کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یقیناً آپ اپنی رائے قائم کر چکے ہوں گے۔ بالفرض اگر آپ کے ذہن میں کچھ قابل وضاحت سوالات موجود ہیں تو اس کارروائی کو دیکھنے بعد وہ باقی نہ رہیں گے۔ آپ سے استدعا ہے کہ افسر اعلیٰ کے خلاف میری مدد فرمائیں۔''

مہم جو نے اسے ٹوک دیا اور کہا ''میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں؟ ناممکن ہے میں نہ آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں، نہ آپ کو کوئی گزند پہنچا سکتا ہوں۔''

''ہاں آپ ایسا کر سکتے ہیں۔'' افسر نے کہا۔ مہم جو نے واضح طور پر دیکھا کہ افسر نے اپنی مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ ''ہاں آپ کر سکتے ہیں۔'' افسر نے زیادہ اصرار کے ساتھ کہا۔ ''میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے جو ضرور کامیاب ہوگا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی حیثیت کمزور ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ بالفرض یہ مان لیا جائے کہ وہی سچ ہے جو آپ سوچتے ہیں تو پھر بھی روایت کو محفوظ رکھنے کی خاطر یہ ضروری نہیں رہتا کہ آپ کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ آپ غور سے میرا منصوبہ سنیے۔ پہلی بات جو بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آپ اس کارروائی سے متعلق اپنی رائے دینے سے ممکنہ حد تک احتراز کریں۔ جب تک براہ راست آپ سے نہ پوچھا جائے آپ خاموشی اختیار کریں، یا اگر کچھ کہیں بھی تو کوئی مختصر اور رسمی بات کریں۔ مثلاً یہ رائے دیں کہ آپ اس معاملے پر گفتگو نہیں کرنا چاہتے کیونکہ اس طرح آپ تحمل کا دامن چھوڑ بیٹھیں گے یا یہ کہ اگر آپ نے کچھ کہا تو وہ ضرور تلخ ہوگا۔

میں نے آپ سے یہ نہیں کہا کہ آپ جھوٹ بولیں۔ آپ مختصر جوابات دیں۔ جیسے یہ کہ ہاں میں نے تعزیری کارروائی دیکھی ہے یا ہاں مجھے اس بارے میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ بس ایسی ہی کچھ باتیں۔ اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ اسطرح آپ خود کو کسی دباؤ کے زیر اثر آنے سے بچا لیں گے۔ وہ آپ کے الفاظ سے اپنی منشا کے مطابق غلط مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کرے گا۔ انتظامیہ کے دفتر میں تمام افسران کا ایک بڑا اجلاس ہوگا۔ افسر اعلیٰ خود صدارت کرے گا۔ اسے یہ کمال حاصل ہے کہ وہ ایسے اجلاسوں

کو عوامی تقریبات میں بدل دیتا ہے۔ ابن نے غلام گردش تعمیر کی ہے جو ہمیشہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھری رہتی ہے۔ مجھے چار، ناچار ان اجلاسوں میں شرکت کرنا پڑتی ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو، آپ کو اجلاس میں مدعو کیا جائے گا۔ اگر آپ میرے مشورے کے مطابق عمل کریں تو دعوت نامہ فوری التماس میں بدل جائے گا۔ بالفرض اگر چند پراسرار وجوہات کی بنا پر آپ کو مدعو نہیں کیا جاتا تو آپ خود اس کا تقاضا کریں۔ آپ کو وہاں بلا لیا جائے گا۔ کل آپ افسر اعلیٰ کے دفتر میں اس کی خواتین کے ساتھ براجمان ہوں گے۔ آپ کی موجودگی کا یقین کرنے کے بعد وہ اوپر دیکھتا رہے گا۔ وہاں ہونے والے متعدد سطحی اور مضحکہ خیز وقوعات کے بعد، جنھیں صرف حاضرین کو متاثر کرنے کے لیے رونما کیا جاتا ہے، محض سرسری انداز میں ہمارے تعزیری طریقہ کار کو موضوع بحث بنایا جائے گا۔ اگر افسر اعلیٰ خود یہ معاملہ نہیں چھیڑتا یا ایسا کرنے میں سستی برتتا ہے تو میں خود ہی کوئی ایسا اشارہ دوں گا۔ میں کھڑا ہو جاؤں گا اور انہی اطلاع دوں گا کہ سزا دی جا چکی ہے۔

یہ ایک مختصر سا بیان ہوگا۔ ایسا بیان گو غیر اہم ہے لیکن میں ایسا ہی کروں گا۔ افسر اعلیٰ ہمیشہ کی طرح میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ میرا شکریہ ادا کرے گا۔ پھر وہ خود کو روک نہیں پائے گا۔ وہ اس موقع کو استعمال کرے گا۔ اطلاع مل چکی ہے وہ کچھ یوں کہے گا۔ یا اس سے ملتے جلتے الفاظ ہوں گے کہ 'آج سزا دی گئی ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ ایک معروف مہم جو نے سزا کا مشاہدہ کیا ہے جس کی یہاں آمد ہمارے قصبے کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ اس اجلاس میں ان کی موجودگی اس موقع کی اہمیت کو دو چند کرتی ہے۔ کیا ہمیں ان سے درخواست نہیں کرنی چاہیے کہ وہ سزا کے ہمارے روایتی قواعد اور ان پر عمل درآمد کے طریقہ کار پر اپنی رائے کا اظہار کریں؟ قدرتی طور پر عوام اس بات سے اتفاق کے اظہار کے طور پر پرجوش انداز میں تالیاں پیٹیں گے۔

افسر اعلیٰ آپ کے سامنے جھکے گا اور کہے گا۔ ''یہاں موجود افراد کی طرف سے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔'' آپ اٹھ کر سامنے آ جائیں گے۔ اپنے ہاتھ ایسی جگہ رکھیے گا جہاں سبھی دیکھ سکیں۔ بصورت دیگر خواتین اسے پکڑ لیں گی اور آپ کی انگلیاں دبائیں گی۔ آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں میں کیسے اس لمحے کے انتظار کا کرب سہہ پاؤں گا۔ اپنے خطاب کے دوران خود کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد رکھنے کی کوشش کریں اور بآواز بلند سچ بیان کیجیے۔ نشست کے آگے جھک کر چلائیے...... ہاں بے شک چلا کر حتمی اور غیر متزلزل رائے دیجیے۔ شاید آپ ایسا نہیں کرنا چاہیں گے۔ یہ آپ کے مزاج کے موافق نہیں ہے۔ آپ کے ملک میں لوگ شاید ایسے موقعوں پر مختلف رویہ ظاہر کرتے ہوں گے۔ خیر یہی ٹھیک ہے۔ یوں بھی ہمارا مقصد پورا ہو سکتا ہے۔

آپ کھڑے بھی مت ہوں۔ بس چند الفاظ کہیں۔ چاہے سرگوشی میں لیکن جسے نیچے کھڑے افسران سن سکیں۔ اتنا کہنا ہی کافی ہوگا۔ آپ کو یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ عوام میں اس سزا کی طرف داری کا رجحان کم ہے۔

یا چیتھڑے پیسے، شکستہ پٹے اور غلیظ نمدے کے ڈھانے کا ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب خود سنبھال لوں گا۔ آپ یقین کیجیے اگر میری الزام تراشی سے وہ کانفرنس ہال سے بھاگ نہ گیا تو ضرور میں اسے اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دوں گا۔ سابقہ افسر اعلیٰ میں آپ کو عاجز خادم ہوں۔ یہ ہے میرا منصوبہ۔ کیا اسے کامیاب بنانے میں آپ میرا ساتھ دیں گے۔ بے شک آپ میرا ساتھ دیں گے۔ اس سے بڑھ کر آپ کیا چاہیں گے؟"

افسر نے مہم جو کو دونوں بازوؤں سے پکڑا اور گہرے سانس لیتے ہوئے اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں جما دیں۔ اس نے آخری جملہ بلند آواز میں چیخ کر کہا کہ سپاہی اور مجرم دونوں تھرا گئے۔ انہیں کوئی ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ انہوں نے کھانا موقوف کر دیا اور منہ میں موجود نوالے کو چباتے ہوئے مہم جو کو دیکھنے لگے۔ آغاز گفتگو ہی سے مہم جو نے طے کر لیا تھا کہ اسے کیا جواب دینا ہے۔ اسے زندگی میں متعدد بار ایسے حالات کا تجربہ ہوا تھا۔ وہ کسی ابہام کا شکار نہیں تھا۔ وہ ایک معزز اور نڈر انسان تھا۔ سپاہی اور مجرم کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر اسے کچھ ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔

بس ایک لحظہ ٹھہر کر اس نے وہی کچھ کہا جو وہ کہنا چاہتا تھا۔ "نہیں" افسر نے کئی مرتبہ اپنی آنکھیں جھپکائیں۔ "کیا آپ چاہیں گے کہ میں اپنی بات کی وضاحت کروں۔" مہم جو نے کہا۔ افسر نے کوئی لفظ کہے بغیر اثبات میں سر ہلایا۔

"میں اس تعزیری کارروائی کی حمایت نہیں کرتا۔" مہم جو نے کہا "آپ کے مجھے اعتماد میں لینے سے بھی پہلے میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہاں دخل در معقولات کرنا میرا فرض ہے اور کیا میری مداخلت سے صورت حال میں تبدیلی کا کوئی معمولی امکان موجود ہے۔ تب مجھے سمجھ میں آیا کہ مجھے کس سے رجوع کرنا چاہیے، بلاشبہ افسر اعلیٰ سے آپ نے میری اس فیصلے تک پہنچنے میں مدد کی ہے۔ میں آپ کی اس روایت سے مخلصانہ وابستگی سے متاثر ہوا ہوں۔ گو یہ بات میری رائے پر اثر انداز نہیں ہو سکتی ہے۔"

افسر خاموش کھڑا رہا۔ پھر مشین کی طرف مڑا۔ پیتل کی ایک سلاخ اٹھائی اور کچھ پیچھے جھکتے ہوئے ڈیزائنر کا بغور جائزہ لیا۔ جیسے یقین کرنا چاہتا ہو کہ یہ درست حالت میں ہے۔ معلوم ہوتا تھا سپاہی اور مجرم دونوں اصل معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئے تھے۔ مجرم سپاہی کو کچھ اشارے کر رہا تھا لیکن کسے ہوئے پٹوں میں اسے ہر حرکت دشوار معلوم ہو رہی تھی۔ سپاہی اس پر جھکا ہوا تھا۔ مجرم نے اس کے کان میں کچھ سرگوشی کی سپاہی نے اثبات میں سر ہلایا۔

مہم جو افسر تک گیا اور بولا۔ "آپ نہیں سمجھ سکے کہ میرا مطلب کیا تھا۔ میں افسر اعلیٰ سے اس تعزیری عمل سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کروں گا لیکن عوامی اجتماع میں نہیں بلکہ تخلیے میں۔ نہ ہی میرے پاس اتنا

وقت ہے کہ میں کسی اجلاس میں شرکت کر سکوں۔ میں کل علی الصبح یہاں سے چلا جاؤں گا یا کم از کم اپنے جہاز میں سوار ہو چکا ہوں گا۔''

معلوم ہوتا تھا، افسر نے اس کی کوئی بات نہیں سنی ''تو آپ کو یہ طریقہ کار معقول نہیں لگا۔'' اس نے جیسے اپنے آپ ہی سے سوال کیا اور مسکرایا جیسے پختہ کار انسان کسی طفلانہ غیر معقولیت پر مسکراتا اور اپنے تفکر کو مسکراہٹ کی آڑ میں چھپا لیتا ہے۔

''تو پھر وقت آ گیا ہے۔'' آخر اس نے کہا اور معاً چمکتی ہوئی آنکھوں سے مہم جو کو دیکھا جس میں پختہ ارادے کی جھلک موجود تھی۔

''کیا وقت؟'' مہم جو نے بے چینی سے پوچھا۔ افسر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تم آزاد ہو۔'' افسر نے مجرم سے مقامی زبان میں کہا۔ فوری طور پر اس شخص کو یقین نہ آیا۔ ''ہاں تمہیں آزاد کیا جاتا ہے۔'' افسر نے اپنی بات دہرائی۔ پہلی بار مجرم کے چہرے پر حقیقی جذبے کی چمک ابھری۔ کیا واقعی یہ سچ ہے؟ کیا یہ محض افسر کی متلون مزاجی کا ایک رنگ تو نہیں ہے جو ابھی بدل جائے گا؟ کیا اجنبی مہم جو نے اس سے درخواست کی تھی؟ یہ سب کیا تھا؟ اس کے چہرے سے یہ سارے سوالات پڑھے جا سکتے تھے۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔ یہ جو کچھ بھی ہو، اگر واقعی ایسا ہی ہے تو اسے آزاد ہو جانا چاہیے۔ اس نے سیر اون میں خود کو آزاد کرنے کے لیے ہاتھ پیر مارے۔

''تم ان پٹیوں کو توڑ دو گے۔'' افسر چلایا۔ ''خاموش لیٹے رہو۔ ہم ابھی کھولتے ہیں۔'' پھر سپاہی کو مدد کا اشارہ کر کے وہ اسے کھولنے لگا۔ مجرم بغیر بولے آپ ہی آپ ہنسا۔ کبھی چہرہ بائیں جانب افسر کی طرف موڑ لیتا۔ کبھی دائیں جانب سپاہی کی طرف اور کبھی مہم جو کی طرف۔

''اسے باہر نکالو۔'' افسر نے حکم دیا۔ سیر اون کی وجہ سے اس عمل میں احتیاط ضروری تھی۔ مجرم اپنے اتاولے پن کی وجہ سے اپنی کمر زخمی کر چکا تھا۔ اس کے بعد افسر نے اسے قریب قریب فراموش کر دیا۔ وہ مہم جو کے پاس واپس گیا۔ اپنا وہی مختصر چرمی تھیلا نکالا۔ اس میں کاغذوں کو کھنگالا اور ایک کاغذ باہر نکالتے ہوئے مہم جو کو دکھایا اور کہا ''اسے پڑھیے۔'' وہ بولا۔

''میں نہیں پڑھ سکتا۔'' مہم جو نے جواب دیا۔ ''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھ سے یہ تحریر نہیں پڑھی جا سکتی۔''

''اسے غور سے دیکھیے۔'' افسر نے کہا اور مہم جو کے قریب آ گیا تا کہ اسے پڑھنے میں دقت نہ ہو۔ وہ پھر بھی کچھ نہ پڑھ سکا تو اسے پڑھنے میں سہولت دینے کے لیے اپنی چھوٹی انگشت کو کاغذ کی سطح سے کچھ فاصلے

پر رکھتے ہوئے جیسے چھونے سے تحریر شکستہ ہونے کا خدشتہ تھا، ایک خاص لفظ پر ٹھہرا لیا۔ مہم جو نے افسر کی خوشنودی کی خاطر پڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ سمجھ پایا۔ افسر نے حروف تہجی الگ الگ کر کے ادا کیے اور پھر تمام الفاظ پڑھے۔ ''عدل کرو۔ یہی لکھا ہے۔ اب آپ اس کو پڑھ سکیں گے۔'' مہم جو مزید آگے جھک گیا جس سے افسر کو خدشہ محسوس ہوا کہ وہ تحریر کو چھو لے گا۔ اس نے کاغذ مزید پرے ہٹا لیا۔ مہم جو خاموش رہا۔ واضح تھا کہ وہ ہنوز کچھ نہیں پڑھ سکا تھا۔

''عدل کرو! یہی لکھا ہے۔'' افسر نے پھر سے کہا۔

''شاید یہی لکھا ہو،' مہم جو نے کہا'' مجھے آپ پر اعتماد کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' افسر نے کسی حد تک مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ وہ کاغذ کے ٹکڑے کو ساتھ لیے زینے پر چڑھ گیا۔ بہت احتیاط کے ساتھ اس نے اسے ڈیزائنر کے اندر رکھا۔ معلوم ہوتا تھا وہ تمام کھانچے دار پہیوں کی ترکیب بدل رہ تھا۔ یہ ایک دقت طلب کام تھا۔ وہاں بہت چھوٹے پہیے بھی تھے۔ کبھی کبھار افسر کا سر مکمل طور پر ڈیزائنر کے اندر غائب ہو جاتا۔ مہم جو نیچے کھڑا مخل ہوئے بغیر اس کارروائی کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کی گردن اکڑ گئی اور آنکھیں آسمان پر چمکتے سورج کی شعاعوں سے بھینچ گئی تھیں۔

مجرم اور سپاہی اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ سپاہی نے گڑھے سے مجرم کی قمیض اور پاجامے کو سنگین کی نوک سے باہر نکالا۔ قمیض کراہت انگیز حد تک غلاظت میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اسے بالٹی میں پانی سے دھویا۔ مجرم نے قمیض اور پاجامہ پہن لیا تو سپاہی اور وہ دونوں قہقہہ مار کر ہنسے۔ لباس پشت سے چاک تھا۔ جیسے یہ فرض کرتے ہوئے کہ وہ سپاہی کو محظوظ کرے، مجرم اس کے سامنے کٹے پھٹے لباس میں اپنے قدموں پر پھرکی کی طرح گھومنے لگا۔ سپاہی ہنستے ہوئے زمین پر گھٹنے مار کر لوٹنے لگا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ دو معزز افراد کی موجودگی کے پیش نظر اپنی ہنسی کو دبانے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔

خود ہی سارا کام کرنے کے بعد افسر نے مسکراتے ہوئے مشین کے پرزوں کا ایک بار پھر تفصیلی جائزہ لیا۔ ڈیزائنر کا ڈھکنا بند کیا جو اب تک کھلا ہوا تھا۔ پھر وہ نیچے کودا۔ پہلے گڑھے اور پھر مجرم کو دیکھا۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ کپڑے گڑھے میں سے نکال لیے گئے تھے، وہ ہاتھ دھونے کے لیے پانی کی بالٹی تک گیا۔ اسے غلاظت سے بھرا ہوا دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں ابھریں۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو ریت میں گھسیڑ دیا۔ ہاتھ صاف کرنے کا یہ متبادل طریقہ اسے پسند نہیں تھا، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی سرکاری جیکٹ کے بٹن کھولنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے دونوں نسوانی رومان، جنھیں اس نے کالر کے نیچے جما رکھا تھا، اس کے ہاتھوں میں آن گرے۔

''یہ تمہارے ہیں۔'' اس نے کہا اور رومال مجرم کے طرف اچھال دیا۔ پھر مہم جو کو وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ خواتین نے اسے تحفتاً دیئے تھے۔'' پھر محبت کے ساتھ انگلیوں کو جیکٹ پر لگی جھالر پر پھیرا اور پھندے کو چھوا۔ لیکن یہ اہتمام اور لگاؤ تب بناوٹی معلوم ہوا کہ اس نے کپڑے اتارتے ہی انہیں جھٹکے سے گڑھے میں پھینک دیا۔ وردی کا آخری حصہ اس کی مختصر تلوار اور پیٹی تھی۔ اس نے نیام سے تلوار نکالی۔ اسے توڑا۔ پھر ٹکڑوں کو اکٹھا کیا۔ پیٹی اور نیام کو اٹھایا اور یوں نفرت کے ساتھ انہیں گڑھے میں پھینکا کہ ان کے زمین سے ٹکرانے کی آواز پیدا ہوئی۔

اب وہ بالکل برہنہ تھا۔ مہم جو اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ وہ خاموش تھا اور جانتا تھا کہ کیا ہو رہا تھا؟ لیکن وہ افسر کو کسی کام سے روکنے کا مجاز نہیں تھا۔ اگر یہ تعزیری طریقہ کار جو افسر کو بہت مرغوب تھا، اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا تو یہ ممکنہ طور پر خود اسی کی دخل اندازی کے باعث ہو رہا تھا۔ افسر جو کچھ کر رہا تھا، درست ہی تھا۔ ایسی صورت حال میں مہم جو اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سپاہی اور مجرم ابتداً نہیں سمجھ پائے کہ کیا ہو رہا تھا۔ بلکہ شروع میں تو انہوں نے اس طرف دیکھا بھی نہیں۔ مجرم رومال واپس ملنے پر شاداں تھا۔ تاہم اس کی خوشی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ سپاہی نے فوری اور غیر متوقع جھٹکے سے انہیں اس سے چھین لیا۔ مجرم انہیں پیٹی کے نیچے سے کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں سپاہی نے انہیں اڑس رکھا تھا۔ سپاہی مزاحم تھا۔ وہ آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔

افسر کے مکمل برہنہ ہو جانے پر وہ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ خاص طور پر مجرم اس خیال سے ششدر معلوم ہوتا تھا کہ کچھ بڑی تبدیلی ہونے والی ہے۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہونے جا رہا تھا وہ اب افسر کے ساتھ ہوگا۔ شاید یہی اختتام ہے۔ ظاہر ہے اجنبی مہم جو نے ہی اس تبدیلی کا فرمان جاری کیا تھا۔ یہ ایک انتقامی کارروائی تھی۔ ایک کشادہ اور خاموش مسکراہٹ کے چہرے پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔

افسر مشین کی طرف مڑا۔ یہ بات پہلے سے تسلیم شدہ تھی کہ وہ مشین کو بہتر طور پر جانتا ہے، لیکن اب یہ بات بجائے خود ایک معمہ تھی کہ وہ کیسے اسے چلائے گا۔ اس نے محض سیرادن کو چھوا تو وہ پہلے بلند ہوئی اور پھر کئی ایک مرتبہ نیچے آ گئی۔ حتیٰ کہ اس کے موافق بلندی پر آ کر ٹھہر گئی۔ اس نے بستر کو چھوا اور وہ مرتعش ہو گیا۔ ڈھانا اس کے منہ تک آ گیا۔ یوں لگا جیسے افسر اسے منہ میں لینے سے ہچکچا رہا ہو۔ لیکن ایسا دو ایک لمحے کے لیے ہی تھا۔ فوراً ہی اس نے اسے قبول کر لیا۔ ہر شے تیار تھی۔ صرف پٹے اطراف میں نیچے لٹک رہے تھے۔ تاہم ان کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ افسر کو باندھنا ضروری نہیں تھا۔ مجرم نے کھلے پٹوں کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں افسر کو پٹوں سے باندھنے کے لیے آگے بڑھے۔

افسر نے ڈیزائنر کو چلانے والے بیرم کو دبانے کے لیے اپنا ایک پیر باہر لٹکا لیا تھا۔ دونوں کو اپنی طرف

آتے دیکھا تو پیر اندر کھینچ لیا اور بندھے جانے کے لیے تیار لیٹ گیا۔ اب وہ بیرم کو دبا نہیں سکتا تھا۔ نہ ہی مجرم اور سپاہی کے لیے ممکن تھا کہ وہ اسے تلاش کریں جبکہ مہم جو کسی بھی کام میں دخل نہ دینے کے ارادے پر اٹل تھا۔ لیکن یہ ضروری بھی نہیں تھا کیونکہ جونہی اسے پٹوں سے باندھا گیا مشین خود بخود چلنے لگی۔ بستر تھرتھرایا اور سوئیاں جلد پر سانپ کی طرح حرکت کرنے لگیں۔ سیر اوپر نیچے چلتا ہوا کام کرنے لگا۔ اس کارروائی کو بغور دیکھتے ہوئے اچانک مہم جو کو خیال آیا کہ کچھ دیر پہلے تک ڈیزائنر کا ایک پہیہ بہت چرچرا رہا تھا، لیکن اب ہر شے خاموش تھی۔ معمولی سی کھڑکھڑاہٹ بھی مشین میں سے سنائی نہیں دیتی تھی۔

مشین خاموشی سے کام کر رہی تھی۔ سبھی نے اس میں دلچسپی کھو دی۔ مہم جو نے سپاہی اور مجرم کو بغور دیکھا۔ مجرم پہلے سے زیادہ پرجوش معلوم ہوتا تھا۔ مشین کے ہر پرزے میں اسے دلچسپی تھی۔ کبھی وہ آگے جھک جاتا اور کبھی پنجوں کے بل کھڑا ہو جاتا۔ اس بیچ میں وہ اپنی تنی ہوئی انگشت کے اشارے سے دونوں کو مختلف تفصیلات سے آگاہ کرتا۔ اس بات نے مہم جو کو برہم کیا۔ وہ اس کارروائی کے اختتام تک وہاں ٹھہرنے کا خواہاں تھا۔ لیکن دونوں کا رویہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

''اپنے گھروں کو جاؤ۔'' اس نے کہا۔ سپاہی واپس جانے پر آمادہ تھا لیکن مجرم کو یہ فرمان بھی ایک سزا معلوم ہوا۔ ہاتھ باندھ کر اس نے وہاں ٹھہرنے کی اجازت طلب کی۔ مہم جو نے سرنفی میں ہلایا اور اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ مجرم گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ گیا۔ مہم جو سمجھ گیا کہ محض حکم دینا کافی نہیں ہوگا۔ وہ انہیں پکڑنے اور دھکے مار کر دور بھگانے کے بارے میں سوچ رہا تھا جب اسے ڈیزائنر میں کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ اس نے اوپر دیکھا۔ کیا کھانچے دار پہیہ خراب ہو گیا تھا؟ لیکن یہ اور ہی معاملہ تھا۔

آہستگی سے ڈیزائنر کا ڈھکنا اوپر اٹھا اور پورا کھل گیا۔ پہیے کے دندانے ظاہر ہوئے اور بلند ہونے لگے۔ جلد ہی پورا پہیہ اوپر اٹھ آیا جیسے کوئی انجانی قوت ڈیزائنر کو بھینچ رہی تھی اور پہیے کے لیے اس میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ ڈیزائنر کے آخری سرے تک پہیہ اوپر اٹھتا چلا گیا اور پھر سیدھا لیٹ گیا۔ فوراً بعد دوسرا پہیہ ظاہر ہوا جس کے پیچھے کئی دوسرے بھی تھے۔ لگتا تھا ڈیزائنر اندر سے بالکل خالی ہو رہا تھا۔ پہیوں کا ایک جمگھٹا منظر پر ابھرتا، پھر گرتا اور ریت پر ٹھیلتا ہوا لیٹ جاتا۔ اس منظر نے مجرم کے ذہن سے مہم جو کا فرمان بالکل محو کر دیا۔ وہ دندانے دار پہیوں کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ سپاہی کو بھی مدد کے لیے بلاتا لیکن جلد ہی کسی خوف سے ہاتھ کھینچ لیتا۔ ایک دوسرا پہیہ لڑھکتا ہوا اس کی طرف بڑھتا اور اسے خوفزدہ کر دیتا۔

مہم جو سخت ذہنی اذیت میں تھا۔ مشین ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ اس نے افسر کے قریب جانے کے

بارے میں سوچا جواب اس کی طرف دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ لیکن اس کی توجہ کو لڑھکتے ہوئے دندانے دار پہیوں نے اپنی جانب منعطف کر لیا تھا۔ ڈیزائنر سے آخری پہیہ بھی نکل گیا۔ وہ سیراون پر جھکا۔ اسے یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ سیراون گود نہیں رہی تھی۔ بلکہ سوئیاں جسم میں اندر تک کھبی ہوئی تھیں۔ بستر جسم کو الٹ پلٹ نہیں رہا تھا بلکہ سوئیوں کے سامنے تھرتھراتے ہوئے اسے اوپر کی طرف اٹھا دیتا۔ مہم جو نے مشین کو بند کر دینے کے بارے میں سوچا۔ یہ سزا نہیں تھی بلکہ صریحاً ایک قتل تھا۔ اس نے ہاتھوں کو پھیلایا۔ اسی لمحے سیراون بلند ہوئی اور ایک طرف گر گئی جیسا عموماً بارہویں گھنٹے میں ہوتا تھا۔ خون سیکڑوں سوراخوں سے بہہ رہا تھا۔ پانی کی پھوار اسے صاف نہیں کر رہی تھی کیونکہ ٹونٹیوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کارروائی کا آخری عمل بھی ممکن نہیں ہو سکا۔ جسم لمبی سوئیوں سے چھوٹ کر گرنے کے بجائے گڑھے کے اوپر ان کے ساتھ ٹنگا رہا۔ سیراون نے پہلے والی حالت میں مڑنے کی کوشش کی لیکن وہ جسم کے بوجھ سے ہل نہیں سکتی تھی۔ سو وہ اسی جگہ گڑھے کے اوپر رہی۔

''ادھر آؤ۔ میری مدد کرو۔'' مہم جو نے ان دونوں سے کہا اور پھر خود ہی افسر کے پاؤں پکڑے۔ دونو نے دوسری طرف سے افسر کا سر تھام لیا۔ اس طرح اسے سوئیوں سے نجات دلائی جا سکتی تھی۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے۔ مہم جو کو خود ان کے پاس جانا اور انہیں افسر کے سر کی طرف دھکیلنا پڑا۔ تب غیر ارادی طور پر اس کی نگاہ لاش کے چہرے پر پڑی۔ یہ ایک تازہ انسان کا چہرہ تھا۔ اس پر گزشتہ سزا کا شائبہ تک نہ تھا۔ جو اذیت اس مشین سے دوسروں کو ملتی تھی، افسر اس سے بالکل محفوظ رہا تھا۔ ہونٹ مضبوطی سے باہم پیوست تھے۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور نگاہ ویسے ہی پر سکون اور ہموار تھی جیسے زندہ انسان کی ہوتی ہے۔

جونہی مہم جو سپاہی اور پیچھے پیچھے آتے ہوئے مجرم کے ساتھ آبادی کے ابتدائی گھروں تک پہنچا سپاہی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں چائے خانہ ہے۔''

یہ گھر کی نچلی منزل میں واقع تھا۔ اس کی چھتیں او دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو چکی تھی۔ یہ چائے خانہ لمبائی کے رخ پر سڑک پر کھلتا تھا۔ یہ گھر آبادی کے دوسرے گھروں سے جو انتظامیہ کے عالیشان ہیڈ کوارٹر تک پھیلے ہوئے اور انتہائی شکستگی کا منظر پیش کر رہے تھے، مختلف نہیں تھا۔ مہم جو کو اس میں تاریخی قدامت کا احساس ہوا۔ اسے گزرے ہوئے دن یاد آئے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے پیچھے چلتا ہوا اس کے قریب گیا۔ اس نے سرد اور بھاری ہوا کو محسوس کیا جو اندر کہیں سے آ رہی تھی۔ خالی میزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سپاہی نے کہا ''وہ بڑھیا یہاں دفن ہے۔ پادری نے اسے گرجا گھر کے صحن میں دفن کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ تب۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے کہاں دفن کیا جائے۔ آخر یہاں قبر بنائی گئی۔ افسر نے آپ کو اس بارے میں کچھ

نہیں بتایا ہوگا۔ یہ واقعی ایسی بات ہے جس پر شرمندگی ہوتی ہے۔ اس نے کئی بار رات کو چھپ کر بوڑھے کو کھود نکالنے کی کوشش کی لیکن ہر بار پکڑا گیا۔''

''قبر کہاں ہے؟'' مہم جو نے پوچھا۔ اسے سپاہی کی کسی بات پر یقین نہیں تھا۔ فوراً ہی سپاہی اور مجرم دونوں بازو پھیلائے ایک طرف بھاگے۔ وہ مہم جو کو عقبی دیوار کی طرف لے گئے جہاں چند گاہک میزوں کے گرد بیٹھے تھے۔ وہ سب گودی کے مزدور اور مختصر چمکتی ہوئی بھاری داڑھیوں والے مضبوط انسان تھے۔ کسی نے جیکٹ نہیں پہنی ہوئی تھی۔ ان کی قمیض پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ غریب اور عاجز لوگ تھے۔ جونہی مہم جو قریب گیا ان میں سے چند ایک کھڑے ہو گئے اور دیوار سے لگ کر اسے تکنے لگے۔

ایک سرگوشی سی اس کے گرد پھیلی۔ ''یہ قبر دیکھنا چاہتا ہے۔'' انہوں نے چند میزوں کو ایک طرف ہٹایا۔ وہاں نیچے ایک کتبہ موجود تھا۔ یہ اتنا چھوٹا تھا کہ میز کے نیچے چھپ گیا۔ اس پر باریک الفاظ میں کچھ لکھا تھا۔ مہم جو کو اسے پڑھنے کے لیے گھٹنوں کے بل جھکنا پڑا۔ لکھا تھا'' یہاں سابقہ افسر اعلیٰ آسودہ خاک ہے۔ اس کے طرفداروں نے جواب بے نام ہو چکے ہوں گے، یہ قبر بنائی اور کتبہ لگایا۔ یہ پیشین گوئی کی جاتی ہے کہ ایک مخصوص عرصہ بعد افسر اعلیٰ پھر سے جی اٹھے گا اور کالونی کی بہبود کے لیے اس گھر سے اپنے طرف داروں کی رہنمائی کرے گا۔ یقین پختہ رکھو اور انتظار کرو۔

یہ تحریر پڑھ کر افسر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دیکھا وہاں موجود لوگ مسکرا رہے تھے جیسے انہوں نے بھی یہ تحریر پڑھ لی تھی۔ انہیں یہ سب کچھ مضحکہ خیز لگتا تھا۔ وہ اس سے توقع کر رہے تھے کہ وہ بھی ان سے اتفاق کرے اور کتبے کی تحریر کا ٹھٹھہ اڑائے۔ مہم جو نے انہیں نظر انداز کیا۔ چند سکے ان میں تقسیم کیے۔ میزوں کے دوبارہ قبر کے اوپر رکھے جانے تک وہیں کھڑا رہا۔ پھر چائے خانہ سے نکل کر بندرگاہ کی طرف چل پڑا۔ سپاہی اور مجرم کو چائے خانہ میں چند واقف کار مل گئے جنہوں نے انہیں روک لیا۔ لیکن جلد ہی وہ ان سے اپنی پنڈ چھڑا کر بھاگے۔ انہوں نے مہم جو کو جالیا جو لمبے لمبے قدم اٹھاتا کشتیوں تک جاتی طویل سیڑھی کے نصف میں پہنچا تھا۔ شاید وہ اسے آخری لمحے تک مجبور کرنا چاہتے تھے کہ انہیں ساتھ لے چلے۔ وہ دخانی جہاز تک پہنچنے کے لیے ایک کشتی بان سے معاملہ طے کر رہا تھا۔ وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھے۔ لیکن جب تک وہ سیڑھیوں سے نیچے اترتے مہم جو کشتی میں سوار ہو چکا تھا۔ کشتی بان کشتی کو دھکیلتا ہوا ساحل سے دور لے گیا۔ وہ کشتی میں کود سکتے تھے لیکن مہم جو نے کشتی کے فرش سے ایک موٹی گانٹھ دار لٹھا اٹھائی اور اسے لہراتے ہوئے انہیں دھمکایا اور کشتی میں چھلانگ لگانے سے باز رکھا۔

☆☆

نجیب محفوظ
ترجمہ: محمود احمد قاضی

ہاتھ کی صفائی

وقت آ گیا ہے کہ تم کار آمد آدمی بنو۔ ماں نے مجھ سے کہا اور ساتھ ہی اپنی جیب میں ہاتھ سرکاتے ہوئے کہنے لگی۔ یہ 'پیاسترا' لو اور جا کر تھوڑا سا 'لوبیا' لے آؤ۔ دیکھو راستے میں کھیل کود میں مت لگ جانا اور ٹریفک سے بھی بچنا۔

میں نے تھالی لی۔ کھڑاویں پہنیں اور ایک دُھن گنگناتا ہوا چل پڑا۔ لوبیا بیچنے والے کے پاس لوگوں کا ہجوم تھا۔ میں نے انتظار کیا اور تب مجھے اس سنگ مرمر کی میز تک جانے کا راستہ ملا۔

جناب مجھے ایک پیاسترا کے برابر لوبیا چاہیے، میں نے چیخنے کے انداز میں کہا۔

اس نے فوراً پوچھا، خالی لوبیا؟ تیل یا گھی کے ساتھ؟

میں کوئی جواب نہ دے پایا تو اس نے بے رخی سے کہا جاؤ کسی اور کو آنے دو۔

میں بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا اور شکست خوردہ گھر کو لوٹا۔

''ہوں۔ خالی تھالی کے ساتھ لوٹ آئے۔ شریر لڑکے تم نے کیا کیا۔ لوبیا گرا دیا، 'پیاسترا' گم کر بیٹھے''
ماں مجھ پر چلائی صرف لوبیا تیل یا گھی کے ساتھ چاہیے تھا۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں میں نے احتجاج کیا۔

احمق ہر روز صبح کے وقت تم کیا کھاتے ہو؟

مجھے نہیں معلوم۔

نکمے آدمی اسے کہو تیل کے ساتھ لوبیا۔

میں اس شخص کے پاس پہنچا اور کہا جناب کیا 'پیاسترا' کا لوبیا تیل کے ساتھ۔

اس نے نہایت عجلت کے انداز میں تیوری چڑھا کر پوچھا السی کا تیل، اخروٹ کا تیل، یا زیتون کا تیل؟

میں حیران رہ گیا اور مجھ سے کوئی جواب نہ بن پایا۔ کسی اور کے لیے جگہ چھوڑو بھئی، وہ چلایا۔

میں غصے میں تپا ہوا ماں کے پاس پہنچا تو وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ تم پھر خالی ہاتھ واپس

آ گئے۔ نہ لوبیا نہ تیل۔
السی کا تیل، اخروٹ کا تیل یا زیتون کا تیل۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں، میں نے غصے سے کہا۔
تیل کے ساتھ لوبیے کا ملاپ ہوتا ہے السی کے تیل کے ساتھ۔
اب مجھے یہ کیسے معلوم ہوتا۔
تم نکمے ہو اور وہ ایک تکلیف دینے والا شخص ہے۔ اسے کہو کہ لوبیا السی کے تیل کے ساتھ۔
اب مجھے کیا پتا تھا۔
میں جلدی سے واپس ہوا اور ابھی دوکان سے کچھ دوری پر ہی تھی کہ میں نے اس آدمی سے کہا جناب لوبیا السی کے تیل کے ساتھ۔
اس نے کرچھے کو تیل والے برتن میں داخل کرتے ہوئے کہا پیاستر کاؤنٹر پر رکھ دو۔
میں نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا مگر پیاستر وہاں نہیں تھا۔ میں نے پریشانی کے عالم میں تلاش کیا۔ میں نے جیب کو باہر کی طرف الٹ دیا لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔ آدمی نے بے زاری کے ساتھ خالی کرچھا پیچھے ہٹایا، تم نے 'پیاستر' گم کر دیا۔ تم قابل اعتماد لڑکے نہیں ہو۔
مسئلہ کھڑا مت کرو اور کسی دوسرے کے لیے جگہ خالی کرو۔
میں خالی تھالی کے ساتھ ماں کے پاس لوٹا۔
افسوس۔ تم بے وقوف لڑکے۔ یعنی پیاستر۔ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟
وہ میری جیب میں نہیں تھا۔
کیا تم نے اس کی مٹھائی خرید لی؟
میں قسم کھاتا ہوں میں نے ایسا نہیں کیا۔
تم نے کیسے اسے گم کیا؟
میں نہیں جانتا۔
کیا تم قرآن کی قسم کھا سکتے ہو کہ تم نے اس کے عوض کچھ نہیں خریدا۔
میں قسم کھاتا ہوں۔
کیا تمہاری جیب میں سوراخ ہے؟
نہیں۔
ہوسکتا ہے تم نے پہلی مرتبہ یا دوسری مرتبہ اسے اس شخص کو دے دیا ہو۔

ہوسکتا ہے۔

کیا تمہیں کسی بھی بات کا یقین نہیں۔

مجھے بھوک لگی ہے۔

ماں نے راضی بہ رضا ہو کر ہاتھوں کو تالی کے انداز میں جوڑا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ وہ بولی میں تمہیں ایک اور پیاسترد دوں گی لیکن یہ میں تمہاری گولک سے نکالوں گی اور اگر اب تم خالی تھالی کے ساتھ واپس ائے تو میں تمہاری گردن توڑ دوں گی۔

میں ایک مزیدار ناشتے کا خواب دیکھتا ہوا دوڑنے کے انداز میں روانہ ہوا۔ وہ موڑ جہاں لوبیا بیچنے والا بیٹھا تھا وہاں میں نے جشن کے انداز میں خوشی کی آوازیں نکالتے بچوں کا ایک ہجوم دیکھا۔ میں نے اپنے پاؤں کو گھسیٹا کیونکہ میرا دل ان کی طرف کھنچتا تھا۔ کم از کم تھوڑی دیر کے لیے سرسری طور پر ہی مجھے ان کو دیکھ لینا چاہیے۔ میں ان میں گھس گیا اور مجھے لگا کہ ہاتھ صفائی دکھانے والا سیدھا میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک مدہوش کردینے والی خوشی مجھ پر چھا گئی۔ میں اپنے آپ میں بالکل نہیں رہا تھا۔ میں اپنے پورے حواس کے ساتھ خرگوشوں، انڈوں، سانپوں اور رسوں کے کرتبوں میں محو ہو گیا۔ جب وہ شخص پیسے اکٹھے کرنے کے لیے آیا تو میں بڑبڑاتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ ''میرے پاس تو پیسے ہیں ہی نہیں'' وہ وحشیانہ طریقے سے میری طرف بڑھا اور میں نے بڑی مشکل سے اپنے کو بچایا۔ میں دوڑ پڑا۔ اس کے مکے کی ضرب سے میری کمر تقریباً ٹوٹ ہی چلی تھی۔ تاہم جب میں لوبیا بیچنے والے کی طرف جارہا تھا تو بے انتہا خوش تھا۔

ایک 'پیاستر' کا لوبیا السی کے تیل کے ساتھ جناب، میں نے کہا۔

وہ کوئی حرکت کیے بغیر میری جانب دیکھتا رہا میں نے اپنا سوال دہرایا۔

مجھے تھالی دو، اس نے غصے سے مطالبہ کیا۔

''تھالی'' تھالی کہاں تھی؟ کیا میں نے اسے دوڑتے ہوئے گرادیا تھا؟ کہیں اس شعبدہ باز نے تو اس کے ساتھ ہاتھ کی صفائی نہیں دکھادی تھی۔؟

لڑکے، تم بالکل پاگل ہو۔

میں واپس مڑا اور اپنے راستے پر چلتے ہوئے کھوئی ہوئی تھالی کو تلاش کرنے لگا۔ جہاں شعبدہ باز موجود تھا اس جگہ کو میں نے خالی پایا لیکن بچوں کی آوازیں مجھے ایک قریبی گلی میں اس تک لے گئیں۔ میں دائرے کے گرد گھوما۔ جب شعبدہ باز نے مجھے دیکھا تو وہ دھمکی آمیز لہجے میں چیخا ''پیسے دو ورنہ یہاں سے چل دو۔''

وہ تھالی، میں مایوسی سے بولا۔

ننھے شیطان، ''کون سی تھالی؟''

مجھے میری تھالی واپس کرو۔''

یہاں سے'' دفعہ ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں سانپوں کی غذا بنا دوں گا۔''

اس نے تھالی چرالی تھی۔ بہرحال خوف کے مارے میں اس کی نظروں سے دور ہو گیا اور رونے لگا۔ جب بھی کوئی راہ گیر مجھے روتے ہوئے پا کر مجھ سے رونے کی وجہ پوچھتا تو میں کہتا ''شعبدہ باز نے میری تھالی غائب کر دی ہے۔'' جب میں اس مصیبت میں گھرا ہوا تھا تو ایک آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''یہاں آؤ اور نظارہ کرو۔''

میں نے اپنے پیچھے دیکھا ایک سیر بین والے نے وہاں اپنا اڈا جمایا ہوا تھا۔ میں نے درجنوں بچوں کو دیکھا جو ''سیر بین'' والے ڈبے کی طرف بڑھ رہے تھے اور باری باری موکھے کے سامنے کھڑے ہو کر اندر جھانک رہے تھے اور وہ شخص ساتھ ساتھ تصاویر پر تبصرہ بھی کرتا جا رہا تھا۔ ''آؤ، بہادر بانکا دیکھو اور عورتوں میں سب سے زیادہ خوبصورت عورت زینت البنات دیکھو۔'' اپنے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے، اور شعبدہ باز اور تھالی کو مکمل طور پر بولتے ہوئے میں نے شوق کے ساتھ اس ڈبے کی طرف دیکھا۔ میں اپنی خواہش پر قابو نہ پاسکا۔ میں نے 'پیاسٹر' ادا کیا اور اس لڑکی سے آگے جا کر موکھے کے اندر جھانکنے لگا وہ ایک دوسرے موکھے کے آگے کھڑی تھی۔ وہاں ہماری نظروں کے سامنے خوش کن تصویری کہانیاں تیر رہی تھی۔ جب میرے ہوش وحواس بحال ہوئے تو میں نے محسوس کیا کہ میں 'پیاسٹر' اور تھالی دونوں چیزوں کو بھول چکا تھا اور شعبدہ باز کا کوئی پتہ نہیں تھا تاہم میں نے نقصان پر دھیان نہیں دیا اور اس لیے کہ میں تصاویر کی شان، محبت اور جرأت کے کارناموں سے مغلوب ہو چکا تھا۔ میں اپنی بھوک بھول گیا تھا اور گھر واپس پہنچنے پر جو کچھ میرے ساتھ ہونے والا تھا اسے بھی میں بھول چکا تھا۔ میں چند قدم پیچھے ہٹا اور میں نے اس قدیم دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی جہاں کسی زمانے میں آفیسر مالیات کا دفتر اور آفس اعلیٰ کا گھر ہوا کرتا تھا اور پھر میں جاگتی آنکھوں سے سپنا دیکھنے لگا۔ بہت دیر تک میں شان وشوکت، زینت البنات اور غول بیابانی کے خواب دیکھتا رہا۔ اسی خواب میں اپنی حرکات وسکنات کے توسط سے کیس اپنے لفظوں کو معانی دینے کے لیے اونچی آواز میں بولتا رہا۔ میں نے تصوراتی نیزے سے حملہ کرتے ہوئے کہا ''او غول بیابانی یہ تو سیدھا تمہارے دل میں۔''

اور اس نے اپنے گھوڑے پر اپنے پیچھے بیٹھائی ہوئی زینت البنات کو اوپر اٹھایا۔ ایک ملائم آواز پیچھے سے اُبھری۔

میں نے اپنے دائیں طرف دیکھا یہ وہی لڑکی تھی جو اس تفریحی پروگرام میں میرے قریب موجود رہی

تھی۔اس نے گندہ لباس پہن رکھا تھا اس کی کھڑاویں رنگ دار تھیں وہ اپنے بالوں کی ایک لمبی لٹ سے کھیل رہی تھی اس کے دوسرے ہاتھ میں سرخ اور سفید رنگ کی وہ میٹھائیاں تھیں جنہیں لڑکیوں کی خاص پسند کہا جاتا ہے اور جنہیں وہ اطمینان سے چوسے جارہی تھی ہماری نظریں آپس میں ملیں اور میرا دل جاتا رہا۔

''آؤ کہیں بیٹھتے ہیں اور ستاتے ہیں'' میں نے اس سے کہا۔

اس نے میری تجویز پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ میں نے اس کا بازو تھام لیا اور ہم پرانی دیوار کے دروازے سے نکل کر باہر آ گئے اور سیڑھی دار راستے کے ایک مقام پر جا بیٹھے۔ وہ سیڑھی دار راستہ اوپر کی طرف بڑھتا ہوا ایک ایسے پلیٹ فارم پر جا کر ختم ہوتا تھا کہ جس کے پیچھے سے نیلا آسمان اور مینار دیکھے جا سکتے تھے۔ ہم خاموشی سے ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے۔ میں نے اس کے ہاتھ کو دبایا ہم کو نہیں معلوم تھا کہ کیا کہا جائے اس لیے خاموش ہی بیٹھے رہے۔

میں ایسے احساسات کے تجربے سے گزر رہا تھا جو نئے عجیب اور مبہم تھے۔ اپنا چہرہ اس کے قریب کرتے ہوئے میں نے اس کے بالوں کی فطری خوشبو کو سونگھا جس میں مٹی کی مہک اور مٹھائیوں کی خوشبو ملی جلی تھی۔اس کے سانسوں کی خوشبو بھی شامل تھی۔ میں نے اس کے ہونٹوں کو چوما۔ میں نے اپنے تھوک کو نگلا جس میں اسی ''لڑکیوں کی خاص پسند'' والی مٹھائیوں کو مٹھاس تحلیل ہو چکی تھی۔ میں نے اپنا بازو اس کی گردمیں حمائل کیا اس کی خاموشی برقرار رہی اور میں اس کے گالوں اور لبوں کے بوسے لیتا رہا۔ جب میں نے اس کے ہونٹوں کو چوما تو یہ غیر متحرک ہو گئے لیکن فوراً ہی دوبارہ ان مٹھائیوں کو چومنے میں لگ گئے۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ اب ہم کو اٹھ جانا چاہیے تھا۔ میں نے بے قراری سے اس کا بازو تھالیا۔

''بیٹھ جاؤ'' میں نے کہا۔

''میں جارہی ہوں'' اس نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔

کہاں......؟ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''دائی ام علی کے ہاں'' اور نیچے کی طرف اس نے اس مکان کی جانب اشارہ کیا جس کی نچلی منزل میں لوہار کی ایک چھوٹی سی دکان بھی تھی۔

''کیوں''۔

اسے کہنے کے لیے کہ وہ جلدی سے آئے۔

''کیوں''؟

میری والدہ گھر پر دروازے سے چلارہی ہے۔اس نے مجھے کہا تھا کہ میں دائی ام علی کے پاس جاؤں

اور جلدی سے اسے اپنے ساتھ لے کر آؤں۔''

''کیا تم اس کے بعد واپس آؤ گی؟''

اس نے سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا۔ اس نے جب اپنی والدہ کا حوالہ دیا تو اس نے مجھے میری ماں کی بھی یاد دلا دی میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔ پرانے سیڑھی دار راستے سے اٹھتے ہوئے میں گھر کی طرف چل دیا۔ میں اونچی آواز سے رونے لگا یہ ایک آزمودہ نسخہ تھا جس سے میں اپنا دفاع کر سکتا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکے گی لیکن وہاں تو اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔''میری ماں کہاں چلی گئی؟ وہ کب لوٹے گی؟ میں خالی گھر میں بور ہونے لگا۔ مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے کچن سے ایک تھالی لی اپنی بچت کی رقم میں سے ایک 'پیاسترُ لیا اور فوراً لوبیا بیچنے والے کی طرف چل پڑا۔ میں نے اسے دکان کے باہر ایک بینچ پر اپنے بازو سے چہرے کو ڈھانپ کر سوئے ہوئے پایا۔ لوہے والے برتن غائب تھے اور تیل کی لمبی گردن والی بوتلیں واپس الماری میں رکھی ہوئی تھیں اور سنگ مرمر سے بنے کاؤنٹر کی اوپر والی سطح کو دھو دیا گیا تھا۔

جناب، میں نے اس کے نزدیک پہنچ کر سرگوشی کی۔

مجھے کوئی جواب نہ ملا بس اس کے خراٹے ہی سنائی دے رہے تھے۔ اس کے کندھے کو چھوا۔ اس نے چوکنا ہو کر اپنا بازو بلند کیا اور اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''جناب''

اس نے میری موجودگی محسوس کرتے ہوئے اور مجھے پہچانتے ہوئے نہایت کھردرے طریقے سے پوچھا''کیا چاہتے ہو؟''

''ایک 'پیاسترُ کا لوبیا۔ السی کے تیل کے ساتھ۔''

''ہوں''۔

میرے پاس پیاستر بھی ہے اور تھالی بھی۔''

''لڑکے، تم پاگل ہو'' وہ چیخا'' دفع ہو جاؤ ورنہ میں مار مار کر تمہارا بھیجہ باہر نکال دوں گا۔'' جب میں وہاں سے نہ ٹلا تو اس نے مجھے اتنے زور سے دھکا دیا کہ میں کمر کے بل نیچے گر پڑا۔ میں خاصی تکلیف کے ساتھ اٹھا میں اس چیخ کو روکنے کی کوشش کرنے لگا جس نے میرے ہونٹوں کو سکیڑ دیا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں، ایک میں 'پیاسترُ اور دوسرے میں تھالی کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ میں نے اسے غصیلے انداز سے دیکھا۔ واپس ہونے پر میں اپنی امیدوں کو ختم ہوتے ہوئے محسوس کرنے لگا لیکن دلیری اور ہمت کے تصور

نے میرے عملی اقدام کو بدل کے رکھ دیا۔ پورے تیقن کے ساتھ میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور تھالی کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس پر پھینکا۔ یہ ہوا میں اڑتی ہوئی گئی اور اس کے سر سے ٹکرائی جب کہ اسی دوران ہر چیز سے بے پرواہ ہو کر میں وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا مجھے پورا یقین تھا کہ میں نے اسے مار دیا تھا جیسے کہ اس بانکے نے اس غول بیابانی کو مار دیا تھا۔ میں پرانی دیوار کے قریب پہنچنے تک بھاگتا رہا۔ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ میں نے اپنے پیچھے دیکھا کوئی بھی میرا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ میں اپنی سانسیں بحال کرنے کے لیے رکا، تب میں نے اپنے آپ سے پوچھا اب مجھے کیا کرنا چاہیے کیونکہ اب تو میں نے دوسری تھالی بھی کھودی تھی۔ کسی چیز نے مجھے روکا کہ میں فوری طور پر سیدھا گھر نہ جاؤں اور پھر جلد ہی میں نے اپنے آپ کو لاتعلقی کی ایک ایسی لہر کے سپرد کر دیا جس نے میری اس خواہش کو مضبوط کر دیا۔ گھر واپسی پر کم و بیش ایک ماں تو ضرور میری منتظر تھی اس لیے میں نے سوچا کہ تھوڑی دیر کے لیے تو ضرور اس سے جان چھڑا ہی لینی چاہیے۔ میرے ہاتھ میں ایک پیاسترتو تھا ہی اس لیے مجھے سزا پانے سے پہلے اس سے کچھ نہ کچھ تو خوشی حاصل کر ہی لینا چاہیے تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں یہ سوچوں کہ میں نے کوئی غلط کام کیا ہی نہیں تھا۔ لیکن وہ ہاتھ کی صفائی دکھانے والا کہاں تھا۔ وہ سیر بین والا کدھر تھا۔ میں نے ہر طرف انہیں ڈھونڈا لیکن بے سود تھا۔

اس بے ثمر تلاش سے تھک کر میں اسی پرانے سیڑھی دار راستے کی طرف چل دیا جہاں مجھے اس سے ملنا تھا۔ میں اس ملاقات کے متعلق سوچتے ہوئے اس کا انتظار کرنے بیٹھ گیا۔ میں نے مٹھائیوں کی خوشبو سے معطر ایک اور بوسے کی آرزو کی۔ میں نے تسلیم کیا کہ اس چھوٹی سی لڑکی نے مجھے ایسے لمس سے آشنا کیا تھا جس سے کہ میں پہلے واقف نہ تھا۔ ایسے میں جب کہ میں انتظار کر رہا تھا اور خواب دیکھ رہا تھا مجھے ذرا اور اپنے پیچھے سے ایک سرگوشیانہ آواز سنائی دی۔ میں احتیاط سے سیڑھیوں پر چڑھا اور اختتامی چبوترے پر کسی کی نظر میں آئے بغیر یہ دیکھنے کے لیے کہ میرے پیچھے کیا ہو رہا تھا میں منہ کے بل سیدھا لیٹ گیا۔

میں نے ایک بہت اونچی دیوار کے گھیرے میں کچھ کھنڈرات دیکھے جو کہ مالیاتی دفتر اور افسر اعلیٰ کے گھر کی باقیات میں سے تھے۔ سیڑھیوں کے بالکل نیچے ایک مرد اور ایک عورت دونوں بیٹھے ہوئے تھے اور اس سرگوشی کا باعث وہی تھے۔ وہ مرد ایک آوارہ شخص کی طرح تھا اور عورت ان خانہ بدوشوں جیسی تھی جو کہ بھیڑوں کی رکھوالی کرتے ہیں۔ میرے اندر سے برآمد ہوتی آواز نے مجھ سے کہا کہ ان کی ملاقات بھی بالکل اس جیسی تھی جیسی کہ میں خود کر چکا تھا۔ ان کی آنکھوں اور ہونٹوں سے یہ سب کچھ آشکار ہو رہا تھا۔ لیکن ان کی اس غیر معمولی سرگرمی میں ایک حیران کن مہارت کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میرا ان کو یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا اصل میں تجسس، حیرانی، خوشی اور بہت حد تک میری بے تابی کی وجہ سے تھا۔

آخر کار وہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ دونوں ایک دوسرے سے بے خبر سے تھے۔
تھوڑی دیر بعد وہ شخص بولا ''روپے!''
''تم کبھی مطمئن نہیں ہوتے'' وہ تنک مزاجی سے بولی۔
زمین پر تھوکتے ہوئے وہ بولا ''تم پاگل ہو۔''
''تم ایک چور ہو۔''

مرد نے اپنے ہاتھ کی پشت سے عورت کو ایک بھاری تھپڑ جڑ دیا۔ عورت نے جواب میں مٹھی بھر مٹی مرد کے چہرے پر پھینکی۔ مرد نے عورت پر جھپٹتے ہوئے اس کے نرخرے کو اپنی انگلیوں سے دبایا۔ عورت نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ مرد کی گرفت سے نکلنے کی بے سود کوشش کی۔ اس کی آواز میں ناکامی تھی۔ اس کی آنکھیں اس کے حلقوں سے باہر ابل پڑیں جبکہ اس کے پاؤں ہوا میں بلند ہو گئے۔ ایک گونگی دہشت میں ڈوبے ہوئے میں نے اس منظر کو دیکھا تب میں نے عورت کی ناک سے خون کی ایک باریک دھار کو نکلتے دیکھا۔ ایک چیخ میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص اپنا سر اٹھاتا میں ایک ہی چھلانگ میں نیچے اترتے ہوئے پیچھے کی طرف رینگ گیا۔ جہاں تک میری ٹانگیں مجھے لے جا سکتی تھیں۔ میں نے ایک پاگل شخص کی طرح دوڑ لگا دی۔ جب تک میری سانس نہ پھول گئی میں مسلسل دوڑتا رہا سانس بحال کرنے کے لیے جب میں رکا تو میں قطعی طور پر یہ نہیں جانتا تھا کہ اس وقت میں کہاں تھا لیکن جب میں ہوش میں آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک چوراہے کے درمیان تعمیر کی گئی ایک محراب کے نیچے پایا۔ آج سے پہلے میرے قدم وہاں کبھی نہیں پہنچے تھے اور مجھے بالکل نہیں سوجھ رہا تھا کہ میں اپنے گھر سے کتنی دوری پر اور کدھر موجود تھا۔ دونوں اطراف میں اندھے گداگر بیٹھے ہوئے اور ہر طرف سے لوگ گزر رہے تھے۔ جو ایک دوسرے سے بے تعلق لگ رہے تھے۔ ایک خوف کے تحت میں نے محسوس کیا کہ میں اپنا راستہ بھول چکا تھا اور اس سے پہلے کہ میں اپنے گھر کی طرف جانے والا راستہ ڈھونڈ سکوں ان گنت مشکلات میرے انتظار میں تھیں۔ کیا مجھے کسی راہ گیر کی مدد حاصل کرنی چاہیے تاکہ وہ میری رہنمائی کر سکے۔ لیکن اگر مجھے لوبیا بیچنے والے جیسا کوئی شخص ٹکرا گیا، یا اس ویرانے والے جیسا کوئی آوارہ بندہ مل گیا تو کیا ہوگا؟ کیا ایسا کوئی معجزہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنی ماں کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر اس کی طرف دیوانہ وار بڑھ سکوں؟ کیا مجھے خود سے اپنا راستہ تلاش کرنا چاہیے تاکہ یوں ہی ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے مجھے کوئی ایسی مانوس حد بندی مل جائے جو صحیح راستے کی نشاندہی میں میری رہنما ثابت ہو سکے۔ میں نے خود سے کہا مجھے پر عزم رہنا چاہیے اور جلد کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ دن گزرتا جا رہا تھا اور پر اسرار اندھیرا چھانے والا تھا۔

نرمل ورما

ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری

مایا درپن

چھجے پر بھوری، جلتی ریت کی پرتیں جم گئی ہیں۔ ہوا چلنے پر السائے سے دھول کے ذرے میں جھلمل سے ناچتے رہتے ہیں۔ لڑائی کے دنوں میں جو بیرکیں بنائی گئی تھیں۔ وہ اب اکھاڑی جارہی ہیں۔ ریت اور ملبے کے ٹیلے ایسے کھڑے ہیں جیسے کچی سڑک کے ماتھے پر گومڑے نکل آئے ہوں۔

کھڑکی سے سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔ دن اور شام کے بیچ کتنے عجیب رنگوں کی پر چھائیاں ٹیلوں پر پھسلتی رہتی ہیں دور سے متواتر سنائی دیتا ہے پتھر توڑنے کی مشین کا شور، کسی دیو کی غراہٹوں کی طرح۔ گھر رگھر ر، گھر رگھر ر......

دوپہر کے نیند کے کچے کگاروں پر یہ آوازیں لہروں کی طرح تھپ تھپ ٹکراتی ہیں۔ ترن چونک کر جاگ گئی۔ ہاتھ ماتھے پر گیا تو لگا پسینے کی بوندوں پر بال چپک گئے ہیں، بندی کی رولی دونوں بھنوؤں کے بیچ پھیل گئی ہے۔ اسے لگا جیسے وہ اب تک جاگ رہی تھی۔ سچ مچ جاگنے پر پتا چلا تھا کہ سوتے وقت بھی وہ برابر سوچ رہی تھی۔ دوپہر کی نیند جو ٹھہری۔ آدھی آنکھوں میں، آدھی باہر۔

آنکھیں دھوئیں، بندی پونچھ دی، پمپ کے پانی کو چلو میں لے کر آنکھوں میں چھڑکا۔ غسل خانے کی کھلی کھڑکی سے میدان کا وہ حصہ دکھائی دیتا تھا جہاں بیرکوں کو ہٹایا جارہا تھا۔ آدھی ٹوٹی عمارتیں سوکھے ڈھانچوں جیسی کھڑی تھیں۔ سوکھی ریت کے ذرے دھوپ میں موتیاں کی طرح جھلملا اٹھتے تھے۔ ترن کو لگا جیسے اس کے دانتوں کے اندر بھی ریت چرمرا رہی ہے۔

''دیکھ تو ترن، بابو اٹھ گئے ہوں تو حقہ ان کے کمرے میں رکھ آ۔'' بوا نے رسوئی سے سٹی کوٹھری سے آواز دی۔ اتنی عمر میں بھی بوا کو سب کچھ یاد رہتا ہے۔ لگتا ہے جیسے اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ان کے شعور کی ڈور بابو کے معمولات سے جڑی رہتی ہے۔ اپنی کوٹھری کی دہلیز پر اونگھتی رہتی ہیں بوا، آس پاس کے ہنگاموں سے بالکل بے خبر۔ اس پر بھی انہیں بابو کی ہر ضرورت کا احساس کیسے ہو جاتا ہے، ترن کے لیے یہی سب سے بڑا معما ہے۔

شام ہوتے ہی دیوان صاحب بے تاب اشتیاق سے مہمانوں کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے

لیے کچھ دور چھوٹی لائن کے اسٹیشن پر ٹہلنے نکلتے ہیں تو بھی جلدی واپس لوٹ آتے ہیں تا کہ کوئی اچانک ان کی غیر موجودگی میں گھر نہ آ جائے۔ آتے ہی بوا سے پوچھتے ہیں کہ ان کے پیچھے کوئی آیا تو نہیں تھا۔ بوا ہاں نا کے سوا کوئی جواب نہیں دے پاتیں۔ برسوں بعد آج بھی دیوان صاحب سے انہیں عجیب انجانا سا خوف لگا رہتا ہے۔ چھوٹی تھیں تب بھی بھائی کے سامنے سر جھکا رہتا تھا۔ بیوہ ہونے پر دیوان صاحب نے کچھ روپے مہینہ باندھ دیے تھے۔ اب اس عمر میں مالکن کے نہ رہنے پر آئی ہیں، وہ بھی اس لیے کہ اتنے بڑے گھر میں ترن اکیلی ہے۔ ترن نہ ہوتی تو لمحہ بھر کے لیے بھی ان کا اس اجاڑ اکیلے گھر میں رہنا دوبھر ہو جاتا۔

دھوپ مٹتے ہی برآمدے میں جمگھٹا لگ جاتا ہے۔ سرکاری سپروائزر مسٹر داس سے لے کر بڑے ٹھیکیدار ہری چند تک کام ختم ہونے پر دیوان صاحب کے برآمدے میں کچھ دیر کے لیے ستانے آ بیٹھتے ہیں اور ہے بھی کیا اس اجاڑ بستی میں جہاں دن بھر کی تھکان اتاری جا سکے۔ اہیروں کے مٹی کے جھونپڑے اکا دکا پان بیڑی کی دکانیں اور اوپر ٹیلے پر کال، بھیرو کا مندر۔ لے دے کر ایک دیوان صاحب کا ہی تو گھر ہے جہاں دور شہروں سے آئے پردیسی شریف لوگ دو گھڑی ہنس بول کر جی ہلکا کر لیتے ہیں۔

''دیکھ تو ترن، ذرا چلم تو بھر لانا داس بابو کے لیے، دروازے کی طرف منہ کر کے بابو نے کہا۔ ان کے چہرے کی مسکراہٹ میں اب اکتاہٹ کا اندازہ تھا۔ داس بابو آئے ہیں تو اور لوگ بھی آتے ہوں گے۔ آج اتنی دیر کیسے ہو گئی؟ بھونپو تو کب کا بج چکا۔''

داس بابو کا تھل تھل گیند سا بدن آرام کرسی میں دھنس گیا۔ بولے تو نقلی پیلے دانت کٹکٹا گئے۔ ''نہر پار زمین دیکھنے گیا تھا۔ واپس لوٹتے ہوئے نیا پٹرول پمپ دیکھنے رک گیا۔ اب یہاں پٹرول کی دقت نہیں رہے گی۔ دیوان صاحب۔''

ترن اندر سے حقہ لے کر آئی تو داس بابو اپنے میں سمٹ گئے۔ پچاس سے اوپر ان کی عمر پھلانگ گئی ہے، لیکن کسی عورت کے سامنے آج بھی گھبرا سے جاتے ہیں۔

ترن کے پاؤں پیچھے مڑے تو وہ ذرا بحال ہوئے۔ گلے کو صاف کیا، پھر بھی جب بولے تو آواز کھنکھارتی رہی۔ ''کچھ دنوں کے لیے ہردوار، رشی کیش کیوں نہیں گھوم آتے دیوان صاحب؟ نہ ہو، بیٹا کا من ہی بہل جائے گا۔ دن رات اکیلے میں کیا اوب نہیں جاتی ہوگی؟''

داس بابو ترن کا نام نہیں لے پاتے۔ وہ ذرا عمر میں بڑی ہوتی تو اس کے سامنے اتنا گہرا تذبذب نہ چھا جاتا، ذرا عمر میں چھوٹی ہوتی تو نام لینا محض فطری بات ہوتی لیکن ان دو سیدھی واضح حدوں کے بیچ عمر کا پہیا وقت کی جس دلدل میں پھنسا رہ گیا ہے، جہاں عمر نہ بڑھتی ہے نہ گھٹتی ہے، اسے کیا کہہ کر پکاریں، داس بابو بھی

سمجھ نہیں پاتے۔

بابو کچھ بھی نہ کہہ کر چپ بیٹھے رہے۔ وہ اپنے ان دوستوں سے ہنس بول لیتے ہیں، یہ بات اور ہے، لیکن ذہن میں ہمیشہ انہیں اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہیں۔ اتنی قربت کے باوجود انہوں نے اپنے اور دوسروں کے بیچ کہیں ایک لکیر کھینچ رکھی ہے جس کو پار کرنے کا حوصلہ کوئی بھی نہیں کر پاتا۔

ترن کے پاؤں جو داس بابو کی بات پر اچانک دہلیز پر ٹھٹک گئے تھے، پھر آگے بڑھ گئے۔ دوسرے کمرے میں بوا پرانے کپڑے سی رہی تھیں۔ ان کی آنکھ بچا کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دروازہ بند کر کے دیر تک دروازے کے آگے کھڑی رہی۔ برآمدے کی آوازوں کو نہیں سنتی، سنتی ہے اس مکمل خاموشی کو جو سارے گھر میں چھائی ہے۔ جس کے اندر یہ آوازیں پرائی، اجنبی، ڈراؤنی جان پڑتی ہیں۔

کھڑکی سے برآمدا دکھائی دیتا ہے۔ جب کسی شام بابو کے دوست نہیں آتے تو وہ اکیلے آنکھیں موندے کرسی پر بیٹھے رہتے ہیں۔ ایسے لمحوں میں کتنی گہری خاموشی بابو کے اردگرد چھا جاتی ہے! اس نے کئی بار سوچا ہے کہ ایسے میں وہ برآمدے میں ان کے پاس جا کر بیٹھ جائے، ادھر اُدھر کی باتیں کرے۔ آخر اس گھر میں اب وہ دو ہی تو رہ گئے ہیں جو گزرے دنوں کی یادوں میں ایک دوسرے کے ساجھے دار ہو سکیں۔ لیکن اتنے پر بھی کبھی پاؤں نہیں اٹھتے، صرف کھڑکی سے ہی وہ چپ چاپ انہیں دیکھتی رہتی ہے۔

ہوا چلتی ہے دوپہر شام، سائیں سائیں۔ میدانوں کے ٹیلوں ڈھوہوں سے مٹی ریت کے گرم ریلے بار بار دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور راستہ نہ پا کر آنگن میں بکھر جاتے ہیں۔

کبھی کبھی سڑک کو ہموار کرنے کے لیے بارود سے چٹانوں کو پھوڑا جاتا۔ بارود پھٹتے ہی کپکپاتا سا دھماکا ہوتا، آر پار دھرتی ہل جاتی، دور دور تک خطرے کی لال جھنڈیاں ہوا میں لہراتی رہتیں۔

اونگھتی ہوئی ترن اچانک چونک ہی گئی، جیسے کسی نے جھٹکا دے کر اسے جھنجھوڑ دیا ہو۔ شام کا بجھا بجھا سا پیلا پن چپکے سے سارے میدان میں پھیل گیا تھا۔

بوا کمرے میں آئیں۔ اسے کھڑکی کے پاس اونگھتے دیکھا تو جھڑک کر کہا، ''کتنی بار کہا ہے دونوں وقت ملتے سے اندھیرے کمرے میں نہیں بیٹھتے۔ شمبھو کو لے کر ذرا باہر کیوں نہیں گھوم آتی؟''

لیکن اسی وقت سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ترن کی آنکھیں بے اختیار کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ انجینئر بابو آئے تھے۔

یہ انجینئر بابو بھی عجیب ہیں! اس طرح دھم دھم کرتے آتے ہیں کہ سارا گھر ہل اٹھتا ہے۔

چار پانچ مہینے پہلے ادھر سرکاری آرکیٹیکٹ ہو کر آئے تھے، لیکن سب انہیں انجینئر بابو کے نام سے ہی

مخاطب کرتے ہیں۔ ان کی چال ڈھال اور بات چیت سے ایسا جان پڑتا ہے جیسے برسوں سے یہاں رہتے آئے ہوں۔ وہ بابو کے روزمرہ آنے والے دوستوں میں نہیں ہیں۔ بابو کے دوست ہیں، یہ کہنا بھی مشکل ہے شاید اس لیے کہ عمر میں وہ بابو سے آدھے ہیں اور کوشش کرنے پر بھی بابو ان سے ہنس کھل کر بات چیت نہیں کر پاتے۔

ترن نے ہڑبڑا کر بالوں کو سمیٹ لیا، دو تین بار جلدی جلدی کنگھی سے انہیں کہیں کہیں دھیرے سے دبایا، کہیں ہلکے سے اٹھایا۔ پاؤڈر لگایا تو آنکھیں پھڑ پھڑا اٹھیں۔ مانگ کے نیچے ماتھے کے بیچوں بیچ بندی لگاتے ہوئے ترن کا ہاتھ لحہ بھر کے لیے ٹھٹک سا گیا۔ سوچا کیا یہ بھرم ہے؟ نہ اپنے لیے اسے کوئی بھرم نہیں تھا۔ چہرے کی کشش، چاہے جس میں جیسی ہوتی ہو وہ جانتی تھی کہ اس میں نہیں ہے۔ اس کے لیے اب من بے قابو نہیں ہوتا۔ برسوں پہلے سڑک پر چلتے ہوئے کوئی اس کی طرف دیکھتا تو تن من کپکپا اٹھتا تھا۔ وہ دوڑ کر واپس آتی تھی، گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی رہتی تھی۔ کیا دیکھتے ہیں لوگ اس میں؟ یہ سوال کتنا عجیب تھا اور اس کا جواب پانے کے لیے کتنی دیر تک دل دھونکنی کی طرح چلتا رہتا تھا!

''آپ ابھی تک یہیں بیٹھی ہیں؟''

ترن ایکا ایک چونک سی گئی۔ دروازے پر انجینئر بابو کھڑے تھے۔

''میں ابھی برآمدے میں آ رہی تھی۔ آپ چائے پی چکے؟''

''چائے پھر کسی دن پینے آؤں گا، جب آپ کو برآمدے میں آنے کی فرصت ہوگی!...... اس وقت تو جھٹ پٹ گھر پہنچنا ہے۔''

ترن نے ان کے سامنے چوکی رکھ دی۔

''ٹھہریے کچھ کھا کر جائیے! ابھی تو آپ آئے ہیں!''

ترن رسوئی کی طرف جانے لگی، لیکن انجینئر بابو نے اسے بیچ میں ہی روک دیا۔ ''دیکھیے، اس وقت یہ جھنجھٹ رہنے دیجیے۔ ابھی ابھی شہر سے لوٹ رہا ہوں۔ راستے میں دھول گرد کھائی ہے۔ اس سے بالکل پیٹ بھر گیا ہے۔''

جب کبھی انجینئر بابو ہنستے ہیں، ترن کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس بستی کے لوگ چاہے احترام سے انہیں انجینئر بابو کہہ کر پکاریں، عمر میں وہ اس سے چھوٹے ہی ہیں۔ پہلے پہل جب اس نے انہیں دیوان صاحب کے دوستوں کی منڈلی کے بیچ برآمدے میں دیکھا تھا تو اسے گہرا تعجب ہوا تھا۔ اتنے بڑے بزرگوں کے بیچ کالج کے طالب علم سے دکھنے والے یہ انجینئر بابو ٹھیک سے فٹ نہیں بیٹھتے تھے۔

''آپ اس طرف آئیں نہیں؟ مونو آپ کے بارے میں روز پوچھتا ہے۔''

مونٹو انجینئر بابو کا نوکر ہے۔ جب کبھی ترن ریلوے لائن کے پار ٹہلنے جاتی ہے وہ اسے ہمیشہ ملتا ہے۔
''اس بار آؤں گی۔ آپ رہیں گے؟''
''اگلے ہفتے آ یئے گا۔ چار پانچ دن کے لیے ایک دم بہت کام آ پڑا ہے۔'' انجینئر بابو جانے سے پہلے ایک لمحہ رکے، رومال سے اپنی عینک کا شیشہ صاف کیا۔
ترن کی آنکھیں چپ چاپ اوپر اٹھ گئیں اور دیر تک اسی خالی جگہ پر لگی رہیں جہاں کچھ لمحے پہلے انجینئر بابو کھڑے تھے۔
کیسے ہیں یہ انجینئر بابو!...... کھٹ کھٹ کر کے جب سیڑھیاں اترتے ہیں تو سارا گھر ہل اٹھتا ہے۔
کھڑکی کے پرے ریلوے لائن کے اوپر ڈوبتا سورج خون کی لمبی سی لکیر کھینچ گیا تھا۔ اونچی نیچی چٹانوں کے بیچ مزدوروں کے کھوکھل، شام کی پیلی دھوپ میں چھوٹے چھوٹے لکڑی کے بکسوں سے دکھائی دیتے تھے۔ کالی دیوی کے مندر کے آس پاس پھیکے گلابی دھوئیں کا بادل لمحہ بہ لمحہ گاڑھا ہونے لگا تھا۔
ترن کھڑکی سے اٹھ کر پلنگ کے پاس چلی آئی۔ ادھ لکھا خط تکیے کے نیچے اب بھی دبا تھا۔ صبح سے بھائی کو خط لکھنے بیٹھی ہے، لیکن ابھی تک مشکل سے پانچ چھ سطریں ہی لکھ سکی ہے۔ جب جب لکھنے کی کوشش کرتی ہے، بھائی کا چہرہ وقت کی بجھی باسی پرتوں کو کاٹتا ہوا آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ وہ چہرہ نہیں جو بھائی بابو سے لڑ کر گھر چھوڑتے وقت اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس کی تو ڈراؤنی شکل اتنے برسوں کے بعد آج بھی جب کبھی یاد آ جاتی ہے تو دل کانپ اٹھتا ہے، نہ وہ چہرہ نہیں، ایک اور شکل ہے بہت سادی، بہت اُداس...... تب ماں نہیں رہی تھی۔ شروع سے ہی بابو کا اتنا ڈر تھا کہ جی بھر کر رونے میں بھی جھجھک ہوتی تھی اور تب بھائی آئے تھے۔
''دیکھتی نہیں ترن بابو کتنے اکیلے رہ گئے ہیں!'' انہوں نے کانپتے ہونٹوں سے کہا تھا۔ ''ہمیں ان کے ساتھ رہنا ہوگا...... کچھ دنوں میں پھر سب کچھ پہلے جیسا ہی ہو جائے گا۔''
اور آج ترن سوچتی ہے کہاں ہو پایا سب کچھ پہلے جیسا؟ ان دنوں وہ بہت چھوٹی تھی۔ بھائی کیوں چلے گئے اور بابو انہیں کیوں نہیں روک پائے، تب کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ آج لگتا ہے ماں ایک کڑی تھیں خاندان اور بابو کے بیچ۔ ان کے جاتے ہی وہ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی اچانک ایک دوسرے کے لیے اجنبی سے بن گئے تھے۔
بوا اسے کھانے کے لیے بلانے آئی۔ ترن کے ہاتھ میں کاغذ دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا کوئی چٹھی آئی ہے؟''
''بھائی کو لکھ رہی تھی۔ کل سے ان کا خط آیا پڑا ہے۔''

"کیا کچھ آنے کے لیے لکھا ہے؟"

"لکھا ہے کچھ دنوں کے لیے میں ان کے پاس چلی جاؤں...... کیوں بوا، چلی جاؤں تو کیسا رہے گا؟"

بوا حیرت سے آنکھیں پھاڑے ترن کو دیکھتی رہیں۔اتنی دور آسام ترن اکیلی جائے گی، اس کا تصور کرنا بھی پاگل پن لگتا ہے۔

"بہن کے لیے اتنی وہ ممتا ہوتی تو اتنے برسوں میں کیا ایک بار بھی وہ دیکھنے نہیں آتا؟" بوا بولیں۔

"باپ سے لڑائی ہے تو کیا سب سے کنارہ کرلینا چاہیے۔"

دمے کی وجہ سے بوا سے زیادہ نہیں بولا جاتا۔ جتنے لفظ منہ سے باہر نکلتے ہیں ان سے کہیں زیادہ چڑھتی سانس کے بھنور میں ڈوب جاتے ہیں۔ بوا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ترن فوراً طے نہیں کرسکی وہ اس کے بھائی کے لیے ہیں یا کھانسی کے باعث خود بخود امڈ آئے ہیں۔

"تم چلو بوا، میں ابھی آتی ہوں۔" کمرے میں اوجھل سا سناٹا چھا جاتا ہے۔ برآمدے میں چہل قدمی کرتے ہوئے بابو کی تھکی، غیر یقینی سی چاپ سنائی دے جاتی ہے۔ کھڑکی کے باہر میدان کے اندھیرے میں مٹی کے لیے لمبے ٹیلوں کے پتلے سائے پھیکی چاندنی میں اکھڑ آئے ہیں۔

ایک دھندلی سی تصویر ابھر آتی ہے۔ ڈھلواں گھاٹیوں پر دور دور تک اوپر نیچے چائے کے باغ پھیلے ہیں۔ انہیں باغوں کے بیچ پیڑوں کے جھرمٹ کے پیچھے کہیں بھائی رہتے ہوں گے۔ کہتے ہیں وہاں اسٹیمر پر جانا پڑتا ہے۔ جانے اسٹیمر پر بیٹھ کر کیسا لگتا ہوگا!

ترن اس چھوٹے سے اسٹیشن کے سگنل کی بتی دیکھتی رہی، پاس آتی ٹرین کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ مکان کی دیواروں، میدان میں دور کھڑے گھٹوں اور ٹیلوں کو جھنجھوڑی جاتی ہے۔ کچھ دیر کے لیے پتھر توڑنے کی مشین کی ڈراؤنی گھر رگھر ر ٹرین کے پہیوں تلے ڈوب جاتی ہے۔ انجن کی ہیڈ لائٹ کے گھومتے دائرے میں آس پاس کھڑے جھاڑ جھنکار جھلملا اٹھتے ہیں...... اور پھر وہی پہلے جیسی گھٹی، بوجھل خاموشی چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔

اس رات بوا ترن کے کمرے میں آئیں اور دیر تک بیٹھی رہیں۔ ترن کی طرف کبھی کبھی دیکھ لیتیں اور پھر ایک لمبی گہری سانس لے کر سپاری کترنے لگتیں۔

"سوگئی ترن؟" بوا کبھی کبھی فکرمند آواز میں سر اٹھا کر پوچھ لیتیں۔

"نہ بوا ابھی نہیں۔"

ترن سمجھ جاتی کہ بوا کوئی بات شروع کرنے سے پہلے راستہ ٹٹول رہی ہیں۔ وہ چپ چاپ آنکھیں

موند کر انتظار کرتی رہتی۔

''آج تیری ماں کے کمرے میں گئی تھی،'' بوا کچھ دیر بعد دھیرے دھیرے بولیں۔ ''میں تو دیکھ کر حیرت میں آ گئی ترن! نہ جانے کتنے برسوں سے اس نے یہ سب چیزیں جوڑ جوڑ کر جمع کی ہیں۔ اس کے بیاہ کی ساڑی تک صندوق میں ابھی تک سنبھال کر رکھی ہے۔

ترن کے من میں ہلکا سا تجسس جاگ اٹھا...... ماں کا بھی بیاہ ہوا ہوگا۔ اس پر کبھی کبھی یقین نہیں ہوتا۔

''تیرے بابو ان دنوں نئے نئے دیوان بنے تھے...... بڑی دھوم دھام سے ان کا بیاہ ہوا تھا۔ سکھوں کے دربار میں ایک وہی تو ہندو دیوان تھے جو بے روک ٹوک راجا سے ملنے جایا کرتے تھے۔''

بوا کی آنکھوں میں ایک بہت پرانا، کبھی نہ مٹنے والا خواب تیر آیا۔ ہاتھ کا سروتا چلتے چلتے رک گیا۔

''ایک دن ریاست کے انگریز ریزیڈنٹ ان سے ملنے آئے تھے۔ محلے کے سب لوگ تعجب میں اپنے اپنے گھروں سے نکل کر ہمارے گھر کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ لیکن تیرے بابو اپنے اصول قاعدے کے اتنے پکے تھے کہ ان کے جانے کے بعد انہوں نے اشنان کیا اور سب برتنوں کو دوبارہ دھلوایا۔''

ترن اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ کتنی بار اس نے بوا کے منہ سے یہ سب باتیں سنی ہیں، لیکن ہر بار اندر ہی اندر نئے سرے سے اشتیاق جاگ اٹھتا ہے۔ لگتا ہے جیسے وہ چوری چھپے، دبے پاؤں کسی انوکھے، جادوئی خطے میں چلی آئی ہے۔

''بوا تم نے تو ان دنوں بابو کو دیکھا ہوگا۔ کیا تب بھی تمہیں ان سے آج کی طرح ڈر لگتا تھا؟''

''ارے کون نہیں ڈرتا تھا تیرے بابو سے؟'' بوا کے ہونٹوں پر ایک دھندلی مہین سی مسکراہٹ سمٹ آئی۔ ان دونوں کا ڈر تو آج تک چلا آتا ہے۔ تیری ماں کو تو مجھ سے بھی زیادہ ڈر لگتا تھا۔ وہ تو بس ٹکر ٹکر انہیں دیکھتی ہی رہتی تھی۔ جس دن تیرے بابو دربار جاتے تھے، میں اور وہ جھروکوں میں کھڑے ہو کر لک چھپ کر انہیں دیکھا کرتے تھے۔ چوڑی دار چمچماتا پائجامہ سفید ریشمی چکن اور سر پر راجسی، پیازی رنگ کی پگڑی...... ہماری آنکھیں ان پر سے اٹھتی ہی نہ تھیں۔''

بوا کے ہاتھ سروتے پر ٹکے رہے، آنکھیں خلا کے نہ جانے کس کونے میں جا کر اٹک گئیں۔

''سوچتی ہوں، جب بابو تیرے لیے اونچی ذات اور بڑے گھرانے کی بات چلاتے ہیں تو کیا یہ ٹھیک ہے؟ وہ بات آج کہاں رہی جو برسوں پہلے تھی؟ آج اپنی کون سی عزت رہ گئی ہے جو بڑے گھر گھرانے کا لڑکا ملے! لیکن انہیں یہ بات سمجھائے کون؟''

بوا کی آنکھوں میں ایک گھنا، گہرا سا تعجب چھا جاتا ہے، جیسے وہ خود نہ سمجھ پا رہی ہوں کہ جو نہیں رہا، آج

بھی کیسے جونک کی طرح چمٹا ہوا ہے۔ مان غرور نہیں رہا، زمین جائیداد کب کی بک لٹ گئی، باپ دادا کی وراثت کے نام پر بچارہ گیا ہے ایک یہ مکان اور وقت کی دھول میں لدا پھندا چیتھڑا سا دیوان کا خطاب جسے چاہے اوڑھ لو چاہے، چاہے بچھالو...... پر جو نہیں ہے اسے کوئی کب تک مانے گا؟

بوا کا گلا بھاری ہو اٹھتا ہے، آنکھوں کے آگے گیلا سا جھلملا تیر جاتا ہے، لیکن مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر تب بھی جمی رہتی ہے جیسے وہ اسے مٹانا بھول گئی ہوں۔

لیکن ترن کو بات کا یہ پہلو اب بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اچھا لگتا تھا پہلے، جب ماں ہنسی ہنسی میں وہ گہنے دکھایا کرتی تھیں جو اسے بیاہ پر دیے جائیں گے۔ تب ہلکی سی گدگدی ہوتی، بیاہ کے لیے نہیں، گہنوں کے لیے نہیں، بلکہ اس عجیب انجانی خوشی کے لیے جو اس کی اپنی تھی۔ جس میں وہ بالکل اکیلی تھی۔

ترن پھر لوٹ گئی۔ کھڑکی سے سگنل کی لال بتی دکھتی ہے دور اندھیرے میں نہر کے پیچھے بیرکیں ہیں جن پر رات چپ چاپ جھک آئی ہے۔ انہیں بیرکوں کی کسی تنگ اندھیری کوٹھری میں انجینئر بابو رہتے ہوں گے۔ ترن نے سوچا اور آنکھیں موند لیں۔

اس پل اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔ یہ بھی یاد نہیں رہا کہ بوا نے اس سے کچھ کہا ہے۔ ٹانگوں پر ایک ہلکی میٹھی سی تھکان اتر آئی۔ برسوں پہلے کا ایک دھندلا سا احساس کہیں اندر دھیمے سے اتر آیا ہے۔ لگتا ہے جیسے وہ ٹب کے پانی میں اپنا ننگا بدن پسارے لیٹی ہے۔ بیچ میں کچھ بھی نہیں ہے کوئی واقعہ نہیں گزرا ہے۔ جو گزرا ہے جو کچھ بھی گھٹا بڑھا ہے وہ سب پانی کے اوپر ہے۔

''سو گئی ترن؟'' بوا نے پوچھا۔

اس بار ترن خود فیصلہ نہیں کر سکی کہ وہ نیند کے اس طرف ہے یا دوسری طرف...... پانی کے اوپر سائے تیرتے ہیں لیکن اس کے نیچے کتنی ڈھیر ساری خاموشی بکھری ہے!

پھر کئی دن ایسے آتے جب دیوان صاحب اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتے برآمدہ سونا پڑا رہتا۔ خالی کرسیوں پر سوکھی گرم ریت اور چونے کی پرتیں اکٹھی ہوتی رہتیں۔ بوا کئی بار بابو کے کمرے تک گئی ہیں اور چپ چاپ واپس لوٹ آئی ہیں۔ کھانا بھی وہ اپنے کمرے میں منگوا لیتے۔ آتے جاتے کبھی سامنے پڑ جاتی تھی تو دیکھتے بھی نہیں۔ دیکھ بھی لیتے تو اس طرح سے گویا اسے پہچان پانے میں دبدھا ہو رہی ہو۔ ان کی کوشش یہی رہتی کہ جہاں وہ بیٹھی ہو وہاں نہ جانا، اچانک مڈبھیڑ بھی ہو جائے تو دوسری طرف دیکھنے لگیں یا راستہ بچا کر نکل جائیں۔

ترن سمجھتی ہے بابو اس سے دور دور کیوں رہنے لگے ہیں۔ کیوں گھر میں تناؤ رہنے لگا ہے۔ پہلے بہت دن غصہ آتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں آتا، صرف روکھا سا خالی پن دل میں بھر جاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتی ہے کہ

اگر بابو کو اس سے اتنی چڑ ہے تو کیوں نہیں اس سے چھٹکارا پا لیتے؟ کئی بار بوا نے زور ڈال کر بابو سے خط لکھوائے ہیں، بات چیت آگے بھی بڑھی ہے اس کا فوٹو اور جنم پتری باہر بھیجی گئی ہے لیکن ہر بار بیچ میں ہی سب کچھ رک جاتا ہے...... کیوں رک جاتا ہے آج تک ترن کی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔

آج بھی ترن جب اس رات کا واقعہ یاد کرتی ہے تو سارے بدن میں جھرجھری دوڑ جاتی ہے......

اس روز آدھی رات سے کچھ پہلے بوا اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ وہ جاگ رہی تھی۔ اندھیرے میں بوا کے پیروں کی چاپ دھیرے دھیرے اس کے پلنگ کے پاس سرکتی سنائی دی تھی۔ وہ سانس روکے لیٹی رہی تھی۔

''بوا، تم ہو؟''

بوا کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''تو نے کچھ سنا؟''

ترن اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنکھیں پھاڑتے ہوئے اندھیرے میں دھوئیں کی کالی پرچھائیں کو دیکھا۔

''کیا بات ہے، بوا؟''

''مجھ سے اب اس گھر میں نہیں رہا جائے گا۔''

''کیا بات ہے بوا؟''

''کہنے کو اب کچھ باقی رہا ہے، ترن؟'' بوا کا گلا رندھ سا گیا۔

ترن ساکت آنکھوں سے اندھیرے کے اس حصے کو دیکھتی رہی جہاں بوا کھڑی تھیں۔

''تم سے کچھ بات ہوئی تھی؟'' ترن نے پوچھا۔

''میں تو کمرے میں ہی بیٹھی رہی تھی، وہ خود آئے تھے...... میں کہتی ہوں کہ جو کچھ انہیں کہنا ہے تجھ سے کیوں نہیں کہتے؟...... تو اب بچی تو نہیں رہی...... ناحق مجھے بیچ میں کیوں گھسیٹتے ہیں؟''

''کیا کہتے تھے بوا؟'' ترن کی آواز میں ایک عجیب سا کھوکھلا پن نظر آیا۔

''ان کی بات مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتی...... کہتے تھے، ماں کے سامنے سب کچھ ہو جاتا تو ٹھیک رہتا۔ پھر دیر تک چپ چاپ کمرے میں گھومتے رہے۔ میں نے موقع دیکھ کر کہا کہ اونچے خاندان کو لے کر آج کل کون بیٹھا رہتا ہے؟ اچھا لڑکا ملے تو سب کچھ ہے۔ لیکن میری بات سنتے ہی وہ ایک منٹ بھی کمرے میں نہیں ٹھہرے۔ تیزی سے اپنے کمرے میں گئے اور پھٹاک سے دروازہ بند کر لیا۔ کچھ دیر بعد باہر آئے تو ایکا ایک انہیں پہچان نہیں سکی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، ماتھے پر بال بکھرے تھے۔ تیری ماں کے مرنے کے بعد میں نے انہیں کبھی اس روپ میں نہیں دیکھا۔ ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی جو انہوں نے میرے سامنے پھینک دی...... اس کی ماں کے گہنے اس میں رکھے ہیں، انہیں لے کر وہ جہاں جانا چاہے چلی جائے۔ لڑکا چلا گیا تو میں مر نہیں

گیا۔ یہ چلی جائے گی تو بھی مجھے کچھ نہیں ہوگا...... میں تو بھونچکی رہ گئی، ترن! کیا اپنی لڑکی کے لیے کوئی ایسے کہتا ہے؟''

اس رات بوا کا سوال اندھیرے میں بھٹکتا رہا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پائی تھی کہ بابو اس سے کیا چاہتے ہیں۔ اسے اپنے سے ہی ڈر لگنے لگا تھا۔ لگا جیسے بابو کو اس پر شک ہے، جیسے وہ بھی بھائی کی طرح کسی نہ کسی دن انہیں دھوکا دے کر چلی جائے گی...... پہلے اس نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا، لیکن اس رات بابو کے شک نے اس کے ذہن کو بھی مضطرب کر دیا۔ کیا سچ مچ وہ اس گھر میں رہنا چاہتی ہے؟ اس نے بار بار اپنے سے پوچھا تھا اور اُسے لگا تھا کہ شاید بابو کا شک صحیح ہو، شاید اسے اس گھر سے، گھر کے سائیں سائیں کرتے کمروں سے ڈر لگتا ہے، جسے آج تک چھپاتی آئی ہے...... کیا یہ سچ ہے؟

یہ کیسا سوال تھا؟ سیدھا سادہ، لیکن ان ہزاروں سوالوں میں ایک جن کا شاید کوئی جواب نہیں ہوتا۔ ترن یہ نہیں جانتی تھی، اس لیے رات بھر تکیے میں منہ چھپا کر تھر تھر کانپتی رہی تھی۔

اس رات ترن نے اچانک طے کر لیا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے بھائی کے پاس جا کر رہے گی۔

دوسرے دن ترن چاہنے پر بھی بابو سے اپنے جانے کی بات کہنے کا حوصلہ نہ کر پائی۔ کئی بار ان کے کمرے تک گئی، لیکن بغیر کچھ کہے سنے الٹے پاؤں واپس لوٹ آئی۔ اسے بابو سے ایک عجیب سا خوف آتا تھا، جسے مٹانا کبھی ممکن نہیں ہو پایا۔ اس نے بوا سے کہا کہ وہ بابو سے جا کر کہہ دیں۔

بوا حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی تھیں۔ لیکن بعد میں جب انہوں نے اس پر غور کیا تو لگا کہ شاید ترن کا چلا جانا ہی بہتر ہے۔

اس شام بابو نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ دروازے کی دہلیز پر ترن کے پاؤں اچانک ٹھٹک گئے تھے، سانس گھٹنے سی لگی تھی۔

''آ جاؤ، ادھر بیٹھو۔'' بابو کی بھاری دھیمی سی آواز سنائی دی۔

دیوار کے ساتھ تکیے کا سہارا لے کر بابو بیٹھے تھے، چپ ساکت ایک بار خیال آیا کہ جیسے وہ دبے پاؤں آئی ہے، ویسے ہی واپس لوٹ جائے لیکن اس کے پاؤں فرش سے چپکے رہے۔

''سنا ہے تم کچھ دنوں کے لیے باہر جانا چاہتی ہو؟''

ترن چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اسے لگا جیسے بابو بھائی کا نام اس کے سامنے نہیں لینا چاہتے۔ اس نے کبھی بابو کے منہ سے بھائی کا ذکر نہیں سنا۔ جب کبھی ان کی چٹھی آتی ہے، بابو بغیر پڑھے اسے اس کے پاس بھجوا دیتے ہیں۔

''یہاں جی نہیں لگتا، ترن؟'' بابو کی آواز میں ایک بے نیاز، معصوم سا تجسس تھا، جیسے انہوں نے پہلی بار اس بارے میں سوچا ہو۔

ترن کی آنکھیں ایک پل کے لیے اوپر اٹھیں۔ اس کے اندر ایک عجیب سی اتھل پتھل ہونے لگی۔ شاید بابو اسے روک لیں گے، شاید اس کے بغیر انہیں بھی اکیلا پن محسوس ہوتا ہوگا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اگر ایک بار بھی بابو سے رکنے کے لیے کہیں گے تو وہ ایک دم اپنا ارادہ بدل دے گی۔ پھر جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

لیکن بابو چپ بیٹھے رہے۔ ترن کی آنکھیں نیچے جھک گئیں۔ کمرے کی خاموشی پھر بوجھل سی ہوگئی۔

''اچھا ہے، جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ...... میری طرف سے فکر مت کرنا۔'' بابو کی آواز بالکل پرسکون اور بے تاثر تھی۔

کمرے سے باہر جاتے ہوئے ترن کے پاؤں ایک بار دھلیز پر ٹھٹکے تھے۔ سوچا تھا، شاید بابو کچھ کہیں گے لیکن کمرے میں سناٹا چھایا رہا......

شاید کچھ بھی کہنا باقی نہیں رہا تھا۔ اس دوپہر ترن اپنے کمرے میں ہی لیٹی رہی۔ اتنے دنوں سے اگر کوئی ایک خواہش ہوتی ہے تو یہی کہ جب خواہش کرے، تبھی اسی لمحے نیند آ جائے۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ اتنے برسوں میں جاگنے کے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھنے کے جو لمحے آئے ہیں وہ بھی جیسے غلط ہوں۔ غیر حقیقی ہوں لگتا ہے جیسے وہ بھی پوری طرح سے اس کے پاس نہ آئے ہوں، نیند کی ڈیوڑھی پر کھڑے کھڑے واپس لوٹ گئے ہوں۔

شام کو ترن اپنے کمرے سے باہر آئی۔ دوپہر بھر لیٹے رہنے کے باعث بدن بھاری لگ رہا تھا۔ باہر دن بھر ریت اڑی تھی، آسمان پر پیلی مٹیالی دھول کی تہیں جم سی گئی تھیں۔ میدان کے چاروں طرف ٹیلوں اور مٹی کے ٹیلوں پر پھیکی بجھی بجھی سی دھوپ چمک رہی تھی۔ ترن نے دیکھا، بابو ابھی برآمدے میں نہیں آئے ہیں۔ ان کے کمرے کا دروازہ اب بھی بند پڑا تھا۔

بوا اپنی کوٹھری میں کھانس رہی تھیں اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی جاتی تھیں۔ جب کبھی ہوا کا جھونکا آتا تھا، اس سونے مکان کے دروازے کھنکھنا اٹھتے تھے......

ترن نے جلدی جلدی چپل پہنی۔ اندر بوا سے کہہ آئی کہ وہ کچھ دیر ٹہلنے کے لیے باہر جا رہی ہے۔ نہ جانے بوا نے اس کی بات سنی یا نہیں، سیڑھیاں اترتے ہوئے بھی ترن کو ان کی کھانسی کا کھنکھارتا شور سنائی دے جاتا تھا۔

دور دور تک ریتیلی زمین پھیلی تھی۔ غروب ہونے سے پہلے سورج کی پیلی کرنیں کچے سونے سی ریت پر

بکھر گئی تھیں ۔نئی سڑک کے دونوں طرف روڑی پتھر کے ڈھیر چھوٹے چھوٹے اہرام سے کھڑے تھے۔ انہی کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ترن پانی کے ٹینک تک پہنچ گئی تھی ۔

سب کچھ کتنی دور اور پھر بھی کتنا اپنا تھا، ترن نے سوچا کتنے برسوں سے وہ انہیں دیکھتی آئی ہے! لڑائی کے دنوں میں جب بیرکیں بنائی جا رہی تھیں اور ملٹری کے ٹرک گرد اڑاتے ہوئے جب شہر سے آتے تھے۔ تب بھی وہ یہاں تھی۔ آج...... برسوں بعد جب ہیبت ناک چٹانوں کو توڑ کر نئی سڑک کھودی جا رہی ہے، بیرکوں کو ڈھایا جا رہا ہے یہ بھی وہ صبح شام کمرے کی کھڑکی سے دیکھتی آئی ہے ۔

ترن کو یہ سوچ کر ہلکی سی خوشی ہوئی کہ اب وہ کچھ دنوں کے لیے ان سے چھٹکارا پا لے گی۔ اسے لگا جیسے اس کے اندر کا تناؤ بہہ گیا ہے اور جب اس نے دور سے کچی سڑک پر انجینئر بابو کو آتے دیکھا تو وہ بغیر مسکرائے نہ رہ سکی۔

انجینئر بابو ٹینک کے پاس آ کر رک گئے۔ ان کے سر پر سولا ہیٹ دھوپ میں چمک رہا تھا، قمیض کی آستینیں اوپر چڑھی تھیں جن کے نیچے ننگے بازوؤں کے بال دھول ریت میں اٹے ہوئے تھے۔ گلے کے بٹن کھلے تھے اور نچلے حصے پر پسینے کی دو چار بوندیں دکھائی دے جاتی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک لمبا چوڑا سا بورڈ تھا۔ عینک کے پیچھے آنکھیں ویسی ہی چنچل، بے چین لیکن نہایت سنجیدہ دکھائی دیتی تھیں۔

''آپ یہاں کیسے کھڑی ہیں؟''

''یوں ہی ذرا ٹہلنے کی سوچ رہی تھی۔ گھر میں تو اُمس کے مارے بیٹھا نہیں جاتا...... آپ کو میں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا، انجینئر بابو، حالانکہ سولا ہیٹ میں آپ کو پہچاننا مشکل تھا۔''

انجینئر بابو ہنس پڑے۔ ترن کو یاد آیا کہ جب وہ شروع شروع میں دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر برآمدے میں انجینئر بابو کی ہنسی سنتی تھی تو اسے لگتا تھا کہ وہ عمر میں اس سے کافی چھوٹے ہیں۔

''ادھر شہر جانا ہوا، انجینئر بابو؟''

''کیسے ہوگا؟'' انجینئر بابو اپنی پریشانیوں کو کچھ اس ڈھنگ سے کہتے ہیں کہ ترن کو لگتا ہے جیسے انہیں ان سے کافی خوشی محسوس ہو رہی ہو۔

''کیسے ہوگا؟ تین دن سے کوئی لاری نہیں گئی ہے۔ اتنی دور نہ میں جا سکتا ہوں، نہ بے چارہ مونٹو۔''

''لاری نہیں گئی ہے؟'' ترن تعجب سے انہیں دیکھنے لگی۔ ''پھر کھانے پینے کا سامان کون لاتا ہوگا؟ یہاں تو کوئی اچھا ہوٹل بھی نہیں ہے۔''

''آپ مونٹو کو نہیں جانتیں!'' انجینئر بابو قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ ''شہر جانے میں ہم دونوں کو ہی آلس

لگتا ہے، اس لیے اس نے یہاں ایک اچھا سا ڈھابا کھوج نکالا ہے۔ وہیں سے اپنے اور میرے لیے دونوں وقت کھانا لے آتا ہے۔''

ترن نے انجینئر بابو کو دیکھا۔ بڑا عجیب سا لگا۔ کیسے ہیں انجینئر بابو؟ اپنے شہر اپنے گھر کو چھوڑ کر اتنی دور چلے آئے ہیں۔ نوکر کے سوا کوئی بھی تو نہیں ہے اس اجاڑ علاقے میں جسے وہ اپنا کہہ سکیں۔

''چلیے، آپ ٹہلنے آئی ہیں نا!''

اونچی نیچی، اوبڑ کھابڑ کچی سڑک پر وہ دونوں چپ چاپ چلنے لگے۔ جب کبھی ہوا کا جھونکا آتا، آنکھیں مند جاتیں، منہ میں ریت کرکرانے لگتی، آنکھوں کے آگے سفید پردہ سا کھنچ جاتا۔ مزدوروں کے کھوکھلوں اور جھاڑ پھونس کے چھپروں کے اوپر کالی دیوی کے مندر کا دیا جل گیا تھا، حالانکہ دھوپ ابھی تک آس پاس کھڑی چٹانوں اور مٹی کے ٹیلوں پر رینگ رہی تھی۔

چلتے چلتے اچانک انجینئر بابو رک گئے۔

''آپ نے وہ ٹیلے دیکھے ہیں، ان کھوکھلوں کے پیچھے؟'' انجینئر بابو کی نظر کہیں دور جا کر اٹک گئی تھی۔

ترن تجسس بھری نظر سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''سڑک بننے کے بعد ان سب کو گرا دیا جائے گا۔ ریلوے لائن کے سامنے آپ جو بنجر زمین دیکھتی ہیں، اسے جوتا جائے گا۔ نہر کے اس طرف کارخانے بنیں گے۔ آپ کے دیکھتے دیکھتے سب کچھ بدل جائے گا۔''

انجینئر بابو کی آواز ایک دم بہت اشتیاق سے بھر گئی تھی۔ شام کی دھوپ میں ان کے چشمے کا شیشہ بار بار جھلملا اٹھتا تھا۔

اور بھی نہ جانے انجینئر بابو نے کیسی کیسی عجیب باتیں کہی تھیں۔ ترن حیرت سے دیکھتی رہی تھی، سوچتی رہی تھی کہ دیکھنے میں چاہے انجینئر بابو کالج کے طالب علم لگتے ہوں، جانتے بہت کچھ ہیں۔ اسے ہنسی اس بات پر آئی تھی کہ وہ اتنا جوش میں آ کر کیوں بول رہے ہیں، وہ کوئی ان کی مخالفت تھوڑے ہی کر رہی ہے۔

ریلوے لائن کے پھاٹک کے پاس آ کر وہ رک گئے۔ انجینئر بابو ایکا ایک چپ ہو گئے تھے، جیسے شام کے گھرتے اندھیرے کا سونا پن انہیں ابھی بھی چھو گیا ہو۔ آسمان پر درانتی سا چاند اگ آیا تھا۔ ٹیلوں کی اونچی نیچی لکیریں جو دوپہر کے وقت تیکھی اور سخت دکھائی دیتی تھیں۔ شام کی پھیکی روشنی میں بے حد نرم اور ہلکی پڑ گئی تھیں۔ جیسے اپنی علیحدگی چھوڑ کر چپ چاپ ایک دوسرے کے پاس سرک آئی ہوں۔

''انجینئر بابو! آپ کبھی آسام گئے ہیں؟''

''آسام؟ نہیں تو! کیوں، وہاں کیا ہے؟''

''کچھ نہیں، ایسے ہی یاد آ گیا۔ وہاں ہمارے بھائی رہتے ہیں، آپ ہی کی عمر کے ہیں۔''

''اوہ!'' انجینئر بابو چپ چاپ دوسری طرف دیکھنے لگے تھے۔

ترن کو یہاں سے لوٹ جانا تھا، لیکن وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ ہوا کا بہاؤ اچانک کم ہوگیا تھا۔ پانی کے ٹینک کے پیچھے چھوٹے گھروں کی نیلی چھتیں شام کی ڈھلتی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔

''اب آپ واپس لوٹ جایئے، اندھیرا ہونے والا ہے۔ کہیے تو مونٹو کو ساتھ بھیج دوں؟''

''نہیں، میں چلی جاؤں گی، دور ہی کتنا ہے!''

انجینئر بابو ریل کی پٹری پار کر کے دھیرے دھیرے میدان کی دوسری طرف چلنے لگے تھے۔ ترن دیر تک ان کی طرف دیکھتی رہی۔ ڈوبتے سورج کے رنگ کا آخری احساس بھی مٹنے لگا تھا۔

واپس لوٹتے ہوئے ترن ایک بار رکی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے برسوں بعد اس کے پاس ایک پراسرار، بے لفظ سکھ آیا ہے۔ چاروں طرف گھرتے اندھیرے کے نرم سائے کے بیچ اسے اپنی سب فکریں فضول سی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ سمجھ نہ پائی کہ اسے اب تک جو اتنا ڈر لگتا رہا تھا وہ کس لیے تھا، کس سے تھا؟ زندگی میں صرف ایک بار جینا ہوتا ہے اور اسے اس کے علاوہ کوئی اور نہیں جیے گا۔ انجینئر بابو کو ہی دیکھو اپنا گھر بار چھوڑ کر اتنی دور آئے ہیں، بھلا کس لیے؟ انہیں کیسا لگتا ہوگا؟

میدان کے اندھیرے اوبڑ کھابڑ راستے پر چلتے ہوئے ترن کو لگا تھا جیسے گزرتے برسوں کا باسی پن دھل گیا ہے۔ اس کی نس نس میں سکون کی لہر دوڑ گئی تھی۔

نہیں، اب وہ اس گھر میں کبھی واپس نہیں آئے گی...... وہ اپنی زندگی خود جیے گی...... اسے یہاں اب رہنے کے لیے کسی کا موہ پیچھے نہیں کھینچے گا......

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ترن نے اوپر دیکھا، برآمدے میں گھپ اندھیرا تھا۔ سارے گھر میں سناٹا پھیلا تھا۔ صرف رسوئی کی بتی جل رہی تھی۔ جس کی روشنی کی ایک دھندلی پھیکی سی لکیر بابو کے کمرے کے دروازے پر کھنچ آئی تھی۔

دروازہ کھلا تھا، ترن کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کیا بابو اکیلے اندھیرے کمرے میں بیٹھے ہیں؟

وہ دبے پاؤں دروازے کے پاس گئی، کانپتے ہاتھوں سے دروازے کو ہلکے سے پیچھے ٹھیل دیا۔ آنکھیں اندھیرے میں پہلے کچھ بھی نہ پکڑ پائیں، ادھر ادھر بھٹکتی رہیں، پھر اچانک ایک کونے میں ٹھہر گئیں۔

ایک ٹک دیکھتی رہی ترن۔ نیند میں چلتے مریض کی طرح بابو کمرے میں گھوم رہے تھے۔ کبھی کبھی اچانک کمرے کے بیچ کھڑے ہو جاتے تھے، جیسے کسی بھولی ہوئی چیز کو یاد کر رہے ہوں، پھر ایکا ایک ان کے

پاؤں مڑ جاتے اور دو کونے کے طاق میں رکھی ہوئی برسوں پرانی تصویر کے سامنے آ کھڑے ہوتے۔ ابھری ہوئی نیلی نسوں سے بھرے کانپتے ہاتھوں سے وہ فریم پر جمع ہوئی دھول کی پرتوں کو صاف کرتے۔ دھول کہاں صاف ہو پاتی ہے! ان کی انگلیوں کی چھاپ تصویر کے پرانے، زرد شیشے پر ابھر آتی ہے۔

کوئی شکل ہے جو ماضی کے دھندلے پردے پر دیے کی لو سی جھلملا جاتی ہے۔ جارج پنجم کی سلور جوبلی کے جشن کے موقعے پر برسوں پہلے جو فوٹو لیا گیا تھا، بابو محو ہو کر پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہے تھے۔ ریاست کے انگریزی ریزیڈنٹ اور دوسرے سرکاری اہلکاروں کے بیچ جہاں دیوان صاحب بیٹھے ہیں، فوٹو کے اس کونے پر بابو کی آنکھیں ساکت سی جمی رہ گئی ہیں، جیسے وہ اپنے کو ہی پہچان پانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

لمحہ بھر کے لیے گمان ہوتا ہے، کیا بابو سچ مچ وہاں ہیں جہاں کھڑے دکھائی دیتے ہیں؟ کیا اس گھڑی ان کے ساتھ کوئی نہیں ہے؟

دروازے کے پاس دیوار سے سٹ کر ترن پتھری کھڑی رہی۔ آنکھوں پر ایکا ایک اعتبار نہیں آیا۔ پہلی بار ترن نے بڑھاپے کو ایسی بے نقاب حالت میں دیکھا تھا اور وہ بغیر ہلے ڈلے سن سی کھڑی رہ گئی تھی۔ بابو کے روکھے سفید بال، پتلے لکڑی سے ہاتھوں پر نیلی نسیں، چہرے کی بے شمار اداس جھریاں کیا یہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے دیکھتے دیکھتے ہو گیا ہے؟

''بابو!'' ترن کے ہونٹ پھڑ پھڑا اٹھے۔ وہ اندھیرے کمرے میں بابو کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے بابو کے اتنے قریب جانے کا حوصلہ کیا تھا۔

بابو نے دھیرے سے سر اوپر اٹھایا، ترن کو دیکھا...... اور دیکھتے رہے۔

''تم یہاں کیوں آئیں، ترن؟'' ان کا گلا بھرا سا گیا، آنکھوں میں بے بسی چھلک اٹھی۔

ترن کمرے سے باہر چلی آئی۔ دیر تک اندھیرے برآمدے میں کھڑی رہی۔ ایک ڈراؤنا سا خیال اس کے دماغ میں دھیرے دھیرے رینگتا رہا۔ بابو اسے کبھی نہیں چھوڑیں گے اور وہ ان سے کبھی الگ نہیں ہو سکے گی۔

وہ اکیلی رہے گی، لیکن بابو کے سائے سے بندھی ہوئی...... اور بابو کا اکیلا پن ہمیشہ زندگی بھر، اس سے جڑا رہے گا۔

وہ لمحہ جو آج شام آیا تھا، ریلوے لائن کے سامنے جب وہ انجینئر بابو کے ساتھ کھڑی تھی، وہ شاید غلط تھا۔ اپنے آپ میں ایک خوش کن گمان سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ لمحہ پھر اس کی زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔

رات بھر بوا کے کمرے میں کھانسنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ آدھی رات کے وقت ترن بابو کے کمرے

تک گئی اور نہ جانے کتنی دیر تک اندھیرے میں دروازے سے سٹ کر کھڑی رہی۔ اسے لگا تھا جیسے ماں اس رات دوبارہ مر گئی ہو اور جو آنسو بچپن میں نہیں بہہ سکے تھے وہ اتنے برسوں سے اسی رات کا انتظار کرتے رہے ہوں۔

اپنے کمرے میں واپس آ کر ترن چپ چاپ کھلی کھڑکی کے آگے کھڑی رہی۔ دور دور تک میدان میں پھیکی سی چاندنی بکھری تھی۔ ریلوے لائن کے پرے تین چار بتیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ انہیں کے آس پاس کہیں انجینئر بابو رہتے ہوں گے، ترن نے سوچا۔ اسے اس لمحے انجینئر بابو کی بات یاد آئی کہ کچھ برسوں میں سب کچھ بدل جائے گا...... کیا انجینئر بابو سچ کہہ رہے تھے؟ کیا سچ مچ سب بدل جائے گا؟ ترن کے ہونٹوں پر ایک روکھی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

کھڑکی سے ہٹ کر ترن اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ تھکان کے مارے پلکیں بھاری ہو گئی تھیں، پھر بھی دیر تک نیند نہیں آئی۔ ایک بار بیچ میں کچی نیند کا ہلکا سا جھونکا آیا تھا تو لگا تھا جیسے سامنے بھائی کھڑے ہوں۔ ویسی ہی شکل تھی، وہی اداس سی آنکھیں...... اور ترن دیر تک بھائی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ کتنے برسوں سے انہیں نہیں دیکھا ہے! اب تک شاید وہ بالکل بدل گئے ہوں گے۔

ایک دھندلی سی تصویر آنکھوں کے سامنے ابھر جاتی ہے...... کہیں بہت دور، چائے کے باغوں کے جھرمٹ میں ان کا بنگلہ چھپا ہوگا۔ کہتے ہیں وہاں اسٹیمر پر جانا پڑتا ہے۔ نہ جانے اسٹیمر میں بیٹھ کر کیسا لگتا ہوگا!

وجے دان دیتھا
ہندی سے ترجمہ: اجمل کمال

دُبدھا

ایک دھنی سیٹھ تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے کی برات دھوم دھام سے شادی کی تقریب مکمل کر کے واپس لوٹتے ہوئے جنگل میں بسرام کرنے کے لیے رُکی۔ گھنی کھیجڑی کی ٹھنڈی چھاؤں۔ سامنے ہلورے بھرتا تالاب، کنول کے پھولوں سے ڈھکا ہوا شفاف پانی۔ سورج سر پر چڑھنے لگا تھا۔ جیٹھ کی تیز چلتی گرم لُو سے جنگل چیخ رہا تھا۔ کھانا دانا کھا کر چلیں تو بہت دو لھے کے پتا نے زیادہ منوہار کی تو سب براتی خوشی خوشی وہاں ٹھہر گئے۔ دلہن کے ساتھ پانچ داسیاں تھیں۔ وہ سب اس کھیجڑی کی چھاؤں میں دری بچھا کر بیٹھ گئیں۔ پاس ہی ایک وشال ببول تھا، پیلے پھولوں سے اٹا ہوا۔ چاندی کے سمان سفید ہلاریاں۔ باقی براتی اس کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بسرام کرنے کے بعد کھانے کا انتظام ہونے لگا۔

دلہن منہ پھرائے، گھونگھٹ ہٹا کر بیٹھ گئی۔ اوپر دیکھا۔ پتلی پتلی ان گنت ہری سانگریاں ہی سانگریاں۔ دیکھتے ہی آنکھوں میں ٹھنڈک پھیل گئی۔ اتفاق کی بات کہ اس کھیجڑی میں ایک بھوت کا بسیرا تھا۔ عطر پھلیل کی خوشبو سے مہکتے دلہن کے کھلے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کیا عورت کا ایسا روپ اور جوبن بھی ہوسکتا ہے! گلاب کے پھولوں کی کوملتا، خوشبو اور ان کا رس، مانو سانچے میں ڈھل گیا ہو۔ دیکھ کر بھی ایسے روپ پر یقین نہیں ہوتا۔ بادلوں کا ٹھکانا چھوڑ کر کہیں بجلی تو نہیں اتر آئی! ان مدھ بھری آنکھوں کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ مانو تمام فطرت کا روپ اس چہرے میں سما گیا ہو۔ ہزاروں عورتوں کا روپ دیکھا، پر اس چہرے کی تو رنگت ہی نرالی! کھیجڑی کی چھاؤں تک چمکنے لگی۔ بھوت کی جون سوارت ہوئی۔ دلہن کے بدن میں داخل ہونے کا خیال آنے پر اسے واپس ہوش آیا۔ اس سے تو اسے تکلیف ہوگی! ایسے روپ کو تکلیف کیسے دی جاسکتی ہے۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ یہ تو ابھی دیکھتے دیکھتے چلی جائے گی۔ پھر نہ اس میں داخل ہو کر ستانے کو من کرتا ہے اور نہ تڑپے کا ہی۔ اس روپ کے تڑپنے پر نہ بادل برسیں گے نہ بجلیاں چمکیں گی۔ نہ سورج اُگے گا نہ چاند۔ قدرت کا سارا نظارہ ہی بگڑ جائے گا۔ اس کے من میں اس طرح کی دیا پہلے تو کبھی نہیں آئی۔ اس روپ کو دکھ دینے کے بجائے تو خود دکھ اٹھانا کہیں اچھا ہے۔ ایسا دکھ بھی کہاں نصیب

ہوتا ہے! اس دکھ کے لمس سے تو بھوت کا جیون مکمل ہو جائے گا۔

آخر بسرام کے بعد تو روانہ ہونا ہی تھا۔ دلہن جب اٹھ کر چلنے لگی تو بھوت کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ رات میں بھی صاف دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے یہ دھند کیسی! سر چڑھے سورج کی روشنی پر اچانک یہ کالک کیسے پت گئی!

چھم چھم کرتی ہوئی دلہن دولھے کے رتھ پر سوار ہوگئی۔ یہ دولھا کتنا خوش قسمت ہے! کتنا سکھی ہے! بھوت کے روم روم میں مانو کانٹے چبھنے لگے۔ دل میں جیسے آگ بھڑک اٹھی۔ برہا کی اس جلن کے کارن نہ تو مرنا ممکن ہے اور نہ ہی جینا۔ جیتے جی یہ جلن کیسے سہی جا سکتی ہے! اور مرنے پر تو یہ جلن بھی کہاں! بھوت کے من میں ایسی الجھن تو کبھی نہیں ہوئی رتھ کے اوجھل ہوتے ہی وہ بے ہوش ہو گیا۔

اور ادھر رتھ میں بیٹھے دولھے کے دل کی الجھن بھی کم نہیں تھی۔ دو گھڑی ہوگئی مغز ماری کرتے ہوئے، پر ابھی تک بیاہ کے خرچ کا حساب نہیں مل رہا تھا۔ باپو بہت ناراض ہوں گے۔ خرچ بھی کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ ایسی بھول چوک ہونے پر وہ آسانی سے خوش نہیں ہوتے۔ حساب اور بیوپار کا سکھ ہی سب سے بڑا سکھ ہے۔ باقی سب جھمیلے۔ خود بھگوان بھی پکا حسابی ہے۔ ہر ایک کے سانسوں کا پورا حساب رکھتا ہے۔ برسات کی بوند بوند، ہوا کی رگ رگ اور دھرتی کے ذرے ذرے کا اس کے پاس ایک دم صحیح لیکھا ہے۔ قدرت کے حساب میں بھی جب بھول نہیں ہوتی تب بنیے کی بہی میں بھول کیسے کھٹ سکتی ہے!

تیوری پر بل ڈالے دولھا ہندسوں کی جوڑ توڑ بٹھا رہا تھا کہ دلہن نے رتھ کے پردے کو ہٹا کر باہر دیکھا۔ نظر نہ ٹکے، ایسی تیز دھوپ۔ ہرے بھرے کیروں پر سرخ ڈھالو دمک رہے تھے۔ کتنے سہانے! کتنے موہک! مسکراتے ڈھالوؤں میں دلہن کی نظر اٹک گئی۔ دولھے کی بانہہ پکڑ کر دلہن ناسمجھ بچے کی طرح بولی۔ ''ایک دفعہ بہی سے نظر ہٹا کر باہر تو دیکھو۔ یہ ڈھالو کتنے سندر ہیں! ذرا نیچے جا کر دو تین انجلی ڈھالو تو لا دو۔ دیکھو، ایسی جلتی دھوپ میں بھی یہ پھیکے نہیں پڑے۔ جوں جوں دھوپ پڑتی ہے، توں توں رنگ اور نکھرتا ہے۔ دھوپ میں کیسا بھی رنگ یا تو اڑ جاتا ہے یا سانولا پڑ جاتا ہے۔''

دولھا انسان جیسا انسان تھا۔ نہ زیادہ خوب صورت اور نہ زیادہ بدصورت۔ بیاہ تو بھری جوانی میں ہی ہوا تھا، پر اسے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ پانچ برس بعد ہوتا تو بھی چل جاتا، اور ہو گیا تو بھی اچھا۔ کبھی نہ کبھی تو ہونا ہی تھا۔ بڑا کام نبٹ گیا۔ نو لکھے ہار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا، ''یہ ڈھالو تو ٹھیٹھ گنواروں کی پسند ہیں۔ تمہیں ان کی خواہش کیسے ہوئی؟ کھانے کی اچھا ہو تو گانٹھ کھول کر چھوارے دوں، ناریل دوں۔ جی بھر کر کھاؤ۔''

دلہن بھی نپٹ گنوار نکلی۔ ہٹ کرتی ہوئی سی بولی، ''نہیں، مجھے تو بس ڈھالو لا دو۔ آپ کا احسان مانوں

گی۔ آپ تکلیف نہ اٹھانا چاہیں تو مجھے اجازت دیں، میں توڑ لاتی ہوں۔"

دولھے نے پھر وہی بات کی۔ کہا، "ان کانٹوں سے کون الجھے! جو ایک دم جنگلی ہوتے ہیں۔ وہی ڈھالو توڑتے ہیں اور وہی کھاتے ہیں۔ کھانے کھاؤ، بتاشے کھاؤ۔ چاہو تو مصری کھاؤ۔ ان نمبولیوں اور ڈھالوؤں کی تو گھر پر بات ہی مت کرنا۔ لوگ ہنسیں گے۔"

"ہنسنے دو۔"

دلہن یہ بات کہہ کر ترنت رتھ سے کود پڑی۔ تتلی کی طرح کیر کیر پر اڑتی رہی۔ کچھ ہی دیر میں اوڑھنی بھر کر سرخ ڈھالو لے آئی۔ گھڑے کے پانی سے انہیں اچھی طرح دھویا، ٹھنڈا کیا، ہونٹوں اور ڈھالوؤں کا رنگ ایک سا۔ پر دولھے کو نہ ڈھالوؤں کا رنگ اچھا لگا نہ ہونٹوں کا۔ وہ تو حساب میں الجھا ہوا تھا۔ دلہن نے کافی نہورے کیے، پر وہ ڈھالو کھانے پر راضی نہ ہوا۔

دلہن نے کہا، "آپ کی مرضی۔ اپنی اپنی پسند ہے۔ میرا تو ایک بار من ہوا کہ ان ڈھالوؤں کے بدلے نولکھا ہار کیر میں ٹانک دوں تب بھی کم ہے۔"

ڈھالو کھاتی دلہن کے چہرے کی طرف دیکھ کر دولھا کہنے لگا، "ایسی بے وقوفی کی بات پھر کبھی مت کرنا۔ باپو بہت ناراض ہوں گے۔ وہ روپ کے بجائے عورت کے گنوں کا زیادہ آدر کرتے ہیں۔"

دلہن مسکراتی ہوئی سی بولی، "اب معلوم ہوا، ان کے ڈر سے ہی آپ حساب میں الجھے ہوئے ہیں۔ پر ساری باتیں اپنی اپنی جگہ شوبھا دیتی ہیں۔ بیاہ کے وقت حساب میں پھنسنا، یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

دولھے نے کہا، "بیاہ ہونا تھا سو ہو گیا، پر حساب تو ابھی باقی ہے۔ بیاہ کے خرچ کا سارا حساب سنبھلا کر ٹھیک تیج کے دن مجھے بیوپار کے لیے دساور جانا ہے۔ ایسا شبھ مہورت پھر سات برس تک نہیں ہے۔"

پر گنوار دلہن کو اس شبھ مہورت کی بات سن کر رتی بھر بھی خوشی نہیں ہوئی۔ بات سنتے ہی ڈھالوؤں کا سواد بگڑ گیا۔ لگا جیسے کوئی دل کو دبا کر خون نچوڑ رہا ہو۔ یہ کیسی انہونی بات سنی! اک بارگی یقین ہی نہیں آیا۔ پوچھا، "کیا کہا؟ آپ بیوپار کی خاطر دساور جائیں گے؟ سنا ہے آپ کی حویلی میں تو دولت کے بھنڈار بھرے ہیں۔"

دولھا گمان بھرے لہجے میں بولا، "اس میں کیا شک ہے! تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ ہیرے موتیوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ پر دولت تو دن دونی اور رات چوگنی بڑھتی رہے تبھی اچھا ہے۔ بیوپار تو بنیے کا پہلا دھرم ہے۔ ابھی تو دولت بہت بڑھانی ہے۔ ایسا بڑھیا مہورت کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔"

دلہن نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ بات کرنے کا مطلب ہی کیا تھا۔ ایک ایک کر کے سارے ڈھالو باہر پھینک دیے۔ دولھے نے مسکرا کر کہا، "میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ ڈھالو تو گنواروں کے کھانے کی

چیز ہیں! اپن بڑے آدمیوں کو یہ اچھے نہیں لگتے۔ آخر کھاتے نہیں بنے تو تمہیں بھی پھینکنے ہی پڑے۔ تیز دھوپ میں جلیں سو الگ!''

یہ بات کہہ کر دولھا تخمینہ لگانے کے لیے رتھ سے باہر دیکھنے لگا۔ نظر سلگ اٹھے، ایسی تیز دھوپ۔ پہلے پھولوں سے لدی ہنگانیوں کی ان گنت جھاڑیاں اسے ایسی لگیں مانو ٹھور ٹھور آگ کی لپٹیں اٹھ رہی ہوں۔ دولھے نے تاکید کرتے ہوئے کہا،''اب ان ہنگانیوں کی خاطر تو ضد نہیں کروگی؟ ان میں اچھائی ہوتی تو بھلا گڈریے کب چھوڑتے۔''

دلہن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ سوچنے لگی کہ اس پتی کے بھروسے گھر کا آنگن چھوڑا، ماں باپ کی جدائی سہی۔ سہیلیوں کے جھنڈ، بھائی بھتیجے، تالاب کا کنارہ، گیت، گڈے گڈی کا کھیل، تھرٹی، آنکھ مچولی، دھما چوکڑی، یہ تمام سکھ چھٹکا کر اس پتی کا ہاتھ تھاما، ماں کی گود چھوڑ کر پرائے گھر کی آس کی اور یہ ٹھیک تیج کے دن شبھ مہورت کی بیلا بیوپار کے لیے دساور جانا چاہتے ہیں! پھر یہ بے شمار دولت کس سکھ کے لیے ہے؟ جیتے جی کام آتی نہیں، مرنے پر کفن کی غرض بھی پوری نہیں کرتی۔ کس سکھ کی آشا میں ان کے پیچھے آئی۔ کس ان دیکھی خوشی اور سکون کے بھروسے پرائی ٹھور کا نواس قبول کیا۔ کمائی، تجارت، جائیداد اور دولت پھر کس دن کے لیے ہے۔ اصل سکھ کے اس سودے کے بدلے تین لوک کا راج ہاتھ لگے تو بھی کس کام کا! دنیا کی ساری دولت کے بدلے بھی بیتا ہوا پل واپس نہیں لوٹایا جاسکتا۔ انسان دولت کی خاطر ہے کہ دولت انسان کی خاطر، فقط اسی حساب کو اچھی طرح سمجھنا ہے۔ پھر کون سا حساب باقی رہ جاتا ہے! سونے کی عظمت بڑی ہے یا بدن کی، سانس کی عظمت بڑی ہے یا دولت کی، اس سوال کے جواب میں ہی زندگی کے سارے معنی پروئے ہوئے ہیں۔

دولھا اپنے حساب میں ڈوبا تھا، دلہن اپنے خیالوں میں غوطے لگارہی تھی اور بیل اپنی چال میں مگن تھے۔ چلنے والا منزل پر پہنچے گا ہی، آخر سیٹھ کی حویلی کے سامنے برات آکر رکی۔ گاجے باجے اور ڈھول نگاڑوں کے سواگت کے ساتھ دلہن رنواس (رانیوں کے رہنے کی جگہ، مراد زنان خانہ یا خواب گاہ) میں پہنچی۔ جس نے بھی دیکھا سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ روپ ہو تو ایسا! رنگ ہو تو ایسا!

شام کو رنواس میں گھر کے دیئے جلائے گئے۔ رات کے دوسرے پہر دولھا رنواس میں آیا۔ آتے ہی دلہن کو نصیحت دینے لگا کہ وہ گھر کی عزت کا پورا پورا خیال رکھے، ساس سسر کی سیوا کرے، اپنی آبرو اپنے ہاتھ میں۔ دو دن کے لیے بدن کی چاہ کیوں جگائی جائے! دو دن کا ساتھ رہنا پانچ سال تک تکلیف دے گا۔ وقت بیتتے کیا دیر لگتی ہے! دیکھتے دیکھتے پانچ سال گزر جائیں گے۔ پھر کس بات کی کمی۔ یہی رنواس، یہی چراغ، یہی

راتیں اور یہی سیج۔ وہ کسی بات کی چنتا کو پاس ہی نہ پھٹکنے دے۔ پلک جھپکتے پانچ برس گزر جائیں گے۔

نصیحت کی یہ انمول باتیں دلہن چپ چاپ سنتی رہی۔ کچھ کہنا سننا اور کرنا تو اس کے بس میں تھا نہیں، جو پتی کی اچھا وہی اس کی اچھا۔ جو باپو کی مرضی وہی بیٹے کی مرضی۔ جو لکشمی کی خوشی وہی باپو کی خوشی۔ اور جو لالچ کی اِچھا وہی لکشمی کی اِچھا۔ نصیحت کی ان باتوں میں ساری رات ڈھل گئی۔ رات کے ساتھ جھلمل جھلمل چمکتے نولاکھ تارے بھی ڈھل گئے۔

اور ادھر اس کھیجڑی کے نیچے بے ہوشی ٹوٹنے پر بھوت کی آنکھیں کھلیں۔ چاروں طرف دیکھا۔ سونا جنگل، سونی ہریالی، گہری کھیجڑی، گہری چھاؤں۔ جھولتی سانگریاں، پر کہاں دلہن، کہاں اس کی مدھ بھیر آنکھیں، کہاں اس کا خوبصورت چہرہ، کہاں اس کے گلابی ہونٹ۔ کہیں وہ سپنا تو نہیں تھا۔ بے ہوشی کے بعد ہوش میں آتے ہی اسے ایسا لگا مانو اس کے من میں چھل کپٹ کے میل کی جگہ دودھ کی گرم دھاروں نے لے لی ہو۔ ایسا سورج تو آج سے پہلے کبھی نہیں اُگا۔ بڑا سا گلابی گولہ۔ تمام دنیا میں روشنی ہی روشنی۔ کیسی مند مند ہوا چل رہی ہے! ہوا کے ان دیکھے جھولے میں جھولتی ہریالی۔ اس کا من ہر طرح کے ان گنت روپ دھار کر قدرت ک ذرے ذرے میں سما گیا۔

ارے! آج سے پہلے تو سورج اس طرح غروب نہیں ہوا! پچھم دشا میں مانو گلال ہی گلال چھترا گیا ہو۔ دھرتی پر نہ تو کھلتی ہوئی روشنی نہ پورا اندھیرا۔ نہ گگن میں چاند نہ سورج اور نہ ہی کوئی تارا۔ گویا قدرت نے جھینا گھونگھٹ ڈال لیا ہو۔ چہرہ بھی دکھتا ہے، گھونگھٹ بھی دکھتا ہے۔ اب قدرت نے پھر چندری بدلی۔ نولکھ تاروں جڑی چندری۔ دھندلا دھندلا چہرہ دکھ رہا ہے۔ دھندلے پیڑ، دھندلی ہریالی۔ گویا سپنے کا تانا بانا بنا جا رہا ہو۔ پہلے تو قدرت کبھی اتنی موہک نہیں لگی۔ یہ سب دلہن کے چہرے کا کرشمہ ہے!

اور اُدھر دلہن کا پتی اس جوبن سے منہ پھیر کر دساور کی راہ چل پڑا۔ کمر پر ہیرے موتیوں کی پوٹلی بندھی ہوئی تھی۔ کندھے پر آگے پیچھے لٹکتی دو گٹھریاں اور سامنے آکاش پر چمکتا بیوپار کا اکھنڈ سورج۔ سکھ، لابھ اور کمائی کا کیا پار!

جاتے ہوئے وہ اسی کھیجڑی کے پاس سے گزرا۔ بھوت نے اسے ترنت پہچان لیا۔ آدمی کا روپ دھار کر اس سے رام رام کیا۔ پوچھا، ''بھائی، ابھی تو بیاہ کے منگل دھاگے بھی نہیں کھلے۔ اتنی جلدی کہاں چل دیے؟''

سیٹھ کے لڑکے نے کہا، ''کیوں، منگل دھاگے کیا دساور میں نہیں کھل سکتے؟''

بھوت کافی دور تک ساتھ چلتا رہا۔ ہماری باتیں جان لیں کہ وہ پانچ سال تک پردیس میں بیوپار کرے گا۔ اگر یہ مہورت چوک جاتا تو اگلے سات سال تک ایسا بڑھیا مہورت ہاتھ نہ لگتا۔ سیٹھ کے لڑکے کی بول

چال اور سبھاؤ کو غور سے دیکھنے بھالنے کے بعد اس نے اپنی راہ لی۔ من ہی من میں سوچنے لگا کہ سیٹھ کے لڑکے کا روپ دھار کر سویرے ہی سیٹھ کی حویلی پہنچ جائے تو پانچ سال تک کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ یہ بات تو خوب بنی! کیا عمدہ موقع ہاتھ لگا ہے! آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔ بھگوان نے آخر بنتی سن ہی لی۔ پھر تو اس سے ایک پل بھی نہیں رہا گیا۔ ہو بہو سیٹھ کے لڑکے کا روپ دھار کر گاؤں کی طرف چل پڑا۔ من میں نہ خوشی کی حد تھی نہ آنند کی۔

ایک پہر دن باقی تھا تو بھی کافی اندھیرا ہو گیا۔ اتر سے زور کی کالی پیلی آندھی آتی نظر آئی۔ آندھی دھیرے دھیرے چڑھنے لگی۔ دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھنے لگا۔ سورج کے ہوتے ہوئے بھی اندھیرا! ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ قدرت کو بھی کیسے کیسے سپنے آتے ہیں۔ قدرت کے اس سپنے کے بنا زمین پر بچھی ہوئی پیروں تلے کی دھول کو سورج ڈھکنے کا موقع کب ہاتھ لگتا ہے! زمین پر پڑی دھول آکاش پر چڑھ گئی۔ اندھڑ کی مار سے سارا ماحول کراہنے لگا۔ پہاڑوں تک کی جڑیں ہلا دینے والی آندھی۔ کھوکھلے غرور والے بڑے پیڑ چرمرا کھڑنے لگے۔ نرمی رکھنے والی لچکیلی جھاڑیاں آندھی کے ساتھ ہی ادھر ادھر جھکنے لگیں۔ ان کا کچھ بھی نہیں بگڑا۔ پیروں تلے روندی جانے والی گھاس کا تو کچھ بھی خراب نہیں ہوا۔ حال چال پوچھتی، دُلارتی، سہلاتی ہوئی آندھی اس کے اوپر سے نکل گئی۔ ساری ونس پتی مانو پالنے میں جھولنے لگی۔ پات پات اور کونپل کونپل کی ٹھیک سے سنبھال ہو گئی۔ بڑے پرندوں کو چھپانے لگنے لگے۔ چھوٹے پنچھی ڈالوں سے چپک کر بیٹھ گئے۔ اڑنا ممکن نہ رہا۔ سموچے آکاش پر آندھی کا راج ہو گیا۔ چاروں جانب تیز سرسراہٹ، گویا جنگل کراہ رہا ہو۔ سورج کے تاپ اور تیج کو دھرتی کی دھول نگل گئی۔ عجیب ہے آندھی کا یہ نرت! عجیب ہے ریت کی یہ گھومر! سموچی قدرت اس طوفان میں چھپ گئی۔ سارا برہمانڈ ایک آکار ہو گیا۔ نہ آکاش دکھتا ہے نہ سورج۔ نہ پہاڑ نہ ونس پتی اور نہ زمین۔ بے شکل! پراسرار۔ قدرت کی اس ذرا سی جماہی کے سامنے نہ انسان کے دھیان کی کوئی ہستی ہے نہ اس کی طاقت کی کچھ اوقات، نہ اس کی انا کی کچھ حیثیت اور نہ اس کے کام کاج کی کوئی حقیقت۔

قدرت کی شبیہ کی دوسری تصویر۔ تھوڑا تھوڑا اجالا پھیلنے لگا۔ ہاتھ کو ہاتھ سوجھنے لگا۔ پل پل اجالے کا وجود پھیلنے لگا۔ دھیرے دھیرے قدرت کی شبیہ صاف دکھنے لگی۔ پہاڑ کی جگہ پہاڑ، سونے کی تھالی سا گول سورج، پیڑوں کی جگہ پیڑ، جھاڑیوں کی جگہ جھاڑیاں، ہوا کی جگہ ہوا۔ یہ کیا جادو ہوا...... کہ یکا یک تڑاتڑ موسلا دھار پانی برسنے لگا۔ بوند سے بوند ٹکرانے لگی۔ گویا بادلوں کے منہ کھول دیے گئے ہوں۔ قدرت اشنان کرنے لگی۔ اس کا ذرہ ذرہ نہا گیا۔ ندی نالوں میں پانی بہنے لگا۔ چاروں اور پانی ہی پانی۔ نہاتی ہوئی قدرت کو دیکھ

کر سورج کی چھپی روشنی پر سکون ہوئی۔
بھوت سوچنے لگا کہ کچھ ہی دیر میں یہ کیا ماجرا ہوا۔ دیکھنے پر بھی یقین نہ ہو، یہ قدرت کی کیسی حرکت ہے۔ یہ کیا ہوا، کیسے ہوا، کہیں اس کے من کی آندھی ہی تو باہر ظاہر نہیں ہوئی، قدرت کی یہ لیلا کہیں اس کے من ہی میں تو دبی ہوئی نہیں تھی؟ اس گمان کے زور میں تیز چلنے لگا۔ دل ہی دل میں تدبیر سوچتا جارہا تھا اور رہ چلتا جارہا تھا۔
وہ حویلی نہ جاکر پہلے سیدھا سیٹھ کی دکان پر پہنچا۔ حساب کتاب کرتے ہوئے سیٹھ نے بیٹے کو دیکھا، تب بھی اس کا دل نہ مانا۔ دساور کے لیے گیا ہوا بیٹا واپس کیسے آسکتا ہے؟ آج دن تک اس نے کبھی کہنا نہیں ٹالا۔ بیاہ ہونے کے بعد انسان کام کا نہیں رہتا، یہ سب کیا دھرا دلہن کا ہے۔ اب ہو چکی کمائی! یا تو بیوپار کی حاضری بجالو یا پھر عورت کی۔
باپو کے ہونٹوں پر آتی بات کو بیٹا بغیر کہے ہی سمجھ گیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا، ''پہلے آپ میری بات سنو! بیوپار کے لیے صلاح مشورہ کرنے کے لیے ہی واپس آیا ہوں۔ اگر آپ کی مرضی نہیں ہوگی تو گھر گئے بغیر ہی واپس مڑ جاؤں گا۔ راستے میں سمادھی لگائے ایک مہاتما کے درشن ہوگئے۔ سارے شریر پر دیمک کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں نے ستھرائی سے دیمک ہٹائی، کنویں سے پانی نکال کر انہیں نہلایا، پانی پلایا، کھانا کھلایا۔ تب مہاتما نے خوش ہوکر وردان دیا کہ سویرے پلنگ سے نیچے اترتے ہی مجھے روزانہ پانچ مہریں ملیں گی۔ دساور جانے کی بات سوچتے ہی وردان ختم ہو جائے گا۔ اب آپ جو حکم دیں مجھے منظور ہے۔''
ایسے غیر متوقع وردان کے بعد جو حکم ہونا تھا وہی ہوا۔ سیٹھ خوشی خوشی مان گیا۔ سیٹھ کے ساتھ سیٹھانی بھی بہت خوش ہوئی۔ اکلو بیٹا آنکھوں کے سامنے رہے گا، اور کمائی کی جگہ کمائی کا جگاڑ ہوگیا۔ دلہن کو خوشی کے ساتھ تعجب اور غرور بھی ہوا کہ بھلا یہ روپ چھوڑ کر کون دساور جاسکتا ہے۔ تیسرے دن ہی واپس لوٹنا پڑا۔
دکان کا حساب کتاب اور بھوجن کر کے پتی دو گھڑی رات ڈھلنے پر رنواس میں آکر سوگیا۔ چاروں کونوں میں گھی کے دیے جل رہے تھے۔ پھولوں کی سیج۔ ایسے انتظار سے بڑھ کر کوئی آنند نہیں۔ پایل کی جھنک جھنکار سنائی دی۔ اس جھنکار سے بڑھ کر کوئی سر نہیں۔ سولہ سنگھار سجی دلہن رنواس میں آئی۔ اس حسن سے بڑھ کر کوئی منظر نہیں۔ سموچے رنواس میں عطر پھلیل کی خوشبو چھاگئی۔ اس خوشبو سے بڑھ کر کوئی مہک نہیں۔ اس مہک نے ہی اس کھیجڑی کے مقام پر بھوت کی سوئی خواہشوں کو جگایا تھا اور آج رنواس میں آخر ان کی نظروں کا ملن ہوا۔ اتنی جلدی من چاہی ہو جائے گی، اس کا تو سپنے میں بھی خیال نہیں تھا۔
دلہن بے فکر پاس آکر بیٹھ گئی۔ گھونگھٹ کیا ہٹایا، مانو تینوں لوکوں کا پورا سکھ جگمگا رہا ہو۔ اس روپ کی تو

چھایا بھی دکھتی ہے۔ دلہن مسکراتی ہوئی بولی،''میں جانتی تھی کہ تم بیچ راہ ہی سے لوٹ آؤ گے۔ یہ تاروں بھری رات اس موقعے پر آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ ایسے ارادے کے مالک تھے تو پھر میرے روکنے کے باوجود گئے ہی کیوں؟ میری منت پوری ہوئی۔''

یہ بات سنتے ہی بھوت کے من میں بگولا سا اٹھا۔ اس پوتر دودھ میں کیچڑ کیسے ملائے؟ اسے دھوکا دینے سے بڑھ کر کوئی پاپ نہیں۔ یہ تو اصلی پتی مان کر اتنی خوش ہوئی ہے، پر اس سے بدتر جھوٹ اور کیا ہوسکتا ہے! یہ جھوٹ کا انتم چھور ہے۔ آخری حد اس معصوم پیار کے ساتھ کیسے دغا کرے! پیار کرنے کے بعد تو بھوتوں کا من بھی ڈھل جاتا ہے۔ کوئی برابر کا ہو تو چھل بل کی طاقت بھی آزمائے، پر نیند میں سوئے ہوئے کا گلا چاک کرنے پر تو تلوار میں بھی کلنک لگتا ہے۔

بھوت تھوڑا دور کھسک کر بولا،''کیا معلوم منت پوری ہوئی یا نہیں۔ پہلے پوری چھان بین تو کرلو کہ میں کہیں دوسرا آدمی تو نہیں ہوں۔ کوئی جعل ساز تمہارے پتی کا روپ دھار کر تو نہیں آ گیا!''

دلہن یہ بات سن کر پہلے تو کچھ چونکی، پھر نظر گڑا کر پاس بیٹھے شخص کو اچھی طرح دیکھا۔ ہو بہو وہی چہرہ، وہی رنگ روپ، وہی بولی۔ ترنت سمجھ گئی کہ پتی اس کے کردار کو پرکھنا چاہتا ہے۔ مسکراہٹ کی چمک پھیلاتے ہوئے بولی،''میں سپنے میں بھی پرائے مرد کے سائے تک کا لمس نہیں آنے دیتی۔ پھر کھلی آنکھوں یہ بات کیسے ممکن ہے۔ اگر دوسرا آدمی ہوتا تو میرے کردار کی آگ سے کبھی کا بھسم ہو چکا ہوتا۔''

پہلے تو یہ بات بھوت کو چبھی، ہونٹوں پر آئی ہوئی بات کو فوراً نگل گیا کہ تب تو اس کے کردار میں ضرور ہی کھوٹ ہے۔ وہ بھسم ہو جاتا تو اس کا کردار سچا تھا۔ اصلیت میں دوسرا آدمی ہوتے ہوئے بھی جب وہ بھسم نہیں ہوا تو اس کا کردار ایک دم بجھا ہوا ہے۔ پر اگلے ہی پل بات کا دوسرا پہلو سوچتے ہی اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ الٹا بے حد خوش ہوا۔ سوچنے لگا کہ فقط چہرے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر وہ سچا پتی ہوتا تو بیوپار کے لالچ میں عورت کی یہ مایا چھوڑ سکتا تھا! کیا اس نے اس لیے ہاتھ تھاما کہ ایسے روپ کو برہ کی آگ میں جلنے کے لیے چھوڑ کر چلتا بنے؟ کوئی اندھا بھی اس روپ کی دمک کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ تب وہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی کس طرح اندھا بنا؟ آگ کی گواہی میں سات پھیرے لگا لیے تو کیا ہوا، اس کی پریت میں سچائی کہاں ہے! اور بھوت ہوکر بھی میں نے سچا پیار کیا۔ چھل کرتے ہوئے دل کانپتا ہے۔ میری پریت سچی ہے۔ میری چاہت کھری ہے۔ تبھی تو دونوں کا ست بچ گیا۔ پر پھر بھی راز رکھنے سے پریت کو ٹھیس لگے گی۔ اصلیت بتائے بغیر اس رنواس میں سانس لینا بھی دوبھر ہے۔ پاس کھسک کر کہنے لگا،''دراصل میں ہوں تو دوسرا آدمی ہی، پر پھر بھی تمہارا کردار کھرا ہے، کیونکہ میری پریت سچی ہے۔ منڈپ کے اصلی پتی کی پریت جھوٹی ہے۔ تبھی تو وہ

ایسے روپ سے منہ پھیر کر دساور کے لیے چل پڑا۔"

پر دلہن سچ جھوٹ کی کیسے پہچان کرے! یہ باتیں رتی بھر بھی اس کے پلے نہیں پڑیں۔ خود ماں باپ جسے اپنا بیٹا مانتے ہیں، اس ہو بہو شکل والے آدمی کو اپنا پتی ماننے میں کیسی ہچکچاہٹ! شکل اور رنگ روپ ہی تمام رشتوں کی سب سے بڑی پہچان ہے۔

تب اس کے بعد اس بھوت نے دلہن کو ساری بات بتائی، کہ اس کھیجڑی کے مقام پر اس کا روپ دیکھ کر اس کی کیا دشا ہوئی۔ اس کے روانہ ہوتے ہی وہ کیسے غش کھا گیا۔ واپس کب ہوش آیا۔ پردیش جاتے ہوئے اس کے پتی کے ساتھ اس کی کیا کیا باتیں ہوئیں۔ پھر اس کا روپ دھار کر کیسے اس حویلی پر آنے کا ارادہ کیا۔ راہ چلتے ہوئے آندھی پانی کی بات بھی دستار سے کہی۔ دلہن کٹھ پتلی کی طرح گم سم بیٹھی ساری بات سنتی رہی۔ کیا اسی بات کو سننے کی خاطر اوپر والے نے اسے کان دیے ہیں؟

اس کی کلائی کو سہلاتے ہوئے بھوت آگے کہنے لگا، "ماں باپ کو تو روز کی پانچ مہروں اور دکان کی کمائی سے مطلب ہے۔ اصل بھید سے انہیں کچھ لینا دینا نہیں۔ پر تمہیں نہ جتانے پر پریت کے منہ پر کالک پت جاتی۔ اگر میں یہ بھید ظاہر نہ کرتا تو پانچ سال تک تم سپنے میں بھی اصلیت نہ جان پاتیں۔ تم تو اصلی پتی مان کر ہی ملاپ کرتیں۔ پر میرا من نہیں مانا۔ میں اپنے من سے صحیح بات کیسے چھپاتا؟ آج سے پہلے بہت سی عورتوں کے شریر میں گھس کر انہیں بہت تکلیف دی، پر میرے من کی ایسی حالت تو کبھی نہیں ہوئی۔ رام جانے اتنی دیا میرے من کے کس کونے میں چھپی تھی۔ اس کے باوجود اگر تمہاری خواہش نہ ہو تو میں اسی پل واپس چلا جاؤں گا۔ جیتے جی اس طرف منہ تک نہیں کروں گا۔ تمہیں تڑپا کر مجھے پریت کا آنند نہیں چاہیے۔ پھر بھی عمر بھر تمہارا احسان مانوں گا کہ تمہاری پریت کی وجہ سے میرے دل کا زہر امرت میں بدل گیا۔ عورت کے روپ اور مرد کی پریت کی یہی تو سب سے اونچی سطح ہے۔"

روپ کی پتلی کے ہونٹ کھلے۔ بولی، "ابھی تک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ بھید ظاہر ہونا ٹھیک رہا یا ظاہر نہ ہونا ٹھیک رہتا۔ کبھی پہلی بات ٹھیک لگتی ہے، کبھی دوسری۔"

دلہن کی آنکھوں میں نظر گڑا کر بھوت نے کہا، "زہ کے درد کو بھلا بانجھ کیا سمجھے! اس پیڑا میں ہی کوکھ کا سب سے گہرا سکھ نواس کرتا ہے۔ سچائی اور کوکھ کے پھل کا درد ایک سا ہوتا ہے۔ اس سچائی کو چھپانے میں نہ تو تکلیف تھی اور نہ ہی آنند۔ وہ تو فقط حقیقت کا دھوکا ہوتا۔ آنند کا ڈھونگ۔ میں کئی عورتوں کے شریر میں داخل ہوا، تب کہیں جا کر حقیقت کے دھوکے کی ٹھیک سے پہچان ہوئی۔ میں کئی ایسی ستی ساوتری عورتوں کو جانتا ہوں جو ملاپ کے وقت پتی کے چہرے میں کسی اور کا چہرہ دیکھتی ہیں۔ یوں کہنے کو تو وہ پرائے مرد کی چھایا کو بھی

نہیں چھوتیں، پر پتی کے بہانے دوسرے چہرے کے خیال میں شوہر سے کتنی وفاداری ہے اس کی صحیح پہچان جتنی مجھے ہے اتنی خود اوپر والے کو بھی نہیں ہے۔ پتی ورتا عورتوں کے تماشے میں نے بہت دیکھے ہیں۔ ڈر تو فقط بدنامی کا ہے۔ بھید کھلنے کا ڈر نہ ہو تو خود بھگوان بھی پاپ کرنے سے نہ چوکے۔ اب جو بھی تمہاری اِچھا ہو، ظاہر کردو۔ میں نے تو بھوت ہو کر بھی کوئی بات نہیں چھپائی۔"

ایسی پہیلی سے تو آج تک کسی عورت کا سامنا نہیں ہوا۔ اپنی مرضی سے پرائے مرد کی ہونے کی تو بات ہی الگ ہے۔ پرائی عورت اور پرائے مرد کی خاطر کس کا من نہیں للچاتا، پر سماجی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے پردہ نہیں ہٹایا جاسکتا۔ پردے کے پیچھے جو ہونا ہوتا ہے وہ ہوتا ہی ہے۔ سوچ بچار کر ایسی بات کا جواب دینا کتنا دوبھر ہے! وہ اس طرح گم سم بیٹھی رہی مانو بولنا ہی بھول گئی ہو۔ اتنی باتیں سننے کے بعد تو وہ بالکل گونگی ہوگئی۔

دلہن کے دماغ میں انجانے ہی ایک لہر اٹھی۔ وہ سوچنے لگی، جنم کے وقت تھال کے بجائے سوپ بجا۔ گھر والوں کو کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ لڑکا ہوتا تو زیادہ خوش ہوتے۔ ماں باپ کی نظر میں گھورا بڑھنے میں وقت لگتا ہو تو بیٹی کا بدن بڑھنے میں بھی کوئی وقت لگے۔ دسواں سال لگتے ہی ماں باپ اس کے ہاتھ پیلے کرکے پرائے ٹھکانے بھیجنے کی چِنتا کرنے لگے۔ وہ نہ آنگن میں سماتی تھی اور نہ گگن میں۔ چھاچھ اور لڑکی مانگنے میں کیسی شرم۔ رشتے پر رشتے آنے لگے۔ اس کے روپ کا چرچا چاروں اور ہوا میں گھل گیا تھا۔ سولہ سال پورے کرنے مشکل ہوگئے۔ ماں کی کوکھ میں سماگئی پر گھر کے آنگن میں نہ سما سکی۔ اچانک اس حویلی سے ناریل آیا۔ اس کی قسمت کہ گھر والوں نے ناریل لوٹایا نہیں۔ اس حویلی کے بجائے اگر کوئی دوسرا گھر ہوتا تب بھی اسے تو جانا ہی تھا۔ جس کے لیے گھر والوں کی مرضی ہوتی اسی کا ہاتھ تھامنا پڑتا۔ پتی بیوپار اور حساب کتاب میں ہی کھویا رہتا ہے۔ اس کی نظر میں ہنڈیا کے پیندے اور عورت کے چہرے میں کوئی فرق نہیں۔ پھٹتا ہوا جوبن بھی ویسا اور پھٹتی ہوئی مٹی بھی ویسی۔ نہ رتھ میں بیوی کے دل کی بات سمجھا اور نہ رنواس میں۔ سونی رنواس اور پھیکی سیج چھوڑ کر اپنے بیوپار کے لیے چل پڑا۔ واپس مڑ کر بھی نہیں دیکھا اور آج بھوت کے پیار کی روشنی کے سامنے تو سورج بھی دھندلا گیا! سات پھیرے والا پتی زبردستی روانہ ہوا تو اس کا بس چلا نہیں۔ بھوت کے اس پیار کے سامنے بھی اس کا بس کہاں چلا! جانے والے کو روک نہ سکی تو پھر رنواس میں آنے والے کو کیسے روکے؟ یہ پیار جتاتا ہے تو کانوں میں تیل کیسے ڈالے؟ پتی نے اسے اس طرح منجدھار میں چھوڑ دیا۔ بھوت ہوتے ہوئے بھی اس نے پیار جتایا تو کیسے انکار کرے؟ اگر سپنا بس میں ہو تو پیار بھی بس میں ہو! وہ اپنی سدھ بدھ بسرا کر بھوت کی گود میں لڑھک گئی۔

کہیں یہ دلہن کے من کا ہی تو بھوت نہیں تھا، جو حقیقت کا روپ دھار کر ظاہر ہوا؟ پھر اپنے من سے کیا

دوری! جہاں بھاشا اٹک جاتی ہے وہاں خاموشی کام کر جاتی ہے۔ اب کچھ کہنا سننا باقی نہ رہا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے اندر کی بات سمجھ گئے۔ پھر چراغ کی روشنی گل ہوگئی اور اندھیرا اجالے کا روپ دھار کر دپ دپ کرنے لگا۔ سیج کے مرجھائے ہوئے پھولوں کی پنکھڑی پنکھڑی کھل اٹھی۔ رنواس کی روشنی سوارت ہوئی۔ خواب گاہ کا اندھیرا سوارت ہوا۔ آسمان کے نولکھ تاروں کی جگمگاہٹ آپ ہی بڑھ گئی۔

ایسی رسیلی راتوں کے ہوتے وقت کو گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔ چٹکیوں میں دن بیتنے لگے۔ خوب بیوپار بڑھا۔ خوب لین بڑھا۔ سماج میں خوب مقام بڑھا۔ ماں باپ تو خوش تھے ہی سارا علاقہ بھی سیٹھ کے لڑکے سے بے حد خوش تھا۔ وقت بے وقت سب کے کام آتا تھا۔ دوسرے بنیوں کے موافق گلے نہیں کاٹتا تھا۔ بالکل متحمل مزاج، ہمیشہ اچھے سبھاؤ والا۔ دکان پر آنے والی عورتوں کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ چھوٹی کو بہن اور بڑی کو ماں سمان مانتا تھا۔ اس کا نام لیتے ہی لوگوں کا دل احترام سے بھر جاتا تھا۔ اس میں فقط ایک بات کی کمی تھی، کہ پردیس سے سیٹھ کے لڑکے کا خط آتا تو پھاڑ کر پھینک دیتا۔ واپس کوئی جواب نہیں۔

اس آنند اور کامیابی کے بیچ دیکھتے ہی دیکھتے تین برس گزر گئے، گویا میٹھا سپنا بیتا ہو۔ بھوت بھی اس حویلی میں رس بس گیا، مانو سیٹھ کا سگا بیٹا ہو۔ بہو بھی رنواس کے نشے میں مست تھی۔ رنواس کے انتظار میں اگتے ہی دن ڈھل جاتا۔ رنواس میں گھستے ہی پل بھر میں رات ڈھل جاتی۔

بہو امید سے ہوگئی، تیسرا مہینہ اترنے والا تھا۔ پاؤں بھاری ہونے کی خوشخبری سن کر سیٹھ نے سوامن گڑ اپنے ہاتھوں سے بانٹا۔ لوگوں نے سوامن سونا مان کر قبول کیا۔ سیٹھ نے عمر میں پہلی مرتبہ یہ سخاوت برتی تھی۔ آج ہاتھ کھلا ہے تو آگے بھی کچھ نہ کچھ ملے گا۔ بیٹے بہو نے چپکے چپکے کافی دان پن کیا۔ سکھ کے ان گنت تاروں کے بیچ اب نیا چاند جڑے گا۔ کوکھ کا چاند آکاش کے چاند سے سدا بڑھ کر ہوتا ہے۔

دونوں پتی پتنی کو بیٹی کے بے حد چاہ تھی۔ خوب خوشیاں منائیں گے۔ بیٹا کون سا سورگ لے جاتا ہے۔ رام جانے کس کی شکل پر جائے! اولاد کے جنم کے بجائے اولاد کے تصور میں زیادہ سکھ ہوتا ہے۔ کوکھ میں اولاد کے ساتھ ساتھ سپنے پلتے ہیں۔

دن گھوڑے کی رفتار سے دوڑنے لگے۔ پانچ مہینے بیتے۔ سات مہینے پورے ہوئے۔ یہ نواں مہینہ اترنے والا ہے۔ بہو دن بھر رنواس میں سوئی رہتی۔ اس کی سیوا میں تین داسیاں آٹھوں پہر حاضر رہتیں۔

ایک رات پتی کی گود میں سوئی بہو منہ اٹھا کر بولی، ’’کئی دفعہ سوچتی ہوں، اگر اس دن کھیجڑی کے سائے میں آرام کرنے کے لیے نہ ٹھہرتے تو رام جانے میرے یہ چار سال کس طرح کٹتے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کٹتے ہی نہیں۔‘‘

بھوت بولا، ''تمہارے دن تو جیسے تیسے نکل ہی جاتے۔ پر میری کیا دشا ہوتی؟ جھاڑی جھاڑی، پیڑ پیڑ پر بھوت کی جون پوری کرتا۔ اس دن خیر ہوئی کہ میں تمہیں لگا نہیں۔ مجھے تو آج بھی یقین نہیں ہوتا کہ زندگی کا آنند بھوگ رہا ہوں یا کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔''

چکنے ریشمی بالوں پر انگلیاں پھراتے پھراتے رات پھسل گئی۔

اُدھر بہت دور دساور میں بہو کا پھیرے لینے والا دولھا رات کے آخری پہر میں اٹھ بیٹھا۔ آلکس سے جماہی لے کر گھڑے سے ٹھنڈا پانی پیا۔ چاروں طرف دیکھا۔ ایک سا اندھیرا۔ جھلملاتے ہوئے ایک سے تارے۔ کسی بھی سمت میں روشنی نہیں۔ سوچنے لگا کہ یہ رات اور بھی چھوٹی ہوتی تو کتنا اچھا رہتا! کیا ضرورت ہے اتنی لمبی راتوں کی! سونے سونے میں ہی آدھی زندگی گزر جاتی ہے۔ نیند میں تو بیوپار اور لین دین ہو نہیں سکتا، ورنہ دونی کمائی ہوتی۔ پھر بھی دولت کم اکٹھی نہیں کی۔ باپو بے حد خوش ہوں گے۔

بیچ بیچ میں آس پاس کے بیوپاری ملتے رہتے تھے۔ اسے وہاں پا کر انہیں بہت تعجب ہوتا تھا۔ ایک دفعہ پوچھ ہی لیا کہ وہ گاؤں سے واپس کب آیا۔ یہ سن کر اسے بھی کم تعجب نہیں ہوا تھا۔ جواب دیا کہ اس نے تو ابھی گاؤں کی طرف منہ بھی نہیں کیا۔ وہ پاگل تو نہیں ہو گئے؟ لوگوں نے زور دے کر کہا، وستار سے ساری بات بتائی، پھر بھی اسے وشواس نہیں ہوا۔ وہ جب یہاں ہے تو وہاں کیسے ہو سکتا ہے! کمائی سہل نہیں ہوتی، اس لیے حاسد لوگ اسے چکر میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ پر وہ ایسا نا سمجھ نہیں ہے ان کے بھی کان کترنے والا ہے۔ کمائی اور بیوپار میں اور زیادہ من لگانے لگا۔

پر آج بہت سویرے ہی ایک بھروسے مند پڑوسی نے خبر دی کہ بہو کے تو بچہ ہونے والا ہے۔ شاید ہو گیا ہو۔

سیٹھ کا لڑکا بیچ ہی میں بولا، ''اگر ایسی بات ہوتی تو گھر والے مجھے ضرور خبر کرتے۔ میں نے پانچ سات چٹھیاں بھیجیں، پر ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔''

پڑوسی نے کہا، ''بھلے آدمی، ذرا سوچو تو سہی کہ گھر والے کیوں خبر کرتے؟ کس کو کرتے؟ ان کا لڑکا تو بیچ راہ سے تیسرے ہی دن واپس آ گیا تھا۔ ایک مہاتما کے دیے ہوئے منتر سے سیٹھ جی کو روزانہ پانچ مہریں دیتا ہے۔ حویلی پر تو رام کی مہر ہے۔ گاجے باجے اور جشن کے ٹھاٹھ ہیں۔ رنواس میں گھی کے دیے جلتے ہیں۔ ہاں، اب معلوم ہوا کہ آپ کی شکل ہو بہو سیٹھ جی کے لڑکے سے ملتی ہے۔ اوپر والے کا کھیل! خود سیٹھ جی دیکھیں تو پہچان نہ سکیں۔ اب بات چیت کرنے پر معلوم ہوا کہ شکل تو ضرور ملتی ہے پر آپ دوسرے ہیں۔''

''بھلا میں دوسرا کیسے ہوا؟ اب لگتا ہے کہ کل پرسوں ہی جانا پڑے گا۔''

سوسیٹھ کے لڑکے نے اپنا دھندا سمیٹا، منیم کو حساب کتاب سمجھایا اور اپنے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ وہی جیٹھ کا مہینہ۔ لوؤں کے اندھڑ شور مچا رہے تھے۔ جھاڑیوں پر سرخ ڈھالو دیکھ کر یکا یک اس دن والی بات یاد آ گئی۔ سوچا بہو کی اگر ایسی پسند ہے تو اپنا کیا جاتا ہے۔ کون سے پیسے لگتے ہیں! پکے ہوئے ڈھالو توڑ کر انگوچے کے پلو میں باندھ لیے۔

وہ حویلی پہنچا تو آنگن میں عورتوں کا جمگھٹ لگا ہوا تھا۔ سیٹھ سیٹھانی گھبرائے ہوئے منت پر منت مان رہے تھے۔ بھوت والا پتی اور پر رنواس کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اداس اور پریشان۔ بہو نیچے سوری (زچہ خانہ) کے اندر کراہ رہی تھی۔ بچہ اٹک گیا تھا۔ دائیاں اپنے ہنر آزما رہی تھیں۔ کہ اتنے میں آنگن کی اس چل پوں کے درمیان سات پھیروں والا پتی دھول میں اٹا ہوا، بے ہچک، آنگن میں آ کھڑا ہوا۔ کندھے پر ڈھالوؤں کا انگوچھا لٹک رہا تھا۔ ماں باپ کے چرنوں میں سیس نوا کر پرنام کیا۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ ہو بہو بیٹے سے شکل ملتی ہے۔ گردے سنا ہے تو کیا ہوا! دولت کے لالچ میں کوئی بہرو پیا تو نہیں آ گیا؟ انتہائی تعجب بھی گونگا ہوتا ہے۔ ماں باپ نے بولنا چاہا تو بھی ان سے بولا نہیں گیا۔ عورتوں کے گلے کا راگ بدل گیا۔ ہائے دیا! ایک ہی صورت کے دو پتی! کون سچا، کون جھوٹا؟ یہ کیسا کرشمہ، یہ کیسا تماشا؟ کوئی ادھر بھاگی، کوئی اُدھر بھاگی۔

سوری کے اندر سے بہو کے کراہنے کی آواز سن کر وہ فوراً ساری بات سمجھ گیا۔ سنی سو خبر سچی تھی! ایسا چھل کس نے کیا؟ کیسے ہو اس کی پہچان؟ لوگ کس کے کہے پر یقین کریں گے؟ اچانک اور پر رنواس کے دروازے پر کھڑے نوجوان پر اس کی نظر پڑی۔ یہ تو واقعی ہو بہو اس کا ہم شکل ہے۔ جعل ساز کے چھل کا کون مقابلہ کر سکتا ہے! رگوں میں خون جم گیا۔ اوہ یہ انہونی کیسے ہوئی؟

پریت والے پتی کے کانوں میں تو فقط زچہ کا کراہنا گونج رہا تھا۔ اسے تو کسی دوسری بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ ہوا تھم گئی تھی۔ سورج تھم گیا تھا۔ کب یہ کراہنا بند ہو اور کب قدرت کا یہ بندھن کھلے!

باپو کے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے بیٹا بولا، ''میں تو چار سال سے دور دساور میں تھا، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ بہو کے گربھ کیسے رہ گیا۔ تمہیں کچھ تو عقل سے کام لینا تھا۔''

سیٹھ نے دل ہی دل میں سارا حساب لگالیا۔ بولا: ''تو ہے کون؟ میرا لڑکا تو تیسرے ہی دن واپس آ گیا تھا۔ یہاں عیاری کی تو دال نہیں گلے گی۔''

باپو کے منہ سے یہ بول سن کر بیٹے کو بے حد تعجب ہوا۔ چپ رہنے پر تو ساری بات بگڑ جائے گی۔ ترنت بولا، ''چار سال تک بے شمار کمائی کر کے دساور سے باپ کے گھر آیا۔ اس میں عیاری کی کون سی بات ہے؟ تمہیں نے تو زبردستی بھیجا تھا۔''

سیٹھ نے کہا،''نہیں چاہیے مجھے ایسی کمائی۔تو مجھے کمائی کا کیا لالچ دے رہا ہے؟ جس راہ آیا اسی راہ سیدھے سیدھے چلتا بن ورنہ بری بیتے گی۔''

باپو کا تو دماغ ہی پھر گیا لگتا ہے۔اسنے ماں کے منہ کی طرف دیکھ کر پوچھا،''ماں کیا تو بھی اپنے کوکھ کے بیٹے کو نہیں پہچانتی؟''

ماں اس سوال کا کیا جواب دیتی! اسکی زبان مانو تالو سے چپک گئی تھی۔وہ ٹکر ٹکر پتی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ ماں نے کچھ جواب نہ دیا تو بیٹا بھی دبدھا میں پڑ گیا۔اچانک اسے ڈھالوؤں کی بات یاد آ گئی۔ کانپتے ہاتھوں سے ترنت انگوچھا کھولا اور لال لال ڈھالوؤں کو باپو کے سامنے کرتے ہوئے کہا،''بہو سے اس دن کی ڈھالوؤں کی بات تو پوچھو۔ وہ سارا قصہ بتادے گی۔اس دن اس نے خود ہی ڈھالو توڑ کر کھائے تھے۔آج میں اپنے ہاتھوں سے توڑ کر لایا ہوں۔ایک دفعہ اس سے پوچھو تو سہی۔آپ فرمائیں تو میں باہر کھڑے کھڑے ہی پوچھ لوں۔''

سیٹھ کو غصہ آ گیا۔ بولا،''پاگل کہیں کا! یہ وقت ڈھالوؤں کی بات پوچھنے کا ہے؟ بہو موت سے جوجھ رہی ہے اور تجھے ڈھالوؤں کی پڑی ہے۔ بھاڑ میں جائیں تیرے یہ ڈھالو۔ میں تو یہ بے تکی بات سنتے ہی ساری بات سمجھ گیا۔میری بہو گنواروں کی طرح ہاتھوں سے توڑ کر ڈھالو کھائے گی؟ عزت پیاری ہے تو یہاں سے دفع ہو جا۔ورنہ اتنے جوتے پڑیں گے کہ کوئی گننے والا بھی نہیں ملے گا۔''

بیٹے نے کہا،''باپ کے جوتوں کی کوئی پروا نہیں۔لیکن سچ مچ میں نے بھی اس دن رتھ میں ٹھیک یہی بات کہی تھی۔''

سوری کے اندر بہو کا کراہنا اسی طرح جاری تھا۔ دائیوں نے کئی دفعہ پوچھا، پھر بھی وہ بچے کو کاٹ کر نکلوانے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ بمشکل مرنے سے بچی۔ بہو کی آنکھوں کے آگے کبھی اندھیرا چھا جاتا، کبھی بجلیاں جگمگانے لگتیں۔

حویلی سے بھاگی عورتوں کی زبانی یہ بات ہوا کی طرح گھر گھر میں پھیل گئی۔دیکھتے ہی دیکھتے سیٹھ کی حویلی کے سامنے میلہ لگ گیا۔ایسی انہونی بات کا سواد تو زبان کو برسوں میں ملتا ہے۔ ہر ایک کی زبان کے پنکھ لگ گئے۔ایک ہی شکل کے دو پتی! ایک تو چار سال پہلے سے ہی رنواس میں عیش کر رہا ہے اور ایک آج دساور سے لوٹا ہے۔ بہو زچہ خانے میں دردزہ سے کراہ رہی ہے۔خوب تماشا ہوا! دیکھنا ہے کہ دھنا سیٹھ اس معاملے کو کیسے نبٹاتے ہیں، کیسے چھپاتے ہیں۔ بھلا ایسی بات پر پردہ کون ڈالنے دے گا! لوگ چبا چبا کر پھر سے جگالی کرنے لگتے۔

اپنی حویلی کے چاروں طرف یہ جمگھٹ دیکھا تو سیٹھ کے ایڑی سے چوٹی تک آگ لگ گئی۔ تھوک اچھالتے ہوئے کہنے لگا،" میرے گھر کی بات ہے، ہم آپ ہی نبٹ لیں گے۔ بستی والے کیوں ٹانگ اڑاتے ہیں؟ میں کہتا ہوں کہ بعد میں آنے والا آدمی چھلی ہے۔ میں اپنے نوکروں سے دھکے دلوا کر اسے نکلوا دوں گا۔ دن دہاڑے یہ مکاری نہیں چل سکتی۔"

بیٹا چلایا،" باپو، تم یہ کیا پاگل پن کر رہے ہو؟ سورج کو تو اور توا کو سورج بتا رہے ہو؟ تم جیسے بھی چاہو پوری چھان بین کرلو۔ یہ تو سراسرانیائے ہے۔"

ان دولت مندلوگوں کو نیچا دکھانے کا موقع کب کب ملتا ہے! لوگ باگ بھی اڑ گئے کہ کھرا انصاف ہونا چاہیے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی۔ قصوروار کو واجب سزا ملے۔ یوں وہ پتیوں کا رواج چل نکلا تو کیسے نبھے گی؟ امیروں کا تو کچھ نہیں، پر غریبوں کا جینا حرام ہو جائے گا۔ بستی کی بات نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ چاہے کتنا ہی دولت کا زور کیوں نہ ہو، کندھا دینے والے کرائے پر نہیں آئیں گے۔

معاملہ کافی الجھ گیا۔ دونوں اپنی اپنی بات پر اڑ گئے۔ کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ نہ سیٹھ اور نہ برادری والے۔ لوگوں کی زبان تھی اور بہو کے کان تھے۔ سواس تک بھی ساری خبر پہنچ گئی۔ عورت کی اس زندگی میں رام جانے کیسی کیسی باتیں سننی پڑیں گی، کیسی کیسی ہتک سہنی پڑے گی اور کیسے کیسے تماشے دیکھنے پڑیں گے! آخر ایک دن تو یہ جھمیلا ہونا ہی تھا۔ چار سال تو سپنے کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ بھلا سپنوں کے دلاسے سے کب تک من کو سمجھایا جاسکتا ہے۔ کتنا اس کا سہارا! اور کتنی اس کی گہرائی!

کسی پرانے کھنڈر کی چمگادڑوں کی طرح بھیڑ اِدھر اُدھر چکر لگانے لگی۔ یہ معاملہ نبٹائے بغیر تو گلے سے نوالہ بھی نہیں نگلا جاسکتا۔

سوری کا دروازہ کھلوا کر دائیوں نے خبر دی کہ بہو کے لڑکی ہوئی ہے۔ موت کے خطرناک گھاٹی ٹل گئی۔ زچہ کے مرنے میں تو کوئی کسر نہیں تھی۔ بچ گئی سو قسمت کی بات۔ سوری کے باہر دندناتی عورتوں کی بچی کا رونا سنائی دیا۔ خواب گاہ کے باہر کھڑے پتی کو اب جا کر ہوش آیا، پر ہوش آتے ہی جو بھنک کانوں میں پڑی تو مانو کلیجے میں اچانک سرنگ چھوٹی ہو۔ سدھ بدھ کو گویا لقوہ مار گیا ہو۔ ایک سال پہلے یہ بجلی کیسے گری!

سیٹھ سیٹھانی پاگلوں کی طرح ہکا بکا، گنگ! پوری بستی میں کانا پھوسی ہونے لگی۔ یہ کیسی ناگہانی مصیبت آپڑی! اس حرام زادے چنڈال نے نہ جانے کس جنم کا بدلہ لیا ہے۔ بات تو ہاتھ سے چھوٹتی جا رہی ہے۔ اب کیسے سمیٹی جائے، کون جانے کون جانے کس نے یہ چال چلی ہے۔ رنواس تو پچھلے چار سال سے روشن ہے۔ اسے نہ قبولیں پر تو حویلی کی ساری عزت ہی مٹی میں مل جائے گی۔ ڈھالو والا کسی طرح مان جائے تو پردہ پڑا

رہے۔ منہ مانگی دولت دینے کو تیار ہیں، پھر اسے کیا چاہیے!

پر نہ ڈھالو والا مانا اور نہ بستی کے لوگ ہی مانے۔ پختہ انصاف ہونا چاہیے۔ ساری برادری کی ناک کٹتی ہے۔ چار سال بعد کوکھ اکھڑتے ہی ایک اور پتی آ دھمکا۔ کیا معلوم کون اصلی ہے! ایک کو تو جھوٹا ہونا ہی پڑے گا۔ لوگوں نے شور مچا کر آسمان پر اٹھالیا، مانو بڑوں کا بڑا چھتا نیچے آ پڑا ہو۔ ڈھالو والے کی حمایت نہ کرنا تو ہاتھوں بڑکائی آگ پر پانی ڈالنا ہوگا۔ تب تو ساری مزہ ہی کرکرا ہو جائے گا۔ اس مزے کو چکھنے کی خاطر ہر شخص ڈھالو والے پتی کی طرف داری کرنے لگا۔

سیٹھ ہاتھ جوڑتے ہوئے رندھی آواز میں بولا،" میری پگڑی اچھال کر تمہیں کیا ملے گا؟ بھائیوں کی طرح ساتھ رہتے ہیں، وقت بے وقت ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ میرے بیٹے کے گن تم لوگوں سے چھپے نہیں ہیں۔ اس کے ہاتھوں سے کس کا بھلا نہیں ہوا! اتنی جلدی احسان فراموش نہ بنو۔ میری عزت اب تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ کسی بھی طرح معاملہ سلجھادو۔ یہ ڈھالو والا آدمی جعلی ہے۔ اسے دھکے مار کر گاؤں سے باہر نکالو۔"

بزرگوں نے کہا،" سیٹھ جی، دکھتی مکھی انگلی نہیں جاسکتی۔ وقت آنے پر جان دینے کو تیار ہیں۔ پر پانی کی گٹھری کیسے باندھی جاسکتی ہے! یہ آدمی بڑھ بڑھ کر کہہ رہا ہے۔ بہو سے ڈھالوؤں والی بات پوچھو تو سہی۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

ایسی بات کیسے پوچھی جاسکتی ہے؟ کون پوچھے؟ تب کچھ بھلی بوڑھی عورتیں آگے آئیں۔ مصیبت میں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ سوری کا دروازہ کھول کر اندر گئیں۔ زچہ کا پیٹ درد سے اینٹھ رہا تھا۔ زچگی کی گھاٹی پار کرنے کے بعد اس بات کی بھنک اس کے کانوں میں پڑی تو وہ زچگی کی ساری تکلیف بھول گئی۔ یہ دوسری تکلیف بہت بہت بڑی تھی۔ دانت پیستے ہوئے مشکل سے بولی،" کوئی مرد یہ بات پوچھتا تو اس کو ہاں یا نہ میں جواب بھی دیتی۔ پر عورتوں کا دل رکھ کر بھی تم یہ بات پوچھنے کی ہمت کیسے جتا پائیں؟ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ تمہیں پریشان کرنے کا کیا یہی وقت ملا ہے؟ شاباش ہے تمہاری ہمت کو!"

بوڑھی عورتیں منہ بگاڑتی ہوئی باہر آئیں۔ بولیں،" ایسی بات میں عورتیں سچ نہیں بولتیں۔ ہمیں تو دودھ میں کالک نظر آتی ہے۔ باقی جو تمہاری سمجھ میں آئے سو کرو۔"

ایسے موقعوں پر ہی تو سمجھ کی دھار تیز ہوتی ہے۔ سوت تو خوب ہی الجھا۔ بزرگوں نے پھر سمجھ سے کام لیا۔ کہا،" یہ انصاف راجہ کے بنا نہیں نبٹ سکتا۔ کسی اور نے اس میں ٹانگ اڑائی تو سموچی بستی کو ان کے غصے کا شکار ہونا پڑے گا۔ اپنا بھلا برا تو سوچنا ہی پڑتا ہے۔ ایک دفعہ ان دونوں پتیوں کو راجہ کے حوالے کردیں۔ پھر راجہ

جانے اور سیٹھ جانے۔ اپن بیچ میں ناحق کیوں تھوک اچھالیں؟ پھر بستی رام ہے، جو سب کی اچھا ہو سو کرو۔''
آخر کار بستی جو چاہتی تھی وہی ہو۔ بھلا اپن رام پدوہ کیوں چھوڑتی۔ دونوں پتیوں کو رسیوں سے باندھ کر لے چلنے کا فیصلہ ہوا۔
رنواس کے باہر کھڑے پتی کو باندھنے لگے تب اسے ہوش آیا کہ آخر بات کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ اس نے کچھ بھی آنا کانی نہیں کی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے کلیجہ ہونٹوں تک لا کر بولا ''مجھے ایک دفعہ سوری میں جانے دو۔ ماں بیٹی کی خیریت تو پوچھ لوں۔ نہ جانے کیسی طبیعت ہے۔''
پر لوگ نہیں مانے۔ کہا، ''فیصلہ ہونے کے بعد ساری عمر خیریت پوچھنی ہی ہے۔ اتنی جلدی کیا ہے؟''
لوگوں کا بگولا پیروں پیروں آگے بڑھا۔ دونوں پتی بندھے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سیٹھ بھی جوتیاں پھٹکارتا ساتھ گھسٹ رہا تھا۔ پگڑی کھل کر گلے میں جھول رہی تھی۔ تیز ہوا کے جھونکے پتے پتے کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ چلتے چلتے اسی کھیجڑی پر بھوت کی نظر پڑی۔ سارے بدن میں بجلی دوڑ گئی۔ اس کے پاؤں وہیں چپک گئے۔ سر میں ابھان اٹھنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے یادوں کی تصویریں پھڑ پھڑانے لگی ہی تھیں کہ رسی کا جھٹکا لگنے پر اسے ہوش آیا۔ پیر آپ ہی آپ بڑھنے لگے۔ بایاں دایاں، بایاں دایاں۔ انسان کے دل میں یادوں کا جھنجھٹ نہ رہے تو کتنا اچھا ہو۔ یہ یاد مانو خون ہی نچوڑ ڈالے گی۔
ساتھ بندھے کاروبار والے پتی کا من تو چھل سے خالی تھا۔ لیکن آج سانچ کو یہ آنچ کیسی لگی؟ وہ خود بھرم میں پڑ گیا۔ یہ کیا لیلا ہوئی؟ ساتھ ساتھ چلتا یہ شخص ایسا لگ رہا ہے گویا وہ شیشے میں اپنا ہی عکس دیکھ رہا ہو۔ اس سے پوچھنے پر ہی بھرم مٹ سکتا ہے۔ اس کے گلے میں پھنستے پھنستے بمشکل یہ لفظ باہر نکل پائے ''بھائی میرے انصاف تو رام جانے کیا ہوگا، پر تو یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں ہی سیٹھ جی کا لڑکا ہوں۔ سات پھیرے کھانے والا اصلی پتی ہوں۔ پر تو کون ہے، یہ تو بتا؟ یہ کیسا اندر جال ہے؟ بیٹھے بٹھائے یہ کیسی مصیبت آ پڑی! بتا مجھے تو بتا کہ تو ہے کون؟''
تھا تو وہ مہابلی بھوت۔ انصاف کرنے والے پنچوں کی گردنیں ایک ساتھ مروڑ سکتا تھا۔ کئی کرتب کر سکتا تھا۔ کسی کے جسم میں گھس کر اس کا ستیاناس کر سکتا تھا۔ پر چار سال تک پریت کی زندگی جی کر اس کا مانس ہی بدل گیا۔ جھوٹ بولنا بھی چاہا تو اس سے بولا نہیں گیا۔ لیکن کھلا سچ بھی کیسے کہے! پر۔تما کی عزت تو رکھنی ہی تھی۔ اس سے بے وفائی کیسے کرے! یدھشٹر والی مریادا نبھائی۔ بولا، ''میں عورتوں کے بدن کے اندر کا باریک جیو ہوں۔ ان کی پریت کا مالک ہوں۔ بیوپار اور کمائی کی بہ نسبت مجھے موہ پریت کی لالچ زیادہ ہے۔''
ساتھ پھیروں والا پتی بے صبری سے بیچ میں ہی بولا، ''فالتو بکواس کیوں کرتا ہے! صاف صاف بتا کہ

منڈپ میں تو نے بیاہ کیا تھا کیا؟''

''فقط بیاہ سے کیا ہوتا ہے! بیاہ کی دہائی عمر بھر نہیں چل سکتی۔ بیوپار چیزوں کا ہوتا ہے، پریت کا نہیں۔ تم تو پریت کا بھی بیوپار کرنے لگے! اس بیوپار میں ایسی ہی برکت ہوا کرتی ہے!''

سیٹھ کے لڑکے کے دل میں گویا گرم سلاخیں گھس گئی ہوں۔ ایسی باتیں تو اس نے کبھی سوچی ہی نہیں۔ سوچنے کا موقع ہی کب ملا تھا! آج موقع ملا بھی تو اس حالت میں!

بھیڑ کا بگولا انصاف کی خاطر راجہ کی طرف جلدی جلدی بڑھ رہا تھا کہ بیچ راہ میں ریوڑ چراتا ہوا ایک گڈریا ملا۔ ہاتھ میں تڑا (لٹھ) لال صافے سے باہر نکلے بال۔ گھنی کالی داڑھی۔ ہاتھوں میں چاندی کے کڑے۔ بھرپور لمبا قد۔ ریچھ کی طرح سارے جسم پر بال ہی بال۔ پلکوں اور بھنوؤں کے بال بھی کافی بڑھے ہوئے تھے۔ کانوں پر بالوں کے گچھے پیلے دانت۔ تڑا سامنے کرتے ہوئے پوچھا، ''اتنے سارے لوگ اکٹھے ہو کر کہاں جا رہے ہو؟ شاید مرتیو بھوج (کسی کی موت پر دیا جانے والا کھانا) کھانے کے لیے یہ کارواں نکلا ہے۔''

دو تین مرتبہ سمجھانے پر اسے ٹھیک سے سمجھ میں آیا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ ہونٹوں کے ایک کونے سے ہنسی چھلکاتے ہوئے کہنے لگا، ''اس ادنیٰ سے کام کی خاطر بے چارے راجہ کو کیوں تکلیف دیتے ہو! یہ جھمیلا تو میں ہی نبٹا دوں گا۔ تمہیں میری آنکھوں کی قسم اگر ایک قدم بھی آگے رکھا تو۔ ندی کا ٹھنڈا پانی پیو۔ کچھ آرام کرو۔ تمہارے علاقے کی تو غضب ہی قلعی کھلی۔ کوئی مائی کا لال یہ انصاف نہیں بنٹا سکا! جوتے پھٹکارتے ہوئے سیدھے راجہ کے پاس چل پڑے!''

لوگوں نے بھی سوچا کہ ابھی تو راج دربار کافی دور ہے۔ اگر اس گنوار کی عقل سے کام نکل جائے تو کیا حرج ہے۔ ورنہ آگے تو جانا ہی ہے۔ وہ مان گئے۔ تب گڈریے نے باری باری سے دونوں کے چہرے دیکھے۔ بالکل ایک سی شکل۔ بال جتنا بھی فرق نہیں۔ چنچل اوپر والے نے بھی کیسا مذاق کیا!

ان دونوں کی رسیاں کھولتے ہوئے وہ کہنے لگا، ''بھلے آدمیو، انہیں اس طرح باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس بھیڑ سے بچ کر یہ کہاں جاتے؟''

پھر مکھیا کی طرف دیکھ کر پوچھا، ''یہ گونگے بہرے تو نہیں ہیں؟''

مکھیا نے جواب دیا، ''نہیں، یہ تو بالکل گونگے بہرے نہیں ہیں۔ بے دھڑک بولتے ہیں۔''

گڈریا یہ بات سنتے ہی ٹھہاکا مار کر ہنسا۔ ہنستے ہنستے ہی بولا، ''پھر یہ بے کار چکر کیوں لگایا؟ ان سے وہیں پوچھ تاچھ کر لیتے۔ دونوں میں سے ایک تو جھوٹا ہے ہی۔''

پنچ دل ہی دل میں ہنسے۔ یہ گڈریا تو نرا مورکھ ہے۔ یہ سچ بول جاتے تو پھر رونا کس بات کا تھا۔ بس ہو چکا اس کے ہاتھوں انصاف! ایسی انصاف کرنے لائق عقل ہوتی تو یہ ترا لیے بھیڑوں کے پیچھے ڈھرڈھر کرتا کیوں بھٹکتا!

رسی کو سمیٹتے ہوئے گڈریا کہنے لگا، ''سمجھ گیا، سمجھ گیا۔ بولنا تو جانتے ہیں، پر ساتھ ہی ساتھ جھوٹ بولنا بھی سیکھ گئے ہیں۔ پر کوئی بات نہیں۔ سچ کو باہر نکالنا تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ گلے میں ترا ڈال کر آنتوں میں پھنسا ہوا سچ ابھی باہر لا پٹکتا ہوں۔ دیر کس بات کی! کھیجڑی کی ڈالیاں بھی اس ترے کے سامنے نہیں ٹک سکتیں۔ پھر بیچارے سچ کی تو اوقات ہی کیا ہے! بولو، کس کے گلے میں ترا گھسیڑوں؟ جو پہلے منہ کھولے گا وہی سچا ہے۔''

بھوت نے سوچا کہ اگر اکیلے اسی کی بات ہوتی تو کوئی بھی جوکھم اور مصیبت اٹھالیتا۔ پر اب بھید ظاہر ہونے پر تو گھر کی مالکن کو دکھ اٹھانا پڑے گا۔ ایسا معلوم ہوتا تو کھیجڑی کے کانٹوں میں بند ھا رہنا ہی ٹھیک تھا۔ بھوتوں کے چھل بل میں تو وہ استاد تھا، پر انسانوں کے کپٹ کی اسے رتی بھر بھی جانکاری نہیں تھی۔ انسان کی زبان سے نکلی ہر بات کو وہ صحیح مانتا تھا۔ ترا اس کے گلے کا کیا بگاڑ سکتا ہے! ایسے سات ترے گھسیڑ کر بھی یہ میرا بال بانکا نہیں کر سکتا۔ میری پریت جھوٹی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اس میں اتنا سوچنے کی کیا بات ہے! وہ ترنت منہ پھاڑتا ہی نظر آیا۔ سیٹھ کے لڑکے نے تو ہونٹ ہی نہیں کھولے۔ غصہ تو ایسا آیا کہ اس گنوار گڈریے کی چٹنی بنا ڈالے، پر کہا کچھ نہیں۔

منہ پھاڑنے والے پتی کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے گڈریا بولا، ''واہ رے پٹھے! تجھ جیسے ستیہ وادی (حق پرست) آدمی کو ان مورکھ لوگوں نے اتنا پریشان کیا! پر من کی تسلی بڑی بات ہے۔ تھوڑی بہت بھی شک کی گنجائش کیوں رہے!''

اس کی بھیڑیں کافی دوری پر الگ الگ چر رہی تھیں۔ ان کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے گڈریا کہنے لگا، ''میں سات تالیاں بجاؤں، تب تک ان تمام بھیڑوں کو جو اس کھیجڑی کے گرد اکٹھا کر دے وہی سچا ہے۔''

گڈریے کے کہتے ہی اس بھوت نے بگولے کا روپ دھار کر پانچویں تالی بجنے سے پہلے تمام بھیڑوں کو اکٹھا کر دیا۔ سیٹھ کا لڑکا منہ لٹکائے کھڑا رہا۔ وہاں سے ہلا تک نہیں جیسی گڈریوں کی جاہل قوم، ویسا ہی جاہل اس کا انصاف! ماننا اور نہ ماننا تو اس کی مرضی پر ہے۔

گڈریا بولا، ''شاباش! سچے پتی کے علاوہ اتنا جوش اور اتنی طاقت بھلا کس کی ہو سکتی ہے! اب ایک آخری

پر کھاور کروں گا۔تھوڑا سستا لو۔"

تڑا بغل میں دبا کر چھاگل کا منہ کھولا۔ایک ہی سانس میں غٹ غٹ سارا پانی منہ میں انڈیل کر زور سے ڈکار کھائی۔پھر پیٹ پر ہاتھ پھراتے ہوئے کہنے لگا،" سات چٹکیوں کے ساتھ ہی جو اس چھاگل کے اندر گھس جائے گا وہی رنواس کا اصل مالک ہے۔جو میرے انصاف کو غلط بتائے گا اس کے گلے کی خاطر میرے تڑے کا ایک ہی جھٹکا کافی ہے، یہ خیال رکھنا۔"

لوگوں نے تڑے کے منہ پر بندھے ہنسیے کی طرف دیکھا: دھار لگا ہوا۔ایک دم تیکھا۔ایک جھٹکا لگنے پر دوسرے کی ضرورت ہی نہیں۔کھوپڑی سیدھی دھول چاٹتی نظر آئے گی۔

لوگوں کو ہنسیے کی طرف دیکھنے میں تو وقت لگا، پر بھوت کو چھاگل کے اندر گھسنے میں کچھ بھی وقت نہ لگا۔یہ کرتب تو وہ جنم سے ہی جانتا تھا۔ بے چارے گڈریے نے تو آج عزت رکھ لی۔ بھوت کے اندر گھستے ہی گڈریے نے پھر ایک پل کی بھی ڈھی نہیں کی۔ترنت چھاگل کا منہ دوہرا کر، رسی سے کس کر باندھ دیا۔پھر پنچوں کے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے فخر سے بولا،" انصاف کرنے میں بس اتنی دیر لگی۔ چھاگل تو میری بھی جائے گی، پر انصاف کرنا منظور کیا تو کچھ سوچ بچار کر ہی کیا تھا۔چلو، اب سب چل کر اس چھاگل کو ندی کے حوالے کردیں۔امڑتی، اتھلیے کھاتی ندی اسے آپ ہی رنواس کی سیج پر پہنچا دے گی۔بولو، ہوا کہ نہیں کھرا انصاف؟"

سب نے ایک ساتھ سر ہلا کر تائید کی۔سیٹھ کا لڑکا تو خوشی کے مارے بورا سا گیا۔بیاہ سے بھی ہزار گنا آنند اس کے دل میں ہلکورے لینے لگا۔مارے خوشی کے کانپتے ہاتھوں سے نگ جڑی انگوٹھی کھول کر گڈریے کے سامنے کی۔گڈریا بغیر کہے ہی اس کے دل کی بات سمجھ گیا۔پر انگوٹھی قبول نہیں کی۔کالی داڑھی کے بیچ پیلے دانتوں کی ہنسی ہنستے ہوئے بولا،" میں کوئی راجہ نہیں ہوں جو انصاف کی قیمت وصول کروں۔میں نے تو ان کا کام نکال دیا۔اور یہ انگوٹھی میرے کس کام کی! نہ انگلیوں میں آتی ہے نہ تڑے میں۔میری بھیڑیں بھی میری طرح گنوار ہیں۔گھاس تو کھاتی ہیں، پر سونا سونگھتی تک نہیں۔بیکار کی چیزیں تو امیروں کی ہی شوبھا دیتی ہیں۔"

اب کہیں جا کر بھوت کو گڈریے کے اجڈ انصاف کا پتا چلا۔پر اب ہو بھی کیا سکتا تھا! بات قابو سے باہر نکل گئی تھی۔پھر بھی وہ چھاگل کے اندر سے چلایا،" مجھ پر دیا کر! ایک دفعہ باہر نکال دے زندگی بھر تیرا غلام رہوں گا۔"

بھلا اب بھوت کی بات کون سنتا! جوش سے بھرے سب لوگ ندی کے کنارے پہنچے۔ چھاگل کو تیزی سے بہتے پانی میں پھینک دیا۔پریت کے مالک کو آخر بل کھاتی بھنور بناتی، لہراتی، اتھلیے کھاتی، کل کل کرتی ندی کی سیج ملی۔اس کا جیون سپھل ہوا۔اس کی موت سوارت ہوئی۔

پھر بستی کے لوگ سیٹھ اور سیٹھ کا لڑکا واپس دگنی رفتار سے گاؤں کی طرف لوٹے۔

حویلی کے دروازے میں گھستے ہی سیٹھ کا لڑکا سوری کی طرف لپکا۔ ایک دائی بیٹی کو گھی کی مالش کر رہی تھی۔ دوسری چندن کی کنگھی سے زچہ کے بال سلجھا رہی تھی۔ گڈریے کے کھرے انصاف کی ساری داستان اس نے ایک ہی سانس میں سناڈالی۔ ایک ایک لفظ کے ساتھ زچہ کو ایسا لگتا گویا آگ میں تپالال سرخ بھالا اس کے دل میں گھونپا جا رہا ہو۔ زہ کے درد سے بھی یہ پیڑا ہزار گنا زیادہ تھی۔ پر اس نے نہ تو اُف کی اور نہ کوئی آہ اس کے منہ سے نکلی۔ پتھر کی مورت کی طرح گم سم سنتی رہی

دل کی ساری بھڑاس نکالنے کے بعد وہ کہنے لگا، ''پر تم اس قدر پریشانی میں کیوں پڑ گئیں؟ جنم دینے والے ماں باپ بھی جب نہیں پہچان سکے تو بھلا تم کیسے پہچانتیں؟ اس میں تمہاری کچھ بھی غلطی نہیں ہے۔ پر نالائق بھوت پر تو اس کے لچھن کے مطابق خوب بیتی۔ چھاگل میں گھسنے کے بعد بہت گڑگڑایا، بہت رویا، پر پھر تو رام کا نام لو۔ ہم ایسے نادان کہاں! آخر ندی میں پھینکنے پر اس سے پنڈ چھوٹا اور اس کا چلانا بند ہوا۔ حرام زادہ پھر کبھی چھل کرے گا!''

تب آخر کار گھر والوں نے جیسا کہا، زچہ نے ویسا ہی کیا۔ کبھی کسی بات کا الٹ کر جواب نہیں دیا۔ کسی بھی کام میں آنا کانی نہیں کی۔ اس کی خاطر ساس نے جتنے بھی لڈو وغیرہ بنائے، اس نے چپ چاپ کھالیے۔۔ جب ساس نے کہا تب سر دھویا۔ سورج پوجا۔ برہمن نے ہون کیا۔ عورتوں نے گیت گائے۔ گڑ کی منگلک لاپسی بنی۔ تالاب پر جا کر جل دیوتا کی پوجا کی۔ پیلی چندری اوڑھی۔ بیٹی کو پالنے میں جھلایا۔ جل بھرے گھڑے پوجے۔ کم کم سے آنگن اُریہا۔ مہندی لگائی۔ جیسا کہا ویسا ہی سنگھار کیا۔ زیور پہنے۔ ایسی سلچھنی بہو تو سوبھاگیہ سے ہی ملتی ہے۔

جل پوجن کی رات کو بہو پیلی چندری اوڑھ کر، جھانجھر کی جھنکار کرتی ہوئی رنواس کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ گود میں بچی۔ آنچل میں دودھ۔ آنکھیں سونی۔ دل سونا۔ سر میں مانوان گنت جھینگر گونجار کر رہے ہوں۔ پتی انتظار میں پھولوں کی سیج پر بیٹھا تھا۔ اس ایک ہی رنواس میں رام جانے اسے کتنے جیون بھوگنے پڑیں گے۔ پر آنچل سے دودھ پیتی یہ بچی بڑی ہو کر عورت کا ایسا جیون نہ بھوگے تو ماں کی ساری تکلیفیں سوارت ہو جائیں۔ اس طرح تو جانور بھی آسانی سے اپنی مرضی کے خلاف استعمال نہیں کیے جاتے۔ ایک دفعہ تو سر ہلاتے ہی ہیں۔ پر عورتوں کی اپنی مرضی ہوتی ہی کہاں ہے۔ شمشان نہ پہنچے تب تک رنواس اور رنواس چھوٹنے پر سیدھے شمشان!

☆☆

ویکوم محمد بشیر
ترجمہ مسعود الحق

دو ملیالم کہانیاں

تعویذ

منتراچراتو کا وجود اس دن ہوا جس دن ایک آم عبد العزیز کے گنجے سر پر گرا۔ گھر کے قریب لگے ہوئے آم کے درخت سے پکے آم تو گرتے ہی رہتے تھے۔ ان گرے ہوئے آموں کو اگر فوراً نہ اٹھایا جاتا تو خان انہیں فوراً لپک لیتا اور جھوٹا کر کے انہیں ناپاک کر دیتا تھا اور وہ کھانے کے قابل نہیں رہتے تھے۔

''خان'' عبد العزیز کا کتا ہے۔ وہ خوبصورت ہے، سفید جسم اور اس پر بڑے بڑے کتھئی دھبے، گرے ہوئے آموں میں سے زیادہ تر اسی کے حصے میں آتے تھے اور اسی لئے ہر شخص کی پریشانی یہ تھی کہ انہیں اس سے کیونکر بچایا جائے۔ خان عجیب کتا ہے، وہ کٹہل کھاتا ہے، کیلے کھاتا ہے اور چائے کا بھی شوقین ہے۔ اسے ہمیشہ کھلا رکھا جاتا ہے کیونکہ اگر اسے گھر میں بند کر دیا جائے تو اپنے شور سے سارے گھر کو سر پر اٹھالیتا ہے۔

ابھی حال ہی میں اسے عشق ہو گیا اور وہ ہر وقت اداس رہنے لگا۔ پاروتی کی کالی خوبصورت کتیا ''مالو'' پر اس کا دل آ گیا۔ مالو تھی بھی محلے کی سب سے حسین کتیا، یہ معاملہ ہندو مسلمان کے عشق کا تھا۔ محبت دو طرفہ تھی۔ اور عبد العزیز کی بیوی ام سلمہ اور پاروتی دونوں کو اس معاشقے پر نہ تو کوئی اعتراض تھا اور نہ ہی کوئی تردد۔ پاروتی نے تو ام سلمہ سے کتیا کا ایک بچہ اسے دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

اسی دوران، اسے بدقسمتی ہی کہیے، حالات نے ایک پلٹا کھایا۔ نہ جانے کدھر سے ٹکڑے ٹکڑے سے کتے آ گئے اور انہوں نے مالو سے پیار محبت کی پینگیں بڑھانی شروع کر دیں۔ انہیں مالو اور خان کا ملنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ جھگڑا ہوا اور خان کے ہندو کتے رقیبوں نے نوچ نوچ کر خان کا بھرتا بنا دیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس نے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مقابلہ تو کرنا ہی تھا، خان کی عزت جو داؤں پر لگی تھی۔ ایک مسلمان کتے کی کافروں کے خلاف پرجوش جنگ، خان ہیبت ناک آوازوں کے ساتھ اپنے دشمنوں کی گردنوں پر حملہ کر رہا تھا۔ ہندو کتوں نے اسے زمین سے اٹھا اٹھا کر پٹکا بلکہ اسے نوچا بھی اس بری طرح کی اس کے جسم پر بڑے بڑے گھاؤ ہو گئے اور ساتھ ہی اس کا داہنا کان بھی کٹ کر الگ ہو گیا۔ مالو اس خوفناک معرکے کو بے نیازی سے دیکھتی رہی۔ پاروتی اور ام سلمہ نے بھی یہی کیا۔ ایک ہندو مسلم

جھگڑا ہونے کی وجہ سے ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس کی حمایت کریں۔

شکست خوردہ، زخموں سے خون بہتا ہوا، خان بھاگ کر باورچی خانے کی طرف گیا اور وہاں جا کر فرش پر گر گیا۔ مگر ہندو کتے مل کر بھونکتے رہے اور اسے چیلینج کرتے رہے۔ شرمناک شکست، بے عزتی، رسوائی اور ناکام محبت کے غم کے باوجود خان نے صبر کیا، اور اپنی اس شکست فاش کے اثرات کے تدارک کے لیے کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔ ہوا صرف یہ کہ اسے تمام مادہ نسل سے نفرت سی ہوگئی۔

مادہ سے اس کی کٹر نفرت کی شکار سب سے پہلے دو ہندو عورتیں ہوئیں۔ ایک ہندو مخالف رویہ، اگرچہ یہ کوئی قابل تعریف یا جائز جذبہ نہ تھا۔ پڑوسیوں میں چونکہ زیادہ تر ہندو تھے اس لیے عبدالعزیز یا پھر ام سلمہ کو اپنے یہاں آنے والی ہندو عورتوں کو باہر کے پھاٹک سے گھر کے دروازے تک لانے اور پھر انہیں چھوڑنے کے لیے پھاٹک دروازے تک اور دروازے سے پھاٹک تک دوڑتے ہی رہنا پڑتا تھا۔

یہ صورت حال تھی جب عبدالعزیز کے سر پر آم گرا۔ اسی لمحے ڈاکیہ آ گیا۔ شکر یہ کہ خان میں ہندو مردوں کے لیے نفرت کا جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا۔ عبدالعزیز کے سر پر گرے ہوئے آم کو فوراً ڈاکیہ کی نظر کیا گیا اور گویا اس تحفے کے بدلے میں آنے والے خطوں میں ایک خط اس کے لنگوٹیا یار شنکر ایئر کا نکلا۔ عبدالعزیز اور شنکر ایئر کالج کے زمانے کے دوست تھے۔ ان کی اس دوستی کو ان کی ایک مشترک پریشانی سے بھی ملتی تھی، یہ پریشانی تھی دونوں کا گنجاپن۔ دونوں نے ہر قسم کے علاج کیے، ہر ہر جتن کر ڈالا، گنجے پن کو دور کرنے والی ہر دوا کے اشتہار پر ایمان لائے۔ اس سلسلے کی ہر بات، ہر ملاقات دونوں ایک دوسرے کو بتاتے، یہی نہیں دونوں نے آسمانی طاقتوں سے آس لگائی اور متعدد دیوی دیوتاؤں کے چرنوں میں چڑھاوے چڑھائے۔

دونوں کی بیویوں نے بھی اس سلسلے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ مختلف قیمتی تیلوں سے اپنے شوہروں کے سروں کی باقاعدہ مالش کی اور اپنی عدم موجودگی کی صورت میں خود مالش کرنے کی ہدایت کی۔ مگر افسوس، یہ سرگرمیاں سودمند ثابت نہ ہوئیں۔ کبھی کبھی دونوں بیویاں اپنے شوہروں کو دیکھ کر ہنستی بھی۔ اس گنجے پن کی وجہ سے دونوں دوستوں میں مماثلت بھی بہت پیدا ہوگئی تھی۔ تھوڑے بہت بال جو تھے وہ دونوں کے سروں کے پچھلے حصے پر تھے۔

ابھی کچھ دن ہوئے جب شنکر ایئر اور اس کی بیوی سرسوتی عبدالعزیز کے یہاں آئے، اس وقت دونوں بیویوں نے اپنے اپنے شوہروں کے سروں کے بال گنے تھے اور سرسوتی نے اعتراف کیا تھا کہ عبدالعزیز کے سر پر اس کے شوہر کے مقابلے میں نو بال زیادہ ہیں، مگر عبدالعزیز کے خیال میں سرسوتی کی اس رائے کے پیچھے ایک سبب تھا۔ حمل کے ابتدائی دنوں میں وہ کچھ آم، ہری ہری املیاں اور امرود جیسی چیزیں جو اس زمانے میں عورتیں پسند کرتی ہیں، مسلسل فراہم کرتا رہتا تھا۔

اپنے دوست کا خط پڑھتے ہوئے عزیز نے کسی قدر دکھ کے ساتھ کہا،'' افوہ! ذرا دیکھوتو، سرسوتی اپنے پہلے بیان سے کس طرح ہٹ گئی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس عورت نے محض کچھ آموں کی خاطر سفید جھوٹ بولا؟ تم ہی بتاؤ میرے سر پر بال زیادہ ہیں یا شنکر کے سر پر؟''

''تمہارے سر پر زیادہ بال ہیں، نو بال زیادہ ہیں'' ام سلمہ نے اپنے شوہر کو یقین دلایا۔'' یہ بات بھول نہ جانا کہ ہم اس فیصلے پر بڑے بحث مباحثہ کے بعد پہونچے تھے۔'' آزردہ عبدالعزیز کے لیے سرسوتی کے اس دوغلے پن کو برداشت کرنا بہرحال دشوار ہو رہا تھا۔ اس نے کہا،'' لیکن وہ اب دوسرا ہی راگ الاپ رہی ہے..... یہ دغا بازی...... بہرحال وہ آم.........''

ابھی اس نے اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ اسے ایسا لگا کہ جیسے دروازے پر سے اسے کسی نے مخاطب کیا،'' السلام علیکم۔''

عبدالعزیز نے جواب دیا،'' وعلیکم السلام۔''

ایک اجنبی کے اس طرح اچانک آجانے پر ام سلمہ فوراً اندر چلی گئی۔ اجنبی ایک طویل قامت، گورا اور قبول صورت شخص تھا۔ سفید براق پاجامے اور ململ کے کرتے میں ملبوس۔ وہ ایک سفید صافہ باندھے ہوئے تھا۔ اس کی داڑھی، قلمیں اور مونچھیں اتنے سلیقے اور صفائی سے ترشی ہوئی تھیں کہ مصنوعی لگتی تھیں۔ آنکھوں میں سرمے کی گہری سی تحریر تھی۔ قمیص اور تہبند میں ایک نوجوان لڑکا ہاتھ میں چمڑے کی ایک اٹیچی لیے اس کے ساتھ تھا۔ لڑکے نے آتے ہی بڑے ادب کے ساتھ بلکہ کسی قدر تقریبی انداز میں اعلان کیا،'' زین العابدین تھنگل۔'' (نام کے ساتھ ''تھنگل'' کا لفظ ''سید'' کا مترادف ہے)

عبدالعزیز نے اجنبی مہمان کے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔ لڑکے۔ نے مودب انداز میں بڑے احترام کے ساتھ اٹیچی کو پاس پڑی ہوئی کرسی پر رکھ دیا۔

''یہاں کسی کی طبیعت خراب ہے؟''، تھنگل نے سوال کیا۔

عبدالعزیز نے معتقدانہ انداز میں جواب دیا،'' جی ابھی اس وقت یہاں کوئی بیمار نہیں ہے۔''

''کوئی خواہش ہے جسے تم چاہتے ہو کہ پوری ہو جائے؟''

اس دنیا میں کون ہے جس کے دل میں خواہش نہیں ہے؟ مگر عبدالعزیز اور ام سلمہ کے دل میں کیا آرزوئیں ہیں؟ کسی کو نہیں معلوم۔

جب تھنگل نے اپنی اٹیچی کھولی تو عبدالعزیز کی ناک میں بڑی تیز خوشبو آئی۔ اٹیچی کے اندر کالے دھاگوں کی بہت سی موٹی پتلی لڑیاں تھیں۔ ہر لڑی تقریباً ایک فٹ کے برابر لمبی تھی اور ہر لڑی کے ساتھ کاغذ کی ایک پرچی بندھی

ہوئی تھی۔

"یہ سب تعویذ ہے،" اس نے کہا" ہم لوگوں کی مختلف بیماریوں کو اچھا کرنے کے لیے پانی پھونک کر دیتے ہیں، بیماروں کی سفارش کرتے ہیں اور ان کی شفاء کے لیے مختلف مسجدوں اور مقدس مزاروں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں........ ہے نا؟ اس میں شک نہیں کہ ان سب طریقوں سے لوگوں کو راحت ملتی ہے۔ مگر ایسے شخص کو ڈھونڈھ نکالنا جو ایسی معتبر اور موثر دعا کر سکے، بہت مشکل ہے۔ اور بسا اوقات تو ایسا شخص ملتا ہی نہیں ہے۔ یہ تعویذ بڑے اثر والے ہیں۔ میں نے ان پر بڑی موثر دعائیں پڑھ کر انہیں انتہائی اثر دار بنا دیا ہے۔"

عبدالعزیز نے اٹیچی میں سے دھاگے کی ایک لڑی اٹھائی۔ تھنگل بولا" سر کے درد کے لیے ہے۔ چار روپے پچانوے پیسے۔ تمہیں کرنا صرف یہ ہوگا کہ اسے اپنے بازو پر یا اپنی گردن میں باندھ لو۔ یہ تعویذ تم نے باندھا نہیں کہ تم زندگی بھر کے لیے درد سے محفوظ ہو گئے۔ اسے اگر سونے یا چاندی کا پترا چڑھوا کر رکھا جائے تو یہ گلتا سڑتا نہیں ہے اور بہت دن تک کام آتا ہے۔" تھنگل نے اٹیچی سے ایک ایک کر کے لڑیاں نکالنا شروع کیں اور ہر لڑی کے ساتھ بتانا شروع کیا،" کھانسی کے لیے، پیٹ درد کے لیے، سینے کی جلن کے لیے، قولنج مروڑ کے لیے، دانت کے درد کے لیے، ہسٹریا کے لیے، بھوت پریت بھگانے کے لیے، پاگل پن کے لیے، آتشک، کوڑھ، جذام، سوزاک، کمر کے درد کے لیے، ڈراؤنے خوابوں کے لیے، پیٹ میں کیڑوں کے لیے، بدمزاجی اور چڑچڑے پن کے لیے، چار روپے پچانوے پیسے فی تعویذ۔"

عبدالعزیز نے کسی قدر سادگی سے پوچھا،" یہ تعویذ کیا جانور کے لیے بھی کار آمد ہے؟"

" کیوں نہیں، یقیناً، گائے، بیل، بکریوں، گھوڑوں، اونٹوں یہاں تک کہ مرغیوں تک کے لیے میرے پاس خاص تعویذ ہیں۔ مثلاً اگر تمہاری مرغی انڈے نہیں دیتی تو پھونکے ہوئے دھاگوں کی ایک لڑی مرغی کے ایک پاؤں میں باندھ دو اور بس۔"

" کتیوں کے لیے بھی کوئی تعویذ ہے؟ ادھر کچھ دنوں سے ہمارے کتے نے ہندو عورتوں کو کاٹنا شروع کر دیا ہے۔ کیا آپ مجھے کوئی ایسا تعویذ دے سکتے ہیں جو کتے کو ایسا کرنے سے روک سکے؟"

"یعنی ایک ایسا کتا جو صرف ہندو عورتوں کو کاٹتا ہے؟"

"جی ہاں۔"

" کتے کو صرف ہندو عورتوں سے ہی نفرت کیوں ہے؟"

" ہمارے کتے کو پڑوس کی ایک کتیا مالو سے محبت تھی۔ ہماری پڑوسن پاروتی کی کتیا ہے۔ لیکن ایک دن مگڑے تگڑے ہندو کتوں نے پاروتی اور مالو کی آنکھوں کے سامنے ہمارے کتے کو بھنبھوڑ ڈالا۔ بیچارے کا دایاں کان بھی کٹ

کر الگ ہو گیا۔ جھگڑے کو ختم کرانے کے بجائے پاروتی لڑائی کو بس کھڑی دیکھتی رہی۔''

''کتے کے اندر ہندو عورتوں کے خلاف جذبہ پیدا ہونے کی شاید یہی وجہ ہے''، تھنگل نے کہا۔

''مگر میری بیوی ام سلمہ بھی پاروتی ہی کی طرح کھڑی لڑائی کو دیکھتی رہی تھی۔ کتے کو مسلمان عورتوں سے بھی نفرت کرنا چاہیے۔''

''اس کا نام کیا ہے؟''

''خان۔''

کتے کے نام کا لیا جانا تھا کہ وہ آ کر ان لوگوں سامنے کھڑا ہو گیا۔

''دیکھو، اصل بات یہ ہے کہ یہ مسلمان عورتوں کو صرف اس لیے نہیں کاٹتا کہ اس کا نام خان ہے''، تھنگل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

عزیز نے اپنا سوال دہرایا: ''کیا آپ کے پاس کوئی ایسا تعویذ ہے جو اسے ہندو عورتوں کو کاٹنے سے روک سکے؟''

''صرف اس بات کے لیے تو میرے پاس کوئی تعویذ نہیں ہے مگر ہاں ایسا تعویذ ہے جو اسے کسی کو بھی کاٹنے سے روک سکتا ہے۔ اس کے لیے یہ تعویذ رہے گا۔ صرف چار روپے پچانوے پیسے۔''

تھنگل نے بہت سے تعویذوں پر لگی ہوئی پرچیوں کو پڑھا اور پھر ان میں سے ایک کو نکال کر کہا: ''یہ رہا علو ہم اسے خان کے گلے میں باندھ دیں۔''

عبدالعزیز گھر کے اندر جا کر ایک لوٹے میں پانی اور ایک صابن لے کر آیا۔ تھنگل اور عبدالعزیز اٹھ کر باہر صحن میں گئے۔ عبدالعزیز نے خان کو پکڑا اور تھنگل نے اس کی گردن میں وہ تعویذ باندھ دیا۔ ''اسلامی قاعدے کے مطابق جو بھی کسی کتے کو ہاتھ لگائے اسے سات دفعہ مٹی سے ہاتھ دھونا لازمی ہے''، تھنگل نے کہا۔

عبدالعزیز لوٹے سے پانی ڈالتا رہا اور تھنگل نے سات بار مٹی سے اپنے ہاتھ دھونے کی رسم کو پورا کیا۔ عبد العزیز نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد دونوں نے صابن سے اپنے ہاتھ دھوئے۔ اپنے ڈیڑھ کانوں اور گلے میں کالے دھاگوں کے ساتھ خان بڑی شان سے کھڑا ہوا تھا۔ ''بس اب آج کے بعد تعویذ کی برکت سے یہ کسی کو نہیں کاٹے گا''، تھنگل نے بڑے اعتماد لہجے میں اعلان کیا۔

ام سلمہ چائے کے تین گلاس لیے ہوئے دروازے پر آئی۔ چائے ختم کرنے کے بعد تھنگل نے دھاگے کی بہت سی لڑیوں کو اٹھایا اور ایک ایک کو دکھانا شروع کیا: ''یہ بہرے پن کے لیے، یہ کمزور نگاہ کے لیے یہ فالج کے لیے اور یہ بخار کے لیے، یہ بیماری عشق سے صحت یاب ہونے کے لیے، اس سے بے خوابی سے نجات ملے گی، یہ پیشاب کے تمام

امراض کے لیے، اس کو استعمال کرنے سے بانجھ پن دور ہوگا اور ان چاہے حمل سے بھی نجات ملے گی، اس کو استعمال کرنے سے اولاد اپنی پسند کی ہوگی، لڑکا یا لڑکی، اور اس سے دشمن پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ سچ تو یہ کہ ہر مرض اور آدمی کی ہر پریشانی کے لیے تعویذ موجود ہے اور ان میں سے ہر ایک کی قیمت ہے صرف چار روپے پچانوے پیسے۔''

وقت گزرنے کے ساتھ ان کا اثر کم ہوتا جاتا ہوگا؟'' عبدالعزیز نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

''ارے نہیں مگر وقت کے ساتھ تعویذ گھستا چلا جاتا ہے اور بوسیدہ ہو جاتا ہے اسی لیے تو میں اسے چاندی کے پترے میں مڑھوانے کا تمہیں مشورہ دیتا ہوں۔ میرے والد صاحب نے ایک تعویذ چاندی کے پترے میں مڑھوا کر رکھا تھا۔ ان کے انتقال کو بیس برس سے زیادہ ہو چکے ہیں مگر تعویذ ابھی بھی میرے پاس ہے اور اچھی حالت میں ہے۔''

''کیا دوسرا والا تعویذ دستوں کے لیے بھی ویسا ہی مفید ہوگا؟''

''ہرگز نہیں، دیکھو، ہر تعویذ الگ الگ قوت اور الگ الگ تاثیر کا ہوتا ہے۔ دستوں کے لیے وہی تعویذ استعمال کرنا ہوگا جو دستوں کے لیے ہو۔''

یہ بات ہو رہی تھی کہ ام سلمہ نے اپنے شوہر کو اندر آواز دی۔ عبدالعزیز اٹھ کر دروازے پر گیا۔ ام سلمہ نے اس کے کان میں کہا،'' ذرا ان سے پوچھو کہ ان کے پاس گنجے پن کے لیے بھی کوئی تعویذ ہے؟''

''ہوگا نہیں ان کے پاس،'' عبدالعزیز نے دھیرے سے کہا۔

''ارے پوچھو تو، معلوم کرنے میں کیا حرج ہے؟'' ام سلمہ نے اصرار کیا۔

عبدالعزیز نے باہر آ کر تھنگل سے پوچھا، آپ نے کہا تھا کہ آپ کے تعویذ انسانوں کے تمام امراض کا تدارک کر سکتے ہیں۔ کیا آپ کے پاس کوئی ایسا تعویذ ہے جو کسی گنجے سر پر بال اگانے کے لیے ہو؟''

عبدالعزیز کو بڑی حیرت ہوئی جب تھنگل نے اٹیچی کے اندر بالکل نیچے ہاتھ ڈال کر دھاگوں کی بہت سی لڑیاں نکالیں۔ ان لڑیوں میں ہر ایک پر لگی ہوئی پرچی میں لکھا ہوا تھا، گنجے پن کے لیے۔''

''اسے تمہیں اپنی کمر میں باندھنا ہوگا۔''

ت'' تب تو مجھے اس کو مزید لمبا کرنا ہوگا، میرا ایک دوست ہے شنکر ائیر، وہ بھی میری ہی طرح گنجا ہے۔ اگر اس تعویذ کو کمر کے چاروں طرف باندھنا ہوگا تو پھر تو مجھے چار تعویذوں کی ضرورت ہوگی۔ دو اپنے لیے اور دو شنکر ائیر کے لیے۔''

''ہاں۔''

تھنگل نے خود ہی دو دو تعویذوں کو ایک دوسرے سے باندھ دیا۔ عزیز ان تعویذوں کو لیکر اندر گیا اور ام سلمہ نے فورا ان میں سے ایک کو اپنے شوہر کی کمر میں باندھ دیا۔ عبدالعزیز نے اپنے سر اور اپنے جسم میں ایک عجیب وغریب سرسراہٹ

سی محسوس کی۔ ایک عجیب سا احساس، شنکر ائیر کے تعویذ کو نہایت احتیاط کے ساتھ لفافے میں رکھا گیا اور ساتھ ہی اس کے زبردست اثرات کے بارے میں ایک چھوٹا سا خط بھی لکھ کر رکھ دیا گیا۔ اس نے چوبیس روپے پچھتر پیسے تھنگل کے ہاتھ پر رکھے۔ یہ پانچ تعویذوں کی قیمت تھی۔ ایک تعویذ خان کا، دو شنکر ائیر کے اور دو خود عبدالعزیز کے۔

عزیز کو بڑا جوش و خروش تھا: ''اس خفیہ اور غیر معروف معجزے کی خبر تو حکومت کو دی جانا چاہیے۔ ہزاروں روپے اسپتالوں، دواؤں اور ڈاکٹروں پر خرچ کیے جا رہے ہیں۔ ایک زبردست نقصان۔ یقیناً ایک مجرمانہ تضیع۔ ان تعویذوں کو ہر جگہ فراہم کیا جانا چاہیے۔ اس کے بعد ان اسپتالوں کو بڑے بڑے پانچ ستارہ ہوٹلوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے، یا پھر انہیں کسی دوسرے بہتر مصرف کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ تعویذ تو پرچون کی تمام دوکانوں پر، پان بیڑی کی ہر دوکان پر، ریلوے اسٹیشنوں اور ہوائی اڈوں پر ملنے چاہئیں۔ اتنی ضروری چیز کی تقسیم کے لیے تو خصوصی شعبے کھولے جانے چاہئیں۔ یہ برآمد کی جانے والی شے ہو سکتی ہے۔ بمبئی، انگلستان، جرمنی، امریکہ اور روس میں اچھی منڈیاں مل سکتی ہے، جہاں اسپتالوں اور دواؤں پر زبردست خرچ ہوتا ہے، اور اس سودے میں ہم کچھ نفع بھی کما لیں گے۔''

''مگر اس اسکیم پر عمل درآمد کرانے کے لیے مجھے کس سے بات کرنا چاہیے؟''

''تمہیں صرف اپنے وزیر اعظم سے بات کرنی ہوگی۔''

''میرا خیال ہے یہ ممکن ہے، ہو سکتا ہے کچھ مسلمان وزیر ہوں؟ یہ لوگ یقیناً ہماری مدد کریں گے۔'' تھنگل نے اتفاق کیا۔

''جناب کا کیا خیال ہے، یہ بیماریاں کیوں ہوتی ہیں؟''

''یہ سب جنوں اور شیطانوں کی کارگزاری ہے۔ اب اسی گنجے پن کو دیکھو، تم اس کی وجہ کیا سمجھتے ہو؟''

''بالوں کا جھڑنا:'' عبدالعزیز نے کہا۔

''اور بال کیوں جھڑتے ہیں؟''

''معلوم نہیں۔''

''میں تمہیں بتاتا ہوں، یہ بدروحیں جو تمہارے بال اکھاڑتی رہتی ہیں۔ یہ بدروحیں چاند پر رہتی ہیں۔''

''مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے چاند پر تو کوئی نہیں رہتا ہے۔ سائنس دانوں کے چاند پر جانے کے بعد اخباروں نے لکھا تھا۔پ''

''تم ان پر یقین کرتے ہو؟'' چاند تک پہنچنا ناممکن ہے۔ چاند پر سے جو کچھ لان ے کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں وہ سب یہیں کسی پہاڑی پر سے اٹھائی ہوئی چیزیں ہیں۔ نہیں نہیں، یہ لوگ چاند تک نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی کبھی پہنچیں گے،'' تھنگل نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

ٹھنگل اور اس کے ساتھ والا لڑکا جانے کے لیے تیار ہوئے۔ عبدالعزیز سے رخصت کی اجازت لیتے ہوئے اس نے کہا: "ان تعویذوں کی آسان فراہمی کے سلسلے میں کچھ مسلمان وزیروں کے ذریعے وزیراعظم صاحب سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ اچھا خدا حافظ۔ السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔"

اسی دن تعویذ اور ایک خط رجسٹرڈ پوسٹ سے شنکر ائیر کو بھیج دیا گیا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔

اسی زمانے میں ایک دن للتا، ایک خوبصورت ہندو لڑکی، کسی کام سے عبدالعزیز کے گھر آئی تھی۔ خان نے اسے کاٹ لیا، گھاؤ بہت گہرا نہیں تھا للتا کی ران پر صرف چند دانتوں کے نشان پڑے تھے۔ ام سلمہ نے ان پر کڑوے کریلے کا لیپ لگا دیا۔ اس نے للتا کی پھٹی ساڑی بھی سی دی۔ ایک پیالی چائے پلائی اور پچیس روپے جو وہ ادھار لینے آئی تھی، وہ بھی دے دیے۔

حیرت کی بات ہے کہ تعویذ کے باوجود خان کی ہندو عورتوں کو کاٹنے کی عادت ختم نہیں ہوئی تھی۔ للتہ کو اس طرح کاٹ لینے کی حرکت خان کی ہندو عورتوں سے پچھلی نفرت ہی کا مظہر تھی۔ مگر اس دفعہ خان نے جس طرح للتا کو کاٹا تھا اسے یقیناً کاٹنا نہیں کہا جا سکتا۔ لوگ کہتے تھے کہ کاٹنے کی اس کی یہ عادت آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی۔

مگر وہ بال جو عبدالعزیز کے سر پر نکلنے والے تھے؟ ام سلمہ روزانہ اپنے شوہر کے سر کی مالش کرتے وقت بڑی امیدوں کے ساتھ غور سے دیکھتی کہ آیا کہیں کسی نئے بال کے نکلنے کے کوئی آثار ہیں۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ کوئی قابل ذکر تبدیلی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ پھر اچانک ایک اور خوفناک واقعہ ہوا۔ خان نے اب مسلمان عورتوں سے نفرت کرنی شروع کر دی تھی۔ یہ بات اب بالکل واضح ہو گئی کہ خان اب پورے طور پر عورتوں سے بیزار ہو گیا ہے۔

ام سلمہ کی ماں ملنے کو آئی تو خان نے اسے بھی کاٹ کھایا۔ وہ چلائی: "مجھے بچاؤ! اپنے کتے سے مجھے بچاؤ نہیں تو وہ مجھے مار ہی ڈالے گا، اس جانور کو جان سے مار دو۔"

ماں کی چیخیں سن کر ام سلمہ اور عبدالعزیز دونوں بھاگے بھاگے آئے اور دیکھا کہ خان نہایت معصومیت کے ساتھ وہاں کھڑا ہے۔ تعویذ اس کے گلے میں لٹک رہا تھا۔ محبت میں ناکامی کی وجہ سے خان کے اس عجیب و غریب رویے پر غریب کو جان سے کیوں مار دیا جائے؟ ان دنوں عورتیں عموماً اسے اچھی نہیں لگتی ہیں۔ مگر اس نے ام سلمہ پر اپنے غصے کا اظہار ابھی نہیں کیا ہے۔ مگر اس کی ماں.......... اس خیال سے عبدالعزیز کو جیسے گدگدی سی ہوئی۔ وہ یوں بھی اپنی ساس کو تکلیف پہنچانے کے مختلف طریقوں کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ خان نے اس کی خوش دامن کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس پر اسے اگر چہ اندر ہی اندر خوشی تھی مگر اس نے خان کو مارنے اور کمرے میں بند کر دینے کا ناٹک کیا۔ پھر

سات دفعہ مٹی سے اپنے ہاتھ دھوئے۔ ام سلمہ نے ماں کے زخم کو دھونے اور اس پر پرانا دیسی مرہم لگانے کی رسم ادا کردی۔

وقت گزرتا گیا مگر جہاں تک عبدالعزیز کے گنجے پن کا سوال تھا کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اس کی کھوپڑی بدستور چمکتی ہوئی کھوپڑی تھی۔ ''پتا نہیں شنکر ایئر کے سر پر کچھ بال نکلے یا نہیں؟'' عزیز سوچ رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ تعویذ بے اثر ہوں۔ خان عورتوں کو اب بھی کاٹ رہا ہے۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ نئے نکلنے والے بالوں کو جن نوچ لیتے ہوں؟ مگر انہیں انسانوں کے بالوں کی کیا ضرورت ہوگی؟ ان جنوں کو دور رکھنے کے لیے بھی تعویذ ہوں گے تھنگل کے دیے ہوئے تعویذوں سے زیادہ طاقتور تعویذ بھی ہوں گے۔ تھنگل کے تعویذوں کو بے اثر بنانے سے کن لوگوں کو دلچسپی ہوگی؟ دلچسپی تو تمام ان لوگوں کو ہوسکتی ہے جن کا تعلق علاج معالجے اور دوائیں بنانے سے ہے۔ کیا بازار میں بہت سے دوسرے تعویذ بھی آگئے ہیں؟ یہ اور ایسے بہت سے خیالات تھے جو عبدالعزیز کے ذہن میں گھوم رہے تھے۔ یہ سارا مسئلہ بہر حال ایک انتہائی الجھا ہوا گورکھ دھندا تھا اور اس کی سمجھ سے بالاتر۔ لیکن پھر وہ اس بارے میں مشورہ کس سے لے؟

ام سلمہ اور عبدالعزیز نے صورتحال کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد یہ سوچنا شروع کیا کہ آیا انہیں اس تعویذ کا استعمال جاری رکھنا چاہیے یا ترک کردینا چاہیے۔ بہت غور وخوض کے بعد آخر فیصلہ کرلیا گیا۔ عبدالعزیز نے قینچی سے کاٹ کر خان کے گلے کا تعویذ الگ کردیا۔ اسی قینچی سے ام سلمہ نے اپنے شوہر کی کمر میں بندھے ہوئے تعویذ کو بھی کاٹ دیا۔ کٹے ہوئے تعویذ کے دھاگوں کو گھر کے پچھلے آنگن میں لے جا کر مٹی کے تیل میں ڈبویا گیا اور آگ لگا دی گئی۔ تعویذ کے جلانے سے کوئی خاص بات بھی نہیں ہوئی، نہ کوئی دھماکہ نہ کچھ اور۔ جلتے ہوئے دھاگے ذرا دیر میں راکھ ہوگئے۔ عبدالعزیز نے راکھ کو جمع کرکے آم کے درخت کے نیچے دفن کردیا۔

''یہ سب کرنے کے بعد انہیں ایسا لگا جیسے ان کے سروں سے کوئی بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ مگر ذرا اتفاق دیکھیے۔ اسی وقت شنکر ایئر کا خط ملا اور ساتھ ہی سو روپے کا منی آرڈر۔ خط میں ایک بڑی اہم خبر دی گئی تھی۔ شنکر ایر بے حد خوش تھا۔ اس نے لکھا:

تعویذ کا بہت بہت شکریہ۔ میں نے جس دن تعویذ کو اپنی کمر میں باندھا تھا اسی دن ایک روپے کا ایک لاٹری کا ٹکٹ بھی خریدا تھا۔ اس ٹکٹ پر ایک ہزار روپے کا انعام نکلا۔ یہ تعویذ بعد کو سرسوتی کی کمر میں باندھا گیا۔ نتیجہ جانتے ہو کیا نکلا؟ بغیر کسی تکلیف کے بچے کی پیدائش اور بچہ بھی لڑکا۔ یہ کچھ تم جانو اسی تعویذ کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں جو روپے تمہیں بھیج رہا ہوں اس میں جتنے تعویذ آسکیں، مہربانی کرکے مجھے فوراً سے پیشتر بھجوادو۔ دو تعویذ میرے والدین چاہتے ہیں۔ مجھے بھی اور تعویذ چاہئیں۔ ہمیں بچے کے لیے بھی ایک تعویذ کی ضرورت ہے اگر یہ روپے کافی نہ ہوں تو میں اور روپے بھیج دوں گا۔'' خط میں گنجے سر پر بال کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا۔

(ملیالم سے انگریزی میں ترجمہ: وناجم رونڈرن)

ویکوم محمد بشیر
ترجمہ مسعود الحق

بچپن کی دوست

ویسے تو زہرا اور مجید بچپن سے ایک دوسرے کے بڑے جگری دوست رہے تھے، مگر ان کی اس جگری دوستی کی ایک عجیب بات یہ تھی کے دونوں اس طرح قریب آنے سے پہلے ایک دوسرے کے انتہائی دشمن تھے اس دشمنی کی کیا وجہ تھی؟

وہ ایک دوسرے کے پڑوسی تھے دونوں خاندانوں کے درمیان بڑے اچھے تعلقات تھے مگر ان دونوں میں سخت دشمنی رہتی تھی۔

زہرا کی عمر سات سال تھی اور مجید نو برس کا تھا۔ ایک دوسرے کا منہ چڑانا اور ڈرانا دونوں کی عادت تھی۔

اور پھر آم کی فصل آئی زہرا کے گھر کے قریب لگے ہوئے آم کے درخت سے آم ٹپکتے مگر زہرا کے ہاتھ کوئی آم نہ آتا۔ زہرا آم گرنے کی آواز سنتی، بھاگ کر وہاں جاتی مگر دیکھتی یہ کہ مجید اس کے وہاں پہونچنے سے پہلے ہی اسے اٹھا چکا ہے اور مزے لے لے کے کھا رہا ہے۔ وہ زہرا کو آم دکھاتا تو تھا مگر دیتا نہیں تھا۔ اور اگر کبھی دیتا بھی تو یہ آم وہ ہوتا جو وہ تھوڑا سا کھا چکا ہے... اس کا جھوٹا آم... اور پھر جب زہرا اس آم کو لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتی تو مجید اپنی کہنی زہرا کے منہ کے قریب لے جاتے ہوئے کہتا ''لو میری کہنی کھالو'' اس طرح تنگ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ جب کبھی زہرا کو دیکھتا تو اپنی آنکھیں پھاڑ کر لمبی سی زبان نکال کر اسے ڈرانے کی کوشش کرتا۔ زہرا اس کی اس حرکت سے خوفزدہ کبھی نہ ہوتی، بلکہ وہ اسے پلٹ کر اسی طرح چڑھا دیتی، مگر جہاں تک آموں کا تعلق تھا، زہرا ہمیشہ خسارے میں رہتی۔ اسے آخر کوئی آم کیوں نہیں ملتا تھا؟ ہوا چل رہی ہو یا نہ چل رہی ہو زہرا درخت کے نیچے کھڑی رہتی مگر آم تو کیا کوئی پتہ بھی نہ گرتا وہ جانتی تھی کہ درخت پر بہت سے پکے ہوئے آم لگے ہیں۔ پھر بھی اگر کوئی آم نہ گرے تو آم حاصل کرنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ درخت پر چڑھا جائے۔ مگر درخت پر تو سیکڑوں لال چیونٹے ہیں، وہ تو کاٹ کاٹ کر لہولہان ہی کر ڈالیں گے۔ اور اگر چیونٹے نہ بھی ہوتے تب بھی وہ۔۔۔۔ ایک لڑکی۔۔۔۔ درخت پر کیسے چڑھ سکتی تھی؟

ایک دن وہ وہاں کھڑی تھی اور آموں کو دیکھ دیکھ کر اس کے منہ میں پانی آ رہا تھا کہ دفعتا درخت کی ٹہنیوں کے بیچ سے کوئی چیز نیچے آ کر بڑے زور سے گری۔ آواز سن کر زہرا لپکی، بے انتہا خوش، وہ اسے اٹھانے ہی والی تھی مگر رک گئی۔ یہ آم نہیں ایک چھوٹا سا ناریل تھا۔ وہ کھسیا گئی۔۔۔۔ اس کا کھسیانا کسی نے دیکھا تو نہیں؟ نہیں مگر سوال یہ ہے

کہ آم کے درخت سے یہ ناریل کیسے گرا؟ اس نے چاروں طرف دیکھا، یکا یک اسے نظر آیا۔ وہ غصے سے پاگل ہوگئی، یہ وہی تھا۔

مجید نے جس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی، زہرا کو اور چڑھانے کے لئے منہ سے کچھ بے معنی سے آوازیں نکالیں اور زور سے ٹلی لی ٹلی لی کہتا ہوا درخت سے نیچے آیا۔ ان حرکتوں کے بعد بھی اس نے بس نہیں کی بلکہ اپنی آنکھیں پھاڑیں اور لمبی سی زبان نکال کر دکھاتا رہا۔ اس کی صورت بڑی ڈراونی لگتی تھی۔

گاؤں کی کوئی دوسری لڑکی اگر یہ منظر دیکھتی تو کانپنے لگتی اور خوف زدہ ہو کر بچاؤ بچاؤ کہتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوتی۔ بہت سی لڑکیاں ڈر کر بھاگ بھی چکی تھیں۔ مگر زہرا نہیں بھاگی اور صرف یہی نہیں کہ وہ بھاگی نہیں بلکہ اس نے بھی اپنے دیدے گھمائے اور زبان نکال کر مجید کو دکھا دی۔ زہرا کی اس حرکت کو دیکھ کر مجید کو بڑا تاؤ چڑھا۔۔۔ یہ چھوٹی سی، سڑی سی لڑکی ایک بڑے سے لڑکے کو ڈرانے کی کوشش کر رہی ہے؟ وہ زہرا کے اور قریب آ گیا۔ اس کی آنکھیں اور پھیل گئیں، اس کی بھنوئیں تن گئیں، اس کے نتھنے چوڑے ہو کر پھڑ کنے لگے اور اس نے منہ سے غرر غرر کی بڑی بھیانک آوازیں نکالنا شروع کر دیں۔ زہرا پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی مجید کو حیرت تھی۔ چھالیا بیچنے والے کی ایک معمولی سی لڑکی، لکڑی کے تاجر کے بیٹے سے ڈرتی کیوں نہیں ہے؟ عورتوں کو ان کی عمر چاہے جتنی ہو، مردوں سے ڈرنا چاہئے۔ مجید زہرا کے اور نزدیک گیا مگر زہرا نے ایک انچ بھی حرکت نہیں کی۔ مجید کا وقار مٹی میں مل گیا تھا۔ اس پر اب واقعی جنون سوار ہو رہا تھا۔ آخر اس کی یہ ہمت کیسے ہوئی؟ زہرا کی کلائی پکڑتے ہوئے اس نے غصے سے پوچھا "اے تم۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا" ایسا نہیں تھا کہ اسے اس لڑکی کا نام نہیں معلوم تھا۔ وہ نام خوب اچھی طرح جانتا تھا، مگر اسے کچھ نہ کچھ پوچھنا تھا۔ پوچھنا تھا نا؟ وہ بہر حال ایک مرد تھا اسی لئے اس نے پوچھ لیا۔

ایسا لگتا تھا کہ وہ اسے کچا ہی چبا لے گا۔ زہرا کے چھوٹے چھوٹے دانتوں اور انگلیوں کے دسوں تیز ناخنوں میں جیسے کھجلی ہونے لگی۔ تھوڑی دیر تو اسے یہی اندازہ نہیں تھا کہ کرنا کیا چاہتی ہے۔ وہ اپنے دانتوں سے اس کے بازو پر سے ایک بوٹی اتار لے یا پھر اپنے تیز نکیلے ناخنوں سے اس کے سارے جسم کو نوچ ڈالے۔؟ "اے تم!" اس کی ماں اور اس کے باپ نے بھی اسے کبھی مخاطب نہیں کیا تھا۔ یہ بدتمیز لڑکا جو مجھے گھورتا بھی ہے، آم بھی نہیں دیتا ہے اور کھانے کے لئے آم کی بجائے میرے منہ کے سامنے اپنی کہنی اٹھا کر کہتا ہے، "لو میری کہنی کھا لو"، مجھے اس طرح مخاطب کرتا ہے! وہ غصے سے بھری ہوئی اس پر جھپٹی اور تیز تیز نکیلے ناخنوں سے اس کے دائیں ہاتھ کو اپنی پوری طاقت سے نوچ ڈالا۔ مجید بلبلا اٹھا، جیسے تپتی ہوئی گرم گرم کیلیں اس کے ہاتھ میں ٹھونک دی گئی ہوں۔ اس نے زہرا کی کلائی چھوڑ دی اور زور سے چلایا، "بچاؤ"، مجید کو اس بات کی توقع نہیں تھی۔ بہر حال، اس نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ بدلے میں زہرا کو بھی اس طرح نوچے گا، مگر۔۔۔۔ مگر اس نے تو اپنے ناخن چبا چبا کر پہلے ہی ختم کر رکھے تھے اب تو وہ صرف یہی کر سکتا

تھا کہ اسے گھونسے مارے یا پھر دانت کاٹ لے۔ مگر اسے یہ خوف گھیرے ہوئے تھا کہ اس کے بعد زہرا اس کے ساتھ پھر ایسا ہی کرے گی۔۔۔۔۔۔ اور زہرا تو یہ کام پہلے ہی کر چکی تھی۔ اگر لوگوں کو معلوم ہوا کہ زہرہ نے اسے مارا ہے تو یہ بڑی بے عزتی کی بات ہوگی۔ بڑی بدنامی ہو جائے گی۔ اس نے کچھ نہیں کیا۔ شکست خوردہ، ایک احمق کی طرح وہ وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ زہرہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ مجید ٹس سے مس نہ ہوا۔ زہرہ نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے منہ بنایا اور پھر اس کی نقل کرتے ہوئے اسی کی سی آواز بنا کر چیخی، ''بچاؤ'' اس پر بھی مجید کو حرکت نہ ہوئی۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اپنی اس بے عزتی کو چھپانے کے لئے وہ کیا کرے اور اس وقت کیا جواب دے وہ بہر حال ایک مرد تھا۔ مگر وہ کہہ کیا سکتا ہے؟ کوئی ایسی بات ہونا چاہیئے جس کا اثر ہو۔ اس کی سمجھ میں ایسی کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔ خیال کو ہٹانے کے لئے اس نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کیلے کے درختوں کے درمیان اسے زہرہ کا گھر دکھائی دیا، جس کی چھت پھوس کی تھی اور دیواریں مٹی سے لپی ہوئی تھیں۔ ناریل کے جھنڈ میں کھپریلوں کی چھت اور سفیدی کی ہوئی دیواروں والا اپنا گھر بھی اسے نظر آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ زہرہ کی تذلیل کرنے کے لئے اس نے کہا ''میرے گھر میں کھپریل کی چھت ہے''، اس میں گھمنڈ کرنے کی کون سی بات ہے؟ میرے گھر کی چھت پھوس کی ہے تو اس میں شرمندگی کیوں؟ مجید کو چڑھانے کے لئے اسی کی نقل کرتے ہوئے وہ پھر زور سے چیخی، ''بچاؤ''

تب مجید نے کچھ اور بھی کہہ دیا، ''تیرے ابا تو چھالیا بیچتے ہیں اور میرے والد۔۔۔۔۔۔۔ میرے والد لکڑی کے بہت بڑے تاجر ہیں''۔ اس میں بھی زہرہ کو شیخی بگھارنے کے لائق کوئی پہلو نظر نہیں آیا، زہرہ وہیں کھڑی آم کے درخت کو دیکھتی رہی اور یہ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک کیڑے کے حقیر وجود سے بھی واقف ہے۔

مجید کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے والے تھے۔ کیسی بے عزتی ہے، کیسی بے عزتی ہے کیسی جھڑکی ہے! یہ اس کے لئے قطعی ناقابل برداشت تھا۔ وہ گدھے کی طرح چیخنا اور چلانا چاہتا تھا۔ اگر چیخ لے تو اس کی خفت اور غصہ کچھ کم ہو جائے گا۔ مگر معاً اس کلے دماغ میں ایک اور خیال کوندا۔۔۔۔ ایک کام ایسا ہے جو صرف وہی کر سکتا ہے اور دوسرا کوئی نہیں کر سکتا، اور اس سے وہ زہرہ کو بھی مات دے دے گا۔ اپنی فوقیت اور برتری کے احساس سے سرشار اس نے گویا ساری زمین اور آسمان کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کیا، ''میں آم کے درخت پر چڑھنا جانتا ہوں۔

زہرہ کی پلک تک نہیں جھپکی۔ یہ جاننا کہ درخت پر کیسے چڑھا جاتا ہے، کیا یہ کوئی بہت بڑی بات ہے؟ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور پھر اگر وہ درخت پر چڑھ بھی جائے تو کیا وہ کوئی آم اسے دے گا؟ یہ فرض کر لینا چاہیے کہ وہ نہیں دے گا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس صورت میں اپنے حق کو پہلے ہی جتا دینا چاہیے۔ ''وہ جو دو بڑے پکے آم ہیں نا۔۔۔'' (آموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے درخت پر چڑھنے کے بعد جن کا حاصل کرنا کوئی دشوار کام نہیں تھا۔۔۔۔) ''ان

آموں کو پہلے میں نے دیکھا ہے‘‘۔

مجید خاموش رہا۔اس کی خاموشی شاید اس لئے تھی کہ وہ درخت پر رینگتے ہوئے چیونٹوں سے ڈر رہا تھا۔یہی سمجھ کر زہرہ نے کہا،’’ارے ہاں!چیونٹے تو تمہیں چبا جائیں گے‘‘۔مجید کو زہرہ کا نہ تو لہجہ پسند آیا اور نہ ہی انداز۔اسے تاؤ آ گیا،چیونٹے!چیونٹوں کی کوئی پرواہ نہیں۔درخت اگر بچھوؤں سے پٹا ہوتا تب وہ درخت پر چڑھتا۔دونوں آم اس نے پہلے دیکھے۔کیا واقعی اس نے دیکھے تھے؟مجید نے اپنی لنگی چڑھائی اور آناً فاناً درخت پر چڑھ گیا۔اگرچہ اس کے سینے پر کھال جگہ جگہ سے چھل گئی،سارے جسم کو چیونٹوں نے بھنبھوڑ لیا،مگر وہ دونوں آموں کو جنہیں زہرہ نے دیکھا تھا،توڑ کر انتہائی فاتحانہ انداز میں نیچے اترا۔

زہرہ بڑی بے چینی اور تذبذب کے ساتھ اس کی طرف لپکی اور اپنا ہاتھ بڑھایا۔’’یہ مجھے دو‘‘۔مجید کچھ نہ بولا اور اپنے ہونٹ سختی سے بند کیے ہوئی وہیں کھڑا رہا۔

’’یہ مجھے دو۔۔۔انہیں میں نے پہلے دیکھا تھا!‘‘۔

مجید نے اس کی طرف دیکھا اور مذاق اڑاتے ہوئے کہا،’’واقعی؟سچ؟‘‘یہ کہہ مجید نے ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔چلتے چلتے وہ آموں کو سونگھتا جاتا اور خود اپنے آپ سے کہتا جاتا،’’کیسی عمدہ خوشبو ہے!‘‘

زہرہ کو غصہ آ گیا۔وہ پیچ و تاب کھا رہی تھی۔اسے دکھ تھا،تکلیف پہونچی تھی،اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ سسکیاں بھرنے لگی۔وہ الٹے پاؤں واپس آیا۔اپنی برتری اور فوقیت جتانے کا یہی موقع تھا۔اس نے آم زہرہ کی طرف بڑھائے۔انتہائی خواہش کے باوجود زہرہ انہیں لینے کے لیے ٹس سے مس نہ ہوئی۔مجید نے دونوں آم اس کے سامنے رکھ دیے۔زہرہ نے انھیں ہاتھ نہیں لگایا۔اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔وہ اتنا بے غرض ہے،زہرہ اپنے آپ کو اس بات کا یقین نہیں دلا پا رہی تھی۔اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے پیچھے باندھ لیے۔آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک رہے تھے۔وہ وہیں کھڑی رہی۔

مجید خاصا پریشان ہو کر بولا،’’اگر تم چاہتی ہو تو میں اور آم بھی لا سکتا ہوں‘‘۔

زہرہ پگھلی۔اگر یہ چاہے تو اور بھی آم لا سکتا ہے۔کتنا بے غرض،کتنی ہمت والا اور کتنا اچھا لڑکا ہے!اس کو نوچنا کھسوٹنا کیا ٹھیک تھا؟

خودغرضی اور ضد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بڑی انکساری کے ساتھ اس نے کہا،’’مجھے صرف ایک چاہیے۔‘‘

حقیقی معنوں میں بے غرض اس انسان نے بڑی شرافت کے ساتھ کہا۔تم یہ سب لے لو‘‘۔

’’میں صرف ایک لوں گی‘‘۔زہرہ نے ان سب میں سے ایک آم اٹھایا اور اسے مجید کی طرف بڑھایا۔’’نہیں،مجھے

نہیں چاہیے'' مجید نے کہا۔ زہرہ نے اصرار کیا اور کہا کہ اگر ایک آم وہ نہیں لے گا تو وہ رو دے گی۔

مجید نے آم لے لیا، وہ دونوں باری باری آم چوس رہے تھے اور آم کا رس ان کے سینوں پر گر رہا تھا۔ زہرہ نے دیکھا کہ چیونٹوں نے اس کی ساری پیٹھ پر جگہ جگہ کاٹ رکھا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اسے بہت دکھ ہوا۔ اس کے بالکل قریب کھڑے ہو کر اس نے مجید کی پیٹھ پر چپکے ہوئے چیونٹوں کو ایک ایک کر کے چھڑا دیا۔ زہرہ کی انگلیاں جب مجید کے جسم پر لگیں تو مجید کو اپنے سارے جسم میں سنسنی سی محسوس ہونے لگی۔

اگر چہ اس دن زہرہ نے پھر مجید کو اپنے ناخنوں سے نہیں نوچا مگر بعد کو بہت دنوں تک اس نے نوچنے اور چٹکی کاٹنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب کبھی وہ کہتی کہ میں تمہیں نوچوں گی تو مجید ایک عجیب سے خوف سے لرز جاتا۔ ایک دن مجید نے بڑی چالاکی سے، مگر زہرہ کے علم میں، اس کا سب سے ظالم ہتھیار یعنی اس کے ناخن کاٹ دیے۔

ایک دن صبح کے وقت زہرہ مجید کے ساتھ تھی اور پھولوں کے کچھ پودے اٹھا کر لا رہی تھی جو انھوں نے آس پاس سے جمع کیے تھے۔ ان پودوں سے مجید کے گھر کے سامنے ایک باغیچہ لگانے کا ارادہ تھا۔ پودے زہرہ اٹھائے ہوئے تھی۔ مجید اس سے دو قدم آگے بڑا اکڑا ہوا چل رہا تھا۔ بہر حال وہ ایک مرد تھا نا۔

اس کے ہاتھ میں ایک کھلا ہوا چاقو تھا۔ وہ اپنے تمام ان منصوبوں کا ذکر کر رہا تھا جنہیں مستقبل میں پورا کرنے کا اس نے ارادہ کر رکھا تھا۔ مجید کی گفتگو سن کر زہرہ صرف خوش ہو سکتی تھی یا پھر حیرت کر سکتی تھی۔ گفتگو کے دوران وہ کبھی '' ہاں ہاں'' کرتی جاتی تاکہ مجید کو یہ اطمینان رہے کہ وہ اس کی باتیں سن رہی ہے۔ مجید کے خواب اونچے اور بڑے حسین تھے۔ اس کے خوابوں کی ایک دنیا تھی، سنہری روشنی میں نہائی ہوئی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مجید اس دنیا کا واحد حکمراں تھا اور زہرہ اس کی ساتھی اور رفیق۔ وہ رونا شروع کر دے گی، اس کے ناخن پھر اس کی طرف بڑھیں گے اس خیال نے اس کے دماغ میں ناخنوں سے نوچے جانے کی تکلیف اور جلن کو پھر بیدار کر دیا۔ اس ناخوش گوار تجربے سے ایک بار پھر گزرنے سے بچنے کی خاطر مجید اپنی گفتگو میں بڑی احتیاط برت رہا تھا، پھر بھی اس سے کبھی کبھی بھول ہو جاتی۔

خیالوں میں کھوئے رہنا مجید کی عادت ہے۔ وہ تخیلات کا غلام ہے آنے والے دنوں میں وہ ایک بہت اونچا محل بنوائے گا۔۔۔۔ اس کی ساری دیواریں سونے کی ہوں گی۔۔۔۔ اس محل سے فرش میں لعل و جواہر جڑے ہوں گی۔۔۔ اس کی چھت کیسی ہوگی۔۔۔۔ وہ چھت کے بارے میں کچھ سوچ نہ پایا۔ کیوں نہیں سوچ پایا؟ اس کی وجہ کہیں یہ تو نہیں کہ زہرہ اس کی باتوں کی طرف دھیان نہیں دے رہی ہے؟ اگر وہ صرف 'ہاں' کہہ دے یا کبھی کبھی اپنا سر ہلا دے۔ تو اس کی سمجھ میں آتا رہے گا کہ اسے آگے کیا کہنا ہے۔

''اے زہرہ!''

''مجید، یہ کون سا ڈھنگ ہے پکارنے کا؟''

''تم دھیان کیوں نہیں دے رہی ہو؟''

''میں سن تو رہی ہوں، اور یہ تم نے مجھے اے کیوں کہا؟''

وہ غصے میں اس کی طرف بڑھی اور اسے پھر نوچ لیا۔ اس کی اس حرکت سے مجید بھڑک اٹھا۔ اپنے چاقو کی نوک کا رخ زہرہ کی طرف کرتے ہوئے مڑا۔ مگر زہرہ بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی طرف اس کی توجہ دلاتے ہوئے بولی، ''میں پھر نوچوں گی۔''

پہلے کی نوچ کھسوٹ اور چٹکیاں اسے یاد آ گئیں اور مجید کا خون جیسے سرد ہو گیا۔ زہرہ اپنے ناخنوں کے ساتھ تو ایک آفت تھی، مگر یاد آیا کہ ناخن تو ایک زمانہ تھا جب تھے۔ یہ خیال آتے ہی اسے زہرہ کو چھیڑنے کے تصور ہی سے ایک لطف آیا۔ بڑی معصومیت کے ساتھ وہ کچھ اس طرح گویا زہرہ نے اسے ایک بار پھر نوچا ہو۔ اس نے پوچھا، ''زہرہ تم نے مجھے نوچا کیوں؟''

تم نے مجھے اے کیوں کہا؟

مجید نے حیرت کا اظہار کیا۔

''یہ کب کی بات ہے؟ میں نے تو ایسا بالکل نہیں کہا۔ تم نے خواب میں دیکھا ہوگا۔''

مجید کے چہرے پر بے گناہی کے تاثرات دیکھ کر زہرہ کو ندامت بھی تھی۔ اور افسوس بھی، کیا مجید نے واقعی اسے ایسا کہا تھا؟ یہ ممکن یہ کہ اس نے خواہ مخواہ ایسا سوچ لیا ہو، لیکن اگر ایسا تھا تو اس کا مجید کو نوچنا ناقابل معافی تھا۔ چار نشان، لال لال اور سوجے ہوئے۔ کیا یہ اس کی سخت دلی کی علامت نہیں ہیں؟ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ اس نے زہرہ کے آنسو نہیں دیکھے، گاؤں جانے والے سفید ریت کے رستے پر آگے بڑھتے ہوئے مجید نے سوچا، جب میں کوئی غلطی بھی نہیں کرتا ابا اور اماں مجھے مارتے ہیں۔ اور ڈانٹتے ہیں۔ اور کچھ اور لوگ ہیں جو محض مزے کے خاطر بالکل بلاوجہ چٹکی کاٹ لیتے ہیں یا پھر نوچ لیتے ہیں۔ میں جب مر جاؤں گا تب یہ لوگ کہیں گے ''اگر بے چارہ مجید اس وقت ہوتا۔۔۔۔ تو ہم کم از کم اسے چٹکی تو کاٹ ہی سکتے تھے۔''

اس کے بعد مجید آہستہ آہستہ مڑا۔ زہرہ کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر بے اختیار اس کی زبان پر آیا، ''بہت اچھا ہوا!'' وہ اب خوش تھا اس کی خوشی سے خوش ہو کر پہاڑی کی چوٹی پر چمکا اور ڈھلان پر بسے ہوئے گاؤں پر سنہری روشنی ڈال کر مسکرا دیا۔ یہ دریا بھی جو حصوں میں بٹ کر پہاڑی اور گاؤں دونوں کو اپنی باہوں میں لے کر آگے چلتا ہے۔ اور پھر ایک ہو جاتا ہے، پگھلے سونے کی طرح نظر آنے لگا۔ چڑیوں کی چہکار جو گاؤں کی خاموشی کو توڑ رہی ہے، اس میں بھی مجید کو بے پناہ مسرت کی بازگشت سنادی۔

صرف زہرہ کے دل میں خوشی اور مسرت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس نے نا قابل معافی جرم کیا تھا۔ کیا اس نے مجید کو بلا وجہ نہیں نوچا ہے؟ وہ اس کے بارے میں جتنا سوچتی اتنا ہی اداس ہوتی۔ مجید کی پیٹھ کے وہ نشان لال لال اور سوجے ہوئے۔۔۔۔۔ وہ اپنی غلطی کا ازالہ کیوں کر کرے؟

زہرہ نے بڑی نرمی سے، گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا، مجید کی اس عالیشان محل کی بات یاد دلاتے ہوئے کہا، ''ہاں، وہ عالیشان محل؟''

مجید چپ رہا، تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا، تم سن رہی ہو؟''

ندامت اور افسوس سے بھری ہوئی زہرہ نے کہا، ''ہاں سن رہی ہوں۔''

''تم جانتی ہو''، مجید نے بات شروع کی ؛'' وہ محل پہاڑی کی چوٹی پر ہوگا۔'' اگر ایسا ہوا تو وہ دونوں سارے گاؤں کو دیکھ سکیں گے اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ ان دو دریاؤں کو بھی دیکھ سکیں گے جو کچھ آگے بڑھ کر آپس میں مل جاتے ہیں۔ اور ایک نسبتاً بڑے ردیا کی شکل میں بہتے ہیں۔ مجید اور زہرہ پہلے بھی دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر یہی منظر دیکھنے کے لیے اس پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ چکے تھے۔ مجید جو محل وہاں تعمیر کرنے جا رہا ہے وہ لا جواب ہوگا۔

''میں کہتی ہوں''، اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا،'' یہ محل اونچا کتنا ہوگا؟'' یہ محل کتنا اونچا ہوگا؟ اونچائی کی کیا کوئی حد ہوتی ہے؟ مجید نے کہا،'' بہوت اونچا۔'' اس کے '' بہوت اونچا'' کا اندازہ نہ کر سکنے کی وجہ سے زہرہ نے پھر سوال کیا،'' کیلے کے درخت کے برابر؟''

'' کیلے کا درخت!'' یہ بھی کوئی گھر ہوگا، کیلے کے درخت کے برابر اونچا؟'' ہونہہ!'' اس نے زہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

'' پھر ناریل کے پیڑ کے جتنا؟''

مجید نے زہرہ کے اس بات کا بھی مذاق اڑایا۔ زہرہ نے اب کسی قدر مایوس ہو کر اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھایا اور قدرے جھجکتے ہوئے کہا،'' اتنا اونچا جتنا اونچا آسمان ہے؟''

زہرہ کے پاس ایک اور سوال تھا۔

'' کیا تم وہاں اکیلے رہو گے؟''

'' نہیں'' مجید کو الف لیلی کی کہانیاں یاد آ گئیں۔ اس نے کہا۔'' میں اور میری رانی۔''

'' رانی؟'' زہرہ سوچنے لگی۔ اس کے آس پاس کی دنیا میں تو کوئی رانی نہیں ہے۔۔۔۔ پھر بھی وہ کون سی لڑکی ہے؟''

جیسے کہ یہ بہت بڑا راز ہو، مجید نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا،'' ایک ہے'' جب زہرہ نے یہ سنا تو اس کا چہرہ

اتر گیا۔ اسے غصہ بھی تھا اور دکھ بھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے پھولوں کے تمام پودے زمین پر رکھتے ہوئے کہا، ''اپنی رانی کو بلاؤ، وہی اس بوجھ کو اٹھائے گی۔''

مجید نے پوچھا، ''تم انہیں لے کر کیوں نہیں چلتی ہو؟''

زہرہ پھوٹ کر رونے لگی۔

''میں تمہارے ساتھ نہیں آؤں گی۔ انہیں اٹھانے کے لیے اپنی رانی کو بلاؤ۔''

حالات کی یہ تبدیلی خوب ہے۔ میری بات اس کے دل کو لگ گئی۔ وہ قریب جا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''زہرہ تم میری۔۔۔۔''

''کیا؟''

''رانی!''

اس کا چہرہ چمک اٹھا، ''تم مذاق کر رہے ہو!''

''اپنی قسم۔۔۔۔تمہاری قسم۔''

وہ بہت خوش تھی۔ وہ مجید کے ساتھ اس محل میں رہے گی۔ کتنا اچھا ہوگا۔ وہ وہاں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں مگر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

اس کے ناخن کاٹنے کے لیے مجید نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

''نہیں'' زہرہ آنسو بہاتے ہوئے کچھ اس قدر ہنسی جیسے پورا چاند ہلکی بارش میں چمکے۔ ''میرے ناخن مت کاٹو'' اس نے کسی قدر منہ لٹکائے ہوئے کہا، ''ابھی جب تم مجھے کچھ کہو گے تو مجھے تمہیں چٹکی کاٹنے کی ضرورت پڑے گی۔''

تم مجھے چٹکی کاٹو گی زہرہ؟

''بالکل، میں تمہیں ہمیشہ چٹکی کاٹوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے دانت کٹکٹائے بھنوئیں چڑھائیں اور اسے چٹکی کاٹنے کے لیے تیار ہوگئی۔ مجید اٹھ کھڑا ہوا، یہ جتانے کے لیے کہ اس کا یہ جرم کتنا بڑا ہوگا، اس نے کہا'' مگر رانیاں چٹکی نہیں کاٹتیں۔''

زہرہ کو جیسے مجید اس بات پر یقین نہ ہو، اس نے پوچھا، ''اگر کوئی رانی کسی کو چٹکی کاٹتی ہے تو کیا یہ بڑا جرم ہوتا ہے؟ سچ سچ بتاؤ؟'' مجید نے قسم کھا کر کہا کہ ہاں یہ بہت بڑا جرم ہوتا ہے۔ ''بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ شہزادیوں اور رانیوں کو چٹکی نہیں کاٹنا چاہیے۔''

یہ سن کر وہ کچھ پریشان سی اپنی جگہ پر کھڑی سوچتی رہی۔ اگر رانی کو چٹکی نہیں کاٹنا چاہیے تو اسے ناخنوں کی کیا ضرورت ہے؟ وہ ناخن کٹوا دینے پر راضی ہوگئی اور مجید کے سامنے اپنے ہاتھ اس طرح پھیلا دیے جیسے وہ کوئی بڑی

قربانی کر رہی ہو۔

''تب ٹھیک ہے کاٹ دو۔''

مجید خوش ہو کر زہرہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ مجید نے تیز اور نکیلے دسوں ناخن ایک ایک کر کے کاٹ دیے اور پھر اطمینان سے کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر گھر پہونچے اور جا کر سارے پودے لگائے۔ گھر کے سامنے والے آنگن میں مجید نے چھوٹے چھوٹے گڑھے کھودے، زہرہ نے ہر گڑھے میں ایک ایک پودا لگایا، دوسرے میں پیلی پتیوں والا اور تیسرے میں مرغ کی دم جیسی پتیوں والا پودا جما دیا۔ پودوں کی اس ترتیب کے مطابق دونوں نے سارے گڑھے بھر دیے۔ ایک کونے میں انہوں نے شوفلاور کا پودا بو دیا۔ جب زہرہ کھدے ہوئے گڑھے پر پودا لگا رہی تھی اس وقت اس کی شاخ پر ایک لال پھول لگا ہوا تھا جو اب مرجھانے لگا تھا۔

زہرہ ہر روز صبح صبح مجید کے گھر جاتی اور سارے پودوں میں پانی ڈالتی۔ ایک دفعہ زہرہ کی ماں نے اسے چھیڑتے ہوئے پوچھا،''زہرہ تم ایرے غیرے کے گھر کے پودوں کو پانی دینے کیوں جاتی ہو؟''

ایک شام زہرہ اور مجید آنگن میں کھڑے تھے۔ کلے پھوٹتے ہوئے پودوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجید نے پوچھا،''زہرہ یہ سارے پودے کیا تمہارے ہیں؟''

''کیوں؟ کیا یہ تمہارے ہیں؟''

مجید ہنس پڑا۔''تم انہیں اپنا کرنا چاہتی ہو؟'' اس کی اس بات پر زہرہ اپنی خفگی کے اظہار کے لیے کچھ کر سکتی ہے؟ اس نے اسے نوچ لیا، مگر اب ناخن تو تھے نہیں؟ اس لیے مجید نے ہنستے ہوئے کہا،''لو اور نوچو، اچھا لگتا ہے۔''

زہرہ نے اپنے ناخنوں کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''پھر میں اب تمہیں دانت کاٹوں گی۔''

وہ اس کی کلائی پر دانت کاٹنے کے لیے بڑھی۔ مجید کو جب بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے جلدی سے اسے قرآن کی قسم دلا دی۔ کتاب کے تیس پاروں کی قسم، میں تم سے کہتا ہوں کہ رانیوں کو دانت نہیں کاٹنے چاہئیں۔''

زہرہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے اور اسی طرح روتے روتے اس نے سوال کیا؛'' کیا کسی کو بھی نہیں؟''

مجید نے ہنستے ہوئے جواب دیا،''ہاں کسی کو بھی نہیں۔''

زہرہ حساب میں بہت اچھی تھی۔ اسکول میں ماسٹر صاحب اس کی بہت تعریف کرتے تھے اور مجید کی پٹائی ہوتی تھی اور جب بات حساب کی ہوتی تو مجید بہت ہی پریشان ہوتا۔

وہ حساب میں چاہے جتنی کوشش کرے اس کے جواب غلط ہی ہوتے تھے۔'' اول نمبر کا غبی ہے،'' ماسٹر صاحب

کے بعد سے وہ ابھی تک لیٹا ہوا تھا۔ یہ چھٹیوں کا زمانہ تھا۔ مجید کے ختنے کی تقریب ایک ایسا موقعہ تھا جس نے سارے گاؤں میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ آتش بازی ہوئی اور بڑے پیمانے پر لوگوں کی دعوت کا انتظام کیا گیا۔ مجید کو باقاعدہ بینڈ باجے کے ساتھ ہاتھی پر بٹھا کر لایا گیا تھا اور جلوس کے ساتھ گیس کی روشنی تھی۔ کھانا ہوا جس میں ایک ہزار سے زیادہ لوگوں نے شرکت کی۔ سنت دعوت سے پہلے مجید کو سارے دن ایک انجانہ سا ڈر لگا رہا۔۔۔کوئی چیز کاٹی جائے گی۔۔۔ وہ چیز کیا ہے؟ وہ مر تو نہیں جائیگا؟ اس خوف سے اسے کمزوری کا احساس ہوتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دن بھر زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اسے کچھ اندازہ بھی نہیں تھا کہ ہونے والا کیا ہے۔ تمام مسلمانوں کی سنتیں ہوتی ہیں۔ ایک بھی ایسا مسلمان نہ ہوگا جس کی سنتیں نہ ہوئی ہوں۔۔۔ سنت میں کرتے کیا ہیں؟ یہ کیسے ہوتی ہے؟ اس نے زہرہ سے پوچھا۔

وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔

اس نے صرف یہ کہہ کر اسے اطمینان دلایا کہ ''یہ جو بھی ہوتی ہو اور جب بھی ہوتی ہو تم مر و گے نہیں۔'' بہر حال مجید کو بڑی تشویش تھی۔ پنڈال میں جوں ہی دلوں پر ایک خاص کیفیت گذار دینے والی تکبیر اللہ اکبر کی آواز گونجی، مجید کے ابا نے اسے گود میں اٹھا لیا اور لے جا کر ایک چھوٹے کمرے میں چھوڑ دیا۔ وہاں پر ایک اوندھا کونڈا رکھا تھا، جس پر ایک صاف ستھرا کپڑا پڑا ہوا تھا اور اس کے سامنے ایک لیمپ تھا جس میں اگر بتیاں جل رہی تھیں۔ نائی کے علاوہ مولوی صاحب بھی تھے۔ جنہیں آج کی تمام رسموں کو اصولوں کے مطابق ادا کرنا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ کمرے میں دس بارہ آدمی اور تھے۔ انہوں نے اس کی قمیص اور لنگی اتار دی، اسے اوندھے کونڈے پر اس کے پیدائشی لباس میں یعنی بالکل ننگا ،بٹھا دیا گیا۔ وہ حیرت میں تھا کہ آخر یہ لوگ کرنے کیا جا رہے ہیں۔

انہوں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور اس کے ہاتھ پاؤں اور سر کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے صرف ''اللہ اکبر'' کی آواز سنائی دی۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ اسی افراتفری میں اس نے وہاں جہاں پر اس کی دونوں رانیں ملتی تھیں، ایک ہلکا سا درد محسوس کیا، ایک ایسی کیفیت جیسے کسی نے چھالیا کے درخت کے پتے پر سے سوکھی جھلی اتار دی ہو۔ یہ احساس بھی بالکل عارضی تھا، ایک لمحے کا، اب ایک جلن اور سوزش کا احساس تھا اور بس۔

انہوں نے مجید کو پلنگ پر لٹا دیا۔ اس کے سر پر اور اس کی ٹانگوں کے لیے تکیہ رکھے گئے تھے۔ اس سارے شور و شعب میں مجید نے ایک نظر ڈالی ۔ یہ ویسا نہیں تھا۔ جیسے آپ اپنی انگلی لال روشنائی کی شیشی میں ڈبو لیں اس کے بجائے اس کی شکل کچھ ایسی تھی جیسے آپ نے روشنائی کو چھوئے بغیر اس کی شیشی کے منہ کی گولائی سے انگلی کے چاروں طرف لال روشنائی کا دائرہ سا بنا لیا ہو۔ خون نکلنے کی موہوم سی علامت ۔ دوسرے دن مجید نے یہ سارا حال زہرہ کو بتایا۔

زہرہ نے کھڑکی کی دوسری طرف کھڑے کھڑے سوال کیا، ''مجید، تم ڈر گئے تھے؟''

"کیا؟ میں؟" بستر پر لیٹے لیٹے مجید نے کہا "میں ڈرا بالکل نہیں تھا۔"
پھر اس نے اپنے کان چھیدے جانے کے بارے میں اسے بتایا اور کہا کہ دس بارہ دن میں یہ تقریب ہوگی۔
"مجید تم تو نہ آسکو گے؟"
"میں آؤں گا،" مجید نے کہا۔
جس دن تقریب ہونے والی تھی، مجید کے لیے ہلنا بھی مشکل تھا۔ اس نے پہلے تو زہرہ کی امی کی آواز سنی اور بعد کو خود زہرہ کی۔ دونوں اس کے خاندان کے لوگوں کو تقریب میں شرکت کی دعوت دینے آئی تھیں۔ کچھ دیر اس نے کھڑکی کے قریب زہرہ کو بھی دیکھا۔ اس کا چہرہ گھبراہٹ اور تشویش کی وجہ سے پیلا معلوم ہو رہا تھا مگر اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔
"آج میرے کان چھیدے جائیں گے۔"
کچھ کہے بغیر مجید مسکرا دیا۔ مسکراہٹ زہرہ کے ہونٹوں تک بھی پہنچ گئی۔ مجید نے اس کے کانوں پر نظر ڈالی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب ان خوبصورت کانوں میں سوراخوں کی ایک لائن بنائی جائے گی تو تکلیف تو نہ ہوگی؟ جب اس نے یہی سوال زہرہ سے کیا، تو اس نے کہا، "میں نہیں جانتی، تم خود آکر دیکھ لینا۔" یہ کہہ کر زہرہ بھاگ گئی۔
مجید تقریب میں جانا چاہتا تھا مگر جہاں وہ لیٹا ہوا تھا وہاں سے اٹھ نہیں پایا۔ پھر بھی کچھ دیر بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ کوئی اسے دیکھ نہیں رہا ہے، وہ زور لگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹھنا ایک عذاب تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بہت بھاری بوجھ، چکی کا بھاری پاٹ اٹھا رہا ہو۔۔۔ سیکڑوں زخموں کا درد۔۔۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ درد خود دل میں ہو جائے گا۔ کوئی اسے دیکھ نہیں رہا تھا، مجید نے آہستہ آہستہ باہر کا رخ کیا۔ اس کی دونوں ٹانگیں ایک دوسرے سے دور دور پڑ رہی تھیں۔ اس نے دھیرے دھیرے بستر کا کنارہ طے کیا، پلنگ سے اترا احاطے میں داخل ہوا اور زہرہ کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں نہ تو کوئی بڑا جشن تھا اور نہ ہی کوئی مجمع۔ مجید نے سوچا کہ یہ شاید اس لیے ہے کہ یہ لوگ امیر نہیں ہیں۔ اگر یہ دولت مند ہوتے تو یہاں بھی ڈھول تاشے ہوتے، آتش بازی ہوتی، دعوت ہوتی۔
مجید پر زہرہ کی ماں کی نظر پڑ گئی۔ اسے دیکھ کر وہ دوڑتی ہوئی آئی اور بولی، "میرے بچے، تم کیوں آگئے؟" مجید نے بمشکل جواب دیا، "کان چھدنے دیکھنے کے لیے۔"
اسی وقت زہرہ کے دونوں کان اوپر سے نیچے تک چھدے ہوئے تھے اور ہر چھید میں کالے رنگ کا تاگا پڑا تھا۔ دائیں کان میں گیارہ سوراخ تھے اور بائیں میں دس۔ مجید جانتا تھا کہ جب کان کے زخم سوکھ جائیں گے تو یہ کالے تاگے نکال لیے جائیں گے۔ اور ان کی جگہ چاندی کے چھلے ڈال دیے جائیں گے۔ پھر بعد کو اس کی شادی کے موقع پر چاندی کے ان چھلوں کی جگہ سونے کے چھلے لے لیں گے۔

کہتے تھے۔ حاضری لیتے ہوئے وقت بھی ماسٹر صاحب اسے اسی طرح پکارتے۔ ان کے اس طریقے پر کسی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ مجید ہی ایک غبی لڑکا تھا، اس وجہ سے ماسٹر صاحب کے ''غبی'' پکارنے پر جماعت کے تمام بچوں میں سے مجید ہی جواب دیتا۔ ''حاضر جناب۔''

ایک دفعہ ماسٹر صاحب نے مجید سے پوچھا: ''ایک جمع کا ایک کا کیا مطلب ہے؟'' یہ ایک ایسی حقیقت تھی جسے ساری دنیا جانتی تھی کہ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں مگر مجید نے اس سیدھے سادے اور آسان سے سوال کا ایک ایسا جواب ڈھونڈھ نکالا کہ اسے سن کر ماسٹر صاحب سے بھی ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ ساری کلاس بھی ہنس پڑی۔ مجید نے سوال کا جو جواب بتایا وہ اتنا دلچسپ تھا کہ وہی اس کی عرفیت بن گئی۔ جواب دینے سے پہلے مجید نے تھوڑی دیر سوچا۔ جس طرح دو دریا جب بالکل ساتھ بہتے ہیں تو وہ نسبتاً بڑا دریا بن جاتے ہیں، یہ سب سوچنے کے بعد اسے نہایت فاتحانہ انداز میں جواب دیا: ''ایک اور ایک مل کر بڑا ایک ہوتا ہے۔''

ریاضی کے مضمون میں ایک نئے نظریے کی تخلیق کرنے کی پاداش میں اسے بنچ پر کھڑا کر دیا گیا۔

''نسبتاً بڑا ایک!'' جماعت کے تمام بچے اسے دیکھ رہے تھے۔ مجید کو اب بھی اس بات سے اتفاق نہیں تھا کہ ایک اور ایک مل کر دو ہوتے ہیں۔ ماسٹر صاحب نے اس کے ہاتھ پر چھ بید مارے اور کہا کہ تم انہیں ایک جگہ جوڑ کر نسبتاً بڑا ایک سمجھو۔''

اس واقعے کے بعد کلاس کے سب ساتھی جب اسے دیکھتے تو ایک دوسرے کو کہنی مار کر کہتے: ''نسبتاً ایک بڑا!'' یہ چڑھانا اور اس چڑھانے کا سبب، دونوں سے مجید کو بہت دکھ تھا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا، ایک حقیقت تھی، مگر کوئی اس پر یقین کیوں نہیں کرتا؟ ہو سکتا ہے یہ غلط ہو، ہو سکتا ہے کہ مجید ''غبی'' ہو۔۔۔ اس کا یہ دکھ جب اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تو اس نے ایک دن اپنی ماں سے شکایت کی۔ ماں نے اسے اپنی ساری پریشانیاں اللہ میاں کو بتانے کا مشورہ دیا۔ ''بیٹے رب العالمین کسی کی دعا کو نہ منظور نہیں کرتے ہیں۔''

اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے مجید کے کمسن اور کمزور دل نے خالق کائنات اور ساری دنیا کے مالک کے سامنے گڑگڑا گڑگڑا کر دعا کی۔

''اے میرے رب، حساب کے سوالوں کے میرے جواب ٹھیک کر دیا کر۔''

یہ مجید کی اللہ میاں سے پہلی دعا تھی۔ وہ دن رات دعا مانگتا مگر اس کے باوجود اس کے سارے جوابات اب بھی غلط ہوتے۔ اسے کئی دفعہ بید بھی کھانے پڑے۔ اس کی ہتھیلی میں ہمیشہ تکلیف رہتی۔ وہ اپنی اس حالت کو برداشت نہ کر سکا تو ایک دن اس نے اپنی ساری پریشانی زہرہ کو بتائی۔ یہ بڑی ناچاقیوں اور اختلافات کے بعد ہوا تھا۔ وہ اسے اپنی بنچ پر بیٹھی دیکھا کرتی۔ جب کبھی نظریں مل جاتیں تو مجید منہ پھیر لیتا۔ بالآخر مجید نے بات کی۔ زہرہ مسکرائی۔ وہ کھسک کر

مجید کے نسبتاً قریب والی بنچ پر بیٹھی اور آخر میں آکر اسی بنچ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ جس پر مجید بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بعد سے مجید کو بید لگنے بند ہو گئے اور وہ سوالات کے جواب بھی صحیح نکالنے لگا۔

ماسٹر صاحب کو حیرت ہوئی۔

''قابل تعریف!'' انہوں نے کہا، ''میں یہ غلط سمجھتا تھا کہ تمہارے سر میں صرف بھوسا بھرا ہوا ہے۔'' ماسٹر صاحب کی اس تعریف نے اس کی عرفیت کا کلنک بھی مٹا دیا اور کلاس کے بچے بھی کسی قدر رشک کے ساتھ کہنے لگے۔ کہ مجید تو اب کلاس میں سب سے آگے ہے۔

جب زہرہ یہ سب سنتی تو وہ صرف مسکرا دیتی۔ زہرہ کی مسکراہٹ کے معنی کوئی دوسرا نہیں سمجھتا تھا۔ مجید کے اب اپنے سوالات صحیح کرنے کا راز زہرہ کی اسی مسکراہٹ میں پنہاں تھا۔

جب کبھی سوال کرنے کے لیے دو بچے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے کیے جاتے تو مجید کی بائیں آنکھ زہرہ کی سلیٹ کی طرف ہوتی، وہ سوال ختم کر لیتی تھی، مگر بیٹھتی نہیں تھی۔ پہلے مجید کو بیٹھنا ہوتا تھا۔ گھر واپس ہوتے ہوئے راستے میں جب کوئی سن نہ رہا ہوتا تو زہرہ مجید کو چھیڑتی۔ بہت سی باتیں اس کے دماغ میں آتیں مگر وہ مسکرا مسکرا کر رہ جاتی۔ پھر چپکے چپکے سے کہتی، ''نسبتاً بڑا ایک!'' یہ سن کر مجید کو غصہ آتا مگر اس کے سارے غصے کا اظہار صرف ایک لفظ سے ہوتا: ''رانی!''

چاندی کی چھوٹی سی گھنٹی کی آواز کی طرح مگر غمگین ہنسی کے ساتھ زہرہ اپنے ناخنوں کی طرف دیکھتی۔ سارے ناخن بڑے سلیقے سے کٹے ہوئے تھے۔ اسکول میں وہ اپنی صفائی اور ستھرائی کے معاملے میں اپنی مثال آپ سمجھی جاتی تھی۔ مجید کے کپڑوں پر روشنائی کے دھبے تو ہوتے ہی تھے، ان کے علاوہ طرح طرح کے نشان اور بھی پڑے رہتے تھے۔

وہ علاقے میں لگے ہوئے تمام درختوں پر چڑھتا۔ درخت کی سب سے اونچی اور پتلی شاخوں پر چڑھ کر پتوں کے اوپر سے سامنے چاروں طرف پھیلی ہوئی زمین دیکھنے میں اسے بڑا مزہ آتا تھا۔ اسے افق کے دوسری طرف کی دنیا کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ جب وہ اس طرح اپنے ایسے ہی خیالوں میں گم درخت کی اونچی شاخوں پر کھڑا ہوتا تو زہرہ نیچے سے پکار کر پوچھتی، ''تمہیں وہاں سے مکہ شریف دکھائی دیتا ہے؟''

جواب میں مجید وہ سطریں دہراتا جن کے بارے میں خیال تھا کہ وہ آسمان کی بلندیوں پر اڑنے والے عقابوں کے گیت کی ہیں:

''مجھے مکہ دکھائی دیتا ہے
میں مدینے کی مسجد دیکھتا ہوں۔''

مجید کو اگرچہ تکلیف بہت تھی مگر اس کے باوجود وہ چھپ کر زہرہ کے کان چھدنے کی تقریب میں گیا۔ ختنہ ہونے

مجید نے زہرہ نے پوچھا ''کیا بہت تکلیف ہوئی ہے؟''
زہرہ درد کے باوجود مسکرائی اور بولی ''تھوڑی سی''۔
اس وقت تک مجید کو تلاش کرتے ہوئے لوگ وہاں پہنچ چکے تھے۔ دو آدمیوں نے اسے اٹھایا اور گھر لے جا کر اس کو بستر پر لٹا دیا۔
اس واقعے پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ ابا نے مجید کو ڈانٹا۔ وہ مجید کی ماں پر برسے۔ انھوں نے زہرہ کے ماں باپ کو بھی سخت سست کہا۔ اس کے بعد ہی یہ ہنگامہ ختم ہوا۔
پہلے مجید صحت یاب ہوا۔ اس دن اسے نہلایا گیا، نئے کپڑے پہنائے گئے۔ عطر لگایا گیا اور پھر مسجد لے جایا گیا۔ یہ ایک شاندار موقع تھا۔ مجید نئے کپڑے پہن کر جس طرح سج بن کر نکلا تھا اس پر زہرہ نے اس کا خاصا مذاق اڑایا۔
''اوہو! اتنے شاندار کپڑے!'' اس نے کہا ''دولہا بن کر شادی کرنے گئے تھے؟''
اس سال مجید اور زہرہ دونوں کو اسکول میں ترقی ملی تھی۔ یہ گاؤں کے اسکول کا آخری درجہ تھا۔ بدقسمتی یہ کہ ایک ایسا حادثہ ہو گیا جس نے قصبے کے اسکول جانے اور اپنی تعلیم جاری رکھنے کا زہرہ کا خواب چکنا چور کر دیا۔ مجید نے موت کی صورت پہلی بار دیکھی تھی۔ زہرہ یتیم ہو گئی۔
اس حادثے کا نتیجہ یہ نکلا کہ زہرہ اس کے ساتھ اس کی دو بہنوں اور ان کی ماں کی خبر گیری کرنے والا، ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں رہ گیا۔ ان کی کل ملکیت زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اور ایک مختصر سا مکان تھا۔ اس کے ابا نے ان لوگوں کی پرورش چھالیا کے کاروبار سے ہونے والی تھوڑی سی آمدنی سے کی تھی۔ وہ ایک سفید ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ لنگی باندھتے تھے، جو لال ریت کے دھبوں سے بالکل بدرنگ رہتی تھی، اسی رنگ کا ایک تولیہ ان کے کندھے پر پڑا رہا کرتا تھا۔ داڑھی رکھتے تھے، جس کا رنگ سیاہ تھا۔ گورے چہرے پر ان کی کالی آنکھیں ہمیشہ مسکراتی رہتی تھیں۔ بغل میں ایک بوری دبائے ہوئے وہ کچھ جھک کر چلتے تھے۔ وہ پاس پڑوس کے لوگوں سے چھالیا خریدتے، بوری میں بھرتے اور بوری کو خود اٹھا کر قصبے کے بازار میں لے جاتے جہاں وہ اسے بیچا کرتے۔ وہ باتیں بہت کرتے تھے اور بڑے مزے کی باتیں کرتے تھے۔ وہ مجید کو ان تمام جگہوں کے بارے میں بتایا کرتے تھے جہاں جہاں وہ گئے تھے۔ ''اصلی مسلمان تو کسی اور جگہ رہتے ہیں، اس گاؤں میں رہنے والے مسلمان تو توہم پرست اور سخت دل ہیں۔ اگر تم اچھے لوگوں کو دیکھنا چاہتے ہو تو تمھیں کسی اور جگہ جانا چاہیے۔''
''یہاں کے لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ صرف یہی اصلی مسلمان ہیں۔ ان کا یہ سمجھنا محض ان کی جہالت اور کم علمی کی وجہ سے ہے۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے اور اپنی پڑھائی ختم کر لو گے تو انشاء اللہ اس وقت تک حالات بدل جائیں گے۔''
ان کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی زہرہ کو صحیح معنوں میں اچھی تعلیم دلانا تھا۔ ''پھر،'' وہ کہتے، ''جب زہرہ کو اچھی

سی نوکری مل جائے گی۔ تب تو وہ ہم سب کو بھول جائے گی، بلکہ اسے تو یہ کہتے ہوئے بھی کہ میں اس کا باپ ہوں شرم آئے گی۔"

"یہ صحیح ہے،" مجید نے کہا اس کے چہرے پر شرارت کھیل رہی تھی۔ "زہرہ بڑی مغرور لڑکی ہے۔"

دروازے کے پیچھے کھڑی ہوئی زہرہ آنکھیں نکالتی، دانت پیستی، غصے سے مگر آہستہ سے کہتی "نسجاً بڑا ایک!"

ایسے موقعوں پر مجید ایک بالکل انوکھے انداز میں اس سے بدلہ لیتا۔ اس کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک غلیل رہا کرتی تھی۔ وہ اپنی پینٹ میں سے ایک چھوٹا سا ڈھیلا نکالتا، غلیل میں لگاتا اور زہرہ کے ٹخنوں کو نشانہ بناتا، نشانہ اس کا کبھی خطا نہیں ہوا۔

جب ڈھیلا جا کر ٹھیک زہرہ کے ٹخنے پر لگتا تو وہ کہتا "دروازے کے کنارے پر لگے ہوئے سفید نشان کا میں نے بالکل ٹھیک نشانہ لگایا۔" زہرہ وہاں سے ٹس سے مس نہ ہوتی اگرچہ تکلیف کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے دو آنسو ضرور ٹپک جاتے۔ زہرہ کی ماں بیچاری کو کچھ پتا نہیں تھا کہ اس وقت وہاں کیا ہو رہا ہے۔ بڑی معصومیت کے ساتھ اس نے مجید سے کہا، "کبھی اس پر کبھی اس پر نشانہ لگانے سے مجید تم میرے گھر کے سارے برتن بھانڈے توڑ دو گے۔ ہم لوگ تمہاری طرح پیسے والے نہیں ہیں۔"

"ارے اماں اب میں یہاں چیزوں پر نشانہ لگانے نہیں آیا کروں گا۔ میں یہاں سے بہت دور جا رہا ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہو تم؟"

"چھ مہینے کا راستہ ہے۔"

"اور پھر یہ رات کو دیر گئے گھر واپس آیا کرے گا۔" زہرہ نے کہا۔

مجید کے بارے میں زہرہ کی یہ رائے تھی۔ مگر زہرہ کے بارے میں مجید کی رائے بالکل مختلف ہے۔

دنیا کے دیکھنے کے بعد جب واپس آؤں گا اس وقت زہرہ ایک بڑی افسر ہو چکی ہوگی۔ پھر اس وقت یہ نوجوان خاتون کچھ اس طرح ظاہر کریں گی جیسے انہوں نے مجھے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے، مجھے جانتی ہی نہیں ہیں۔

زہرہ کو ایسا لگتا جیسے وہ بہت دور مستقبل کا ایک بڑا اطمینان بخش خواب دیکھ رہی ہو۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کافی دیر سوچنے کے بعد اسنے کہا، "تم جا رہے ہو پڑھنے بڑے افسر تو تم بنو گے، ہمارے پاس تو پیسے ہی نہیں ہیں۔" یہ سن کر زہرہ کے ابا کہتے، "اللہ ہمیں بھی پیسے دے گا۔ قصبے کے اسکول میں ہم تینوں ساتھ آیا کریں گے ہر روز چھالیا بیچنے کے بعد میں آ کر اسکول کے باہر کھڑا ہو جایا کروں گا۔"

مگر اس سارے پروگرام پر عمل ہونا مقدر میں نہیں تھا۔ اس دن وہ بارش میں بری طرح بھیگ گئے۔ دو تین دن تیز بخار میں گھر میں پڑے رہے تیسری رات ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت مجید بھی ان کے پاس تھا۔ چراغ کی لو کی

طرح چمکتی ہوئی دونوں آنکھیں، ان کے مرنے کے بعد جیسے دھوئیں سے کجلاسی گئیں۔ بے حس و حرکت جسم جس میں نہ تو کوئی روشنی تھی اور نہ ہی گرمی۔

تدفین دوسرے دن ہو گئی۔ اس شام مجید ہمیشہ کی طرح آم کے درخت کے نیچے زہرہ کا انتظار کر رہا تھا۔ غم سے نڈھال آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے وہ اس کے پاس آئی۔ جب مجید سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں تو پھوٹ کر رو پڑی۔ مجید بھی کچھ بول نہ پایا۔ اس کے آنسو اس کے سر پر ٹپک رہے تھے اور اس کے آنسو اس کے سینے پر۔ چاند ناریل کے سیاہی مائل درختوں پر چمک رہا تھا۔

اپنے گھر کی دہلیز سے زہرہ نے دیکھا کہ مجید کے ابا اسے قصبے کے اسکول میں داخل کرانے کے لیے لے جا رہے ہیں۔ دونوں کے ہاتھوں میں چھتریاں تھیں۔ مجید کی چھتری بالکل نئی تھی۔ اس کی قمیص، اس کی لنگی اور ٹوپی بھی نئی تھی۔ وہ انہیں گاؤں کی سڑک پر جاتے ہوئے دیکھا کہ یہاں تک کہ وہ لوگ کچھ فاصلے پر جا کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اسکول سے واپس آنے کے بعد شام کو مجید آم کے درخت کے نیچے اپنی ملاقات والی جگہ پر آیا۔ اس کے ہاتھ میں اس کی نئی کتاب تھی۔ اس نے بڑے فخر کے ساتھ کتاب زہرہ کو دکھلائی۔ وہ اس کی طرف بڑے اشتیاق سے لپکی۔

''کتاب کے اندر بہت سی تصویریں ہے۔''

زہرہ نے کتاب اپنے ہاتھ میں لی اور ورق پلٹنے لگی۔ مجید نے دو میل دور واقع شہر کے قابل دید مقامات کا تذکرہ کیا اور آخر میں اپنے اسکول کے بارے میں بتایا۔

''قصبے کے بالکل بیچوں بیچ سات بڑی بڑی عمارتیں، سات، ٹائل لگی ہوئی صاف ستھری عمارتیں، اپنے یہاں کے اسکول سے بالکل الگ۔ ایک بڑا سا باغیچہ، طرح طرح کے پودے..... میں ان میں سے ہر ایک کے بیج لاؤں گا.....اور پھر کھیل کا میدان، اتنا بڑا کہ بس دیکھنے کی چیز ہے۔

''اور اتنے بہت سارے لڑکے!'' مجید نے اسکول کا ذکر جاری رکھا۔ ''کوئی شمار ہی نہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بہت موٹے ہیں، سنہری کمانی کا چشمہ لگائے رہتے ہیں، ہاتھ میں ہر وقت ایک چھتری رہتی ہے.....اور جو ماسٹر صاحب مجھے پڑھاتے ہیں نا ان کے ایک ہی آنکھ ہے۔ میری کلاس میں بیالیس بچے ہیں۔ ان میں چودہ تو لڑکیاں ہیں۔''

مجید یکا یک خاموش ہو گیا۔ کتاب پر زہرہ کے آنسو دیکھ کر اسے دھکا سا لگا۔ ''تم رو کیوں رہی ہو؟'' مجید نے بار بار پوچھا۔

کافی دیر بعد زہرہ نے سر اٹھایا اور دھیرے سے بولی، ''میں بھی پڑھنا چاہتی ہوں۔'' زہرہ پڑھنا چاہتی ہے۔ اس کے پڑھنے کا کوئی انتظام ہو سکتا ہے؟ مجید نے اپنے دماغ پر زور ڈالا۔ اس کے دماغ میں جھینگر کی آوازیں آ رہی تھیں۔

بالآخر اسے ایک راستہ سجھائی دیا۔

"میں اسکول میں جو کچھ پڑھتا ہوں، وہ ہر روز تمہیں پڑھا دیا کروں گا۔" مجید نے کہا۔

اگر چہ دونوں اس طریقے سے متفق لوٹے تھے مگر مجید کے ذہن میں ایک اور بہتر طریقہ آیا۔ مجید ایک دولت مند گھر کا ہے، یہ لوگ خود کیوں نہ زہرہ کو اسکول بھیج دیں؟ اسے اپنے ابا سے بات کرتے ڈر لگتا تھا۔ وہ اپنی ماں سے بات کرے گا، اس نے فیصلہ کیا۔

اسی رات ابا کھانے سے فارغ ہو کر پان کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اماں چھالیا کاٹ رہی تھیں۔ مجید کا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ گیا اور اپنی اماں کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر بہت آہستہ سے بولا، "اماں!" اماں نے بڑے پیار سے پوچھا، "کیا ہے میرے بچے؟"

"زہرہ کو پڑھنے کے لیے ہم ہی لوگ اسکول کیوں نہیں بھیج دیتے؟" مجید نے بہت آہستہ سے کہا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی، کوئی بھی نہ بولا۔ ابا نے پان کو موڑا اور اپنے منہ میں رکھ لیا، کچھ چھالیا منہ میں ڈالی اور پان چبانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے پیتل کے پاندان میں سے جو دیکھنے میں سونے کا لگتا تھا، چاندی کی ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی۔ ڈبیا کو انہوں نے کھولا ہی تھا کہ ساری فضا ایک تیز خوشبو سے مہک اٹھی۔ انہوں نے خاص طور پر تیار کی ہوئی تمبا کو نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھی اور پھر اسے اپنے منہ میں ڈال لیا۔

ان ساری چیزوں کو کچھ دیر اپنے منہ کے اندر چاروں طرف گھمایا اور پھر آنگن میں تھوک دیا۔ اماں نے اگلدان سامنے کرتے ہوئے کہا، "آخر تم اس میں کیوں نہیں تھوکتے؟ پودے پتیوں پر یہ خون سا لگے۔" "تو پھر کیا ہوا؟" ابا نے تمسخر کے انداز میں کہا اور پھر آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔ لالٹین کی روشنی میں ابا کی ریشمی قمیص کے سنہرے بٹن چمک رہے تھے۔ انہوں نے اپنی بھنویں چڑھائیں، سانولی اور چکنی پیشانی پر بل ڈالے اور سنہری کمانی والی عینک کے شیشوں میں دیکھتے ہوئے مجید کے سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "دیکھو، اس کو تم کہیں چلا جانے دو، اسے ملک بھر میں گھومنے دو تا کہ یہ دیکھے کہ ہم جیسے لوگ کیسے رہتے ہیں.............سمجھیں؟ نہیں سمجھیں؟"

یہ سن کر اماں بولیں، "یہ پھر شروع ہو گئے۔ اگر کبھی وہ کچھ کہتا ہے تو یا وہ فوراً نظروں کے سامنے سے ہٹ جائے یا پھر ملک ہی چھوڑ کر چلا جائے.....تم ہمیشہ ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟"

"اس کے پاس عقل تو ہے ہی نہیں؟!"

"ہاں ہاں، دوسروں کے پاس تو بہت ہے۔"

اماں کی لمبی زبان........کیا ابا خاموش رہیں گے؟

اس کو جو عقل ملی ہے وہ تمہاری عقل ہے.........سمجھیں؟ نہیں سمجھیں؟"

''اوہو! تو آج کل میری عقل کام کی نہیں ہے! یہ اللہ کی مرضی ہے اور کیا۔''

''نہیں تو پھر کیا تم سمجھتی ہو کہ اس کے دماغ میں ایسی باتیں آتیں؟ خیر چھوڑو، میرے بھائیوں اور بہنوں کے چھبیس بچے ہیں، تمہارے بھائیوں اور بہنوں کے یہاں اکتالیس اولادیں ہیں، اور سب کے پیٹ بڑے بڑے تندور ہیں۔ ان لوگوں میں سے جب کوئی یہاں آتا ہے اور کھانا کھاتا ہے......کبھی میں کچھ کہتا ہوں؟ نہیں سمجھیں؟''

''یا پیر دستگیر، مدد! میرا پالا کس سے پڑا ہے؟''

''تم ہزاروں پیروں دستگیروں کو پکارو، اس سے کیا تمہیں عقل مل جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ تم سمجھ رہی ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ نہیں سمجھیں؟''

''لکھ لو اس کو اور مجھے دکھا دیا کرو''، اماں نے جواب دیا جو پڑھنا جانتی ہی نہیں تھیں۔

جب ابا نے یہ سنا تو ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اماں کی جیسی سفید قمیص ابا کے پان کی چھینٹوں سے لال ہو گئیں۔

''اچھا اب تم جاؤ......فوراً اٹھو......جاؤ اپنی قمیص بدلو......سمجھیں؟ نہیں سمجھیں؟''

اماں گئیں اور قمیص بدل کر پھر آ گئیں۔

''لکھ لو اس سب کو!'' ابا نے اماں کے جملے کو دہراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

تمہارے باپ نے بھی پڑھنا لکھنا سیکھا تھا؟ نہیں، بالکل نہیں، تمہارے بھائیوں نے سیکھا تھا؟ نہیں بالکل نہیں۔''

''اماں یہ سن کر کیا خاموش رہے گی......مشکل ہے۔''

''ہاں ہاں تمہارے یہاں تو لوگ عالم فاضل ہیں!''

ابا جواب میں بہت دیر تک کچھ نہیں کہہ پائے۔ ابا نے لکھنا کبھی نہیں سیکھا تھا، نہ ہی ابا کے ابا نے اور نہ ہی بابا کی اماں نے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ چونکہ اماں نے ابا کو یہ یاد دلا دیا اس لئے وہ ناراض ہو گئے۔

''اگر تم نے زیادہ بات کی،'' ابا گرجے، ''تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا، تمہیں جان سے مار دوں گا سمجھیں؟ نہیں سمجھیں؟''

اگر اماں اس وقت خاموش نہ ہو جاتیں تو واقعی ہنگامہ ہو گیا ہوتا۔ ابا نے پاندان اٹھا کر آنگن میں پھینک دیا ہوتا، اماں کو مارا ہوتا، مجید کو بھی دو چار ہاتھ پڑے ہوتے۔ مجید کی بہنوں کی بھی پٹائی ہوئی ہوتی، صرف یہی نہیں، انہوں نے مجید کے لگائے ہوئے سارے پودے بھی جڑ سے اکھاڑ کر پھینکے ہوتے......اسی لیے اماں کچھ نہیں بولیں اور چونکہ اماں نے اور کچھ نہیں کہا اس لیے ابا نے پوچھا، ''کیا ہوا؟ تمہاری زبان گنگ ہو گئی کیا؟ بولتیں کیوں نہیں؟ بولو؟''

اماں نے نہایت نرمی سے پوچھا، ''تم یہ سب کیوں کرتے ہو؟ مجید نے صرف کچھ پوچھا ہی تو تھا۔ خدا کے کرم اور

پیر دستگیر کی توجہ سے ہم لوگوں کے پاس ہماری ضرورت کے لحاظ سے کافی ہے۔ اب جبکہ زہرہ کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے اور اب ان لوگوں کا کوئی نہیں ہے تو اس میں کیا ہرج ہوگا اگر ہم اسے اسکول بھیج دیں؟''

مجید ابا کے جواب کا بڑی بے چینی سے منتظر تھا۔ اماں کی گردن اور کان کے زیور چمک رہے تھے۔

''ہاں، ہمارے پاس ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ ساری دولت کیا تمہارے باپ نے جمع کی تھی؟ یا پھر تم اپنے جہیز میں اپنے ساتھ لائی تھیں؟''

''اب جب تم نے میرے جہیز کی بات چھیڑی ہے تو سنو۔ تم نے مجھ سے شادی یوں ہی نہیں کر لی تھی، انہوں نے تمہیں پورے ایک ہزار روپے نقد دیے تھے اور پھر اس کے اوپر لاتعداد زیور میرے گلے، کانوں، کلائیوں: پیروں کے لیے اور جڑاؤ کردھنی بھی تھی۔ اس سب کو شاید تم بھول گئے؟''

''ہونہہ'' ابا نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ ''ایک ہزار روپلی! اگر وہ تمہارے وزن کے برابر بھی روپے دیتے تب بھی کوئی تمہاری جیسی بے عقل اور احمق سے شادی نہ کرتا۔ نہیں سمجھیں؟''

''ٹھیک ہے، تو جاؤ کسی عقل والی سے بیاہ کر لو۔''

''میں بالکل یہی کروں گا۔ مجھ جیسے خوبرو آدمی کے لیے لوگ ہیں جو ایک ہزار کیا دس ہزار دینے کے لیے تیار ہیں۔ سمجھیں؟ نہیں سمجھیں؟''

اماں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ابا کی اگر خواہش ہو تو وہ جتنی شادیاں چاہیں کر سکتے ہیں۔ چونکہ اماں خاموش رہی تھیں اس لیے ابا پر اور جنون سوار ہو گیا۔ ''ذرا اس کی بات سنو! ہمارے پاس ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے۔'' انہوں نے یہ بات اس طرح کہی گویا وہ اس وقت کوڑی کوڑی کے محتاج ہیں۔ مجید کو حقیقت معلوم تھی۔ پورے علاقے میں ابا سب سے زیادہ متمول تھے۔ ہر فصل میں جب ناریل توڑے جاتے تو ناریلوں کے انبار لگ جاتے تھے۔ فصل کٹتی تو سارے دھان کو رکھنے کے لیے گھر میں جگہ مشکل سے ملتی تھی۔ اس سب کے علاوہ لکڑی کی تجارت میں بھی وہ بہت نفع کماتے تھے۔ ایک دفعہ تو ایک سودے میں وہ سونے کی اشرفیاں ہی اشرفیاں لائے تھے۔ انہوں نے ساری اشرفیاں ایک بڑے سے سفید کاغذ پر ڈھیر کر دی تھیں۔ انہوں نے لائنوں میں رکھ کر ساری اشرفیوں کو گنا تھا، پھر ایک تھیلی میں ڈال کر بکس میں منتقل کر دیا تھا۔ مجید کو اچھی طرح یاد ہے کہ بکس میں رکھے جانے سے پہلے وہ ان ڈھیر ساری سنہری اشرفیوں سے کھیلا تھا۔ آج بھی ان کی چمک مجید کی نظروں کے سامنے ہے اور ان کی کھنکھناہٹ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ جب وہ اتنے امیر ہیں تو کیا وہ ایک غریب اور بے سہارا لڑکی کو اسکول نہیں بھیج سکتے؟

''یہ مت کہو کہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے،'' اماں نے کہا۔ ''ہمارے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ سارے علاقے

میں ہم ہی سب سے اچھی حالت میں ہیں۔ اگر ہم زہرہ کو اسکول بھیج دیں تو بس اتنا ہی اور خرچ ہوگا جتنا مجید کی پڑھائی پر ہوتا ہے۔''

ابا کو غصہ آ گیا۔

''میں کہتا ہوں کہ تم نری احمق ہو۔ سمجھیں؟ نہیں سمجھیں؟ کیا تم جانتی ہو کہ تمہارے اور میرے رشتے دار مل کر کتنے ہوتے ہیں؟ تمہیں نہیں معلوم!''

''کتنے ہوتے ہیں مجید؟'' اماں نے پوچھا۔

مجید کا سر چکر کھا رہا تھا۔ وہ کاغذ اور پنسل لینے کے لیے دوڑا۔

ابا نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''وہ جا رہے ہیں آپ کے عقل مند نور چشم!''

مجید کاغذ اور پنسل لے کر آیا۔ چھبیس کے نیچے اکتالیس لکھا اور پسینے میں شرابور، دونوں کو جوڑنے میں لگ گیا۔

ابا نے ہنستے ہوئے بتایا، ''سڑسٹھ!''

اس وقت تک مجید نے بھی چھبیس اور اکتالیس جوڑ لیے تھے۔

''ٹھیک ہے سڑسٹھ ہی ہوئے'' مجید نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

ابا چیخ کر بولے، ''نکل جاؤ!''

''دیکھو'' ابا نے بات جاری رکھی۔ ''زہرہ اچھی لڑکی ہے اور ہوشیار بھی ہے۔ پھر اگر ہم اسے اسکول بھیجتے ہیں تو ہمیں ان سڑسٹھ کو بھی بھیجنا چاہیے۔ کیا ہماری مالی حالت اتنی اچھی ہے؟''

اماں خاموش رہیں۔

''یہ ابھی یہیں ہے؟'' مجید پر نظر پڑتے ہی وہ پھر گرجے۔ ''دفان ہو جاؤ یہاں سے!''

سر جھکائے افسردہ مجید وہاں سے ہٹ گیا اور جا کر ایک کھڑکی کے سامنے چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اس نے اندھیرے میں زہرہ کے گھر کی طرف دیکھا۔ پیرافین لیمپ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ زہرہ ہاتھوں پر اپنا منہ ٹکائے کسی سوچ میں غرق برامدے میں بیٹھی ہوئی ہے۔

زہرہ کی زندگی یوں ہی بے سمت گزرتی رہی۔ اس کا زیادہ وقت مجید کے گھر میں گزرتا۔ وہاں وہ ہر ایک کی چہیتی تھی، مگر اس کے باوجود اس کے چہرے پر ایک بے چینی اور اداسی رہتی۔ مجید کی اماں، اس سے ہمیشہ کہتی رہتی کہ وہ اداس نہ ہو۔

''میں بالکل اداس نہیں ہوں''، زہرہ مسکرا کر جواب دیتی، مگر اپنی آواز کا درد نہ چھپا پاتی۔ اس کی اس کیفیت کو دیکھ کر مجید بھی پریشان رہتا تھا۔

''زہرہ! میں تمہاری پہلی والی ہنسی کو ترستا ہوں'' مجید کہا کرتا۔
زہرہ پوچھتی، ''کیوں؟ کیا میں ویسے نہیں ہنستی ہوں جیسے پہلے ہنسا کرتی تھی؟''
''نہیں؟ اب ایسا لگتا ہے کہ تمہاری ہنسی میں بھی آنسو ہیں۔''
''اوہ اب شاید ایسا اس لیے ہو کہ میں بڑی ہو گئی ہوں۔'' کچھ دیر چپ رہنے کے بعد زہرہ پھر بولی، ''ہمیں بڑا نہیں ہونا چاہیے تھا!''

وہ چونکہ اب بڑے ہو گئے تھے، کیا اسی وجہ سے مایوسیوں اور دکھوں کا انہیں تجربہ ہوتا ہے؟ وہ بچے تھے، انہیں پتا بھی نہیں چلا اور وہ بڑے ہو گئے۔ زہرہ ایک بھری پری جوان عورت بن گئی اور مجید داڑھی مونچھوں والا ایک جوان مرد۔ زہرہ کو اپنے مستقبل کے بارے میں بڑے اندیشے تھے۔ وہ اس کی ماں اور اس کی بہن بالکل بے سہارا تھیں۔ باپ کی موت کے بعد ان سب کی ذمہ داری جو پہلے اس پر تھی اب زہرہ کے کاندھوں پر آ گئی تھی۔

وہ صرف سولہ برس کی ہے اور اسے سارے خاندان کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ وہ لوگ مجید کی اماں کی مدد کے سہارے کب تک چلتے رہیں گے؟ دوسروں کی فطری نیکی کے سہارے زندگی کب تک گزاری جا سکتی ہے؟ اس طرح کی مدد میں اگر صرف مجید ہوتا تب اسے اتنا برا نہ لگتا۔

زہرہ کو مجید کے ابا، اماں یا اس کی بہنوں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ مگر کوئی چیز ایسی ضرور تھی جو وہ مجید کے لیے تو محسوس کرتی تھی، مگر ان لوگوں کے لیے نہیں۔ وہ جب اس کی نظروں کے سامنے ہوتا تو ہر چیز ٹھیک ہوتی مگر جب وہ سامنے نہیں ہوتا تو اس کا یہ احساس شدید ہو جاتا۔ صبح کو مجید کے اسکول جانے کے بعد سے شام کو واپس آنے تک اسے ایک بے چینی سی رہتی۔ مجید کی اگر طبیعت خراب ہو تو وہ رات بھر سو نہیں سکتی ہے۔ وہ ہمیشہ مجید کے نزدیک رہنا چاہتی ہے، وہ دن رات اس کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔

غالباً اس کی اسی خواہش کو پورا کرنے کے لیے مجید کو واقعی تکلیف ہو گئی۔ مجید کے دائیں پاؤں میں درد ہو گیا۔ یہ شہر کے اسکول میں اس کا چوتھا سال تھا۔ ایک دن جب وہ اسکول سے واپس آ رہا تھا، اسے اپنے دائیں پاؤں میں درد محسوس ہوا۔ وہ تقریباً لنگڑاتا لنگڑاتا گھر پہونچا دوسرے دن اس نے دیکھا کہ اس کے پاؤں کے تلوے میں سوجن بھی ہے۔ اور ایک پھوڑا بھی نکل رہا ہے۔ اس کے سارے جسم میں درد تھا اور تلوے میں شدید ٹپکن۔ مجید بستر پر لیٹا کراہ رہا تھا۔ ہر شخص کا یہ کہنا تھا کہ پھوڑے کو تھوڑا سا چھیڑ دیا جائے تو درد کم ہو جائے گا مگر مجید کی حالت یہ تھی کہ پھوڑے کو چھیڑنے کی بات تو دور کی تھی، اس کے قریب کوئی ہاتھ بھی لے جاتا تو مجید زور زور سے چیخنے لگتا۔

اسے دیکھنے کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ کبھی کبھی جب ایسا ہوتا کہ عیادت کرنے والوں کے آمد و رفت کم ہوتی، مجید کے پاس سناٹا ہوتا تو زہرہ مجید کے کمرے میں جاتی اور جا کر مجید کے پاؤں کے پاس بیٹھ

جاتی۔ پھوڑے کو اپنی گرم گرم پھونکوں سے سینکنے کی کوشش کرتی۔ تکلیف والی جگہ پیلی پڑ گئی تھی۔ تلوے کی کھال کے نیچے ایسا معلوم ہوتا کہ پکا ہوا امرود رکھا ہو۔ مجید درد کی شدت سے تڑپ تڑپ اٹھتا تھا۔

''زہرہ، میں مر جاؤں گا!'' مجید روتے ہوئے کہتا۔

زہرہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ آخر وہ کیا کرے کہ مجید کی یہ تکلیف کم ہو جائے۔ وہ خود روہانسی ہو گئی۔ اس نے مجید کا دایاں پاؤں اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے اپنے گال سے لگالیا۔ پھر بڑی محبت سے اس کے پاؤں کو چوم لیا۔

اولین بوسہ!

وہ اٹھی، اس کے جلتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور اس کے چہرے پر جھک گئی۔ اس کے بالوں کا جوڑا کھل کر مجید کے سینے پر بکھر گیا۔ مجید اپنے سینے پر اس کی سانسیں محسوس کر سکتا تھا۔ وہ اس طرح کانپ رہا تھا جیسے بجلی کا کرنٹ اس کے اعصاب میں گزر گیا ہو۔ مجید کا چہرہ کچھ اس طرح اوپر اٹھ گیا جیسے مقناطیس نے لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔ اس کے دونوں ہاتھوں نے زہرہ کی گردن کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ مجید نے اسے اپنے سینے پر لگالیا۔

''زہرہ!''

''مجید!''

زہرہ کے گلابی ہونٹ مجید کے ہونٹوں پر ٹک گئے۔

اگر چہ پہلے ہی دن سے دونوں کے تعلقات میں ایک اپنائیت اور قرب کی کیفیت تھی مگر اس دن پہلی بار ان کے جذبات کے جاگنے کے بعد وہ دونوں حقیقی معنوں میں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو ہزار بار پیار کیا۔ آنکھوں پر پیشانی پر، گالوں پر، سینے پر...... وہ دونوں سر سے پیر تک کانپ گئے۔ پھر ایک پر سکون خاموشی تھی۔ اور نئی راحت کا احساس کچھ ہوا تھا! کیا تھا یہ؟

''پھوڑا پھوٹ گیا،'' زہرہ نے مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔ اس کی آواز ملکوتی سازوں کی آواز تھی۔ مجید اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''یہ تو بہت اچھا ہوا!'' پھوڑا پھوٹ گیا تھا۔ مجید نے زہرہ کے محبت سے شرابور چہرے کو دیکھا جو حیا سے جھک گیا تھا۔ مرجان جیسے ان ہونٹوں کی مٹھاس...... ان بوسوں کا نشہ!

دائیں پاؤں کے تلوے میں جسے زہرہ نے چوما تھا، ایک ناقابل بیان ٹھنڈک پڑ گئی تھی۔ اس رات زہرہ سو نہ سکی۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا...... وہ پگھل رہی تھی۔ زہرہ کے سامنے زندگی کی ایک منزل تھی، مگر اس منزل تک کامیابی کے ساتھ پہنچ جانے کے خیال سے اسے ڈر سا لگتا تھا۔

اس لئے اس کے شب و روز ایک مایوسی بے یقینی کی کیفیت میں گزرتے۔

زہرہ کو مجید سے محبت تھی اور مجید کو زہرہ سے، اور دونوں اس بات سے واقف تھے۔ مجید کی محبت بے پناہ تھی، مگر

اپنے نظریات اور اپنے دشوار طلب خیالات کی پیروی کرتے رہنے کی شدید خواہش اس کی رہنما تھی ۔ وہ مجسم خودداری تھا۔ اپنی قدر و قیمت کا تخمینہ خود اس کی نظر میں بہت اچھا تھا۔ اپنے ابا کی دنیا میں اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں تھی۔ اپنے ابا سے گفتگو کرنے کا خیال بھی اسے خوف زدہ کر دیتا تھا۔

ابا گھر کے انتظامات کرنے میں اس ضدی اور مطلق العنان شخص کی طرح تھے جو کسی دوسرے کی رائے اور مشورے کو کبھی نہیں مانتا۔ اگر مجید کو کبھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ اماں سے کہتا اور وہ اسے مل جاتی۔ جب کبھی ابا کی آواز اس کے کانوں میں پڑتی تو اس کے دل میں احتجاج کا ایک طوفان لہریں مارنے لگتا۔ یہ احتجاج کس بات کے خلاف ہوتا، مجید کے دماغ میں یہ صاف نہیں تھا۔ کیا اس کے ابا اچھے باپ نہیں تھے؟ کیا وہ مجید کی ہر ضرورت پوری نہیں کرتے تھے؟ پھر ان کی کمی یا کوتاہی کیا ہے؟

مجید کو اپنے ابا کے مقابلے میں زہرہ کے ابا سے زیادہ لگاؤ تھا۔ جب زہرہ اپنے ابا کی باتیں کرتی تو سا کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اگر میرے ابا مریں تو کیا میں روؤں گا۔ اگر اماں کا انتقال ہو جائے تو وہ ضرور روئے گا۔ بہرحال جیسا بھی ہو مجید اب وہاں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ زیادہ وقت گھر سے باہر رہتا یا پھر اپنے کمرے کے اندر۔ ایسے میں ایک بڑا واقعہ ہو گیا۔

مجید شہر کے اسکول کی آخری سے پہلی کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ فصل کی کٹائی اور اسے گاہنے کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ رمضان کا مہینہ تھا۔ ابا سارا دن روزہ رکھتے، نہ کھانا کھاتے نہ پانی پیتے، بھوکے رہنے کی وجہ سے انہیں ذرا ذرا سی بات پر انہیں غصہ آجاتا اور وہ جھگڑتے رہتے۔

ایک صبح کھیتوں میں جانے سے پہلے ابا نے مجید سے کہا کہ گاہے اور سوکھے ہوئے دھان ناؤ کے ذریعے لائے جاتے ہیں۔ اگر ناؤ پر اپنا کوئی آدمی نہ ہو تو ناؤ والا راستے میں دھان بیچ سکتا ہے۔ تم روزے سے نہیں ہو اس لیے جیسے ہی اسکول سے واپس آؤ سیدھے کھیت پر آجاؤ...... آجاؤ گے نا؟

''ضرور آجاؤں گا''، مجید نے کہا۔

مگر مجید کھیت پر نہیں پہونچا۔ اسکول سے واپس آنے کے فوراً بعد حسب معمول وہ کھیلنے چلا گیا۔ یہ تو جب افطار کے وقت جب ابا کو گھر پر نہیں دیکھا تب اسے یاد آیا......... ابا کافی اندھیرا ہو جانے کے بعد واپس آئے۔ مجید پر ان کی نظر کا پڑنا تھا کہ وہ ایک دم اس کی طرف لپکے۔ غصے میں بھرے ہوئے انہوں نے اس کے گال پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا۔ مجید سناٹے میں آ گیا۔ وہیں جیسے جم گیا ہو۔ اسے دن میں تارے نظر آنے لگے۔ ابا نے اس پر چانٹوں، طمانچوں، گھونسوں کی بارش کر دی۔ ''یا تو تم اپنے ڈھنگ بدلو یا مر جاؤ۔ سمجھے؟ نہیں سمجھے؟'' چیخ پکار سن کر اماں بھاگی ہوئی آئیں۔ انہوں نے مجید کو لپٹا لیا۔

''بس کرو اب بس بھی کرو گے؟ یا اب بھی تمہارا جی نہیں بھرا؟''

''یہاں سے چلی جاؤ! ابا چلائے۔'' تم نے سنا نہیں؟'' انہوں نے اماں کو بھی مارا۔

انہوں نے مجید کی بہنوں کی بھی پٹائی کی جو روتی ہوئی بھاگیں۔ انہوں نے دروازے توڑ ڈالے، پلیٹیں اٹھا کر پھینک دیں۔ اس سارے ہنگامے کے دوران مجید بت بنا کھڑا رہا۔

''نکل جاؤ! اور اب اس وقت صورت دکھانا جب تم ساری دنیا دیکھ چکے ہو اور کچھ سیکھ چکے ہو۔ سمجھ میں آیا تمہاری؟ نہیں سمجھے؟'' چیختے چلاتے ہوئے ابا نے مجید کی گردن پکڑی اور اسے آنگن میں دھکا دے دیا۔ مجید منہ کے بل گرا، اس کا ہونٹ کٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ جب مجید زمین پر سے اٹھا، ابا پھر چلائے: ''نکل جاؤ!'' چیخنے کی آواز ہی مجید کو کہیں دور بھگا دینے کے لیے کافی تھی۔ مجید وہاں سے ہٹ کر گیٹ پر پہنچا اور جا کر بیٹھ گیا۔ وہ رو بھی نہیں پا رہا تھا۔ اس کی آنکھ میں کوئی آنسو نہیں تھا اس کے دل میں احتجاج کا ایک زبردست طوفان اٹھا ہوا تھا اس کی دل جوئی کرنے یا پیار محبت کے دو بول بولنے والا اس کے پاس کوئی بھی تو نہیں تھا۔ گھر میں ایسا سناٹا کہ دم گھٹتا تھا۔ لالٹین کی روشنی بھی بڑی تیز لگ رہی تھی۔ گھر قبرستان معلوم ہوتا تھا...... کہیں کوئی حرکت نہیں، کوئی آواز نہیں، ہر طرف ایک سناٹا، ہوش ربا اور ہولناک، اس وسیع و عریض دنیا میں وہ تنہا تھا۔ مجید نے کہیں چلے جانے کا، اپنے گھر سے بہت دور چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ مگر وہ کہاں جائے گا؟ اس کے پاس پیسہ بھی نہیں ہے۔ اس کا سرمایہ صرف اس کی جسم کی توانائی ہے اور بس۔ پھر بھی وہ جھیل جائے گا، آخر وہ ایک جوان آدمی ہے۔

وہ چلا جائے گا!

وہ چلا گیا۔

جانے سے پہلے وہ زہرہ کی طرف گیا، آم کے درحت کے نیچے جہاں وہ عموماً بیٹھا کرتے تھے۔ وہ رات کی تنہائی میں وہاں جا کر کھڑا ہو گیا۔ زہرہ کی دور سے آتی ہوئی خوبصورت آواز وہ سن سکتا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں بیٹھی وہ قرآن پڑھ رہی تھی۔ تلاوت کے دوران اس نے اپنا سر اٹھایا اور اس طرف دیکھا جدھر آم کا درخت تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، جیسے وہ کوئی آواز سننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے گلابی گال دمک اٹھے، اس کے لہو جیسے سرخ ہونٹ تھوڑے سے کھل گئے۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد اس نے پھر تلاوت شروع کر دی۔

''زہرہ!'' وہ آواز ہونٹوں سے نہیں دل سے نکلی ہوئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسے زور سے پکارے۔ آخری بار اس سے رخصت ہونے کے لیے۔ مگر نہیں...... مجید آگے بڑھ گیا، ایک پاگل کی طرح، گاؤں کو پیچھے چھوڑتا ہوا، شہر سے گزرتا ہوا وہ اپنے راستے پر آگے بڑھتا رہا...... جنگلوں سے پرے، پہاڑیوں اور بستیوں سے پرے۔

سات سال وہ گردش میں رہا۔ سات طویل برس۔ اس پورے عرصے میں اسے کوئی خبر نہ ملی کہ اس کے چلے جانے

کے بعد گھر میں کیا ہوا یا یہ کہ زہرہ کی زندگی میں کیا انقلاب آئے۔ اس نے کوئی خط بھی نہیں بھیجا۔ یہ اس لیے نہیں کہ وہ کچھ جاننا نہیں چاہتا تھا۔ بس اس نے خط نہیں لکھا۔ ہوسکتا تھا کہ اسے کوئی ڈھونڈتا ہوا آ ہی جاتا۔ وہ سفر کرتا رہا، مختلف طریقوں سے، کبھی پیدل، کبھی سواریوں پر، فقیروں کے ساتھ، بھکاریوں اور گداگروں کی ہمراہی میں۔ کبھی سنیاسیوں کے چیلے کے روپ میں۔ کبھی ہوٹل کے بیرے کی طرح رہا، کبھی دفتر کے کلرک کی حیثیت سے، کبھی سیاسی کارکنوں کے دوش بدوش، کبھی کسی امیر کے مہمان کی طرح۔ وہ بہر حال زندگی گزارتا رہا، اس کی حیثیت، اس کا مرتبہ بدلتا رہا۔ مختلف مذہبوں کے ماننے والوں سے اس کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

ان دنوں روپیہ کمانے کی کوئی خواہش مجید کے اندر نہیں تھی۔ اس سلسلے میں اگر کچھ موقعے اسے ملے بھی تو اس نے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ دیکھنا اور سیکھنا، بس یہی اس کا مقصد تھا۔ مجید نے اپنی اس جہاں گردی میں بہت کچھ دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں، بڑے بڑے شہر دیکھے، چھوٹی ندیاں اور موجیں مارتے دریا دیکھے۔ اس نے نیچی نیچی پہاڑیاں دیکھیں اور فلک بوس پہاڑ بھی۔ زرخیز مٹی والے لہراتے کھیت دیکھے اور حد نظر تک پھیلے ہوئے چمکتی ریت کے میدان بھی۔ غرض مجید نے ہزاروں میل کی مسافت طے کی۔

کیا دیکھنے کے لیے؟ اور کیا سیکھنے کے لیے؟

ایک ہی طرح کے لوگ ہر جگہ ہیں۔ فرق صرف ان کے لباسوں میں ہے اور ان کی بولیوں میں۔ سب ہی جگہ مرد ہیں اور عورتیں ہیں.... وہ سب پیدا ہوتے ہیں، بڑے ہوتے ہیں، شادی بیاہ کرتے ہیں اور نئی نسلیں پیدا کرتے ہیں۔ اس سب کے بعد موت ہوتی ہے اور بس۔ پیدائش اور موت کے درمیانی وقفے میں جو شدید جدوجہد ہے وہ ہر جگہ ہوتی ہے۔ کیا ہر چیز موت کے ساتھ ختم ہو جائے گی؟ اس طرح کی شدید مایوسی کا شکار ہو کر وہ اسی جگہ واپس آ گیا جس جگہ کو چھوڑ کر گیا تھا۔ واپس کس لیے ہوا؟ زہرہ سے شادی کرنے اور کسی جگہ خاموشی کے ساتھ زندگی گزار دینے کے لیے!

مگر واپسی پر اسے وہاں ایسی تبدیلیاں ملیں جنہیں دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا۔ یا تو اس کے لیے کہ ابا کو اپنے کاروبار میں مسلسل گھاٹا ہوتا تھا یا پھر اس لیے کہ انہوں نے ایک کاغذ پر دستخط کر دیے تھے جس کے بارے میں انہیں بتایا گیا تھا کہ ایک پل کی تعمیر سے متعلق حکومت کے نام درخواست ہے۔ جبکہ حقیقت میں وہ ایک بڑی واجب الادا رقم کی توثیق تھی۔ بہر حال ابا کی ساری جائداد ان کے قرضوں کی ادائیگی کی نذر ہو چکی تھی۔ اور تو اور ان کا رہائشی مکان بھی رہن رکھا جا چکا تھا۔ مجید کے والدین بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ اس کی دونوں بہنیں بڑی ہو چکی تھیں۔ انہوں نے عمر کی اس منزل کو بھی پار کر لیا تھا جہاں ان کی شادیاں ہو جانا چاہیے تھیں۔ ان سب سے زیادہ یہ کہ زہرہ اب ایک شادی شدہ عورت ہو چکی تھی۔

یہ واقعہ مجید کی واپسی سے ایک سال قبل ہوا تھا۔ قصبے میں کسی جگہ رہنے والے ایک قصائی نے زہرہ سے شادی کر لی تھی۔

زہرہ نے مجید کا انتظار نہیں کیا۔ زندگی خود غرضیوں سے پر ہوتی ہے، مجید اس نتیجے پر پہنچا تھا۔

بہر حال مجید کی آمد کی خبر سن کر سارے گاؤں کے لوگ اس کو دیکھنے آئے۔ اس کے سامان کو، جسے چار پانچ لوگ اٹھا کر لائے تھے، دیکھ کر ہر شخص یہ سمجھا کہ مجید نے بہت دولت کمائی ہوگی۔ مگر اس کے پاس تھا کیا؟ سامان میں بہت سی کتابیں اور جیب میں دس روپے۔

ان دنوں جگہ جگہ کی دعوتیں ہوتیں۔ ہر روز اسے دو تین مختلف گھروں میں مہمان کی بھی حیثیت سے جانا پڑتا تھا۔ ہر جگہ پیٹ بھر کھانے کے بعد بھی اس سے اور کھانے کے لیے اصرار ہوتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر تمام لوگوں کو مجید کی اصلی حالت کا پتا چل گیا۔ مجید بھی اسی خاندان کا ایک مفلس رکن تھا جو اب خود افلاس کی دلدل میں گردن گردن تک دھنس چکا تھا۔ ایک مفلس و نادار سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

''وہ واپس کیوں آیا؟'' ہر شخص کی زبان پر یہی سوال تھا۔ وہ سات سال بعد واپس آیا تھا، اور بالکل خالی ہاتھ۔

مجید کے لیے ہر طرف تحقیر آمیز نگاہیں تھیں اور تضحیک آمیز الفاظ۔ اسی لیے گھر سے نکلنے میں اسے تکلف ہوتا تھا۔ وہ ہر وقت اپنے کمرے کے اندر پڑا رہتا۔ کمرہ جو بہت سی کہانیاں کہتا تھا۔ جب وہ اسکول جایا کرتا تھا اس وقت بھی وہ اسی کمرے میں رہتا تھا۔ یہیں اسی کمرے میں اس کی سنتیں ہوئی تھیں۔ یہی وہ کمرہ تھا جس میں وہ اس وقت لیٹا رہتا تھا جب اس کے پیر میں پھوڑا نکلا تھا۔

وہ اسی پرانی آرام کرسی میں لیٹا ہوا باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گھر میں کھانے کے لیے بھی کافی نہیں تھا۔ ابا بہنوں کی، ناریل کے ریشوں سے بنی ہوئی رسی بازار لے جا کر بیچتے اور پھر ان ہی پیسوں سے کچھ سامان لاتے۔ اماں اس میں زیادہ حصہ مجید کو دیتیں۔ پھر بڑی محبت سے کہتیں، ''بیٹے تم واپس آنے کے بعد بہت دبلے ہو گئے۔ جانتے ہو میں نے کس طرح تمہاری پرورش کی ہے؟ بچپن میں تمہارا رنگ بہت اچھا نہیں تھا۔ اس لیے میں تمہیں سونے کا سفوف ملا کر بہت سا دودھ پلایا کرتی تھی۔''

افسردہ و غمگین مجید چپ بیٹھا رہا۔ کیا کیا جائے؟ اس کے پاس پیسہ نہیں تھا۔ یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کوئی ایسا بھی نہیں تھا جو کچھ مدد کر دیتا۔

مجید روز بروز دبلا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا چنانچہ اس نے وقت گزارنے کے لیے ایک باغیچہ لگایا...... اس دفعہ خود تن تنہا۔ اس نے اپنے گھر کے سامنے ریت پھیلائی، ریت کے چاروں طرف کچھ جھاڑیاں لگائیں ایک طرف شوفلاور کا وہ پودا تھا جسے زہرہ نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ یہ اب بڑا ہو کر تقریباً ایک درخت ہو چکا تھا۔ جب مجید واپس آیا تھا اس وقت اس پر پھول آچکے تھے، شوخ رنگ کے پھول۔ یہ پھول مسلسل کھلتے رہتے۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے سبز پتیوں کے ڈھیر پر کسی نے خون چھڑک دیا ہو۔ وہ اسی درخت کے نیچے آرام کرسی ڈال کر

بیٹھتا اور پڑھتا رہتا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ محض کھلی کتاب اپنی گود میں رکھ کر کرسی پر نیم دراز پڑا رہتا تھا۔

''میرے بچے، یہ تم ہر وقت کس سوچ میں کھوئے رہتے ہو؟'' اماں پوچھتیں، مجید بڑی نرمی سے جواب دیتا، ''ارے کچھ بھی نہیں۔''

اماں خود بھی گہری سوچ میں رہتیں۔ پھر خود ہی اپنے آپ سے کہتیں ''ہر بات اللہ کی مرضی سے ہوتی ہے۔''

مجید کو خوش کرنے کے لیے اس کی دونوں بہنیں اس کے چہیتے پودوں کو پانی دینے کے لیے آپس میں لڑتیں اور پھر مجید کے پاس آتیں اور کہتیں، ''بھیا، میں نے آج تمہارے پودوں کو خوب پانی دیا ہے۔'' مجید ان کے جھگڑے کو ختم کرانے کے لیے کہتا ''ٹھیک ہے تم میں ہر ایک کو اس کے پھولوں میں برابر کا حصہ ملے گا۔''

ابا کہا کرتے تھے، ''اپنی ماں کے نور چشم! اسے تعلیم دلانے کے لیے میں نے اپنی ساری دولت خرچ کر دی۔ پھر سات سال باہر رہنے کے بعد یہ ہے کل جمع پونجی۔ ایک باغ لگایا ہے میرے بڑھاپے میں مجھے آرام پہنچانے کے لیے۔ تم نے سنا میں نے کیا کہا؟ نہیں سنا؟''

اماں کہتیں ''چلو کم از کم تمہارا آنگن تو صاف ستھرا ہو گیا۔''

پان کے سوکھے پتے پر سوکھے چونے کے چند ٹکڑے رکھتے ہوئے ابا پوچھتے، ''تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا؟ نہیں سنا؟''

''کیا؟''

''میں نے کہا کہ جاؤ کہیں سے تھوڑی سی تمبا کو لے آؤ۔''

سر کو ایک پرانے کپڑے سے ڈھانکتے ہوئے اماں اپنے بوسیدہ، گندے اور ڈھیلے ڈھالے لمبے کرتے میں تمبا کو مانگنے چلی گئیں۔

مجید کے دماغ میں یادیں ایسے گھومتیں جیسے آسمان پر بادل کے ٹکڑے اڑتے ہیں۔ افلاس ایک خوفناک بیماری ہے۔ یہ بیماری آدمی کے جسم کو، دماغ کو، بلکہ روح تک کو تباہ کر دیتی ہے۔ سماج کے ہر طبقے کے ہزاروں لاکھوں مردوں اور عورتوں کے جسموں، دماغوں اور روحوں کو اسی بیماری نے تباہ کر دیا ہے۔

اس کا دماغ ایسی ہی تصویروں سے بھر جاتا۔ آخر یہ بڑی اور قابل نفرت تصویریں ہی اس کے ذہن میں کیوں ابھرتی ہیں؟ خود زندگی روشن اور حسین ہے مگر وہ اس کے چہرے پر لگی ہوئی گندگی اور کیچڑ کو بھول نہ پاتا، زندگی کی یہ بد صورتی اور بدبختی۔

بھوکے لوگ، ننگے لوگ، لولے لوگ، لنگڑے اور اپاہج لوگ، بدبخت انسانوں کا یہ نہ ختم ہونے والا جلوس.... وہ صبح و شام دیکھتا ہے وہ انہیں بھولنا چاہتا ہے مگر کیسے بھول سکتا ہے؟ اس کا دماغ ہر وقت چکر کھاتا رہتا ہے، دل ہر وقت زور

زور سے دھڑکتا رہتا ہے۔

جب وہ زہرہ کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ وہ اسے ایک بار دیکھنا چاہتا ہے..... مگر وہ تو اب کسی اور کی بیوی ہو چکی ہے۔ پھر بھی اسے ایک بار تو دیکھ لینا چاہیے..... دور ہی سے سہی۔ گلے شکوے دور کرنے کے لیے نہیں، کچھ سخت سست کہنے کے لیے نہیں، صرف دیکھنے کے لیے، اس کی آواز سننے کے لیے۔

وہ مجید کو بھول گئی ہے، مگر کیا مجید اسے کبھی بھول سکتا ہے؟ راتوں کی تنہائی میں مجید جاتا اور آم کے اسی درخت کے نیچے بیٹھ جاتا جس نے نہ جانے کتنے پھل ان دونوں کو دیے تھے۔ وہ کسی کا منتظر نہیں ہے اور پھر وہاں اب ہے بھی کون جس کا وہ انتظار کرے؟ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ میں واپس آگیا ہوں، مجید نے سوچا، تب تو وہ کبھی نہیں آئے گی۔ ہرگز نہیں۔

زہرہ آئی۔

جب اسے معلوم ہوا کہ مجید لوٹ آیا ہے تو وہ آئی، اسی اضطراب کے ساتھ جو کسی مبتلائے محبت میں ہوتا ہے۔ تیز تیز چلنے کی وجہ سے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔ مگر مجید کو اسے دیکھنے یا اس سے ملنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس کی سمجھ جیسے جواب دے گئی ہو۔ وہ تھکا تھکا سا تھا اور مفلوج سا۔

مجید نے زہرہ کا سوال سنا ''وہ کہاں ہے؟'' اور اماں کا جواب بھی ''باغ میں''۔ مجید کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بے حس وحرکت مجید کرسی پر لیٹا رہا۔

باغ شام کی روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھولوں پر شہد کی مکھیاں گھوم رہی تھیں۔ مہکتی ہوئی ہوا پودوں کی پتیوں میں سرسرا رہی تھی۔ مجید سنہری دھوپ میں ایک بت کی طرح کرسی پر ڈھیر تھا۔

زہرہ کے قدموں کی آہٹ قریب آئی اور قریب، اور قریب۔

''اوہو، ایک نیا باغیچہ!''

مجید کی پشت پر سے زہرہ کی افسردہ آواز آئی..... مجید کے دل میں درد اٹھا۔ یہ محض ایک درد نہیں تھا، اس کا دل اس طرح دھڑکا، اس میں اس طرح ٹیس اٹھی جیسے اس میں بہت سے تند و خشک کانٹے چبھ گئے ہوں۔

مضطرب اور پریشان زہرہ نے کچھ اس طرح سوال کیا جیسے وہ اب روئی اور اب روئی۔ ''تم مجھے جانتے ہو؟''

مکمل خاموشی۔ اس کے ہونٹوں سے ایک لفظ نہ نکل پایا...... یادیں...... یادیں...... یادوں کا ایک آبشار۔ مجید کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ زہرہ نے پھر پوچھا، ''کیا تم مجھ سے خفا ہو؟''

مجید آہستہ آہستہ مڑا اور اس پر نظر ڈالی۔ اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ زہرہ بالکل بدل گئی تھی۔ اندر گھسے ہوئے گال، انگلیوں کے جوڑ سوجے ہوئے، ناخن بے رونق اور بالکل ہلدی کے رنگ کے، بالوں میں چھپے ہوئے کانوں میں کالے دھاگے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، بہت دیر تک دونوں میں سے کسی کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔

دھیرے دھیرے سورج چھپ گیا، سیاہی چاروں طرف پھیل گئی اور ساری تبدیلیوں پر اس نے پردہ ڈال دیا۔ انہیں کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ پورے چاند نے پہاڑی کی چوٹی پر سے دریا کے دونوں بازوؤں میں پگھلی ہوئی چاندی انڈیل دی تھی جنہوں نے گاؤں کو اپنے حلقے میں لے رکھا تھا۔

کہیں دور گاؤں کے اس سناٹے کو توڑتے ہوئے پیار کے ایک گیت کی آواز گونجی اور ہوا میں تیر گئی۔ کوئی پیار کا مارا اپنی محبوبہ کی یاد میں گا رہا تھا۔ ایک نغمہ تھا، اداس اور شیریں۔

تم رہو گی
کنول کے باغ میں
بچ رنگے توتے کے مسکن میں
تمہارا بھی حصہ ہوگا
میری قسمت میں کیا صرف یہی ہے
کہ بس دیکھوں تیرے پھول جیسے چہرے کو؟
یا وہ ساعت آگئی ہے
جب میری تمنا برآئے گی؟
کیا میری محبوب آخر کار
میرے پاس آئیگی؟
یا تجھے کسی مصیبت نے گھیر لیا ہے؟
تو جو رہتی ہے کنول کے کنج میں........

اجنبی گویے نے مصرعوں کو بار بار دہرایا۔ آخر کار مجید نے سرگوشی کی۔

''زہرہ!''

''ہوں۔''

''یہ کیا ہو گیا؟'' مجید نے پوچھا۔

''کچھ نہیں،'' اس نے جواب دیا۔

''تم پھر اتنی کمزور کیوں ہو گئی ہو؟''

زہرہ نے اس کا جواب نہیں دیا۔ ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے اس نے کہا: ''مجھے کل ہی معلوم ہوا کہ تم واپس آگئے ہو۔'' کسی قدر شکایت کے لہجے میں مجید نے پوچھا: ''تم نے سوچا کہ میں کبھی واپس نہیں آؤں گا...... کیوں؟ کیوں؟ یہی

نا؟“

”ہر شخص یہی سمجھتا تھا.....اس لیے میں بھی......“

”ہوں۔“

”مجھے یقین تھا کہ تم واپس آ ؤ گے۔“

”تو پھر؟“

ان لوگوں نے سب کچھ طے کر دیا...... کسی نے مجھ سے کچھ پوچھا تک نہیں۔ اماں کو بہت پریشانی تھی۔ میری ہم سن لڑکیوں کی شادیاں بہت پہلے ہوگئی تھیں۔ اگر زیورات اور کپڑے نہ دیے جائیں، یہ سارا جہیز نہ ہو تو کوئی.........“

”تمہارا خیال یہ تھا کہ کوئی آدمی ایسا نہیں ہے جو زیورات اور ڈھیر سارے جہیز کے بغیر بھی تم سے شادی کرے گا؟ کیوں یہی نا؟“

”میرا بھروسا تم پر سے کبھی نہیں اٹھا۔ نہ ہی ایک لمحے کے لیے کبھی تمہیں بھولی۔ ہر رات اور ہر دن مجھے تمہارا خیال رہا اور میں روتی رہی۔ میں نے تمہاری صحت کی دعا کی۔ میں نے دعا کی اللہ میاں تمہیں ہر مصیبت سے بچائے رکھیں۔ ہر روز بلا ناغہ میں نے تمہارے لیے دعائیں مانگیں۔“

”تم نے سوچا کہ میں تمہیں بھول گیا ہوں، تم نے یہی سوچا نا؟ زہرہ؟“

نہیں، میں نے یہ نہیں سوچا تم........تم نے مجھے خط کیوں نہیں لکھا؟“

”بس یونہی، نہیں بھیجا۔ میں نے لکھے بہت سے خط مگر بھیجا نہیں۔“

”میں ہر روز تمہارے خط کی راہ دیکھتی تھی۔ میں سوچتی رہتی تھی کہ آج خط آ ئے گا یا پھر کل۔“

”پھر یہ شادی کیسے ہوگئی؟“

”میں نے تمہیں بتایا کہ کسی نے مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہیں اور پھر دوسروں پر کب تک بوجھ بنی رہتی؟ میں آخر ایک عورت ہوں۔“

آخر میں ہم نے یہ گھر اور اس سے لگی ہوئی زمین رہن رکھ دی۔ زیورات اور کپڑے وغیرہ بن گئے اور شادی ہوگئی۔“

”تم اتنی کمزور اور دبلی کیوں ہو؟“

زہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”زہرہ تم مجھے بتاؤ کہ تم اتنی کمزور کیوں ہوگئی ہو؟“

”پریشانیوں کی وجہ سے۔“

”پریشانیاں؟ کاہے کی پریشانیاں؟“

''ہوں۔''

''زہرہ!''

''ہاں۔''

''مجھے بتاؤ۔''

زہرہ پھوٹ پڑی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنے شوہر کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ ''اسے بہت جلدی غصہ آجاتا ہے، اس کی ایک بیوی اور ہے۔ دو بچے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے گھر آنا چاہیے۔ وہ مصر ہے کہ خاندان کہ ملکیت میں میرا حصہ اس کے نام ہونا چاہیے۔ میری دو بہنیں نہیں ہیں کیا؟ میں کیا کروں؟ جب کبھی وہ اس بات کا ذکر کرتا ہے اور میں انکار کرتی ہوں تو وہ مجھے پیٹتا ہے۔ ایک دفعہ تو اس نے میرے پیٹ میں لات ماردی۔ میں منہ کے بل گر پڑی، اس روز میرا سامنے کا دانت ٹوٹ گیا...... دیکھو' اس نے اپنا منہ کھول کر مجید کو دکھایا۔ دانتوں کی سفیدی کے بیچ ایک خلا تھا۔

''زہرہ!''

''ہاں۔''

''اور پھر؟''

''وہاں جانے کے بعد سے آج تک میں نے ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی مجھے ذہنی سکون نصیب نہیں ہوا ہے۔ میں ایک بیوی نہیں ہوں، ایک ملازمہ ہوں۔ مجھے ناریل کے ریشے نکال کر دوسرے کے لیے پیسے کمانے ہوتے ہیں۔ اگر اتنا ریشہ نہ نکالوں جتنے کی وہ توقع کرتا ہے تو وہ مجھے مارتا ہے۔ وہ مجھے کبھی کچھ نہیں دیتا۔ جب میں بیمار تھی۔

''ہوں۔''

''ایک ساتھ چار دن کے لیے......''

''تو؟''

''مجھے بھوکا رہنا پڑا۔''

زہرہ دھیرے دھیرے کھلنے لگی۔ اس کے پاس سنانے کو بہت تھا، اس کے دل میں بہت سے راز تھے۔ کبھی کبھی وہ خودکشی کرنے کے بارے میں سوچتی تھی۔ اس کی صرف ایک خواہش تھی'' مرنے سے پہلے ایک بار تمہیں دیکھ لوں۔''

''موت کے بارے میں سوچنا...... تمہیں اس طرح پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ تمہارے سامنے ابھی ساری زندگی پڑی ہے۔ تمہیں یقین رکھنا چاہیئے کہ آنے والے دن اچھے ہیں۔'' مجید کے یہ کہنے پر زہرہ نے ایک ٹھنڈی

سانس بھری۔

وہ کرسی کے سامنے مجید کے پیروں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اسی طرح بہت دیر تک بالکل خاموش بیٹھے ہر طرف کھلی ہوئی چاندنی کا منظر دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد مجید نے کہا، ''زہرہ جاؤ، کچھ کھالو، پھر سکون سے سو جاؤ، رات آرام کرلو۔ میں کل تم سے ملوں گا۔''

''میں بہت تھک گئی ہوں مجید،'' زہرہ اٹھتے ہو کہا۔

''تم اتنی تھک گئی ہو؟'' مجید نے بھی اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''پریشانیاں مجید۔''

''پریشان مت ہو، جاؤ سو جاؤ''

''کیا تم کل کہیں جا رہے ہو؟''

''نہیں۔''

''میں صبح کے وقت آؤں گی،'' زہرہ نے کہا اور چلی گئی۔

''اچھا،'' مجید نے کہا۔

مجید چاندنی رات میں ناریل کے درختوں کے بیچ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ گزرتے ہوئے وقت سے بے خبر تھا۔

اماں ایک لالٹین ہاتھ میں لیے ہوئے آئیں۔ نیم خوابیدہ مجید کو وہاں پڑے ہوئے دیکھ کر ممتا بھری ماں نے پوچھا، ''تم یہاں اتنے بے جان سے کیوں پڑے ہوئے ہو؟''

''ارے کچھ نہیں اماں۔''

''بیٹے، تم نے دیکھا زہرہ کی کیا حالت ہوگئی ہے؟ وہ کتنی چونچال اور ہنس مکھ لڑکی تھی۔ مگر... سب خدا کی مرضی ہے۔''

''اسے ایسا کس نے بنا دیا؟'' مجید کو غصہ بھی تھا اور دکھ بھی۔

''بیٹے آؤ کچھ کھالو اور پھر سو جاؤ۔ سوچ سوچ کر افسردہ اور پریشان نہ ہو۔ اللہ میاں ہر چیز ٹھیک کر دیں گے۔''

اس رات مجید بالکل نہیں سویا۔ زہرہ بھی نہیں سوئی۔ ان دونوں کے درمیان آنگن تھے۔ اور دریا تھے۔ دو دیواریں بھی تھیں۔ اس کے باوجود وہ دونوں سو نہ سکے۔ دونوں مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

مستقبل......؟

زہرہ میں اچانک بڑی تبدیلی آگئی۔ اس کے اندر ایک تابناکی سی پیدا ہوگئی۔ اس کے چہرے پر رنگ آگیا اور اس کی آنکھوں میں چمک۔ وہ مانگ نکالتی اور بالوں کو اس طرح باندھتی کہ اس کے کان چھپ جاتے۔ پاس پڑوس کی

عورتوں کو حیرت تھی زہرہ اتنی بدل کیوں کر گئی ہے؟

وہ جب آئی تھی، اس کے مقابلے میں اب وہ بہت بہتر دکھائی دیتی تھی۔ اب اگر وہ واپس جائے تو اس کا شوہر اسے پہچان نہ پائے گا؟

شوہر؟

وہ ہر وقت مجید کے گھر میں رہتی، پودوں کی دیکھ بھال کرتی اور انہیں پانی دیتی۔ مجید کی بہنیں کہتیں، ''پودے اتنے شاداب اس لیے ہو گئے ہیں کہ ہم نے ان کی دیکھ بھال بہت کی ہے۔''

زہرہ ان لوگوں سے شوفلاور کے درخت کے بارے میں پوچھتی۔ ''اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''یہ تو یہاں بہت دن سے لگا ہوا ہے۔''

زہرہ ان کے جواب سے اختلاف نہ کرتی۔ وہاں تو ہر چیز بہت دنوں سے تھی۔

ایک دن مجید نے اس سے پوچھا، ''تم اب دوبارہ کب جاؤ گی، زہرہ؟'' وہ کچھ سمجھی نہیں۔ کسی قدر الجھن کے ساتھ اس نے پوچھا، ''کہاں؟''

''اپنے شوہر کے گھر۔''

''اوہ!'' اس کا چہرہ اتر گیا۔ ''یہ میں نہیں ہوں جس سے اس نے شادی کی ہے۔''

''پھر کس سے کی ہے اس نے شادی؟''

''وہ سونے کے زیورات سے جو میں اپنے جہیز میں لے گئی تھی،'' اس نے کہا، ''اور میرے اس حصے سے جو خاندان کی ملکیت سے مجھے ملے گا۔ اس نے زیورات بیچ دیے ہیں۔ اب رہ گیا ہے صرف خاندان کی ملکیت والا حصہ۔ وہ جانتا ہے کہ اس پر قبضہ کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔''

کچھ دیر بعد اس نے آہستہ سے کہا، ''اگر آس پاس کے لوگ تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر اعتراض کریں تو؟ میں چلی جاؤں گی۔''

''کیا لوگ اس طرح کی بات کرتے ہیں؟''

''مجھے لگتا ہے کہ وہ اس طرح کی بات کرتے ہیں۔''

اس نے گلاب کا ایک پھول توڑا، اسے سونگھا اور پھر اپنے بالوں میں لگا لیا۔

''شوفلاور کا پھول تم پر زیادہ اچھا لگے گا،'' مجید نے کہا۔

یہ سن کر زہرہ ہنس پڑی، مگر اس کے چہرے پر افسردگی کی ایک جھلک تھی۔

''شوفلاور..... تمہیں یاد ہے؟'' کچھ توقف کے بعد زہرہ نے پوچھا۔

''میں نے اس کے بارے میں سنا ہے۔'' مجید نے کہا۔

''تب تو تم نے 'نسبتاً بڑا ایک' کے بارے میں ضرور سنا ہوگا!''

''ہاں ہاں، میں نے اس بارے میں 'رانی' سے سنا ہے۔''

اگر چہ وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے مگر زہرہ کو زندگی کے ان سات برسوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا جن میں وہ باہر رہا تھا۔ وہ سارے بھیدوں کو جاننا چاہتی تھی، ایک ایک بات سے واقف ہونا چاہتی تھی۔ وہ ہر اس مرد اور عورت کے بارے میں جاننا چاہتی تھی جس سے وہ ملا تھا۔ جب تذکرہ عورتوں کا ہوتا تو زہرہ پوچھتی، ''اس کی عمر کیا تھی؟ وہ کالی تھی یا گوری؟ کیا وہ بہت خوبصورت تھی؟ کیا وہ تمہیں اب بھی یاد آتی ہے؟'' مجید ان سب سوالوں کا جواب دیتا، وہ پھر بھی مطمئن نہ ہوتی، اسے یہ شبہ رہتا کہ ابھی بھی کچھ باتیں ضرور ضرور ایسی ہوں گی جو مجید نے نہیں بتائی ہوں گی۔

''مجھ سے...... مجھ سے تمہیں صرف سچ بولنا چاہیے۔ سنتے ہو؟''

مجید نے ہنستے ہوئے کہا، ''عجیب لڑکی ہے...... ظالم!''

وہ اپنی بھنویں سکوڑ کر اسے چٹکی کاٹنے کے لیے اس کی طرف جھکی، پھر ہنس پڑی۔

اس وقت اس کے ٹوٹے دانت کی خالی جگہ، خوبصورت چھوٹے چھوٹے دانت، اس کے بے رونق ناخن، اس کی صورت پر جھلکنے والا بڑھاپا، سب کچھ مجید کی نظروں کے سامنے آ گیا اور مجید کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کا دل کسی کھردری چیز سے رگڑ گیا ہو۔

''یہ مجید اور زہرہ کے بیچ کیا ہو رہا ہے؟'' پڑوسی جاننا چاہتے تھے۔

''وہ آخر اپنے شوہر کے گھر کیوں نہیں جاتی؟ یہ طور طریقے اللہ میاں کے احکامات کے خلاف ہیں۔''

مجید اور زہرہ کا ایک دوسرے سے بات کرنا اور غیر اخلاقی! کیا آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر نہیں پڑے گا۔

''ارے کیا ہوا اگر اس کے شوہر نے ایک بار اس کے لات مار دی؟ جب اس نے اسے مارا تھا تو دانت ٹوٹ گیا ہوگا۔ آخر وہ اس کا شوہر بھی تو ہے!''

''زہرہ!'' مجید نے کہا، ''پڑوسی ہمارے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔''

''پھر؟'' زہرہ نے سوال کیا۔

''کچھ نہیں، تمہیں ذرا احتیاط رہنا چاہیے۔ زہرہ، تم ایک عورت ہو، تمہارے نام پر دھبہ نہیں آنا چاہیے۔''

''او لگ جانے دو دھبہ، میری روح تک پر دھبہ لگ جانے دو۔ لیکن اس کا سبب تمہیں ہونا چاہیے اور بس۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجید اسی وقت اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ زہرہ سے متعلق یہ ایک مثبت فیصلہ تھا،

مگر وہ یہ بات کہے تو کہے کیسے؟

زہرہ کو دینے کے لیے اس کے پاس ہے ہی کیا؟ یہ گھر نہ پیسہ۔ مگر اس کے پاس ایک صحت مند جسم ہے اور محنت کرنے کی طاقت۔

''زہرہ!'' مجید نے کہا، ''اب تمہیں اپنے شوہر کے گھر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں۔''

مجید نے اپنی ماں کو اس کے بارے میں بتایا۔ یہ سن کر وہ بڑی دیر تک خاموش رہی۔ پھر بولی، ''یہ اچھا تھا کہ تم زہرہ سے شادی کر لو۔ مگر ابھی شادی کے قابل خود تمہاری دو بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ سب نکل چکا ہے۔ مگر کیا اس کی وجہ سے اپنی عزت اور اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں سوچنا چھوڑ دینا چاہیے؟ بیٹے، کہیں باہر نکلو، بہنوں کے لیے شوہر ڈھونڈو اور سونے کے زیوروں اور جہیز کے دوسرے سامان کے لیے کچھ روپے کا انتظام کرو...... ان لڑکیوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد تم بھی اپنی شادی کر لینا۔''

یہ کافی نہیں تھا کہ وہ اپنی بہنوں کے لیے لڑکے تلاش کر لائے۔ اسے سونے کے زیورات اور بہنوں کے جہیز کے لیے روپے کا بھی انتظام کرنا تھا۔

''کیا بغیر جہیز کے ان سے کوئی شادی نہیں کرے گا؟'' اس نے پوچھا ''کون کرے گا بیٹا؟ شاید کوئی قلی، مزدور یا پھر کوئی نو مسلم مل جائے......... کیا ایسا رشتہ کرنا ہمارے لیے مناسب رہے گا؟ لڑکیوں کو کم از کم کان اور گلے کے زیور کے علاوہ کردھنی وغیرہ تو دینا ہی چاہیے۔ دونوں بہنوں کے کانوں میں کل ملا کر بیالیس چھید تھے۔ اتنے سوراخ کیوں بنائے جاتے ہیں؟ اور پھر کیا ہرج ہے اگر کمر اور گلے کے لیے زیور نہ ہو؟ یہ جہیز کا دستور ہی اگر نہ ہوتا تو؟ اماں، اگر کانوں کے چھیدنے کا یہ رواج ہوتا ہی نہیں تو؟ ایسا کیوں ہے کہ صرف ہمارے ہی فرقے میں یہ بے تکی رسمیں ہیں؟ بے ہودہ لباسوں اور بے ہودہ زیوروں کا بے ہودہ اور تکلیف دہ رواج ہے!''

اماں اور ابا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجید نے بھی مزید سوالات نہیں کیے۔ ان کو دوش کیوں دیا جائے؟ انہوں نے یہ سب کچھ اپنے زمانے کے طور طریقوں اور رواجوں کے مطابق کیا۔ انہوں نے یہ سوچا بھی نہیں کہ آیا ان چیزوں کی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟ قدیم رسم و رواج سے ذرا بھی منحرف ہونا بہت مشکل تھا...... مگر حالات کو دیکھتے ہوئے کیا یہ حقیقت پسندی تھی؟

مجید رات کو بالکل سو نہ سکا۔ وہ سوچتا ہی رہا۔ اسے اپنی بہنوں کی شادی کس کے ساتھ کر دینا چاہیے؟ وہ جوانی کی بے چینیوں سے شرابور ہیں......... ان کی کچھ خواہشات ہیں، کچھ جذبات ہیں، کچھ آرزوئیں اور کچھ تمنائیں ....ان کے پاس پہننے کے لیے کپڑے نہیں ہیں، پیٹ بھرنے کے لیے کھانا نہیں ہے۔ انسان کی زندگی میں کمزوری

کے لمحات بھی آتے ہیں۔فرض کیجیے ایسے ہی کسی لمحے میں ان سے کوئی لغزش ہو جائے ،کوئی غلط قدم اٹھ جائے۔!

مجید پریشان ہوگیا۔ بہت کچھ ہے جو وہ کرنا چاہتا ہے۔ رہن رکھے ہوئے گھر کو چھڑانا ، بہنوں کی شادی کرنا، کچھ ایسا کام کرنا جس سے ماں باپ کو راحت ملے۔ وہ بوڑھے ہو گئے ہیں۔کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب موت آجائے۔ اسے ان کی زندگی کو خوشگوار بنانا چاہیے۔

اسے زہرہ سے شادی کر لینا چاہیے۔ پھر اس کی ماں اور بہنیں ہیں۔ان لوگوں کے لیے بھی کچھ کرنا ہوگا۔مگر وہ کرے تو کیا کرے؟ ہر کام کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے اگر کچھ شروع ہو جائے تو کچھ ہو بھی جائے ،مگر کچھ شروع کرنا ہی تو مشکل ہے۔ دنیا میں کوئی ہے جس نے بغیر پیسے اور بغیر کسی کی مدد کے کامیابی حاصل کی ہو؟ اس نے ان سب کے بارے میں بہت سوچا، وہ آخر کیا کرے؟

ایک دن اماں نے ایک تجویز پیش کی۔'' دور دراز کے شہروں میں امیر اور مدد کرنے والے سخی مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ فرقے کی ترقی کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں۔ وہ نادار نوجوان عورتوں کی شادیاں کرا دیتے ہیں، بے روزگاروں کو روزگار دلوا دیتے ہیں، مفت تعلیم کے لے اور معذوروں کے لیے مراکز قائم کرتے ہیں، یہ لوگ ایسے بہت سے کام کرتے ہیں۔ بیٹا، اگر ان لوگوں کو ہمارے بارے میں معلوم ہو جائے تو اتنا ہی کافی ہوگا۔ باقی سب وہ لوگ کر دیں گے۔ مجھے...... مجھے اس بات کا یقین ہے۔ یہ سب مجھے وہ ملا جی آتے ہیں انہوں نے بتایا تھا۔''

کسی جہانیاں جہاں گرد فقیر نے اسے یہ بتایا ہے کہ دوسرے علاقے میں متمول مسلمان ،سخاوت اور فیاضی کے مجسمے ہوتے ہیں۔اماں کو اس بات پر پختہ ایمان ہے۔گزرے ہوئے دنوں میں اماں نے بہت سے ضرورت مندوں کی مدد کی تھی، شاید ابا نے ان سے بھی زیادہ ایسے کام کیے تھے۔ اکثر یہ بھی ہوا کہ لوگوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور ان دونوں کو خوب خوب دھوکا بھی دیا، مگر اماں ان لوگوں کے فریب کو کبھی سمجھ نہ پائی۔ بہر حال ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ جھوٹ بولنے والے بھی۔ کیا نہیں ہوتے ایسے؟ وہ لوگوں سے مانگے؟ مجید نے سوچا اور وہ لوگ اسے جھوٹا سمجھیں تو پھر؟

کسی دوسرے کی مہربانی اور خیر خواہی پر بھروسا کیے بغیر روپے حاصل کرنے کا اور کون سا راستہ تھا؟ مجید کا سر چکرا رہا تھا۔اسے کیا کام کرنا چاہیے؟ اگر وہ کوئی کام ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ دنیا کے طور طریقوں کی اپنی واقفیت سے فائدہ اٹھا کر......... اپنے مستقبل کی طرف سے فکر مند مجید نے گھر چھوڑنے کی تیاری کر لی۔ ابا نے کچھ چیزیں جو ان کے پاس تھیں، انہیں بیچ کر اس کے لیے کچھ روپیوں کا انتظام کر دیا۔

اپنے منصوبوں کی تفصیلات زہرہ کو بتاتے ہوئے اس نے کہا:'' میں جلدی واپس آجاؤں گا، میں یہاں گھر کے تمام لوگوں کو تمہاری نگرانی میں چھوڑ رہا ہوں۔''

''جاؤ، میں تمہارے واپس آنے تک ان کی دیکھ بھال کروں گی۔'' زہرہ نے ذمہ داری قبول کر لی۔
اپنے ارادے پر اٹل مجید سفر پر نکل کھڑا ہوا۔
ایک شام مغربی آسمان پر سنہری روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مجید کا بکس اور بستر اٹھا کر ایک لڑکا بس اسٹینڈ گیا۔ مجید ہر ایک سے مل کر رخصت ہوا۔ ''میری نگاہ بہت کمزور ہو گئی ہے، مجھے اب بہت کم دکھائی دیتا ہے، کیا واپسی پر تم میرے لیے ایک چشمہ لیتے آؤ گے؟'' ''جی ہاں، میں ضرور لاؤں گا'' مجید نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔
ہراساں اور پریشان پریشان سی زہرہ کھڑکی کے قریب کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔
''ایک بات،'' زہرہ نے کہا۔
''کہو رانی،'' مجید بولا۔
''تم جانتے ہو''
وہ جملہ پورا نہ کر پائی، اسی لمحے لاری کے ڈرائیور نے ہارن بجایا۔ اماں دروازے تک آئی۔ ''بیٹے جلدی کرو، لاری چھوٹنے والی ہے۔''
مجید جانے ہی والا تھا زہرہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔
''میں جاؤں؟'' مجید نے پوچھا۔
مجید ایک نامعلوم مستقبل کی طرف روانہ ہو گیا۔
پھاٹک تک پہونچ کر اس نے مڑ کر دیکھا.........زہرہ اور اپنے گھر کی جو تصویر اس وقت اس نے دیکھی تھی وہ اس کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہو سکتی۔ اپنی سچی آرزوئیں اور ایک احساس فرض کے ساتھ دل میں ایک مصمم عزم لیے وہ آگے بڑھ گیا۔
زہرہ سے شادی کر لوں۔
اس سے پہلے اپنی بہنوں کے لیے شوہر ڈھونڈوں، زیور اور جہیز کے لیے روپیہ بچاؤں.........ان سب کاموں کے لیے اسے کوئی کام ڈھونڈنا ہی ہوگا.........لیکن یہ صرف مایوسی تھی جو سامنے آ کھڑی ہوئی۔
کہیں کوئی کام نہیں تھا۔ اگر کہیں ملازمت تھی تو وہاں کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو اس کی سفارش کرے۔ ملازمت کے لیے اسے رشوت دینا ہوگی۔ اسے پاس کیے امتحانات کی سندوں کی ضرورت تھی۔ ان میں سے کوئی چیز نہ ہوتو نوکری حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے تلاش جاری رکھی۔ وہ بہت سے شہروں میں گھوما پھرا۔
آخر میں اس نے اپنے قصبے سے تقریباً پندرہ سو میل دور واقع مہانگری پہنچنے کی سبیل نکالی۔ اس پوری بھاگ دوڑ میں چار مہینے کی مدت گزر چکی تھی۔ وہاں اسے ایک کام مل گیا۔ کام کوئی بہت سخت نہیں تھا۔ آمدنی بھی اچھی تھی۔ ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ وہ آرام کا خیال چھوڑ کر بس کام میں لگا رہے۔ اسے چالیس فیصدی کمیشن ملتا تھا۔ یہ

یقین دہانی خود کمپنی کے مالک نے کی تھی۔

اس کے پاس کمپنی کی دی ہوئی ایک سائیکل ہوگی۔ اس کا کام ہوگا کہ وہ کمپنی کی تیار کی ہوئی چیزوں کے نمونے اس سائیکل پر لے کر گھومے، جگہ جگہ ان کو دکھائے اور خریدار بنانے کی کوشش کرے۔ رہنے کے لیے بھی کمپنی کے قریب ہی اسے جگہ دی جائے گی۔

مجید نے کام شروع کر دیا۔ اس نے تمام نمونوں کو چمڑے کے ایک بیگ میں بڑے سلیقے سے رکھ لیا اور آرڈر بک ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا۔ وہ سارے قصبے میں ہر طرف گیا۔ اس نے آرڈر حاصل کیے اور شام کو بڑا خوش خوش واپس آیا۔ اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ شہر بھر کے کافی چکر لگانے کے بعد مجید نے سو روپے گھر بھیجے۔ اس کے علاوہ اپنے ابا کے لیے ایک عینک اور زہرہ اور دوسرے متعلقین کے لیے کپڑے بھیجے۔ ایک مہینہ اور بیتا۔

کوئی نہیں جانتا کہ مستقبل قریب میں کیا ہونے والا ہے۔ کوئی کسی ناخوشگوار بات کی توقع بھی نہیں کرتا ہے۔ مجید کو بھی کبھی ایسی توقع نہیں تھی۔ مگر اچانک ایک غیر متوقع حادثہ ہو گیا۔

پیر کا دن تھا۔ مجید کو خوب اچھی طرح یاد ہے، کھڑی دوپہر۔ ہمیشہ کی طرح اپنی سائیکل کے آگے اپنا چمڑے کا بیگ لٹکائے وہ کھاڑی کے ساتھ ساتھ جانے والی تارکول کی سڑک پر جا رہا تھا۔ اچھی خاصی ڈھلان تھی اور وہ سائیکل کافی تیز چلا رہا تھا۔ اس تیز رفتاری کی وجہ سے چمڑے کا بیگ ہل کر کبھی ادھر جاتا تھا، کبھی ادھر۔ اتفاق سے بیگ کا ہینڈل اچانک ٹوٹ گیا۔ بیگ سڑک پر گرنے کے بجائے سائیکل کے پہیے میں الجھ گیا۔ مجید سائیکل سے دور جا گرا، وہ پہلے سڑک کے کنارے لگی ہوئی لوہے کی ریلنگ سے ٹکرایا اور پھر گہرے نالے میں گر گیا۔ ایسا لگا جیسے اس پر ایک پہاڑ گر پڑا ہے۔ اسے کسی چیز کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا تکلیف دہ احساس تھا اس کے جسم سے کوئی چیز کٹ کر الگ ہو گئی تھی، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور آس پاس کی ہر چیز اس تاریکی میں غائب ہو گئی۔ نسیان کے اندھیارے میں سب کچھ گم ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی ہوش کی ہلکی سی رمق طوفانی رات میں بجلی کی طرح چمکتی اور ختم ہو جاتی۔ شدید درد...... زہر مارنے والی دواؤں کی تیز خوشبو، تکلیف میں کراہتے ہوئے لوگوں کی آوازیں...... نلکی کی طرح کسی چیز کے حلق میں پڑے ہونے کا دھندلا دھندلا احساس..... پیٹ جیسے کسی گرم رقیق سے بھرا ہوا........ ایک عجیب وغریب احساس........ اس ساری کیفیت کے گزرنے میں ایسا لگا جیسے زمانے بیت گئے۔ کوئی چیز صاف اور واضح نہیں، سفید دھوئیں کی طرح، روپہلے بادلوں کی مانند........ مجید سے دور جاتی ہوئی ہر شے! کیا ہر چیز نیستی میں تحلیل ہونے والی ہے؟

''نہیں، نہیں! اسے زندہ رہنا ہے!'' شدید درد، کچوکے لگاتا ہوا درد..... پھر بھی اسے زندہ رہنا چاہیے۔ مجید نے کوشش کی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی ساری ناتوانیوں کو مجتمع کر کے اپنے اوپر سے گزرتے ہوئے بے ہوشی اور نسیان کے پہاڑ کو جو اسے دبائے دے رہا تھا، جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا...... انتہائی تکلیف کے ساتھ اسے ہوش آ ہی گیا۔

اس نے ایک گہرہ سانس لی۔ دھیرے دھیرے اس نے اپنی آنکھ کھولی۔ وہ چت پڑا ہوا تھا۔ اس کے پیروں سے گردن تک ایک چادر پڑی ہوئی تھی....... اسپتال! اسے ہر چیز یاد آ گئی شدید درد اور کچوکے۔ اس کے دائیں کولہے ہیں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ درد کی لہریں اس کے دماغ تک پہونچ رہی تھیں...... مجید نے اپنا ہاتھ پھیر کر محسوس کیا، اس کی کمر کے چاروں طرف بہت سی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ ہوا کیا ہے؟ مجید نے اچانک ایک بار پھر ہاتھ پھیرا، اس کی ہڈیوں میں ایک ٹھنڈی لہر سی دوڑ گئی۔

ایک خالی جگہ!

وہ حیران تھا۔ اس کے سارے جسم پر پسینہ بہہ رہا تھا۔ اسے پھر بے ہوشی سی محسوس ہوئی، اس کی ٹانگ کا آدھا حصہ اس کے جسم سے ہمیشہ کے لیے الگ ہو چکا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک گہرے غار میں اتارا جا رہا ہے۔ اس کے چاروں طرف ہر چیز گھوم رہی تھی۔

مجید نے ایک بار پھر ٹانگ کو ٹٹولا....... ایک خلا، ایک خالی جگہ! نیچے کچھ نہیں تھا۔ ناقابل برداشت درد...... اس کی اپنی ٹانگ جس پر زہرہ نے اپنا پہلا بوسہ ثبت کیا تھا...........

کیا ٹانگ کاٹ دی گئی؟

اس نے آنکھیں کھولیں۔ گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں کے کنارے سے بہہ رہے تھے۔ ڈاکٹر، نرس اور کمپنی کے مینیجر صاحب اس کے بستر کے قریب کھڑے تھے۔ منیجر صاحب نے اس کی پیشانی پر اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھا، اس پر جھکے اور بولے:

''مسٹر مجید، مجھے بے انتہا دکھ ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔''

''اے زہرہ!''

مجید، یہ کیا؟ تم دھیان کیوں نہیں دے رہے ہو؟''

''جی میں سن رہا ہوں۔''

''آپ مجھے اے کہہ کر کیوں مخاطب کرر ہے ہیں؟''

''زہرہ! مجید نے زور سے آواز دی اور ایک جھٹکے کے ساتھ جاگ گیا۔''

تم دن میں خواب دیکھ رہے ہو کیا؟'' نرس نے سوال کیا۔

مجید نے ہلکے سے مسکرانے کی کوشش کی۔

چونسٹھ راتیں گزر گئیں اور پھر مجید اپنے قد سے اونچی ایک چھڑی کی مدد سے اپنی کمپنی کے منیجر کے ساتھ اسپتال کے گیٹ سے نکلا اور شہر کی معروف سڑک پر ہولیا۔ کمپنی کے منیجر نے اسے پچاس روپے دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اب گھر جانا

چاہیے، ہم لوگوں کا تعلق اس طرح ختم ہوا اس کا مجھے بہت دکھ ہے۔" مجید کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔" گھر پر میری دو بہنیں ہیں جو عمر کی ان حدود کو پار کر چکی ہیں جب ان کی شادی ہونا چاہیے تھی،" اس نے کہا۔" میرے باپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ رہن رکھا جا چکا ہے۔ گھر میں ایک اکیلا میں مرد ہوں۔ گھر کے مسائل کا کوئی حل ڈھونڈے بغیر میں واپس نہیں جانا چاہتا...... اور پھر اس حالت میں وہاں جا کر مجھے ان لوگوں کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہیے۔"

"تم اب کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"میری کمپنی میں تمہارے لائق کوئی کام نکل آتا تو..... ہاں، تم کلرک کی حیثیت سے کام کر سکتے ہو، کر سکتے ہو نا؟"

"جی نہیں، میں حساب میں بہت کمزور ہوں۔"

مجید ایک بار پھر صرف اپنے ہی بھروسے پر تھا۔ کوئی بات نہیں دنیا میں بہت سے لوگ ہیں جن کا کوئی سہارا نہیں ہے۔ ڈرنے اور گھبرانے کی کیا وجہ ہے؟ مجید نے منیجر صاحب کے دیے ہوئے پچاس روپوں میں سے چالیس روپے گھر بھجوا دیے۔ روپوں کے ساتھ اس نے ایک خط بھیجا اس میں اس نے اپنی دائیں ٹانگ کے ضائع ہونے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس نے صرف اتنی اطلاع دی کہ وہ بیمار ہے اور بستر پر لیٹا ہے۔ ساتھ ہی ان سے یہ بھی کہہ دیا کہ اس کو کوئی خط اس وقت نہ لکھے جب تک کہ وہ دوسرا خط نہ بھیجے۔

دونوں ہاتھوں سے چھڑی پکڑے لنگڑا لنگڑا کر وہ چلتا رہا..... ہر چار قدم کے بعد وہ رکتا اور پھر چلتا، وہ رکتا تھا اور چلتا تھا..... ایک دو مہینے اسی طرح گزر گئے۔ اس کے بعد رہنے کے لیے کوئی مستقل جگہ نہیں تھی۔ جہاں رات ہوتی وہ وہیں سو جاتا۔

بالآخر ایک شہر میں پہنچنے پر اس نے وہاں متمول لوگوں سے ملنے اور ان سے مدد مانگنے کا فیصلہ کیا۔ معلوم کرنے پر اسے پتہ چلا کہ سب سے زیادہ مخیر شخص ایک خان صاحب ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ شہر کی تمام بڑی بڑی دکانیں ان ہی کی تھیں۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کے توشہ خانہ میں سونے کی سلاخوں کو بھکری لگ رہی ہے سرکاری حلقوں میں بھی ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ ابھی کچھ ہی دن قبل انہوں نے گورنر صاحب کے اعزاز میں ایک دعوت کی تھی جس پر لاکھوں روپے خرچ کر دیے تھے۔ کوئی چیز ان کے لیے ناممکن نہیں ہے۔ کوئی چیز بھی نہیں۔

مگر ان کے محل کے چوکیداروں نے مجید کو گیٹ کے اندر بھی نہیں آنے دیا۔ خان صاحب روزانہ آ کر محل کے گیٹ پر کھڑے ہوا کرتے تھے۔ ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ بالآخر چوکیداروں کو مجید پر رحم آیا۔ اسے خان صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجید نے بڑے سلیقے اور نہایت مہذب طریقے سے انہیں سلام کیا۔ جب دو مسلمان ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو توقع کی جاتی ہے کہ وہ السلام وعلیکم کہیں گے۔ مجید نے یہی کیا۔ مگر نہ جانے کیوں خان صاحب نے اس کے سلام

کا جواب نہیں دیا۔ ان کے چہرے سے یہ بھی ظاہر نہیں ہوا کہ انہوں نے سنا بھی۔ خان بہادر صاحب گورنر چنے تندرست آدمی تھے۔عمر کوئی پچاس برس کے قریب ہوگی۔ جب وہ اپنی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتے تو ان کی بھاری بھاری جڑاؤ انگوٹھیاں چمک اٹھتیں۔ انہوں نے اسی کیفیت میں مجید کی کہانی سنی۔سارا قصہ سننے کے بعد خان صاحب نے کہا: ''بہت سی ایسی ہیں جن کے پاس کھانے کے لیے پیسے نہیں ہوتے۔ میں جو کچھ کرسکتا ہوں وہ سب کے لیے کرتا ہوں۔ بتاؤ اس سے زیادہ میں اور کیا کروں؟''

مجید کچھ نہ بولا۔

خان صاحب نے کمیونٹی کے فائدے کے لیے جو کام کیے تھے ان کا تفصیلی تذکرہ شروع کر دیا۔ انہوں نے چار مسجدیں تعمیر کرائی تھیں، دوسرے لکھ پتیوں نے صرف ایک ایک مسجد بنوائی تھی۔ مزید یہ کہ انہوں نے زمین کا ایک قطعہ کمیونٹی کو دے دیا تھا تاکہ وہ وہاں ایک اسکول بنا سکے۔ اگر زمین کے اس ٹکڑے پر وہ خود کوئی عمارت بنوا کر اسے کرائے پر اٹھا دیتے تو انہیں ہر مہینے نہ جانے کتنی رقم مل جایا کرتی۔ محض کمیونٹی کی خاطر وہ ہر سال کتنا نقصان اٹھاتے ہیں۔

''میں کیا اور کتنا کروں؟ تم ہی بتاؤ۔''

مجید کچھ نہ بولا

ایک ٹانگ ضائع ہو جانے پر خان صاحب نے مجید سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا: ''یہ بھی قسمت ہے، اس میں اور کہا بھی کیا جا سکتا ہے؟ یہ مقدر ہے اور پھر اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔'' اس صورت میں تو پھر کیا چیز ہے جس سے فرق پڑتا ہے؟

مایوسی اور افسردہ دلی کے ساتھ وہ چھڑی کا سہارا لیتے ہوئے کھڑا ہوا خان صاحب کو سلام کیا اور آہستہ آہستہ باہر نکل آیا۔ وہ گیٹ سے باہر قدم رکھنے ہی والا تھا کہ خان صاحب نے اپنے ملازم کے ہاتھ اسے ایک روپیہ بھجوایا۔

''اس روپے کو تم رکھ لو اور خان صاحب سے کہہ دینا کہ تم نے روپیہ مجھے دے دیا ہے'' اس نے نوکر سے کہا اور گیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کا ایسا کرنا کیا ٹھیک تھا؟

مجید نے وہ روپیہ کیوں نہیں لیا؟ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ اس لکھ پتی کے پاس روزانہ سیکڑوں غریب اور ضرورت مند آتے ہیں اور وہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیتا ہے۔ اگر مجید امیر آدمی ہوتا تو وہ خود کیا کرتا؟ کیا وہ اپنی آدھی دولت اس فقیر کو دے ڈالتا جو سب سے پہلے اس کے در پر آیا ہوتا؟ کیا اس نے اس فقیر کو ایک پیسے سے زیادہ دے دیا ہوتا؟ خان بہادر نے تو اسے ایک روپیہ دیا۔ کیا اسے اس روپے کو قبول نہیں کر لینا چاہیے؟

اس شہر میں، مجید نے سوچا، صرف پانچ لکھ پتی ہیں باقی لوگ جن کی تعداد چھ سات لاکھ ہوگی، مختلف طرح کے عام لوگ ہیں۔ یہ سب بھی کسی نہ کسی طرح زندہ رہتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان میں لوگ مرتے رہتے ہیں۔ مجید صرف ایک ٹانگ

سے محروم ہوا ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جن کی دونوں ٹانگیں یا ہاتھ ضائع ہو چکے ہیں۔ جن لوگوں کی دونوں آنکھیں نہیں ہیں وہ بھی زندگی گزار رہے ہیں۔ زندگی امیر اور غریب دونوں کو دکھ بھی دیتی ہے اور سکھ بھی۔ جب کوئی اس طرح سوچتا ہے تو پھر اس کے لیے مسکرانا ممکن ہو جاتا ہے اور رونا بھی۔ مجید نے فیصلہ کیا کہ کسی چیز کو بہت اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا آدمی کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ بہتر زندگی اور خوشحالی کے لیے جتن کرے؟

مجید کی چھڑی گھس گھس کر چار انچ کم ہو چکی تھی۔ اس کی ہتھیلیوں پر چوتھائی انچ کے گھٹے پڑ گئے تھے۔ اس نے بہت سی جگہوں پر کام تلاش کیا۔ بھوکا پیاسا رہنے کی وجہ سے وہ بہت دبلا ہو گیا تھا۔ پھر مجید کی قسمت پلٹی۔ ایک ریستوران میں اسے برتن دھونے کی نوکری مل گئی۔ چار بجے صبح کو اٹھ کر رات گیارہ تک اسے نل کے سامنے بیٹھنا پڑتا تھا۔ گندی پلیٹیں ایک ٹوکری میں آتی تھیں، وہ انہیں دھو دھو کر ایک دوسری ٹوکری میں رکھتا تھا۔ کوئی دوسرا ملازم آتا تھا اور صاف برتنوں کی ٹوکری کو اٹھا لے جاتا تھا، مگر فوراً ہی کوئی اور ملازم کچھ اور گندے برتن لا کر ڈھیر کر دیتا تھا..... یہ اس کا کام تھا بہر حال اسے پیٹ بھرنے کے لیے کھانا خاصا مل جاتا تھا۔ وہ ہر مہینے پانچ روپے گھر بھیج پاتا تھا۔

گھر کا پہلا خط جو اسے ملا اس سے پتہ چلا کہ زہرہ بیمار ہے، اس کا وزن کم ہو گیا ہے، اسے کھانسی آنے لگی ہے۔ ''باقی یہاں پر سب خیریت ہے، سب لوگ تمہیں دیکھنے کو بے چین ہیں۔''

مجید بھی زہرہ کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہے۔ جب وہ زہرہ سے، اپنی ماں اور اپنے ابا سے، اور اپنی بہنوں سے ملے گا، زہرہ کی ماں اور اس کی بہنوں کو دیکھے گا، جب پڑوسیوں سے اس کی ملاقات ہوگی تو یہ سب اسے دیکھ کر کیا کہیں گے؟ مجید ڈیڑھ ٹانگ کے ساتھ! کیا زہرہ بھی اس کا ذکر اسی طرح کرے گی؟........ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔ اس کی آنکھوں میں تو آنسو آ گئے۔ وہ اس آدھی ٹانگ کو چوم لے گی۔ وہ گزرتے ہوئے دن...... جب مجید کو ان کا خیال آیا وہ مسکرا دیا۔ ''نسبتاً بڑا ایک!'' ان کہانیوں کو سنا سنا کر مجید نے بہت سے لوگوں کے چہروں پر مسرتوں کی لہریں دوڑائی تھی۔ زہرہ بھی گفتگو کا ایک موضوع رہتی تھی۔ ہوٹل کے دوسرے ملازمین مجید کے دوست تھے۔ رات کو نہانے اور کھانا کھانے کے بعد جب وہ لیٹتا تو اپنے تجربات کو یاد کرتا اور لوگوں کو مزے مزے کے قصے سناتا، ایسی دلچسپ کہانیاں سناتا کہ ہر شخص سن کر لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ رات جب سونے کا وقت آتا مجید کسی نہ کسی چیز کے بارے میں باتیں کرتا.... کرنے کے لیے کیا اس کے پاس کم باتیں تھیں؟ اس کے تمام دوست اکثر ہنستے ہنستے ہی سو جاتے تھے۔

جب سب لوگ سو جاتے تو مجید کبھی اس چیز کے بارے میں، کبھی اس چیز کے بارے میں زہرہ سے باتیں کرتا۔ پندرہ سو میل دور سے وہ زہرہ کو دیکھ لیتا، اس کے کھانسنے کی آواز سنتا، اس سے کہتا پریشان نہ ہو، اسے طرح طرح سے اطمینان دلاتا......رات اور دن۔

''زہرہ، تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟ کیا اب بھی تمہارے سینے میں درد ہے؟'' وہ کہتا اور دھلی ہوئی پلیٹوں میں

دیکھتا۔اس کی ہتھیلیوں کے چھالے نرم ہو کر ٹوٹ گئے تھے۔ویسے جسمانی طور پر وہ بہت ٹھیک تھا۔وہ خوشی خوشی ہر چیز کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ایمانداری، محنت اور مشقت سے اس نے جو کچھ حاصل کیا تھا اس پر اسے ناز تھا۔زندگی میں کچھ تبدیلیاں تو ہوں گی۔لکڑی یا ربر کی ٹانگیں ہوتی ہیں، ان کے اوپر آدمی پاجامہ اور جوتے پہن سکتا ہے۔اس بات کی طرف ہوٹل کے مالک نے توجہ دلائی تھی۔اسے مجید سے ہمدردی تھی۔وہ دکھ کے سمندر میں آرام اور سکون کا ایک جزیرہ دریافت کرلے گا۔

رات کو جب دوسرے تمام لوگ گہری نیند سو جاتے تو مجید زہرہ سے کہتا ''میری پیاری زہرہ سو جاؤ۔'' مگر اسے دکھائی دیتا صرف تاروں بھرا ایک وسیع آسمان......کیا زہرہ بھی دیکھتی ہوگی؟

مجید بہت سویرے اٹھا کرتا تھا۔صبح کی ضروریات سے فارغ ہو کر ایک پیالی چائے پیتا اور پھر اپنا کام شروع کر دیتا۔شہر تو کبھی سوتا ہی نہ تھا۔وہاں ہر طرف چہل پہل تھی، شور تھا۔لوگوں کی بھاگ دوڑ اور سواریوں کی آمد و رفت کی ملی جلی آوازیں۔ان ہی آوازوں کو سنتے ہوئے مجید پلیٹیں دھو دھو کر ڈھیر کرتا جاتا۔

زندگی اسی طرح چل رہی تھی کہ گھر سے دوسرا خط آیا۔لکھائی زہرہ کی نہیں تھی۔

اماں نے خط لکھنے کے لیے کسی اور کو پکڑا تھا۔مجید نے جب یہ خط پڑھا تو اسے ایسا لگا جیسے شہر کا سارا ہنگامہ یک لخت رک گیا ہو۔

''مجید میرے بیٹے، یہ تمہاری اپنی ماں ہے جو یہ خط تمہارے پڑھنے کے لیے لکھوا رہی ہے۔''

ہماری زہرہ پرسوں مرگئی۔اس کا انتقال صبح کے وقت اس کے گھر پر ہوا۔مرتے وقت اس کا سر میری گود میں تھا مسجد کے احاطے میں اس کے ابا کے قریب اسے جگہ ملی ہے۔

''ہماری اکیلی ہمدرد اور مددگار چلی گئی۔اب ہمارے لیے اللہ میاں کے بعد صرف تم ہو۔''

''بیٹے، پچھلے مہینے کی تیس تاریخ کو ہمارا گھر اور اس سے ملی ہوئی زمین قرض خواہوں کے مطالبات کو ادا کرنے کیلیے بیچ دی گئی۔اب وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اس جگہ کو جلد از جلد خالی کر دینا چاہیے۔ان دو نوجوان لڑکیوں اور تمہارے بیمار ابا کو لے کر میں کہاں جاؤں؟

''بیٹے، نیند نہیں آتی۔مجھے سوئے ہوئے نہ جانے کتنے دن ہو گئے ہیں۔تمہاری بہنوں کی ہم عمر لڑکیوں نے دو دو تین تین بچے پیدا کر دیے ہیں......میری بچیوں کے ساتھ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوگئی..... بیٹے اس طرف کے مسلمانوں میں رحم کا جذبہ بالکل نہیں ہے۔اگرچہ میں نے اور تمہارے ابا نے ان سے بہت منت سماجت کی مگر وہ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ جگہ جلد از جلد خالی کرنا ہوگی۔''

''وہاں، مسلمان امت کے بہت سے امیر اور مہربان لوگ ہیں۔اگر تم یہ سارے حالات ان کو بتاؤ تو وہ کوئی نہ کوئی

راستہ ضرور بتائیں گے۔ ان لوگوں کے پاس جانے اور ان سے صاف بات بتانے میں شرم نہ کرو'' میرے پیارے بیٹے، جب تک زہرہ یہاں تھی وہ میرے لیے بڑے اطمینان کا سبب تھی۔ زہرہ کہتی تھی ہمیں اپنی ساری تکلیفیں لکھ کر تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے میں نے تمہیں پہلے نہیں لکھا۔ پچھلے دو مہینے زہرہ بستر سے لگی رہی۔ گھلا دینے والا بخار.....کوئی نہیں تھا جو اس کا علاج کراتا۔ مرنے سے پہلے اس نے تمہارا نام لیا تھا۔ کئی دفعہ پوچھا کہ تم آئے یا نہیں۔

''سب اللہ کی مرضی ہے۔''

ایک لمحے کے لیے مجید جیسے سناٹے میں آ گیا۔ جیسے ہر چیز خاموش ہوگئی۔ دنیا ایک خالی پن سے بھر گئی تھی۔

نہیں، دنیا کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ شہر کا شور وغل ویسا ہی تھا، سورج چمک رہا تھا، ہوا چل رہی تھی۔ یہ صرف مجید تھا جو پسینے میں شرابور تھا، پسینہ جو اس کے پور پور سے نکل رہا تھا۔ کوئی مدد نہیں تھی.......کیا زندگی بے معنی ہوگئی تھی؟

مجید نے ایک بار پھر برتن دھو کر بڑی احتیاط کے ساتھ دوسری ٹوکری میں رکھنا شروع کر دیے۔ اس کے والدین اور اس کی بہنیں کہاں جائیں گی.......ان کا کیا ہوگا؟

''زہرہ!''

یادیں.....الفاظ.....حرکات......چہرے کے تاثرات.......تصویریں....ان سب نے جیسے مل کر اس کے دماغ پر ہلہ بول دیا۔ مرنے سے پہلے اس نے بار بار پوچھا، ''کیا مجید آ گیا ہے؟''

یادیں....آخری یاد۔

اس دن.....مجید سب سے اجازت لے کر رخصت ہو رہا تھا.....زہرہ نے کوئی بات شروع کی تھی، مگر اس سے پہلے کہ وہ بات پوری کرتی لاری کے ڈرائیور نے ہارن بجا دیا تھا......ماں اندر آ گئی تھی.....مجید نکل کر آنگن میں چلا گیا تھا۔ پھولوں کے باغیچے سے وہ گیٹ تک آیا تھا.....ایک لمحے کے لیے اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔

مغربی افق پر سنہرے بادل، درخت، گھر آنگن اور پھولوں کا باغیچہ.....سب کے سب سورج کی ہلکی پیلی روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔

اس کی دونوں بہنیں دروازے کے پیچھے صرف اپنے چہرے دکھاتی ہوئی کھڑی تھیں.....ابا دیوار کی ٹیک لگائے ہوئے برآمدے میں.....اماں آنگن میں.......

باغ میں شوفلاور کے پودے پر اپنا ہاتھ رکھے اور آنگن میں آنسو بھرے کھڑی ہوئی تھی زہرہ......

اس نے جو بات کہنا شروع کی تھی اب بھی اس کے دماغ میں ہوگی.....

وہ کیا بات تھی جو زہرہ کہنا چاہتی تھی؟

(ملیالم سے انگریزی میں ترجمہ: آر ای اشراور لچمنا، کوائل پر میل، چندر سیکرن)

اقبال مجید

داغ دھبّے

بیٹا بار بار ہورڈنگ کو تکے جارہا تھا۔ باپ ٹرافک جام ہوجانے کے بعد برابر کی سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہاتھا۔ باپ اور بیٹے دونوں ہی پچھلے دوروز سے اس راستے سے گزر رہے تھے۔ دونوں کی اس بڑی سی ہورڈنگ پر نظر پڑتی تھی جو کسی سیاسی لیڈر کے جنم دن کی مبارکباد کے سلسلے میں اس لیڈر کے سیاسی کارکنوں نے اس سے اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے لگوائی تھی۔ اس ہورڈنگ میں لیڈر کی نمایاں تصویر کے علاوہ مبارکباد دینے والے بارہ کارکنوں کی تصویریں اور نام بھی درج تھے اور جلی حروف میں لکھا تھا۔ متو میاں کے جنم دن پر ہاردک بدھائی۔ متو میاں کی پہلوانی مونچھوں میں کچھ ایسا جلال تھا کہ جس سواری کی بھی اس پر نظر پڑتی تو سڑک کی طرف سے اس کا دھیان ضرور ہٹ جاتا اور آگے چل رہی سواری کو دھکا دینے کے بعد ہی وہ ان مونچھوں پر سے نظر ہٹاتا۔

بیٹا یہ تو جانتا ہی تھا کہ اس کے برابر بیٹھا اونگھتا رہا اس کا باپ اپنی جوانی کے کئی سال عملی سیاست میں گزار چکا تھا اور اپنی پارٹی کا ایک سرگرم کارندہ تھا۔ اس ہورڈنگ کو دیکھ کر بیٹے نے سوچا بھی کہ وہ اپنے باپ سے پوچھے کہ کیا کبھی اس کی بھی تصویر ان تصویروں کی طرح کسی مصروف شاہراہ کے کنارے لگی ہورڈنگ میں پینٹ کی گئی اور کیا آتے جاتے ہزاروں راہگیروں نے اسے بھی دیکھا۔

بوڑھا باپ بیٹے کے ساتھ اس راستے سے گزرتے ہوئے کار کے اندر سے اس ہورڈنگ کے بنانے والے کی کنارے بنی دستخط دیکھ چکا تھا۔ اس پینٹر کا باپ بھی ہورڈنگ بنانے کا کام کرتا تھا اور بڈھے کو یاد آیا کہ اپنی جوانی میں ہورڈنگ بنوانے کا کام وہ اسی سے کروایا کرتا تھا۔

باپ بیٹے دونوں اس ہورڈنگ کے پاس ٹریفک جام میں پھنسے گاڑی میں بیٹھے الجھ رہے تھے۔ بوڑھا ٹکٹکی باندھے ہورڈنگ بنانے والے کے دستخط کو کچھ دیر گھورتا رہا اور پھر بے خیالی میں بڑبڑایا۔

''تیاری پر پتا چلا چھوٹی پڑ گئی ہے۔'' بیٹے نے باپ کی ہڑبڑاہٹ سن لی۔ دلچسپی کے ساتھ دریافت کیا۔

''کیا چھوٹی پڑگئی ہے۔''

باپ نے ''کچھ نہیں'' کہہ کر بات ٹالنا چاہی لیکن لڑکے نے پوچھ لیا کہ کیا اسی ہورڈنگ کو دیکھ کر اسے کچھ یاد آ گیا ہے؟ ٹریفک میں پھنسے ہوئے بوڑھے کے پاس وقت کاٹنے کا بہانہ بن کر پرانی یادیں یکا یک سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں تو وقت گزاری کے لیے اس نے بیٹے کو بتایا کہ بہت برس پہلے اس کی پارٹی کی مقامی شاخ کے سارے بھاگ دوڑ والے کام وہی کرتا تھا۔ ایک بار مقامی لیڈر پریم بابو کے ایک جنم دن کے موقع پر انہیں دی جانے والی مبارکباد کی ایسی ہی ہورڈنگ تیار کروانے کا کام انہیں سونپا گیا تھا۔ ہورڈنگ میں عبارت تو لگ بھگ وہی تھی یعنی بھائی پریم بابو کے جنم دن پر دلی مبارکباد۔ ہم ہیں آپ کے فلاں فلاں، لیکن جب ہورڈنگ تیار ہو کر آئی تو پتا لگا ضرورت کے مطابق اس کے بورڈ کی لمبائی چوڑائی کم تھی۔ کیونکہ اس کے تختے پر عبارت کے علاوہ مبارکباد دینے والے پریم بابو کے بیس جانثاروں کی تصویریں بھی چسپاں تھیں۔ جب اس کو ہورڈنگ بنوانے کا کام ملا تو اسے احساس ہونے لگا تھا کہ پارٹی اب اس سے زیادہ ذمہ داری کا کام لینے لگی ہے۔ ہورڈنگ بنانے والے پینٹر نے صفائی دی کہ جس لمبائی چوڑائی کی ہورڈنگ بنانے کا تحریری آرڈر دیا گیا تھا وہ اسی سائز کی ہی ہے اس پر لکھنے اور لگانے کے لیے جو میٹر دیا گیا تھا وہی لکھا اور لگایا گیا ہے۔ یہ کہہ کر پینٹر نے اپنا پلہ جھاڑ لیا لیکن بیس تصویروں کی وجہ سے جگہ اتنی کم پڑ گئی تھی کہ پریم بابو جن کے جنم دن پر مبارکباد دی گئی تھی خود ان کو بھی ان تصویروں میں پہچان کر تلاش کر پانا مشکل ہو رہا تھا۔

جنم دن کی تاریخ میں ابھی ایک مہینہ باقی تھا۔ نئی ہورڈنگ تیار ہو سکتی تھی لیکن مسئلہ کاریہ کرتاؤں کی جیب پر پڑنے والے بوجھ کا تھا کیونکہ جو ہورڈنگ منسوخ کر دی گئی تھی اس کی بنوائی اور نئی ہورڈنگ کا خرچ ان کاریہ کرتاؤں کو ہی ادا کرنا تھا جو مبارکباد دیکر پریم بابو کی نظروں میں سرخرو ہونا چاہ رہے تھے۔

طے پایا کہ ہورڈنگ ضرور لگے گی لیکن پہلے اس کی ایک ڈمی تیار کی جائے اور اس پر آنے والے خرچ کا تعین کر لیا جائے۔ پینٹر نے الگ الگ سائز کی ہورڈنگ اور اس کے کرایے وغیرہ کے نرخ سے آگاہ کیا۔ ایک سائز طے ہوا۔ اس سائز کے تختے پر اگر بیس تصویریں لگائی جاتیں تو وہ اتنی چھوٹی ہوتیں کہ ان کی پہچان مشکل ہو جاتی۔ پھر یہ بھی مسئلہ تھا کہ پریم بابو کی تصویر باقی تصویروں سے ہر حال میں بڑی اور نمایاں ہونا چاہیے۔ ڈمی دیکھنے کے بعد طے پایا کہ بورڈ پر پندرہ لوگوں سے زیادہ کی تصویریں قبول نہ ہوں گی۔ اس طرح جو ہورڈنگ پر اپنی تصویر لگوانے کے خواہاں تھے ان بیس لوگوں میں سے پانچ افراد کو کم کر دینا لازمی قرار پایا۔

بیٹے نے جب اس دلچسپ صورت حال کو سنا تو آگے کا ماجرا جاننے کے لیے اس نے سوالات کر ڈالے۔

پہلا یہ کہ کم کیے جانے والے لوگ کیا ہورڈنگ سے باہر کے لیے تیار ہو گئے۔

دوسرا یہ کہ کیا ان پانچوں نے ہورڈنگ سے باہر آنے پر اپنے نیتا کو مبارکباد دینے کا کوئی دوسرا طریقہ

اختیار کیا؟ بوڑھا باپ جوابوں کے چکر میں نہیں پڑا سیدھے سیدھے اس نے بیٹے کو اتنا بتا دیا کہ پانچوں نے اپنی تصویریں واپس لے لیں، اپنے نیتا کے لیے ہار پھول لے جا کر اس کے گھر پر مبارکباد دی کیونکہ جب انہوں نے خود ہی اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھا تو انہیں اندازہ ہو گیا کہ بھرے بازار میں اپنے چہرے مہرے کی نمائش کے ساتھ وہ اپنے نیتا کے جنم دن کی مبارکباد دینے کی حیثیت میں ابھی نہیں آئے ہیں۔ پھر وہ پانچوں اس رائے سے متفق نکلے کہ ہورڈنگ تو بیکار کی شوبازی ہے اس چونچلے میں پڑنے کا کوئی مطلب نہیں۔ کچھ ایسا بھی تھا کہ انہیں دوسری تصویروں کے مقابلے میں اپنی تصویریں بڑی سوکھی ساکھی اور اجاڑ سی لگیں جیسے بجھی بجھی سی ہوں یا ان میں وہ جاذبیت نہ تھی جو ایک بھری پری اور خوشحال زندگی گزارنے پر شخصیت میں چمل اور کشش پیدا کرتی ہے۔ انہیں دل ہی دل میں ایسا بھی لگا کہ ان کو ایسا کچھ نہیں چاہنا چاہیے جس کے وہ مستحق نہیں۔ پھر انہوں نے سب کو یہ بھی بلا تکلف بتا دیا کہ ان کے پاس ہورڈنگ کا خرچ اٹھانے کے لیے پیسہ بھی نہیں ہے۔

جب بیس لوگوں میں سے پانچ لوگ ہورڈنگ سے باہر ہو گئے تو باقی بچے پندرہ لوگوں میں یہ بے اطمینانی ہی رہی کہ اگرچہ بہ ظاہر باہر جانے والے پانچ لوگوں نے اپنی اس محرومی پر کسی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا ہے لیکن در پردہ اس رویے سے کہیں باقی لوگوں کے خلاف ان کے دل میں کوئی کدورت تو نہیں بیٹھ گئی ہے۔ وہ سب ہی لوگ عوام کے درمیان پارٹی کے احکامات کے مطابق اپنے اپنے فرائض انجام دیتے تھے اور ساتھ ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، لیکن دل کی گہری تہوں میں جا کر بیٹھ جانے والی باتوں کا پتا لگا لینے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ پانچوں بھی انسان تھے۔ بجلی کے پنکھے ہوتے تو ایک ہی ایمپئر پر گھومنے کی امید کی جاتی۔ بہرحال اچھی طرح سے ٹٹول کر یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ وہ پانچوں ہورڈنگ سے ہٹائے جانے پر دل گرفتہ نہیں ہیں انہیں سکون ملا۔

جب نئی ہورڈنگ کی ڈمی تیار ہوئی تو جن پندرہ لوگوں کی اس میں تصویریں لگائی گئی تھیں ان میں پریم بابو کو چھوڑ کر مبارکباد دینے والے ہر ممبر نے ہورڈنگ میں چسپاں اپنی تصویر کو ہر پہلو سے لگ بھگ پندرہ فٹ کے فاصلے سے زاویے بدل بدل کر دیکھا کہ کیا وہ تصویر اتنی نمایاں ہے کہ دور سے دیکھنے والوں کی پہچان میں آ جائے۔ دراصل ان لوگوں کا یہ سوچنا غلط بھی نہیں تھا کہ ووٹ مانگنے کے لیے انہیں جنتا کے بیچ میں کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ان کا چہرہ جنتا کی یادداشت سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ جب سب نے اپنی اپنی تصویروں کا گہرا معائنہ کر لیا تو ان میں سے ہر ایک کا یہ تاثر ٹھہرا کہ تصویریں تھوڑی اور بڑی ہونا چاہیے۔ کم سے کم اتنی جتنی کہ پریم بابو کی تصویر ہے جنہیں مبارکباد دی جا رہی ہے۔ کچھ لوگوں کو تصویر کا بغور معائنہ کرنے کے بعد خود

کو تصویر کھینچنے والے فوٹو گرافر سے بند لفظوں میں بھی یہ شکایت پیدا ہوگئی کہ اس نے ان کی تصویر کھینچنے میں پیشہ ورانہ مہارت کا ثبوت نہیں دیا ہے اور ان کا چہرہ آڑا ٹیڑھا کر دیا ہے یا گردن زیادہ لٹک گئی ہے۔لہٰذا انہوں نے نئی تصویر کھنچوانے کا فیصلہ بھی کر لیا۔

آخر کار ان پندرہ لوگوں نے یک زبان ہو کر اس ڈمی کو منسوخ کر دیا اور لمبائی چوڑائی میں اس سے زیادہ بڑی ہورڈنگ پر آنے والے خرچ کا تخمینہ لگایا گیا۔ پھر جب کارپوریشن سے اتنی بڑی ہورڈنگ کے کرایے کے بارے میں معلومات کی گئی تو ایک ہفتہ کا کرایہ سن کر ہی سب فکر مند ہو گئے۔تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد یہ طے پایا کہ پارٹی کے لیڈر پریم بابو جنہیں بدھائی دی جا رہی ہے ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا جائے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ پریم بابو اس معاملے میں مدد کر سکتے ہیں۔ان سے درخواست کی جائے کہ کچھ رقم وہ پارٹی کے فنڈ سے دلوا دیں تا کہ کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے۔کم سے کم کارپوریشن کا کرایہ ہی مل جائے۔ طے پانے پر ان پندرہ لوگوں میں سے پانچ لوگ اس کام کے لیے پریم بابو سے ملے لیکن پریم بابو نے ان کاریہ کرتاؤں کو یہ کہہ کر ٹکا سا جواب دے دیا کہ اگر اپنے خرچ سے آپ لوگ ایک ہورڈنگ بھی نہیں بنوا سکتے وہ بھی اپنے نیتا کے جنم دن کے موقع پر تو پھر آپ لوگ اپنے گھر بیٹھیں راج نیت کرنے کیوں نکل پڑے ہیں۔ کیونکہ راج نیت میں تو دامے قدمے سخنے جیسی ضرورت ہو ویسا کرنا پڑتا ہے۔

سڑک پر ابھی بھی دور تک جام لگا ہوا تھا۔لڑکا کار کی موٹر بند کر کے اسٹیرنگ پر سر رکھے اپنے باپ کی پرسکون اور اکتا دینے والی یکسانیت سے لبریز زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔لڑکے نے باقاعدہ جنزل ازم کی ڈگری لی تھی۔ کم عمری میں شاطر دنیا میں جینے کے گر سیکھے تھے۔ جیسے جیسے اس کا بوڑھا باپ بغل میں بیٹھا ٹھہرے ہوئے ٹرافک کے درمیان اسے ہورڈنگ تیار کرنے والی روداد بیان کرتا رہا۔ بیٹے کو لگا کہ اس کے ذہن میں پڑی کچھ گانٹھیں اپنے آپ کھل رہی ہیں۔اسے معلوم تھا کہ جس طرح صنعتی سرگرمیوں میں ہورڈنگ کا بازار گرم ہے اسی طرح سیاست بھی ایک صنعت بن گئی ہے اور یہاں بھی مقابلہ آرائی ہو رہی ہے۔اسے معلوم تھا پارٹیوں کے اندر بھی ممبروں کے اپنے اپنے مفادات کے مدنظر چھوٹے چھوٹے گروہ بن جاتے ہیں اور ان کے درمیان آپسی رنجشوں کے مخفی کھیل تماشے چلتے رہتے ہیں۔ بڑے تو بڑے چھوٹے شہروں میں بھی چھوٹے پیمانے پر ہی سہی مگر ہوتا سب کچھ ہی ہے۔

باپ کو ہورڈنگ والے اس پرانے قصے سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس کا بیٹا اس بیان میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے اور بار بار کرید کر سوالات کیوں کر رہا ہے، مجبوراً اس نے بیٹے کے مزید استفسار پر بددلی کے ساتھ اس قصے کو یوں آگے بڑھایا۔

بیس لوگوں کا وہ گروہ جو پانچ لوگوں کے باہر ہو جانے پر اب پندرہ لوگوں کا رہ گیا تھا۔ ہورڈنگ کے معاملے کو کھٹائی میں پڑتے دیکھ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ انہوں نے آپسی میں جلدی جلدی ایک دوسرے کو فون کرنا اور ملنا شروع کر دیا۔ پھر ان پندرہ میں سے پانچ لوگ آپس میں جلدی جلدی ملنے اور ہورڈنگ کے مسئلے پر بات کرنے لگے اور پھر آپس میں پانچوں ایک تجویز پر متفق ہو گئے۔ ان لوگوں نے طے کیا کہ اب باقی دس لوگوں کی میٹنگ بلائی جائے اور ان پانچوں میں سے سب سے سینئر ممبر آپس میں منظور شدہ تجویز کو باقی لوگوں کی منظوری کے لیے پیش کرے۔ جب پورے پندرہ لوگ جمع ہو گئے تو یہ تجویز رکھی گئی کہ ہورڈنگ کے خرچ کی ادائیگی کے معاملے میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو ممبر جتنی رقم آسانی سے دے سکتا ہے دے دے اس کے بعد جو بھی رقم بچے گی اس کی ادئیگی وہ پانچ ممبر اپنی جیب سے ادا کریں گے جنہوں نے وہ میٹنگ بلائی تھی۔ مگر شرط اس کی یہ ہوگی کہ ان پانچ ممبروں کی تصویریں باقی دس ممبروں کے تصویروں سے چار انچ لمبی اور چار انچ چوڑی لگائی جائیں گی۔ ان دس لوگوں میں سے تین لوگ تو اس تجویز پر راضی ہو گئے مگر سات ممبروں نے مخالفت کی۔

ان کا کہنا تھا کہ چار انچ کی لمبائی چوڑائی بہت زیادہ ہے اس کو ڈیڑھ انچ کر دیا جائے کیونکہ پریم بابو کی تصویر تب اور بھی بڑی بنوانا پڑے گی۔ پھر باقی لوگ تو ہورڈنگ پر دکھائی ہی نہ دیں گے۔ ان میں دو لوگ خاصے برہم تھے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ سب کی تصویریں برابر سائز کی ہوں اور یہی نہیں بلکہ سب برابر برابر پیسے بھی ادا کریں۔

پندرہ لوگوں کی فہرست میں وہ پانچ لوگ جو زمانہ دیکھے ہوئے تھے انہوں نے آپس میں یہ تو طے کر لیا تھا کہ ہورڈنگ میں دس لوگوں سے زیادہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے کہ خرچ زیادہ آ رہا تھا۔ انہوں نے بڑی رازداری کے ساتھ ان دو لوگوں کو جب سب سے زیادہ ناراض تھے اپنی طرف یہ کہہ کر ملایا کہ انہیں گروہ بندی کرنا ہے یا ہمارے ساتھ مل کر چلنا ہے۔ باقی تین ممبر ہوا کا رنگ دیکھ کر نئی شرائط کے مطابق ہورڈنگ میں اپنی تصویریں شامل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس طرح ہورڈنگ میں تصویر لگوانے والے دس ممبروں کا ایک گروہ تیار کر لیا گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ ایسے پانچ لوگ جو ہورڈنگ میں شامل نہیں کیے گے ہیں ان سے کیا کہا جائے تا کہ وہ بددل نہ ہوں۔ ابھی اس بات پر غور ہو ہی رہا تھا کہ جن کی تصویریں ہورڈنگ میں لگائی جانا طے ہو گیا تھا ان میں سے ایک نوعمر ممبر نے ایک نوجوان مہیلا کاریہ کرتا کی تصویر لا کر دی اور کہا کہ اس تصویر کو جیسے بھی ہو ہورڈنگ میں ضرور شامل کیا جائے کیونکہ مبارکباد دینے والوں میں کسی خاتون کی نمائندگی نہیں ہو پائی ہے جو بہت ضروری ہے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور پریم بابو کی جنم دن کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی اس لیے اس نئے شوشے نے ان دس ممبروں کو الجھن میں ڈال دیا جو سارا معاملہ آپس میں طے کر چکے تھے۔ پھر اس مہیلا کی تصویر کو دیکھ کر کئی ممبروں نے کانوں پر ہاتھ بھی رکھ لیے کہ اس کو تو کسی حال میں بھی شامل نہ کیا جائے گا۔ وہ لڑکا جس نے اس تصویر کی سفارش کی تھی گھبرایا ہوا اس ممبر کے پاس گیا جس کا نام رام بھروسے تھا۔ رام بھروسے ان پانچ لوگوں میں سے ایک تھا جنھیں ابھی خبر نہ تھی کہ وہ ہورڈنگ میں شامل نہیں ہے۔ مہیلا کی تصویر ہورڈنگ میں لگوانے کے لیے وہ خود سامنے نہیں آیا تھا بلکہ اس لڑکے کو آگے کر دیا تھا۔ لڑکے نے بتایا کہ ممبروں نے اس تصویر کو شامل کرنے سے منع کر دیا ہے۔ یہ سن کر رام بھروسے کو اب خود سامنے آنا پڑا۔ اس نے سینئر ممبروں میں سے پانچ سب سے سینئر ممبروں سے اس سلسلے میں ملاقات کی تو اسے معلوم ہوا کہ جس عورت کی وہ سفارش کر رہا ہے وہ تو دور رہی خود اس کی تصویر بھی اب ہورڈنگ میں شامل نہ ہوگی تو رام بھروسے آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کو انگلی ٹیڑھی کر کے گھی نکالنے کی تعلیم کے علاوہ کوئی اور تعلیم بھی نہیں ملی تھی۔ وہ سیدھا نیتا پریم بابو کے پاس پہنچ گیا جن کے جنم دن پر وہ ہورڈنگ لگائی جانے والی تھی۔ یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ رام بھروسے دیکھتے ہی دیکھتے پریم بابو کا خاص آدمی بن گیا تھا۔ پریم بابو نے کہلوا دیا کہ لڑکی کی تصویر کی سفارش وہ بھی نہیں کر رہے ہیں لیکن رام بھروسے کو بدھائی دینے والوں میں ضرور شامل کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لڑکا جو مہیلا کی تصویر لے کر آیا تھا اسے دس لوگوں کی حتمی فہرست میں سے ہٹا کر رام بھروسے کو اس کی جگہ شامل کر لیا گیا۔

ٹرافک ابھی جام تھا۔ اکتا دینے والے انتظار کی کیفیت کو بہلانے کے خیال سے بیٹا اشتیاق سے باپ کی باتیں ابھی تک سن رہا تھا لیکن اب اسے لگا جیسے دھیرے دھیرے اس کے منہ میں تلخی سی گھلتی جا رہی تھی۔ دھیرے سے پوچھا۔

''وہ ہورڈنگ بنوانا آپ کی ذمہ داری تھی نا۔''

''وہ کیا۔ جب بھی کوئی ہورڈنگ بننا ہوتی تھی میں ہی بنواتا تھا۔ باپ نے بتایا تو بیٹے کے منہ میں تلخی کا احساس اور بڑھ گیا، بدمزہ ہو کر پوچھا۔'' تو آپ رام بھروسے کی تصویر لے کر پینٹر کے پاس گئے ہوں گے۔ لڑکے کی تصویر ہٹوائی ہوگی اور رام بھروسے کی تصویر لگوائی ہوگی۔''

''اور کیا۔'' باپ نے بتایا۔'' میں نے تو اسی دن ہی پینٹر کو کام کرنے سے روک دیا تھا جس دن رام بھروسے نے مہیلا کی تصویر شامل کرنے کے لیے کچھ ممبروں سے ہاتھا پائی کی تھی۔ رام بھروسے معمولی نہیں بہت زور پشت آدمی تھا۔''

''اچھا تو ہورڈنگ کا کام ٹھیک سے ہو گیا؟'' بیٹے نے سوال کیا۔ باپ نے فوراً جواب دیا۔

''کیوں نہیں ہوتا۔ ہورڈنگ بنوانا، پوسٹر چھپوانا، پارٹی کے ہینڈ بل بنوانا یہ سارے کام میرے ہی ذمے رہا کرتے تھے۔''

''چلیے ساتھ خیریت کے وہ ہورڈنگ آخر کو تیار ہوگئی۔'' بیٹے نے مضحکہ خیز انداز میں بات کا خاتمہ بالخیر کیا لیکن باپ جلدی سے بولا۔

''ساتھ خیریت کے کہاں تیار ہوئی۔'' یہ کہہ بوڑھے باپ نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اس ہورڈنگ نے دو جانیں بھی لے لیں۔''

''دو جانیں لے لیں۔ کیسے؟'' بیٹے نے حیرانی سے سوال کیا تو باپ نے بتایا۔

ہوا یہ کہ جن ممبروں نے اس عورت کی تصویر ہورڈنگ میں شامل کرنے کی مخالفت میں سب سے زیادہ شور مچایا تھا وہ دو ممبر رام بھروسے کی نظروں میں چڑھ گئے۔ ادھر وہ عورت جس کی تصویر رام بھروسے کے یقین دلانے کے بعد بھی ہورڈنگ میں شامل نہیں ہوئی تھی رام بھروسے اس کی نظروں میں گر گیا۔ کئی لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ وہ عورت رام بھروسے کی رکھیل ہے اور اس سے پہلے روہتک میں ایک بدمعاش کے پاس بھی رہ چکی تھی اور رام بھروسے نے اسے سیاست میں لے آنے کے لبھاؤ نے خواب بھی دکھا رکھے تھے۔ پھر اس عورت نے رام بھروسے کے ہی کہنے پر لپ اسٹک سجانا، کاجل سرمہ لگانا، بھڑکیلے کپڑے پہننا چھوڑ کر پتلی کناری کی سفید ساڑی پہننا، سیدھی سیدھی کنگھی کرنا اور پوری آستین کا بلاؤز پہننا شروع کر دیا تھا، جب اس عورت کو پتا چلا کہ رام بھروسے کو اس کی تصویر کے معاملے میں کامیابی نہیں ہوئی تو اس نے فوراً رام بھروسے سے پوچھا۔

''تم تو ان لوگوں کو بھڑوا کہتے تھے۔''

''ہاں۔ لیکن ہار گیا۔ تمہاری تصویر نہیں لگوا پایا۔''

''ہارنا کوئی بری بات نہیں لیکن ہار کر بیٹھ رہنا برا ہے۔'' عورت نے اسے سمجھایا مگر خود رام بھروسے بھی یہ بات خوب جانتا تھا، اس لیے رام بھروسے کی شکست کا وہ واقعہ اندر ہی اندر پکتے پکتے ٹیس دیتا ایک پھوڑا بن گیا۔ وہ دو لوگ جن سے رام بھروسے کی ہاتھا پائی ہوئی اور جنہوں نے یہ بھی دیکھا کہ رام بھروسے ان دس لوگوں میں شامل کر لیا گیا جنہیں چوراہے پر لگی ہورڈنگ میں چمکنا بھی تھا اور جہاں سے وہ خود دونوں باہر نکال دیئے گئے تھے۔ اسی روز سے رام بھروسے کے دشمن ہو گئے تھے۔ رام بھروسے کو ایک دن اس کی رکھیل نے بتایا کہ وہ دو لوگ رام بھروسے کی مخالفت میں پوسٹر چھپوا کر شہر میں لگانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اپنی معشوقہ سے یہ انتباہ سن کر رام بھروسے کی وہ رگ پھڑک اٹھی جس سے وہ خود بھی ڈرتا تھا اور اس رگ کو ادھر کچھ دنوں

سے دبائے رہنے کا جتن بھی کرتا رہتا تھا۔ پوسٹر والی خبر سن کر کئی روز تک وہ سکون سے سو نہ سکا آخر کو شہر کے چوراہوں پر جس دن مبارکباد کی ہورڈنگ لگائی گئی اس سے ایک روز پیشتر رام بھروسے کے وہ دونوں دشمن رات ایک دعوت سے واپسی پر کار کے سڑک حادثے میں مارے گئے۔

باپ نے اپنی بات ختم کی تو اس کا ذہن پھر اس ٹرافک جام کی طرف لوٹ آیا جہاں وہ بیٹے کے ساتھ پھنسا ہوا تھا۔ وہ ادھر ادھر جھانکتے ہوئے سڑک کی صورت حال کو ٹٹولنے لگا۔ بیٹے نے کچھ تھکاوٹ اور بے دلی کے ساتھ محسوس کیا کہ اس کے باپ کے ذریعے بیان کیا جانے والا واقعہ ایک ٹھہرے ہوئے ٹرافک جام کی طرح اکتادینے والا ہے اس لیے وہ تلملا کر بولا۔

''جن کی تصویر کو اس ہورڈنگ میں جگہ نہیں ملی ان میں سے بلاشبہ ایک آپ بھی رہے ہوں گے۔''

''میں؟'' بوڑھے نے سوال کیا۔

''ہاں آپ؟ اس لیے کہ......'' اس نے آگے کچھ کہنے سے خود کو روک لیا دراصل وہ باپ کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ دنیا میں زیادہ تر لوگ ہورڈنگ سے باہر رہنے کے لیے ہی پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک وہ بھی ہیں لیکن اس کے بجائے باپ سے اس نے آہستہ سے سوال کیا۔

''کبھی آپ کو بھی خیال آیا کہ ہورڈنگ پر آپ کی بھی تصویر ہو؟''

''نہیں کبھی خیال نہیں آیا۔'' باپ کا جواب سن کر بیٹے منہ کا مزہ خراب ہوگیا۔ آخر کو وہ اس کا بیٹا تھا باپ کی گزشتہ زندگی کے بڑے حصے سے خوب واقف تھا بہت یاد کرنے پر بھی اس کو کبھی ایسی کوئی بات یاد نہیں آئی جس کو اس کے باپ کی زندگی کا بڑا کارنامہ کہا جاتا۔ وہ ہمیشہ سے ہی بیٹے کی آنکھوں میں ایک معمولی باپ سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔

''بڑے کارنامے بڑے لوگوں کے لیے ہوا کرتے ہیں۔'' بیٹا دل ہی دل میں بڑبڑایا اسی وقت اس کے باپ کی آواز آئی۔

''اب میں تم سے کیا بتاؤں۔ کبھی کبھی ایسا ہوا کہ تمہاری ماں لپ اسٹک وغیرہ لگا کر کسی پارٹی میں گئی، واپس آکر بستر پر لیٹی تو تکیے غلاف پر لپ اسٹک کا نشان لگ گیا۔ پھر جانتے ہو کیا ہوا؟ جب تک وہ غلاف بدل نہیں دیا گیا میں نے اس پر سر نہیں رکھا۔''

''کیوں؟'' بیٹے نے سوال کیا مگر باپ نے سوال پر توجہ دیئے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہاں دیکھو ابھی ابھی یاد آیا میں ایک دن سفید براق قمیض پہن کر دفتر گیا۔ جیب میں لگا ہوا قلم اتفاقاً کھل گیا۔ قمیض پر روشنائی کا دھبہ پڑگیا۔ پھر تو دفتر میں وقت کاٹنا مشکل ہوگیا۔ فوراً گھر واپس آکر قمیض بدلی اور تب واپس دفتر گیا۔

باپ کی باتیں سن کر بیٹے نے الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ باپ کو گھور کر دیکھا اور پوچھا۔
''لیکن یہ باتیں آپ کو اس وقت کیوں یاد آ رہی ہیں؟ میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔''
''تم کو یاد ہے نا؟'' باپ نے اپنی بات جاری رکھی۔ میرا خیال ہے تم کو ضرور یاد ہوگا۔ گھر میں جھاڑو پوچھا کرنے والی سے کمرے کے فرش کا جب کوئی داغ صاف ہونے سے رہ جاتا تو میں اس پر کتنا چلاتا تھا۔ بیچاری رو پڑتی تھی۔ یاد ہے نا؟''
''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔'' جواب میں باپ تھوڑا شرماتے ہوئے بولا۔
''دراصل میں داغ دھبوں سے بہت ڈرتا اور گھبراتا تھا۔''
'داغ دھبے؟'' بیٹے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔
''ہاں- کیونکہ آدھ بار ایسا بھی ہو چکا تھا کہ میں نے چمچماتی ہوئی صاف ستھری تصویروں کے ساتھ بڑی سی شاندار ہورڈنگ بنوائی اور پھر بہت بڑے اور مصروف ترین چوراہے کے کنارے بلندی پر اس کو نصب کرایا، لیکن صبح دیکھا تو ہورڈنگ کے بعض خوبصورت اور وجیہ چہروں پر تارکول پھرا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر باپ کچھ ایسا آبدیدہ ہوگیا کہ اس نے بیٹے سے نظریں نہ ملائیں۔ اس وقت بند سڑک پر بیتابی سے ہارن بجنے لگے کیونکہ دیر سے رکا ٹرافک کھل گیا تھا۔

آصف فرخی

سمندر کی چوری

ابھی وقت تھا۔ پانی اور آسمان کے بیچ میں روشنی کی وہ پہلی، کچی پکی، تھرتھراتی ہوئی کرن پھوٹنے بھی نہ پائی تھی کہ شہروالوں نے دیکھا سمندر چوری ہو چکا ہے۔ دن نکلا تھا نہ سمندر کے کنارے شہر نے جاگنا شروع کیا تھا۔ رات کا اندھیرا پوری طرح سمٹا بھی نہیں تھا کہ اندازہ ہونے لگا، ایسا ہو چکا ہے۔ ملگجے سایوں میں لپٹی دو اور تین منزلہ فلیٹوں کی قطار اور اس کی حد بندی کرنے والی دو رویہ سڑک کے پار جہاں دوسری طرف سمندر ہوا کرتا تھا، دور تک پھیلا ہوا نیلا سفید سمندر، وہاں سب خالی پڑا تھا۔ سمندر کی جگہ بڑا سارا گڑھا تھا اور چٹیل زمین جس پر جھاڑیاں تھیں نہ گاڑی کے ٹائروں کے نشان بلکہ سطح جگہ جگہ سے تڑخ کر ٹوٹی ہوئی تھی، جس طرح بہت دیر تک پانی میں بھیگے رہنے کے بعد ڈوبی مٹی کی سی حالت ہو جاتی ہے۔

باقی سارے منظر کی جزئیات وہی تھیں۔ جب تک غور سے دیکھا نہ جائے اس میں چونکا دینے والی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی۔ دن اپنے اسی معمول کے ساتھ آہستہ آہستہ نکلنا شروع ہو چکا تھا، اس میں پہلے پہل سمندر کی کمی محسوس ہی نہیں ہوئی۔ اس لیے شاید کسی نے کچھ کیا بھی نہیں۔ راتیں رنگین کرنے والے موٹروں میں واپس آنے لگے تھے اور صحت کا مراق کرنے والے، صبح سویرے بھاگنے دوڑنے کے لیے گھر چھوڑنے والے گھروں کے دروازے کھولنے لگے تھے۔ کھلے ہوئے ٹرکوں اور کھڑکھڑاتی سائیکلوں پر برتن لادے، دودھ والے اپنے لگے بندھے ٹھکانوں پر دودھ پہنچانے کے لیے پیدل مارتے ہوئے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ دھن کے پکے ان لوگوں میں سے ایک آدھ کی نظر پڑ گئی ہوگی تو اس نے سوچا ہوگا، آج صبح کہر بہت ہے، سمندر دھند میں لپٹا ہوا ہے۔ شہر میں سردی بڑھ جائے گی جب تک دھوپ نہ نکلے، یہ سوچ کر اس نے مفلر یا چادر میں ہاتھ اور منھ چھپا لیے ہوں گے۔ ایک طرف پہنچنے کی جلدی ہو اور سر، منہ لپیٹ لیے جائیں تو سمندر کو نظر انداز کرنا ممکن بھی ہو جاتا ہے۔ سمندر جو شہر کے سامنے پاؤں پسارے ریت پر اوندھا ہوا تھا اور آناً فاناً نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔

سمندر آنکھوں سے اوجھل...... شہر کا کوئی ایک آدمی صبح ہوتے ہوتے چونکے تو چونکے۔ روشنی پھیلنے لگی

تو سمندر کا وہاں نہ ہونا، دکھائی دینے لگا، لیکن دکھائی دینے سے پہلے آپ اسے سن سکتے تھے۔ اس پورے منظر میں سب سے زیادہ اُبھرنے، چبھنے والی چیز خاموشی تھی۔ اتنا گہرا سناٹا جس کی اپنی ایک آواز ہوتی ہے۔ مکمل خاموشی، مانو سوئی گرنے کی آواز تک آئے۔ یہ خاموشی کسی اندیشے میں پل رہی تھی۔ سینے میں دھڑ دھڑ دھڑ کتا ہوا احساس کہ وہ ہو چکا ہے جو ہونا نہیں چاہیے تھا۔ ہاں، تب اندازہ ہوتا کہ لہروں کی آواز نہیں ہے۔ اس لیے خاموشی ہے۔

سمندر میں جوار بھاٹے کا معمول...... چھپ چھپ، چھپا چھپ...... لہروں کے اٹھنے، بڑھنے، پھیلنے، ریت پر بکھرنے کی کبھی ہلکی کبھی اونچی اور مسلسل آواز جو ہزاروں سال سے جاری ہے، گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح، وقت گزرنے کی پیمائش کرتی ہوئی، شہر کی دیواروں کو نمک سے کاٹتی ہوئی، بھیگی ہواؤں میں ڈھلتی ہوئی۔ وہ اب وہاں نہیں تھی۔ اس کی جگہ خاموشی، اٹوٹ خاموشی، اتھاہ سناٹا اور سمندر دور دور تک نہیں۔

کہاں چلا گیا سمندر؟ ایسی چیز بھی نہیں کہ راتوں رات غائب ہو جائے۔ ابھی کل رات تک تو تھا، لہروں کی اچھال پر اکا دکا نہانے والے نظر آ رہے تھے اور اس کے متوازی، گیلی ریت پر قدموں سے چھپا کے کرنے والے چل رہے تھے، دوڑ رہے تھے۔ پھر کیا ہوا، بھاپ بن کر تو نہیں اڑ سکتا، آخر کو سمندر ہے۔ گزرنے والے اب رکنے لگے تھے۔ اکا دکا ٹولیوں میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تھے۔

''سمندر کو چوری کر لیا گیا ہے'' ان میں سے کسی ایک نے جوش سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور لوگوں میں تشویش خبر بن کر امڈنے لگی۔

جنگلی کبوتروں کا ایک جھنڈ فلیٹوں کے درمیان خالی زمین پر اُترا۔ بیماری سے شفایابی کی منّت ماننے والے اکثر اس طرف باجرہ بکھیر دیتے تھے کہ بے زبان پرندے دعا دیں گے تو اس میں اثر ہوگا۔ ایک نشیبی ٹکڑے میں ایک کتا دم اور ٹانگیں سمیٹ کر چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ آسمان کی کلونچ میں نیل ملتے ملتے بڑھ گیا تھا۔ نیل میں نیل۔ جہاں سمندر ہونا چاہیے تھا۔ وہاں سمندر نہیں تھا۔ ایک آدمی وہاں رُک کر کھڑا ہو گیا اور افق کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں دھوپ بالکل نہیں تھی، پھر اس نے آنکھوں پر ہاتھوں سے چھجا بنا لیا تھا۔ جیسے آنکھوں پر بہت زور ڈال کر اس طرف دیکھ رہا ہو اور کوشش کے باوجود صاف نظر نہ آ رہا ہو کہ وہاں کیا ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی وہاں اور لوگ فوراً جمع نہیں ہوئے۔ اس لیے کہ جن دوسرے لوگوں نے اس آدمی کو دیکھا ہوگا وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ بہت پرانی ترکیب ہے چلتے چلتے لوگوں کو بے وقوف بنانے کی۔ مصروف سڑک کے ساتھ کہیں کھڑے ہو جاؤ اور شفاف، نیلگوں آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر اشارے کرو، آنکھوں پر ہاتھوں سے چھجا بنا کر دیکھو اور منہ ہی منہ میں بدبدانے لگو، ذرا دیر میں ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگ جائے گا۔ سب وہی دیکھنے کی

کوشش کرنے لگیں گے جو تم ظاہر کر رہے ہو؟ بہت سے لوگ جب جمع ہو جائیں تو تم ہاتھ جھاڑ کر مسکراتے ہوئے وہاں سے آگے بڑھ جاؤ، جیسے کچھ بھی نہیں ہوا اور واقعی کچھ ہوا بھی نہیں، لیکن وہ آدمی وہاں کھڑا رہا اور اس کے بعد ایک اور، اس کے بعد ایک اور آدمی...... سمندر کسی کو نظر نہیں آیا۔

تب ان میں سے ایک پکار اٹھا، کہاں گیا سمندر۔

اس کی بات کا کسی نے جواب نہیں دیا۔

جواب دینے کے لیے تھے ہی اکا دکا لوگ۔

ادھر ہی کہیں ہوگا، نظر نہیں آرہا...... شاید ادھر ادھر اور دیکھنے کی ضرورت ہے۔ دُھند کے پیچھے نظریں جما کر، آنکھوں پر زور ڈال کر۔

لیکن سمندر ہو تو نظر آئے...... وہ وہاں نہیں تھا...... اس کے غائب ہونے پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

ان میں سے جس آدمی کی آواز سب سے پہلے الگ سنائی دی تھی، وہ ابھی تک اپنے اوپر شک کر رہا تھا۔

''کیا ہو گیا؟ دکھائی کیوں نہیں دے رہا مجھے؟''

''وہاں ہو تو دکھائی دے......'' کسی اور نے فوراً جھنجھلایا ہوا جواب دیا۔

''ایسا ہو سکتا ہے؟ یوں...... اس طرح...... اچانک...... سارے کا سارا سمندر؟'' کئی آوازوں میں حیرت نمایاں تھی۔

''واقعی، راتوں رات...... پورا سمندر......'' بعض آوازیں تائید میں بلند ہونے لگیں۔

''مگر یہ نہیں ہو سکتا......'' ایک آواز نے سراسر انکار کیا تھا۔

''لیکن ہو گیا......'' کسی نے اس کو ٹوک دیا۔

''یہ یقیناً بڑی تباہی کی علامت ہے......'' ایک آواز واضح ہو کر ابھری۔ منہ ہی منہ میں بدبداتے ہوئے کئی لوگ چپ ہو گئے۔ ''ہو سکتا ہے کہ تیل کے Spill سے ایسا ہوا، Ecological Disaster یا پھر جنگ کا اثر...nuclear holocaust...'' وہ بیچ میں رک گیا۔ لوگ اس کا منہ دیکھنے لگے۔ اس نے عینک لگائی ہوئی تھی اور اس کا سر گنجا تھا۔ پھر اس کے پاس ایک توجیہہ تھی...... کچھ لوگوں کو اس کی بات قرین قیاس معلوم ہونے لگی۔ ''یہی ہوا ہوگا......''

''ایران، اسرائیل...... تو آخر جنگ یہاں تک آن پہنچی......''

''یہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا......'' ایک آدمی سب کو باور کرانے لگا۔

''لیکن یہ سب آناً فاناً کیسے ہوگیا؟ آدھی رات کے بعد تک تو میں بی بی سی نیوز دیکھتا رہا ہوں۔ اس پر تو کچھ ایسا نہیں تھا......'' ایک آدمی کو یقین کرنے میں تامل تھا۔

''اب کون سی دیر لگتی ہے؟'' ایک آدمی کندھے اچکا رہا تھا۔ ''ایک سکنڈ کے چھوٹے سے حصے میں تباہی دور دور تک پھیل سکتی ہے......'' وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے باقی لوگوں پر اپنی معلومات کا رُعب جھاڑ رہا ہو۔ اس کی آواز میں مایوسی نہیں تھی۔

یا پھر سننے والوں کو بالکل محسوس نہیں ہوئی۔ وہ ایک ٹکڑی کی صورت میں کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ اس جگہ کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں سمندر کو ہونا چاہیے تھا اور ایک دوسرے کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے، کچھ کچھ شبے کے ساتھ، پھر تجسس کے طور پر، یہ اندازہ لگانے کے لیے اگلا آدمی کیا سوچ رہا ہے، کیا محسوس کر رہا ہے۔

حالاں کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ سبھی اس طرف دیکھ رہے تھے۔ کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ کچھ لوگ پوچھے چلے جا رہے تھے۔ ان کو وہاں کھڑے دیکھ کر وہ لوگ بھی ادھر آنے لگتے جو ادھر سے گزر رہے تھے اور سمندر کو وہاں نہ پا کر رک جاتے، سراسیمہ ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگتے، جیسے وہ ادھر ادھر ہو گیا ہو اور ڈھونڈنے سے مل ہی جائے گا۔ ''کیا ہو گیا، کیا بات ہے؟'' نئے آنے والے شروع سے بات کا سرا پکڑنے کی کوشش کرتے۔

''کچھ...... کچھ نہیں ہوا۔ ہونا کیا ہے؟'' عینک والا آدمی، جس نے عالم گیر تباہی کا خدشہ ظاہر کیا تھا، ہر بار ایک ہی بات کہتے کہتے بیزار آ گیا تھا۔ ''وہاں کچھ ہو گیا ہے، اس طرف...... پتہ نہیں چل رہا......'' زیادہ زور دیے جانے پر وہ مبہم سا جواب دے کر اس طرف اشارہ کر دیتا جہاں سمندر کی جگہ زمین خالی پڑی ہوئی تھی۔

''کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے......'' وہاں جمع ہونے والے لوگوں میں سے کوئی آدمی جواب دے کر اتنا بتا تا جتنا اس وقت تک ان کی سمجھ میں آیا تھا۔ اس کے بعد ''کیا ہوا......'' اور ''کیسے؟'' کے سوالوں پر منہ سے چچ چچ کی آواز نکال کر اپنی لاعلمی ظاہر کرنے سے زیادہ کسی بات کی ضرورت نہیں رہتی۔

جو آدمی ہاتھوں سے آنکھوں پر چھجا بنائے دیکھ رہا تھا، سر ہلاتا ہوا واپس مڑا۔ اس کی قمیص ہوا میں پھٹ پھٹا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ آدمی جس نے ایک سوال کے جواب میں کندھے اچکائے تھے، ذرا سا اچک کر دیوار پر چڑھ گیا جو سڑک کے ساتھ ساتھ دور تک کھنچی ہوئی تھی۔ ''وہاں کچھ بھی نہیں ہے......'' اس نے اسی بات کی تصدیق کی جو سب کو پتہ تھی۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ریت بھی نہیں، جھاڑیاں یا پتھر بھی نہیں۔ خالی زمین، دور تک پھیلی ہوئی، چٹیل اور بنجر، اتنی خالی کہ حیرت ہونے لگتی اور وہی سوال پلٹ کر ذہن میں دہرانے لگتا...... کیا ہو گیا،

یہ سب کیسے...... اتنا بڑا سمندر ہے، آخر کہاں غائب ہوگیا۔ بھاپ بن کر اڑ تو نہیں سکتا۔ کوئی بچہ تو نہیں تھا کہ آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے چھپ گیا...... کل رات تک تو لوگوں نے دیکھا تھا، اسی طرح حسب معمول تھا۔

''سمندر کو کیا ہوگیا؟'' بڑی عمر کے ایک آدمی سے بس نہیں ہوا۔ اس نے وہ سوال پوچھ لیا جو سبھی کو اضطراب میں رکھے ہوئے۔ اس آدمی کی شلوار قمیص مسلے ہوئے تھے اور اس کی داڑھی کے چھدرے بال بڑھے ہوئے تھے۔ وہ بول اٹھا تو جیسے چیونٹی کے انڈے حرکت میں آگئے۔ ''کہاں چلا گیا، کیا ہوگیا؟'' اس نے پوچھا۔

کندھے اچکانے والا آدمی جو عینک والے آدمی کا سہارا لے کر سمندر کی دیوار پر چڑھ گیا تھا، اس دیوار کے اوپر چند قدم چلتے جانے کے بعد واپس مڑا اور وہیں اوپر سے جواب دینے لگا، حالانکہ سوال اس سے نہیں کیا گیا تھا۔ ''سمندر چوری کر لیا گیا ہے!''

اس نے اطلاع دیتے ہوئے بورڈ کی طرف اشارہ کیا جو دیوار کے اوپری حصے میں لگا ہوا تھا۔

دن چڑھے وہاں سناٹا چھا جاتا تھا...... یعنی جب وہاں سمندر موجود تھا۔ صبح سویرے سمندر کے ملاقاتی رخصت ہو جاتے اور دن کی دھوپ تیز ہونے لگتی تو اس کی تپش، سیر تفریح کے مقصد سے آنے والوں کے لیے خوش گوار نہ ہوتی اور وہ عموماً شام گئے آنا پسند کرتے۔ تب وہ جگہیں پھر سے بھرنے لگتیں اور وہاں رونق ہو جاتی۔ خوش طبع، لطف اندوز ہونے والے ہجوم کی بھری پری رونق جو سمندر کے دم قدم سے تھی...... لیکن اس وقت بھی وہاں لوگ اکٹھے ہونے لگے تھے اور وہ سب اس طرح کھڑے تھے یا چھوٹی بڑی ٹولیوں میں باتیں کر رہے تھے جیسے آس پاس کے کسی مکان میں میت ہوگئی ہو اور محلے کے لوگ اس خبر کے ملتے ہی وہاں اکٹھا ہو گئے ہوں۔ جیسے وہ سب سمندر کا پرسا دینے آئے تھے۔

اب انہیں پتہ چل چکا تھا اور ان سے اور لوگوں کو۔ اس لیے ایک آدھ وارد کو چھوڑ کر کوئی یہ نہیں پوچھ رہا تھا کہ کیا ہوا بلکہ اس کے بعد کا سوال کہ کیسے اور کس طرح۔

اس بات کا جواب کسی کو نہیں معلوم تھا۔ سوائے اس کے کہ سمندر اب وہاں سے رخصت ہو چکا ہے۔

''خدا جانے کہاں اور کیسے؟'' سوال یہی تھا اور اس کا جواب کسی کو معلوم نہیں تھا۔ وہاں جمع ہونے والے لوگ یہی باتیں کر رہے تھے۔ لوگ بڑھتے جا رہے تھے، لیکن وہ سب کو وہی کر رہے تھے جو اس وقت جمع ہونے والے لوگوں نے کیا تھا جب زیادہ لوگ جمع نہیں ہوئے تھے...... ایسے جملوں کا تبادلہ کہ کیا ہو چکا ہے۔ اس وقت بولنے والے تھوڑے بہت پہچانے جا رہے تھے۔ وہ لوگ جہاں سے آئے تھے اور جس طرح کے تھے، اسی حساب سے کر رہے تھے باتیں باتیں۔

بہت دور تک جا رہی تھیں یہ باتیں۔ تین ٹانگوں والا اسٹینڈ اتنی سی صاف جگہ پر جما کر ایک نوجوان نے کیمرہ ٹکا دیا تھا اور کوئی بھی جو کچھ کہنا چاہتا، اس کے سامنے آنا چاہتا اس کے تاثرات ریکارڈ کر رہا تھا۔ یقیناً یہ کسی غیر ملکی چینل کا مقامی نمائندہ ہوگا۔ جو بھی اس طرف آتا، نوجوان اس طرف منہ کے سامنے لے آتا کہ پس منظر میں وہ خالی جگہ ہوتی جہاں پہلے سمندر تھا اور اب خالی زمین، جس پر فریز کیا ہوا کیمرہ شاٹ اور اس کے وائس اوور میں آوازیں......

''اس شہر میں کھلی جگہوں، تفریح گاہوں کی سخت ضرورت ہے۔'' ایک عمر رسیدہ صاحب بول رہے تھے۔ انہوں نے کھلے گریبان کی قمیص کے اوپر کوٹ پہنا ہوا تھا اور اپنی جچی تلی انگریزی کی وجہ سے وہ ریٹائرڈ بیورو کریٹ لگ رہے تھے جن کو نوکری پوری کرنے کے بعد ڈیولپمنٹ اشوز کے حق میں بات کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ ''لینڈ گریبنگ یہاں ایک باقاعدہ مافیا بن گئی ہے۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ سیاست اور دولت اس کی مدد کرتی ہیں۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اسٹیٹ بھی اسی زبردستی پر یقین رکھتا ہے۔ اسٹیٹ خوف مافیا میں تبدیل ہونے لگتا ہے اور پھر دوسروں سے بڑھ کر استحصال، ری سورسز، کو ہڑپ ...... یہ سمندر تو سارے شہر کا تھا، کسی خاص طبقے کی ملکیت نہیں......''

''ہم کینڈل لائٹ وجل کریں گے سمندر کی یاد میں۔ ہم امن مارچ کریں گے۔'' ایک خاتون بالوں کو جھٹک کر جوش کے عالم میں بول رہی تھیں۔ ان کے ناخن رنگے ہوئے تھے اور لپ اسٹک کا رنگ دانتوں پر لگ گیا تھا۔ ان کا لباس کاٹن کا تھا اور دونوں بازوؤں میں دھات کی چوڑیاں۔

بھڑک دار ٹی شرٹ پہنے ہوئے اور سیاہ چشمہ آنکھوں سے اوپر کر کے ماتھے پر چڑھائے وہ نوجوان اسٹھنک لک رکھتا تھا۔ ''یہ تفریح گاہ سے بڑھ کر ہے۔ اس پر لاکھوں افراد کے روزگار کا دارومدار ہے۔ یہ ماہی گیر کہاں جائیں گے جو سمندر کنارے کی پرانی بستیوں میں آباد ہیں۔ حکومت ان کے لیے متبادل روزگار کا بندوبست کرے......'' اس کی آواز احوال واقعی سے بڑھ کر مطالبے کی فہرست میں بدلنے لگی۔

''یہ ماحول کا قتل ہے۔ یہاں میگروو کے نیچرل ذخیرے ختم ہو جائیں گے۔ ساری وائلڈ لائف...... بہت نازک سا ماحولیاتی توازن ہے ان کے اور انسانوں کے درمیان۔ ایک تباہ ہوگا تو دوسرا زندہ اور برقرار نہیں رہ سکے گا......'' ایک ایکٹی وسٹ کیمرے کے سامنے دو انگلیاں نچا کر وی کا نشان بنا رہے تھے۔ ان کی انگلیوں کے درمیان خلا میں پورے اسکرین پر ویران زمین ہل رہی تھی، سرک رہی تھی۔ کیمرے کے غیر ماہرانہ انداز کی وجہ سے جیسے جھٹکے لے رہی تھی۔

''آپ لوگوں کو آرگنائز ہونا چاہیے۔ ہمیں ہاتھ میں ہاتھ ملانا چاہیے......'' ایکٹی وسٹ، اسٹھنک

نوجوان سے کہہ رہے تھا اور اسمارٹ نوجوان این جی او کی نمائندہ خاتون سے۔ ''ہمیں امن مارچ کرنا چاہیے چندریگر روڈ سے پریس کلب تک......''

''سب سے پہلے ہمیں ایف آئی آر درج کرانا چاہیے......'' بھاری آواز والے ایک صاحب نے کہا جو کالا کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ غالباً نہیں یقیناً وہ وکیل ہوں گے۔

ان کی آواز سنتے ہی جیسے مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ واقعی یہ تو بہت ضروری تھا۔ اس سے پہلے مجمع میں یہ کسی نے کہا کیوں نہیں تھا؟

''بھئی سب سے پہلے تباہی کی حد کا تو اندازہ لگایئے......'' بڑی عمر کے سفید بالوں والی معزز شکل صورت کی ایک خاتون کی آواز ابھری۔ ان کی آواز پاٹ دار تھی۔ ٹیچر رہی ہوں گی۔ انہوں نے وکیل معلوم ہونے والے آدمی کا جملہ اور مجمع کی خاموشی سنی نہیں تھی۔ اونچا سنتی ہوں گی۔ وہ اپنی تجویز اسی جوش و خروش سے پیش کر رہی تھیں جو ان کی ہر بات کا معمول بن گیا تھا۔ ''پہلے پتہ تو کیجیے کہ یہ صرف یہاں ہوا ہے جو سمندر غائب ہو گیا یا اور جگہوں پر بھی ایسا ہوا ہے......ابراہیم حیدری، کورنگی اور سب سے بڑھ کر کیماڑی۔ اصل اندازہ تو کیماڑی پر ہوگا۔ آپ میں سے کسی نے رابطہ کیا ہے وہاں کے لوگوں سے؟ کچھ کنفرم کیا ہے؟''

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''ایف آئی آر درج کرانا بہت ضروری ہے۔ بات ریکارڈ میں آ جاتی ہے......'' وکیل صاحب مجمع کو باور کرا رہے تھے۔

''ریکارڈ پر آ جائے تب بھی کیا ہوگا؟ ہمارے گرد گھیرا تنگ کیا جاتا رہا......'' اسمارٹ نوجوان کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

''آپ لوگ طے تو کیجیے، ایک ساتھ ہو کر چلیے، اتحاد میں بڑی طاقت ہے۔'' وکیل نما صاحب کی آواز میں جوش بہت تھا۔

''لیکن کس تھانے میں؟ یہ علاقہ تو درخشاں کے تھانے میں لگتا ہے، لیکن اصل میں جیکسن تھانے جانا چاہیے......''

''پولیس میں نہیں بلکہ پورٹ اتھارٹیز کو رپورٹ کرنا چاہیے۔''

''آپ کی مراد شاید کوسٹ گارڈز سے ہے......اجی، وہ کیا کر لیں گے؟ اسمگل کی ہوئی شراب کے علاوہ ان کو دلچسپی اور کس بات سے ہے؟'' ایک آواز ابھری اور ہجوم میں غائب ہو گئی۔

''بھئی کسی نہ کسی کے پاس تو جانا چاہیے......''

''پولیس رپورٹ......''

''ایف آئی آر......''

آوازیں ایک ساتھ بلند ہو رہی تھیں، ایک دوسرے میں رل مل رہی تھیں، ایک دوسرے کو کاٹ رہی تھیں۔

''لیکن درج کس کے خلاف کرائی جائے؟'' ایک آواز بیچ میں سے ابھری۔ اس کو صاف پہچانا نہیں جاسکتا تھا کہ یہ آواز کس کی ہے۔

''ذمہ دار کون ہے؟ کسی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانا ہوگا......'' یہ آواز اپنے آپ کو چھپانے یا ہجوم میں گم کرنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ یہ شاید سفید بالوں والی ان معزز خاتون کی تھی جو کبھی ٹیچر رہی ہوں گی۔

''مگر یہ کس کی طرف سے ہو؟ اس کی چوری سے نقصان کس کا ہوا ہے؟ سمندر کس کا ہے اور اس کا دعوے دار کون......''

یہ آواز فوراً پہچانی نہیں جاسکی کہ ایتھنک نوجوان کی تھی یا ایکٹی وسٹ کی۔ یا پھر کسی اور ہی آدمی کی آواز۔ لیکن اس کے بعد مجمع میں ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ جیسے اس نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جس کی طرف اس سے پہلے کسی نے دھیان ہی نہ دیا ہو، لیکن پھر فوراً ہی بولنے لگے، وہ سب بولنے لگے باتیں باتیں...... ایک دوسرے سے، آپس میں، سامنے والے سے، برابر والے سے، دو آدمیوں کی دوری پر کھڑے ہوئے آدمی سے پھر اس کے ساتھ والے سے وہاں جمع ہونے والے لوگوں کی بھیڑ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ گئی، لوگ الگ الگ ہونے لگے لیکن وہیں کھڑے رہے، بولتے رہے...... شہر...... سمندر، سمندر......

چوری کے بعد لوگ سمندر کو یاد بہت کر رہے تھے۔ جیسے وہ لڑکی...... ایک جیسی، منمناتی آواز میں بولے چلے جا رہی تھی وہ لڑکی...... ''سمندر کنارے ابا سیر کرانے کے لیے لے جاتے تھے۔ میں چھوٹی سی تھی۔ کلفٹن تک ہم بس میں آیا کرتے تھے۔ صبح سے تیاری کرتے، دو تین طرح کے کھانے پکا کر اماں پوٹلی میں باندھ لیتی تھیں اور پوٹلیاں، بید کی ٹوکری میں رکھ کر چلتے تھے۔ کلفٹن پر میں اونٹ کی سواری ضرور کرتی تھی۔ پہلی دفعہ جب اونٹ پر بیٹھی اور اونٹ اوپر اٹھا تو میں نے گھبرا کر چیخ ماری...... اونٹ والا آگے چل رہا تھا اونٹ کی رسی تھامے اور ساتھ ساتھ سمندر، اتنا شفاف کہ بس...... سیپیوں اور کوڑیوں کے نقلی ہار اور بندے ابا خرید کر دیتے تھے اور میں ان کا ہاتھ پکڑ کر چلتی تھی۔ پانی کے ساتھ گیلی ریت پر ان کے قدموں کے نشان میں دوبارہ پانی بھرنے لگتا تھا...... ابا نہیں رہے لیکن سمندر تو تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ایک دن سمندر کا ہاتھ پکڑ سیر کرنے کے لیے نکلوں اور ابا کے قدموں کے نشان ڈھونڈوں کہ ان میں کتنا پانی بھر گیا ہے۔ سمندر نہیں رہا تو اب میں کیا

کروں، اوہ میرے ابو......"

لڑکی کی سپاٹ آواز ٹوٹ گئی اور وہ پتلی، بے جان آواز میں واویلا کرنے لگی......

بچے کے ہاتھ سے غبارہ چھوٹ گیا اور دھاگے کی لمبی دم لہراتا ہوا غبارہ سمندر کے اوپر آسمان کے سامنے اڑتا چلا گیا...... سرمئی، بادلوں بھرے آسمان کے سامنے سرخ نارنجی رنگ کا دھبہ جو اڑتے اڑتے چھوٹا ہونے لگا، چھوٹا اور چھوٹا، پھر غائب...... لیکن سمندر موجود تھا۔

"ساحل سمندر پر ہم نے ایک بار مشاعرہ کیا تھا......" ایک اور آدمی بول رہا تھا۔ اسے کسی نے اسٹھنک نہیں سمجھا ورنہ اپنی وضع قطع اور اس سے بڑھ کر اپنی بات چیت سے وہ بھی اتنا ہی اسٹھنک تھا جتنا کہ وہ نوجوان جسے ایسا سمجھا گیا تھا۔ "میں کالج میں تھا ان دنوں رات بھر محفل جمی تھی۔ لطف آ گیا تھا۔ پھر اس کے بعد جمیل بھائی ایک دن میرے پیچھے پڑ گئے، سمندر کے پاس لے چلو، مجھے سمندر کے پاس لے چلو...... موٹر سائیکل پر پیچھے لادا اور چاندنی رات میں یہیں لے آیا۔ وہ موٹر سائیکل سے اچھل کر اترے اور اسی دیوار پر چڑھ گئے۔ اے سمندر وہ ادھر منہ کر کے زور زور سے بولنے لگے، اے سمندر اتنے دن ہو گئے تو نے مجھ سے کلام نہیں کیا، میرے شعر سن اور وہ زور زور سے غزل سنانے لگے...... سمندر کیا داد دیتا، موجیں سر پٹک کر رہ گئی ہوں گی...... ہم واپس ہونے لگے تو پولیس نے پکڑ لیا۔ یہ نشے میں نہیں ہیں، یہ ایسے ہی ہیں...... میں نے پولیس کے دونوں سپاہیوں کو بڑا سمجھایا۔ یہ ایسے ہی ہیں؟ وہ شک بھری نظروں سے ہمارا جائزہ لیتے رہے۔ ہاں، ہاں یہ ایسے ہی ہیں...... سمندر کے قریب پہنچ کر تو اور بھی ایسے ہو جاتے ہیں، میں نے انہیں یقین دلایا۔ تو چلو پھر لے جاؤ ان کو...... کبھی کبھی سمندر سے ملانے کے لیے لاتے رہا کرو...... انہوں نے ہمیں چھوڑ دیا...... اب کہاں لے کر جاؤں گا؟ اب وہ کس سے کلام کریں گے اے سمندر۔"

وہ اسی طرح پتہ نہیں کب تک بولتا رہا لیکن اس سے آگے کی بات ان بہت سی باتوں سے دب گئی جو لوگ اسی طرح کیے جا رہے تھے، مسلسل، متواتر...... پھر وہ ہجوم تیزی کے ساتھ ادھر ادھر ہونے لگا۔ شاید پولیس والے جو وہاں پہنچ گئے تھے، لوگوں کو ہٹا رہے تھے۔ شاید میڈیا والے لوگوں کی اور ان کی باتوں کی لائیو کوریج کر رہے تھے۔ کیمرہ ہاتھ میں لیے اور شوٹنگ کرتا ہوا پیچھے کی طرف ہٹنے والا ایک نوجوان جس کے لمبے لمبے بال الجھے ہوئے تھے اور قمیص باہر نکلی ہوئی تھی، اس بورڈ کے سامنے قدم جمانے کی کوشش کر رہا تھا اور پولیس والے اسے روک رہے تھے۔

بورڈ دیوار کے اوپری حصے پر نصب تھا۔ اس بورڈ کی کیلوں پر زنگ نہیں آیا تھا جس سے پتہ چل سکتا تھا...... اگر کیمرے والے نوجوان کو پتہ لگانے کی ضرورت ہوتی کہ بورڈ کو نصب ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا

اور سمندر کی ہواؤں کا سامنا کرتے ہوئے زیادہ مدت نہیں ہوئی۔
صبح کی دھوپ میں چمکتے ہوئے اس بورڈ پر تعمیراتی کمپنی کا نام جلی حروف میں پینٹ کیا ہوا تھا اور اس کے نیچے ادارے کا نشان۔ گول، سرخ نارنجی سورج اور ہر خاندان کے لیے بہتر مستقبل کی ضمانت کے الفاظ جن کا رنگ نیلا تھا، سمندر کی طرح۔
کیمرے والے نوجوان اور اس کو روکنے والے سپاہیوں کی طرف سے لوگ دفعتاً مڑ گئے۔ تیز شور کے ساتھ، موٹر سائیکلوں پر سوار نوجوان لڑکوں کا ایک پورا گروہ وہاں پہنچ گیا۔ انہوں نے موٹر سائیکلوں کے سائلنسر اتارے ہوئے تھے اور وہ ریس کرتے ہوئے چلتے تو زوں زوں کا اتنا شور ہوتا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ موٹر سائیکلیں رکیں اور شور دبا تو پتہ چلا وہ اتنے بہت سے نہیں ہیں...... ان میں سے جو سب سے آگے تھا، اس نے ماتھے پر رومال باندھا ہوا تھا۔
''کدر کلٹی کر دیا تم نے سمندر کو؟'' اس نے اپنی انگلی ان ریٹائرڈ بیورو کریٹ کے سینے کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا کہ جو ایکو فرینڈلی ڈیولپمنٹ کا حوالہ بار بار دہرائے جا رہے تھے۔
سینے پر اٹھی اس انگلی کی جنبش کے سامنے وہ گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگے۔
''سمندر کو گم کر کے سمجھتے ہو تم لوگ ہمیں روک لوگے؟ سمندر نہیں ہوگا تو ہم کوئی اور جگہ ڈھونڈ لیں گے نیو ایئر منانے کے لیے......'' نوجوان غصے میں بپھر رہا تھا اور دوسرے نوجوان اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔
اس کی بات سن کر ریٹائرڈ بیورو کریٹ نے سکون کا سانس بھرا۔ ''میں تو خود یہی سمجھتا ہوں...... سمندر تو سب سے بڑی تفریح گاہ ہے، یہاں اوپن اسپیس میں وہ سارے بیریئر ٹوٹ جاتے ہیں جو فنڈامینٹلسٹ لوگ یوتھ پر امپوز کرنا چاہتے ہیں......'' وہ ایک طویل بیان دینے لگا۔
''شٹ اپ! بکواس نہ کر......'' موٹر سائیکلوں والے نوجوانوں میں سے ایک آواز باتوں کو کاٹتی ہوئی ابھری۔
وہ صاحب سہم کر چپ ہو گئے۔
''تم لوگ ہی یہ سب کرتے ہو...... خود تو بڑے بڑے ہوٹلوں میں جو چاہے کر لو......'' لڑکے کی آواز تیز تھی۔
''ابے ان ملاؤں نے تو نہیں چرا لیا سمندر؟ نیو ایئر روکنے کے لیے......'' پہلے والے لڑکے کی آواز آئی۔
''یہ مولوی لوگ بڑے بانی کار ہوتے ہیں......'' مجمع بڑے غور سے یہ اینکاؤنٹر دیکھ رہا تھا، اس میں سے سفید بالوں اور معزز نظر آنے والی خاتون کی آواز ابھری جو شاید ٹیچر رہی ہوں گی۔
''اوہ ویز مولویز اینڈ فنڈوز...... دے آر کل جوئز...... دے ہیو اسٹولن دی سی'' ان دوسری خاتون کی

آواز آئی جن کی عمر کم تھی اور شاید کسی سماجی تنظیم کی رکن تھیں۔ ریٹائرڈ بیوروکریٹ جلدی جلدی اثبات میں سر ہلانے لگے...... لیکن پھر فوراً ہی ایک بے ترتیب سا شور اٹھنے لگا......

''شہر کے لوگوں کے حقوق مسلسل غصب کیے جا رہے ہیں!''

''ان کا بس چلے تو پورے شہر کو بیچ کھائیں......''

''سونے کی چڑیا ہاتھ آ گئی ہے کمپنی بہادر کے......''

''زمین کا چپہ چپہ بیچنے کے بعد سمندر پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگے......''

''یہی لوگ ذمہ دار ہیں۔ شہری اداروں کو کام نہیں کرنے دیتے......''

''شہری حکومت پوری کوشش کر رہی ہے......''

''کوشش کیسی؟ آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں، اپنے مفاد کے لیے ریسورسز پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں......''

اس کے بعد تکرار اور شور بڑھ گیا۔ شور کی آواز اس طرح ہلکی اور تیز ہو رہی تھی جیسے کبھی موجیں اوپر نیچے ہوتی ہوں گی جب وہاں پر سمندر تھا۔

''سٹی فادرز کی طرف سے لازوال تحفہ......''

بورڈ پر الفاظ جگمگا رہے تھے۔

ان الفاظ کے نیچے تصویر بنی ہوئی تھی۔ شہر کی جگمگاتی ہوئی اسکائی لائن۔ آسمان کو چھو لینے والی عمارتوں کی سیاہ پرچھائیوں میں برقی رنگ جھلملا رہے تھے۔ سائن بورڈ کے پینٹر نے پس منظر میں خیالی پہاڑ اور کھجور کے درخت بنا دیے تھے۔ تصویر میں سمندر کا نشان تک نہ تھا۔

دیوار کے ساتھ ساتھ، سڑک کے مخالف رخ پر سیمنٹ کی چھتریاں کبھی بنائی گئی تھیں۔ اب وہ خالی پڑی تھیں۔ ان میں بعض ٹوٹ گئی تھیں، اس لیے جس ترتیب سے انہیں بنایا گیا تھا، وہ بھی ختم ہو گئی تھی لیکن اس وقت یہ زیادہ بے تکی معلوم ہو رہی تھیں۔ پہلے ان کے سائے میں لوگ بیٹھ جایا کرتے تھے اور سمندر کے رخ پر دیکھنے کا لطف اٹھا سکتے تھے، لیکن اب ریت کی طرف کون مسلسل دیکھتا یا پھر مونگ پھلیاں، چنے اور آواز لگا کر پاپڑی...... ی...... ی...... بیچنے والے پھرتے پھرتے وہاں بیٹھ کر ستا لیا کرتے تھے۔ ایک چھتری جو ذرا کونے میں تھی اور جہاں اندھیرا رہا کرتا، وہ مخصوص تھی مالش والوں کے لیے۔ جن لوگوں کو یہ معلوم نہ ہوتا اور وہ وہاں آن کر بیٹھ جاتے، ان کے پاس چمپی مالش والے اتنی بار آ کر پوچھتے کہ یا تو وہ مالش کے لیے تیار ہو جاتے یا وہاں سے اٹھ کر چلے جاتے۔ دونوں صورتوں میں جگہ خالی ہو جاتی، تھوڑی دیر کے بعد پھر بھر جاتی۔

چھتریوں کے ساتھ ساتھ بنچیں اور لوہے کی کرسیاں بھی خالی پڑی تھیں۔

لوگوں نے ان پر بیٹھنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ ان کی سیدھ میں اب بہتے پانی کا نظارہ تو نہیں تھا، چٹیل میدان تھا، لیکن لوگ اگر ریت کی طرف مسلسل دیکھتے رہنے کی عادت ڈال لیتے تو ریت پر زیادہ دیر تک نظریں جمائے رہنے سے بعض اوقات ریت بھی ہلتی، سرکتی ہوئی معلوم ہونے لگتی۔

سمندر کے نظارے کا لطف اٹھانے والوں اور ساحل پر چہل قدمی یا یوگا کی مشقیں کرنے والے لوگوں میں سے چند ایک نے شکایت کی اور بعض نے انگریزی اخباروں میں مدیر کے نام خط بھی لکھے۔ مگر ان کی شکایت پر ناشتے کی میز پر تھوڑی سی گفتگو سے زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ یہ لوگ جو کچھ کرتے رہنے کے عادی ہوگئے تھے، وہ سب یوں بھی کر سکتے تھے۔ آخر کو انہیں جگہ چاہیے تھی، سو موجود تھی، پہلے سے بھی زیادہ! سمندر کے غائب ہوجانے کے بعد شہر کے نوجوانوں میں ایک بے چینی سی پائی جانے لگی، جس میں موضوع بننے کا زیادہ امکان تھا مگر جس کو مختلف ٹی وی چینلز کے ٹاک شوز میں موضوع بنایا گیا اور نہ اس کے بارے میں انگریزی اخباروں میں کوئی خط دیکھنے میں آیا۔ یہ بے چینی بھی مبہم سی تھی، جس کو پوری طرح بیان کرنا بھی مشکل تھا، اس لیے کہ اس کا احساس بھی غیر واضح تھا۔ جیسے صبح شام غسل کرنے کے عادی کو کئی دن تک نہانے کا موقع نہ ملے۔ میٹھا پسند کرنے والوں کو یک لخت میٹھا ملنا بند ہوجائے۔ ایک الجھن، گھبراہٹ، جیسے ہاتھ پاؤں اینٹھ رہے ہوں اور بدن ٹوٹا جا رہا ہو۔ ایک نوجوان نے شکایت کے لہجے میں کہا کہ سمندر کے چلے جانے کے بعد اسے سردی لگنے جا رہی ہے، تو کسی بزرگ نے ٹوک دیا۔ تم کون سا سمندر کو اوڑھے لپیٹے رہتے تھے؟

نوجوان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر کو سمندر بہت کچھ سمیٹ لیتا تھا۔ ہاکس بے، سینڈز پٹ کی ریت پر بنی ہوئی ہٹس صرف گھر والوں کے ساتھ تفریح تک محدود تو نہ تھیں۔ کسی بھی ویک اینڈ کے بعد لمبی ڈرائیور پر اپنی ہم عمر دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے وہاں کے چوکیدار کی مٹھی گرم کرنے کے بعد اس جگہ کو حاصل کیا جاسکتا تھا اور سمندر اس کے لیے پرفیکٹ سیٹنگ فراہم کرتا تھا۔ اور اگر یہ جگہ نہ بھی ملے تب بھی چٹانوں کی اوٹ میں یا پھر گاڑی ایک طرف روک کر اپنا کام پورا کیا جاسکتا تھا۔ ذرا سوچیے، کھلی ریت میں اس طرح گاڑی تو نہیں روکی جاسکتی، کئی نوجوانوں کے دل مین خیال ضرور آیا ہوگا۔ مگر یہ بات کسی نے کہی نہیں۔

وہ ہٹس تو اب بھی اسطرح موجود تھیں۔ فلڈ لائٹس بھی اسی طرح جل رہی تھیں اور دیوار کے ساتھ وارننگ اب بھی مٹائی نہیں گئی تھی۔ ستمبر کے مہینے میں سمندر میں نہانا منع ہے، تیز موجیں آپ کے لیے خطرہ بن سکتی ہیں۔ سمندر نہیں رہا، انتباہ بھری دیوار سامنے کھڑی تھی۔

پریس کلب کے سامنے ایک دن جلوس نکالا گیا۔ پہلے پہل اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی اس لیے کہ

وہاں آئے دن جلوس نکلتے رہتے ہیں۔ پھر اس جلوس میں ایسی کوئی خاص بات نظر بھی نہیں آ رہی تھی۔ نہ پلے کارڈز، نہ بینرز، نہ میڈیا کوریج، تھوڑی سی عورتیں نعرے لگا رہی تھیں اور نعرے بھی ایک آواز میں نہیں تھے۔ وہ لمبی قمیصیں اور گھگھرے پہنے ہوئے تھیں، کئی کی چادریں میلی تھیں یا بدرنگ اور ان کے بازوؤں میں کڑے اور چوڑیاں موٹے اور بھدّے تھے۔ یہ سب کسی ایک بس میں بھر کر شہر کی ایک گنجان آباد، پرانی بستی سے آئی تھیں، ان کو واپس جانے کی جلدی تھی اور گھبراہٹ بھی۔ کئی کے ساتھ چھوٹے بچے بھی تھے، کچھ کی ناک بہہ رہی تھی اور کئی ایک گلا پھاڑ کر چلا رہے تھے۔ بچوں کے رونے کی آواز نعروں میں رلی ملی جا رہی تھی۔ جیسے وہ اسی کا حصہ ہو۔ ''جھینگا مچھی ی ی ی...... جھینگا مچھی ی ی ی......'' ان کے نعرے کا اتنا ٹکڑا صاف سنائی دیتا کہ اس میں آواز بلند ہوتی پھر اس کے بعد دب کر ڈھیر ہونے لگتی۔ ''یہ فشریز میں کام کرنے والیاں ہیں'' پریس کلب کے باہر کھڑے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے اپنے ساتھیوں کو بتایا۔ ''ان کا تو روزگار سمندر سے بندھا ہوا ہے۔ یہ حکومت سے مطالبہ کر رہی ہیں کہ ان کا متبادل بندوبست کیا جائے۔''

''جھینگا مچھی ی ی ی...... آ'' ایک نعرے کے ساتھ ان عورتوں نے ہوا میں ہاتھ لہرائے۔ اتنی دور سے یہ تفصیلات محو ہو گئیں کہ ان انگلیوں کی پوریں کٹی پھٹی ہیں اور یہ ہاتھ میلے، گندے، کالے ہیں۔ اس سمندر کے برخلاف جوان کے نعروں میں گرج رہا تھا۔

ایک اور دن ایسے ہی اور لوگ اسی جگہ پھر جمع ہو گئے۔ ان میں عورتوں کے ساتھ چند مرد بھی تھے۔ ان کے رنگ زیادہ گہرے تھے۔ یہ لوگ آپس میں کسی اور زبان میں بات کر رہے تھے اور ان کے نعروں میں جھینگے کا یا مچھلی کا نام نہیں آ رہا تھا۔ بلکہ ان کے نعرے ہی نہیں تھے۔ یہ لوگ سست رفتاری سے بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی آدمی نے، جس نے ڈھول کہیں نہ کہیں اٹھا رکھے ہوں گے، تھاپ دینا شروع کی۔ پہلے آہستہ آہستہ پھر بڑھتے بڑھتے تیز تیز ایک دم سے زور لگا کر بہت تیز۔ جلوس کے آگے آگے چلنے والی سیاہ رنگ بوڑھی عورت نے منہ ہی منہ میں بُد بدا کر کچھ کہا اور اپنی جگہ کھڑے کھڑے ہلنے لگی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی اور جھوم رہی تھی۔ ایک تواتر کے ساتھ وہ جھوم رہی تھی اور اس کا بدن تھاپ کے آہنگ میں ہل رہا تھا۔ آہنگ میں ہلتے ہلتے اچانک اس میں جیسے بجلی سی بھر گئی اور دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا کر اس نے مستانہ وار تھرکنا شروع کر دیا۔

''مور صاحب! مور صاحب'' اس نے زور سے آواز دی اور پھر جیسے بے جان ہو کر سڑک پر گر پڑی۔ جلوس آگے بڑھتا رہا۔

''پتہ نہیں یہ لوگ اس قدر اودھم کیوں مچا رہے ہیں؟'' پریس کلب کے باہر وہ آدمی اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا جس سے پوچھا گیا تھا کہ جلوس میں یہ کون لوگ ہیں۔ ''ان کے اوپر کون سا آسمان ٹوٹ پڑا؟ فائدہ

ہوگا اور زمین کا الاٹ منٹ کھلے تو سب سے پہلے یہی روتے گاتے، دوڑے چلے آئیں گے، محرومی اور پسماندگی کا رونا روتے ہوئے!"

اس کے مخاطب نے جو جواب دیا، وہ شور میں بکھر گیا کیونکہ جلوس بنے لوگ، منتشر ہونے سے پہلے اس بوڑھی عورت کو سہارا دے کر سڑک سے اٹھا رہے تھے۔

"قائداعظم کا مزار سلامت ہے، شہر کی اصل نشانی تو وہی ہے۔" پہلے آدمی کی آواز آئی۔ "ٹی وی کے ٹیلپ پر وہی ہر بار دکھایا جاتا ہے۔ آخر دوسرے شہر بھی تو ہیں۔ سمندر کے نہ ہونے سے کونسا نقصان ہوگیا ہے؟ کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں......"

جلوس ذرا ہی دیر میں بکھر گیا۔ جلوس کے شرکا سڑک کے ہجوم میں شامل ہوگئے۔

بعض عملی مشکلات بھی پیش آنے لگیں۔ ایک اربن لیجنڈ کے طور پر "نیٹو جیٹی" کے پل کی وہ حیثیت مدتوں پہلے ختم ہوگئی تھی جب اپنی زندگی سے مایوس ہوکر خودکشی کرنے والے لوگوں نے یہاں سے چھلانگ لگانے کے بجائے دوسرے راستے اختیار کر لیے تھے اور خودکشی کے بڑھتے ہوئے حالیہ رواج نے بھی پل کی پرانی حیثیت کو بحال نہیں کیا، لیکن پل کے نیچے سوکھی ریت اڑ اڑ کر ریل کی پٹریوں پر جمع ہونے لگی۔ سب سے پہلے وہاں سے وہ لوگ کم ہوئے جو منت مراد کے لیے مچھلیوں کو آٹا کھلاتے تھے۔ سکّوں کی ڈھیریاں سامنے رکھے ہوئے اور گھی کے پرانے، خالی کنستر میں آٹے کی گولیاں بنا کر بیٹھے رہنے والے بھی غائب ہوگئے اور ان سے مول لے کر یہ گولیاں دعا کے ساتھ پانی میں پھینکنے والے وہ لوگ بھی جن کو ان کی کوئی نہ کوئی ضرورت یا مصیبت وہاں کھینچ کر لے آتی تھی۔

جس دن میں جب تعزیہ اٹھا، اس دن جلوس کے شرکاء کے سامنے یہ سوال بھی اٹھا کر تعزیے کہاں ٹھنڈے کیے جائیں، سمندر تو رہا نہیں۔ اس سوال پر شہر بھر کے جید علماء نے بہت غور وخوض کیا لیکن کسی خاطر خواہ نتیجے پر پہنچے بغیر ان کا اجلاس ختم ہوگیا۔ امام حسینؓ کے نام عریضے ڈالنے کا طریقہ بھی شہر میں اسی دبدھا کا شکار ہوگیا۔ جو لوگ اپنے سوال لکھ لکھ کر نیٹو جیٹی کے پل پر سے پانی میں ڈال دیتے تھے کہ ان کا عریضہ امام حسینؓ کے پاس پہنچ جائے گا، اس طرح اپنے سوال ریت پر لکھ کر بھیجنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ان کے سوال ایک اس سمندر کے نہ ہونے سے وہیں کے وہیں رہ گئے اور جب سوال ہی نہیں آگے گیا تو پھر ان کا حامی وناصر کون ہوتا، اب تو سمندر بھی نہیں رہا...... مٹی ہی مٹی تھی اور کوّے، وہاں بہت سارے کوّے تھے جو ادھر ادھر سے آ گئے تھے اور شور مچا مچا کر اڑ رہے تھے۔ شہر پر آسمان کی چادر پھڑ پھڑا رہی تھی اور اسے اپنی جگہ روکنے کے لیے لگائی جانے والی کیلیں، یہ کوّے، ہوا کے سامنے ٹھہر نہ پا رہے ہوں۔ اب آسمان پھر ہلا، نیچے کی طرف

جھکا اور کوؤں کے ساتھ اوپر اٹھ گیا۔ پرانی روئی کی طرح پھول رہا تھا آسمان جس میں پانی جذب ہو گیا ہو اور قطرہ قطرہ ٹپکنے لگے، بوند بوند سمندر جس میں اب بس بوندیں رہ گئی تھیں، سمندر نہیں۔

ایک دن ایک آدمی نے خواب دیکھا، سمندر کا خواب، اور اسی جگہ آ کر بیان کرنے لگا جہاں شام کے وقت بہت سے لوگ جمع ہو جاتے تھے اور باتیں کرنے لگتے تھے۔ اس نے کہا ''میں نے دیکھا...... میں نے دیکھا...... اجلی ریت کے سامنے، ہرا اور نیلا، پانی ہی پانی دور تک پھیلا ہوا جہاں تک نظر جائے۔ لہروں کے اوپر سفید سفید جھاگ اور لہریں اچھلتی ہوئی اٹھتی چلی آتی ہیں اور جب گرتی ہیں تو ان کا زور ٹوٹتا ہے، سفید جھاگ ریت کے اوپر بڑھا چلا آتا ہے اور پانی پیچھے ہٹتا ہے تو صاف ریت اس طرح نکلتی چلی جاتی ہے جیسے سمندر کی تہہ سے نکلی ہو اور پانی کے ساتھ بہتی جا رہی ہو۔ میرا جی چاہا کہ اس ریت میں پیر گاڑ کر کھڑا ہو جاؤں جیسے اپنے بچپن میں کیا کرتا تھا جب ہم کبھی اپنے سارے گھر والوں کے ساتھ سمندر پر پک نک منانے جاتے تھے۔ پانی پر سمندری پرندے اڑ رہے تھے اور ریت پر اونٹ والا مہار تھامے کھڑا پوچھ رہا تھا، صاحب سواری چاہیے۔ میں نے اس کو منع کرنے کے لیے سر ہلایا تو میری آنکھ کھل گئی...... وہاں سمندر نہیں تھا اور میں اپنے بستر پر تھا......''

اس نے خواب بیان کیا تو دوسرے لوگوں نے بھی بولنا شروع کر دیا...... کلفٹن، سیر...... پیراڈائز پوائنٹ، ساحل کی چٹان، چٹان پر سے اچھلتا ہوا پانی، ہاکس بے، ساحل پر بنی ہوئی تفریحی ہٹ، سینڈز پٹ، اجلی ریت، لپکتا ہوا پانی اور پھر ریت کو بھگونے کے بعد پیچھے ہٹتا ہوا۔ وہ سب ایک ساتھ بول رہے تھے، اپنی اپنی باتیں دہرا رہے تھے کہ ان میں سے ایک آدمی کو لگا جیسے سمندر پھر دکھائی دے رہا ہے۔ پانی گدلا ہے اور ریت پر کوڑا بکھرا ہوا ہے، جوس کے خالی ڈبے، پلاسٹک کی تھیلیاں، موسمی کے چھلکے، پیکٹ جو استعمال کے بعد چرمرا کر پھینک دیے گئے ہیں اور پیچھے ہٹتی ہوئی لہروں کے سامنے بے تحاشا لوگ اتنی سی جگہ میں بھرے ہوئے اور پھر بھی تفریح کے موڈ میں، ان کی آوازیں لہروں کے شور کے اوپر سے گونجتی اور ٹکراتی ہوئی، پھر ان کے سامنے دیوار، عمارت کا ادھ بنا ڈھانچہ جس نے سمندر کو دونوں ہاتھوں سے جیسے بھینچ لیا ہو، سکیٹر لیا ہو، گدلے پانی کے اوپر تیل کے کالے چکتے جو پانی کے بہاؤ کے ساتھ پیچھے ہٹنے کے بجائے وہیں جمے کھڑے ہیں، مری ہوئی مچھلیوں کی سڑی بدبو جو دھیرے دھیرے بڑھتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ اتنی دبیز اور تیز ہو جاتی ہے کہ سانس رکنے لگتا ہے۔ سانس میں جیسے کوئی چیز پھنس رہی ہے اور قے کو روکتے ہوئے آپ وہاں سے مڑ کر واپس جانے لگتے ہیں سمندر سے مخالف سمت میں......

اس شام ہوا بند تھی۔ شہر والے سمندر کی چوری کے اسی طرح عادی ہوتے جا رہے تھے جیسے کبھی سمندر

کنارے مقیم رہنے کے عادی ہوئے ہوں گے۔ ہوا بھی کئی دن سے بند تھی۔ دن بھر کی گرمی کے بعد شام کے وقت سمندر کے رُخ سے ہوا چلنی شروع نہیں ہوئی...... سمندر ہوتا تو ہوا چلتی، کسی نے اپنی دانست میں بہت کانٹے کی بات کہی۔ اور حبس کا عالم سارے شہر پر یوں چھایا ہوا تھا جیسے کسی نے ایک گرم، چپچپاتا ہوا شیشے کا مرتبان اوپر سے لاکر شہر پر دھر دیا ہو۔

شام ہوتے ہوتے بدبو سارے شہر میں پھیلنے لگی۔ مچھلیاں اور کیکڑے فٹ پاتھ پر بکھرے ہوئے نظر آنے لگے۔ سمندری پرندے بجلی کے کھمبوں پر بیٹھے ہوئے تھے، اداس اور بے مصرف...... پر پھیلائے ہوئے، اڑنے سے بیزار...... جیسے کوّے بارش میں بھیگ گئے ہوں......

باہر سے آئے ہوئے پرانے کپڑوں...... سوئٹر، جرسیاں، کوٹ...... کے دام گر گئے۔ انڈے مہنگے ہو گئے۔ کلفٹن کے علاقے میں ٹریفک کا دباؤ برائے نام رہ گیا۔ مالش کرنے والے کم عمر لڑکوں اور کھمبوں کے نیچے کھڑی ہوئی عورتوں میں بے تحاشا اضافہ ہوگیا۔ برگر فروخت کرنے والی ایک ملٹی نیشنل نے اپنی ایک نئی ڈیل کا اعلان کر دیا۔ صحرا کے شہر میں فاسٹ فوڈ کی نئی روایت...... اگلے دن بڑی بڑی تصویریں میڈیا سے جھلکنے لگیں۔ جن میں پانی اترتا تھا اور صحرا کے وسط سے ریت میں جگمگاتا شہر برآمد ہوتا تھا، برگر میں بند...... دانتوں سے کاٹ کر ایک ٹکڑا آپ بھی کھائیے ناں...... باقی شہروں کے رہنے والے اپنے مقامی ڈیلروں سے رجوع کریں......

یاد رکھیے، یہ گولڈن پیش کش صرف محدود مدت کے لیے ہے!

ایسی ہی ایک صبح کی ملگجی، مٹیالی روشنی پھیلنے بھی نہ پائی ہوگی کہ سمندر والے دیکھیں گے شہر کو چرا لیا گیا ہے۔

تب تک کہانیوں میں ان کی کہانی تمام ہو چکی ہوگی۔ مٹی میں مل کر مٹی، پانی میں مل کر پانی......

اس وقت کون کہاں ہوگا اور سمندر کہاں؟

سمندر کے ساحل پر ریت میں قدموں کا ایک نشان بنا ہوا ہے، جس میں پانی بھرتا جا رہا ہے اور ایک اونٹ والا اس کے پاس بیٹھا رو رہا ہے۔

☆☆

غزل کے دیار میں

ظفر اقبال کا شمار ہمارے عہد کے ممتاز ترین شعراء میں کیا جاتا ہے۔ ظفر اقبال نے غزل کو نئے جہانوں کی سیر بھی کرائی ہے اور پرانے جہانوں کو بھی اچھی طرح سے کھنگالا ہے۔ ظفر اقبال کی سب سے بڑی خوبی ہے ''تخلیقی جرأت''۔ غزل جیسی نیم وحشی صنفِ سخن کے ساتھ جس طرح سے موصوف نے نباہ کیا ہے اُس سے بلاشبہ یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ظفر اقبال کی صورت میں غزل کو ایک ''پورا مرد'' مل گیا ہے۔ ظفر اقبال کو دو چار غزلوں سے پرکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے کیونکہ اس میں کوہ کنی کا ایک طویل اور صبر آزما سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ قارئین کے بے حد اصرار پر دہلیز کے پیش نظر شمارے میں ہم ظفر اقبال کی ۱۱۰ غزلیں پیش کر رہے ہیں تا کہ ظفر اقبال کے بارے میں نئے قاری کو رائے قائم کرنے میں کسی دشوای کا سامنا نہ کرنے پڑے۔

زمرد مغل

جو بھی تماشہ کِیا ہے
نقصان اپنا کِیا ہے
اُس کے آگے جُھکے ہم
یہ بھی ڈرامہ کِیا ہے
خُود سے فارغ ہُوئے تو
اُس کا چرچا کِیا ہے
بُرا ہو یا اچھا ، مگر
کام ہمیشہ کِیا ہے
توبہ کر کے بھی وہی
کام دوبارہ کِیا ہے
بہے پسینے ایک دم
جھگڑا اِتنا کِیا ہے
انحراف اُس ذات سے
کیسا کیسا کِیا ہے
جینے کا کرتے رہے
مرنے کا کیا کِیا ہے
حال اپنا ہم نے ، ظفؔر
خُود ہی پتلا کِیا ہے

-☆-

اُس کو پکڑا پیر ہے
اب تو میاں اخیر ہے
آگے اُس کے رکھیں گے
جو اپنی تحریر ہے
حال دُہائی کریں گے
آگے جو تقدیر ہے
کہیں گھاؤ تلوار کا
کہیں ترازُو تیر ہے
ہاتھ بھی ہیں دونوں بندھے
پانو میں بھی زنجیر ہے
دیکھو عبرت سے اِسے
ایک نیا نخچیر ہے
کہو ، حساب کتاب میں
اب کتنی تاخیر ہے
چھوٹے چھوٹے جُرم پر
بڑی بڑی تعزیر ہے
کھڑا ہے کُچھ ایسے ظفؔر
جیسے بے تقصیر ہے

-☆-

جرم سے کچھ اِنکار ہے
اور ، کچھ کچھ اقرار ہے
بہت بدن پر کپکپی
کافی تیز بخار ہے
سودا نقد و نقد لو
سارا بند اُدھار ہے
پڑے اگر اُس کی نظر
پھر تو بیڑہ پار ہے
آگ ہے اندر ہی لگی
باہر ٹھنڈا ٹھار ہے
بچنا ہے انصاف سے
رحمت ہی درکار ہے
آپ حفاظت کرے گا
خُود وہ پہرے دار ہے
دوزخ میں لے جائے گا
سر پر جو طُومار ہے
پائے وہیں دوا ، ظفرؔ
جو اُس کا بیمار ہے

-☆-

کبھی بہانہ کرے گا
کبھی روانہ کرے گا
خالی کر کے زندگی
پُر پیمانہ کرے گا
جو نیت ہے آپ کی
وہی زمانہ کرے گا
دُشمن داری کر چُکا
اب یارانہ کرے گا
ہو گا کُچھ کام آپ ہی
کُچھ دیوانہ کرے گا
یہ سب کو معلُوم ہے
کیا مستانہ کرے گا
سوچو ذرا ، بہشت میں
کیا مولانا کرے گا
ہوتا تھا ہر ماہ جو
اب روزانہ کرے گا
اپنی حقیقت کو ظفرؔ
خُود افسانہ کرے گا

-☆-

کُچھ نہیں اپنے پاس
لیکن نہیں نراس
جنت میں تو بھیج
کھا لیں گے ہم گھاس
چُھوٹے نہیں ہیں پران
ٹُوٹی نہیں ہے آس
شہر سے تنگ پڑے تو
لے لیں گے بن باس
ہم ہی عام ہُوئے
تھے جو اُس کے خاص
شاید آ ہی جائے
دوزخ ہم کو راس
آٹا نہیں بنا
پیسا بہُت فراس
خوف اُس کا دوچند
قایم نہیں حواس
کِیا ہے آپ ، ظفرؔ
اپنا ستیا ناس

-☆-

تیرے بھجن ہی گائے
پھر بھی ہُوا انیائے
تھے ہم اُسی کے داس
اُس کو کون بتائے
سُنی نہ اُس نے بات
مر گئے ہائے ہائے
پہچانا نہیں اُس نے
جس کے پانو دبائے
بخشے جائیں گے سب
اُس کے چاچے تائے
ہوتے ہوتے اُس کے
رہے جگت پرچھائے
کام نکالے اپنا
رہتا ہمیں لڑائے
صُورت کیسے دیکھیں
پردہ کوئی ہٹائے
بھیجیں کاش ظفرؔ کو
جنت کے ہمسائے

-☆-

ایسی طرز نکالی مَیں نے
پڑے تمھارے پیٹے
حمد ہی نئی بنا لی مَیں نے
ہم قسمت کے ہیٹے
گٹھڑی کالے کرتُوتوں کی
جائیں گے اُس دُنیا میں
سر پر تُرت اُٹھا لی مَیں نے
اِس دُنیا کے بیٹے
چھوڑ ہی دی تھوڑا سا چل کر
لڑکیوں سے بھی بدتر
راہ وہ دیکھی بھالی مَیں نے
لڑکے جیٹھ پلیٹھے
آنکھوں سے ہی چُوبی چاٹی
جنت میں بھی جا کر
اُس روزے کی جالی مَیں نے
کھائیں گے حلوے پیٹھے
توبہ و استغفار کی خاطر
دھوئیں گُناہ کی چادر
تھوڑی عُمر بچا لی مَیں نے
پیس لائے ہیں ریٹھے
موت ہُوئی تھی حملہ آور
چین پڑا نہیں پھر بھی
وار دے دیا خالی مَیں نے
مار رہے پلسیٹے
چھوڑی نہیں تھی اپنے وقت میں
بولنا پڑ گئی عربی
کوئی بھی گوری کالی مَیں نے
ہم پنجابی ٹھیٹھے
آخر اُس کے در پر آ کر
آوَ بھگت کیا ہوتی
خُود کو کیا سوالی مَیں نے
گئے تھے ہم بے ڈیٹے
اور ، ظفر ، کیسا جا پکڑا
کیا ظفر نے ٹا ، ٹا
فضل و کرم کا والی مَیں نے
اُس نے سمجھا ٹے ٹے

-☆-

-☆-

حشر کو ہاہا کار پڑے گی
کافی لمبی مار پڑے گی
مِلنا ہے جا عرش پہ اُس کو
راہ میں سو دِیوار پڑے گی
چل سو چل ہی پھر تو ہو گی
پہلی پہلی بار پڑے گی
لیٹ جائیں گے بے سُدھ ہو کر
رُوح وہاں بیمار پڑے گی
سارے سیدھے ہو جائیں گے
اور ہمیں بیکار پڑے گی
پھر اللہ دے اور بندہ لے
کُچھ تو جاتے سار پڑے گی
لگتا ہے اس مار دھاڑ میں
لمبی ہی بیگار پڑے گی
ٹھیک ہی سُنا ہُوا تھا ہم نے
یہ گھاٹی دُشوار پڑے گی
اندازہ ہے اگلے ظفؔر کو
یا ناری ، یا نار پڑے گی

-☆-

درِ زنداں نہ کُھلا میرے خُدا
نہ کوئی تازہ ہُوا ، میرے خُدا
یاد اب تُو بھی نہیں آتا ہے
اب تو یہ حال ہُوا ، میرے خُدا
کیا مرے ساتھ ہُوئی ، دوست مرے
اور ، کیا مَیں نے کیا ، میرے خُدا
میری آنکھیں نہیں ، کشکول ہیں یہ
در پہ آیا ہُوں کھڑا ، میرے خُدا
یہ تعلُّق نہیں منظور مُجھے
کر مُجھے مُجھ سے جُدا ، میرے خُدا
مَیں کِدھر جاؤں یہاں سے اُٹھ کر
یہ مُجھے تُو ہی بتا ، میرے خُدا
ہُوں ستایا ہُوا دُنیا کا بہُت
نگہِ لُطف ذرا ، میرے خُدا
گرہ در گرہ ہُوا میرا وُجُود
اے مرے عُقدہ کُشا ، میرے خُدا
اب ظفؔر بھی نہیں میرا ، مرے یاد
میری امداد کو آ ، میرے خُدا

-☆-

ہُوں پڑا مَیں بھی اِدھر ، میرے خُدا
ایک ، صِرف ایک نظر ، میرے خُدا
ہُوں نہیں اور کسی قابل میں
مُجھ پہ اب رحم ہی کر ، میرے خُدا
وہ اندھیرا ہے ، مَیں کیا بتلاؤں
میرے اندر سے گُزر ، میرے خُدا
تُو کہاں ، تیرے ارادے کیا ہیں
دے مجھے اپنی خبر ، میرے خُدا
اس خزاں میں تری رکھتے ہیں طلب
یہ مرے شاخ و شجر ، میرے خُدا
تُجھ سے دُور اب تو گُزرتے ہی نہیں
یہ مرے شام و سحر ، میرے خُدا
اجنبی لگتا ہے اب گھر مُجھ کو
کر مُجھے خانہ بدر ، میرے خُدا
ڈال دے پھر کسی کارن ، کسی طرح
میری باتوں میں اثر ، میرے خُدا
کیوں غلط کار نہ ہوتا کہ ظفؔر
تھا وہی بندہ بشر ، میرے خُدا

-☆-

زِندگی قید بنی ، میرے خُدا
اور کتنی ہے ابھی ، میرے خُدا
یاد رکھتا ہُوں تُجھے ہر لمحے
بُھول کیا مُجھ سے ہُوئی ، میرے خُدا
درگُزر تُو ہی کرے گا مُجھ سے
یہ بھی عظمت ہے تری ، میرے خُدا
بس گنہگار ہُوں ، باغی نہیں میں
کر سزاؤں میں کمی ، میرے خُدا
مَیں تو ہوتا ہُوں مُعافی سے شُرُوع
کیا ہے اوقات مری ، میرے خُدا
دوست میرا نہیں بنتا تُو بھی
میرے دُشمن ہیں سبھی ، میرے خُدا
تیری رحمت کا نہیں کوئی شُمار
عُمر گننے میں لگی ، میرے خُدا
نئے آغاز پہ ہے اب یہ سفر
زندگی آئی ، گئی ، میرے خُدا
ظفؔر، اندر سے اُچھلتی ہے یہ حمد
یہ سُنی ہے نہ کہی ، میرے خُدا

-☆-

یوں اس حمد کی ہے ، میرے خُدا
اور بُلاؤں تری جے ، میرے خُدا
دِل میں کس طرح سکتی ہے ہوا
اور ، کیسا ہے سے ، میرے خُدا
پُوری طاقت سے بُلاتا ہُوں تُجھے
پھر بھی سُنتا نہیں ، اے میرے خُدا
مَیں جو پہلے نہیں آیا ترے پاس
یہی غلطی ہُوئی ہے ، میرے خُدا
اِک بنایا تھا جو گھر تیرے لیے
وہ عمارت گئی ڈھے ، میرے خُدا
ہاتھ خالی ہیں خُدایا میرے
نہیں پلّے کوئی شے ، میرے خُدا
ڈھونڈنا ہے تُجھے آخر دم تک
چاہے نکلے مری تھے ، میرے خُدا
یہ سفر ہے مُجھے منزل سے عزیز
راہ کرتا نہیں طے ، میرے خُدا
رکھنا حصّے میں ظفؔر کے تاعُمر
یہ لچکتی ہُوئی لے ، میرے خُدا

-☆-

حمد کرتا ہُوں سبُو ، میرے خُدا
نشہ ٹُوٹے نہ وضُو ، میرے خُدا
در پہ آیا ہے ترے تیرا غُلام
طوق ہے زیبِ گلُو ، میرے خُدا
یہ کٹا اور پھٹا سا ہُوا دِل
ہو گا تُجھ سے رفُو ، میرے خُدا
یہ دُعا ہے مری ، اب ہو نہ کہیں
ختم یہ ہفتہء ہُو ، میرے خُدا
یہی رکھتا ہے مُجھے خوار و خراب
مُجھ میں یہ میرا لہُو ، میرے خُدا
مُجھ سے ناراض ہے دُنیا ساری
ایک ہوتا نہیں تُو ، میرے خُدا
دِل مرا پُھول ہے کب سے ایسا
جس میں ہے رس نہ بُو ، میرے خُدا
کہیں دوچار تو ہونا ہے کہ تُو
ہر طرف ہے ، ہمہ سُو ، میرے خُدا
تُجھ سے اُمیدِ کرم ہے کہ ظفؔر
مانتا ہے تری خُو ، میرے خُدا

-☆-

دُور ہیں میں اور تُو میرے خُدا
کب مِلیں گے رُوبرُو میرے خُدا
تیری باتیں ، تیری یادیں ، تیرا ذکر
بس یہی ہے گفتگو ، میرے خُدا
تیرا ثانی تو نہیں کوئی ، مگر
دِل میں ہے تُو ہُوبہُو ، میرے خُدا
کُچھ مُجھے اچھا نہیں لگتا ہے اب
یہ جہانِ رنگ و بُو ، میرے خُدا
یہ نہیں ممکن کہ ہمت ہار کر
چھوڑ دُوں یہ جستجُو ، میرے خُدا
کیا کروں ، بجھتی نہیں ہے میری پیاس
پھر چُکا ہُوں جُوبجُو ، میرے خُدا
کیا مزا ہو جب کہیں ہو جائے تُو
ایک میرے رُوبرُو میرے خُدا
پھر کہیں ٹھنڈی ہوا اور چھاؤں بھیج
چل رہی ہے دِل میں لُو میرے خُدا
کیا کرے تو ہی بتا ، مُجھ کو ظفؔر
ڈھونڈ بیٹھا کُوبکُو میرے خُدا

-☆-

آن تُمھاری ، بان تُمھاری
سب سے اُونچی شان تُمھاری
واری میرا جسم تُمھارے
صدقے میری جان تُمھاری
مَیں معذور گُزر نہیں سکتا
آبادی گُنجان تُمھاری
رکشہ صُبح چلائے تُمھارا
شام ہے گاڑی بان تُمھاری
حاجی یہاں کے سب سے زیادہ
دُھر ہے پاکستانؒ تُمھاری
مشہُوری سی مشہُوری ہے
چھاپے خبریں ڈان تُمھاری
بخشش تو کرتے ہو ، لیکن
شرط نہیں آسان تُمھاری
پُوچھتے نہیں گُنہگاروں کو
نیکی ہے پردھان تُمھاری
کہیں ظفؔر عاصی ہو کر بھی
پا سکتا ہُوں امان تُمھاری

-☆-

کھیت ہُوئے ویران ہمارے
دیدے ہیں حیران ہمارے
نہیں ہمیں نسوار میسر
بند ہُوئے ہیں پان ہمارے
بھاگ گئے لوہار یہاں سے
چھوڑ گئے ترکھان ہمارے
بھری ہُوئی لوگوں سے گلیاں
خالی غلّے دان ہمارے
تو لتے ہیں اندازے سے ہی
رہے نہیں اوزان ہمارے
کٹی ہُوئی ہیں جیبیں اپنی
بٹے ہُوئے ہیں دھیان ہمارے
شور شرابے سے اپنے ہی
پھٹے ہُوئے ہیں کان ہمارے
بات نہیں ہم سے ہو سکتی
بجا نہیں اوسان ہمارے
کام اپنے تو ، ظفؔر ، ہیں جو بھی
سُنا کرو اعلان ہمارے

-☆-

ہٹیں ذرا دربان تُمھارے
آئے ہیں مہمان تُمھارے
ایک پٹھانے خان ہمارا
دُوسرے سارے خان تُمھارے
ایک ہماری بندر جاتی
اور ، سبھی ہنومان تُمھارے
شہر میں یہ فٹ پاتھ ہمارا
اُونچے محل مکان تُمھارے
نرگ نُما جھونپڑیاں اپنی
بنگلے سُورگ سمان تُمھارے
تنکا تنکا بکھر گئے ہم
جُڑے ہُوئے ججمان تُمھارے
دھنسے ہُوئے اِک دُوسرے میں ہم
کُھلے کُھلے میدان تُمھارے
اور ، ہماری بربادی کو
طغیانی ، طُوفان تُمھارے
جو بھی سلُوک اب کرو ظفؔر سے
پیش ہُوا ہے آن تُمھارے

-☆-

اب کیا ہوں اِمکان ہمارے
ملتے نہیں بیان ہمارے
حمد کے سونے پر ہیں سہاگہ
قاری خُوش الحان ہمارے
باہر چمک دمک ہے پُوری
اندر ہیں ویران ہمارے
تازہ ہوا آئے تو کہاں سے
تنگ اور بند مکان ہمارے
آٹا نہیں مِلا پرمٹ پر
بھوکے ہیں نادان ہمارے
وجہ تو ظاہر ہے تُم پر بھی
ہیں جو ضعیفِ ایمان ہمارے
ویسے ہی ہم نے ہونا تھا
جیسے ہی سُلطان ہمارے
کُچھ بھی ہمارے گھر نہیں آتا
کنک ہماری ، دھان ہمارے
سینے کے ناسُور یہی ہیں
اور ، یہی سرطان ہمارے

-☆-

جان ہُوئی بے جان ہماری
اُترے کہیں تھکان ہماری
تُو ہی وردِ زُباں ہے ، اب تک
تُو ہی رہا گردان ہماری
بیٹھ گئے پاتال میں جا کر
کیسی تھی وہ اُٹھان ہماری
زہر تو مِلتا ہی نہیں خالص
پھٹے کہیں شریان ہماری
گرے ہیں مُنہ کے بل آ کر ہم
کیسی رہی اُڑان ہماری
کوئی نمازی کیسے آتا
پہنچی کہاں اذان ہماری
دار و مدار اندازے پر ہے
اُلٹ گئی میزان ہماری
گھوڑا خُود بھاگا پھرتا ہے
ہاتھ میں نہیں عنان ہماری
ہم کمزور ظفؔر سے بھی ہیں
سُنو کبھی بلوان ہماری

-☆-

مُلاقات ہو سکتی ہے
اور ، بات ہو سکتی ہے
مُجھے مات ہو جائے گی
مُجھے مات ہو سکتی ہے
رات آنے سے پہلے ہی
کبھی رات ہو سکتی ہے
خلقت ہے تیری ، لیکن
میرے ساتھ ہو سکتی ہے
وقتِ دُعا جو چمکتی ہے
دِل میں دھات ہو سکتی ہے
پُھول پُھول ہوتی ہوتی
پات پات ہو سکتی ہے
مولوی آئے پھرتے ہیں
واردات ہو سکتی ہے
اگلا ہدف ترا ، مولا
کائنات ہو سکتی ہے
تیرا مرکز اب بھی ، ظفرؔ
ایک ذات ہو سکتی ہے

-☆-

انتظام ہو سکتا ہے
اور ، کام ہو سکتا ہے
یاد اُسے کرنے کے لیے
کوئی نام ہو سکتا ہے
فضل تُمھارا ہے مُمکن
اور ، تمام ہو سکتا ہے
گھونگٹ تُو نہ اُٹھائے تو
دِن بھی شام ہو سکتا ہے
دل وحشی تو ہے ، لیکن
یہی رام ہو سکتا ہے
دانہ ڈالو تو پنچھی
زیرِ دام ہو سکتا ہے
عفو خاص تو ہے اُس کا
کبھی عام ہو سکتا ہے
خالی ہے ایمان سے دِل
پُر یہ جام ہو سکتا ہے
مُلاقات کا کبھی ، ظفرؔ
اہتمام ہو سکتا ہے

-☆-

تُم ہو بڑے اور کام تُمھارا بڑا ہے
اس سے ہمیں کیا مطلب کتنا بڑا ہے
میری سوچ احاطہ ہی نہیں کر سکتی
تُو کُچھ اتنا ، اتنا ، اتنا بڑا ہے
باقی ہیں سب چھوٹے ، نام بھی ہیں گُمنام
خُود سے بڑا اور نام بھی اُس کا بڑا ہے
رونق تو لگتی ہے کافی ہی ، لیکن
خلقت کم ہے اور تماشا بڑا ہے
تیری بڑائی کی ہی نہیں جا سکتی بیاں
اِمکانات سے بھی تو زیادہ بڑا ہے
چشمِ تصور اندازہ نہیں کر سکتی
کوئی نہیں ویسا ، وہ ایسا بڑا ہے
وہ تو بڑا ہے اپنی بڑائی سے بھی بہُت
پڑا یہاں بھی کیسا کیسا بڑا ہے
اور تعلُّق اُس کے سامنے کیا ٹھہرے
موت اور زیست کا رشتہ جتنا بڑا ہے
رحم بھی مُجھ پر ویسا ہی کرنا ہے ، ظفؔر
آپ بذاتِ خُود وہ جیسا بڑا ہے

-☆-

کروں جو تیری شان بیان
پھر ہوتا ہے بیان بیان
تو اس سے بھی زیادہ ہے
جو ہے ترا امکان بیان
ابھی قلم وہ نہیں بنا
کرے جو تیری آن بیان
مہلت ہی نہیں پاس مرے
کروں ترے احسان بیان
حد ہی کوئی نہیں تیری
کیونکر کرے زبان بیان
حمد لکھی بھی کھول کے دل
خالی ہے دامان بیان
حمد سرا ہونا تیرا
نہیں کوئی آسان بیان
جو بھی ، جتنا ممکن ہو
ہے تیرا فیضان بیان
حمد اتنی سی میں بھی ، ظفؔر
ہُوئی ہے ساری جان بیان

-☆-

سبب اِس دِل کی ناصبُوری ہے
اور ، وقفہ بھی یہ عبُوری ہے
حمد کی تُجھ کو ہے ضرُورت کیا
حمد میرے لیے ضرُوری ہے
پیش تیرے حضُور مَیں ہُوں سو یہ
جی حضُوری ہی جی حضُوری ہے
آپ کے در سے آپ کے در تک
میری یہ داستان پُوری ہے
یہ بھی کیا رنگ ہیں مرے مولا
آہ کالی ہے ، عرض بھُوری ہے
حمد میرے لیے جو سچ پُوچھیں
صُبح کا ناشتہ ہے ، پُوری ہے
مُجھے میٹھا بھی ہے پسند ، سو یہ
میرے پچھلے پہر کی چُوری ہے
جڑ تو سارے فساد کی ، مولا
میری اور آپ کی یہ دُوری ہے
کیا بنے گا ظفؔر کا آخرِ کار
یہ نہ ناری ہے اور نہ نُوری ہے

-☆-

حمد خُود میرے پاس آتی ہے
اور ، مُجھے ساتھ لے کے جاتی ہے
مُشکل بھی تیری جانتا نہیں مَیں
پھر تیری یاد کیوں ستاتی ہے
صُبح کی تازہ و لطیف ہوا
روز ہی تُجھ کو ڈھونڈ لاتی ہے
چاہتا بھی ہُوں تُجھ سے ڈرتا بھی
یہ کوئی اختلاف ذاتی ہے
دِل سے اُٹھتی ہے لہر سی کوئی
اور ، وہیں حشر سا اُٹھاتی ہے
تُجھ سے مَیں دُور کیوں رہا اِتنا
تُو تو میرا ازل کا ساتھی ہے
تُو کہ باہر ہے کائنات سے بھی
کہُوں کس طرح کائناتی ہے
ہُوں شُمار و قطار میں بھی ترے
یا مری سوچ حادثاتی ہے
ہے ظفؔر بھی اُمیدوارِ کرم
بھُول جاؤ کہ وارداتی ہے

-☆-

آدھی سُن یا ساری سُن
آ ، اور بات ہماری سُن
خوابِ ندامت میں ڈُوبی
کیسی رات گزاری ، سُن
ہُوا نہیں ، اور اب تک ہے
کیسا صدمہء جاری ، سُن
حرفوں کی حسرت کیا ہے
لفظوں کی لاچاری سُن
دُنیا کی دولت کو دیکھو
اور ، دِل کی ناداری سُن
ہم جو کہیں کے بھی نہ رہے
کبھی ہماری زاری سُن
بول جو بے تاثیر ہُوئے
بات اثر سے عاری سُن
بچنے کی اُمید نہیں
ضرب لگی ہے کاری ، سُن
میرے ساتھ ظفرؔ بھی ہے
سب کو باری باری سُن

-☆-

دِل کے اندر چور ہے
رونے پر ہی زور ہے
پچھتاوے ہیں عُمر کے
اور ، اِنہی کا شور ہے
چھائی ہُوئی یہ خوف کی
کوئی گھٹا گھنگھور ہے
جنگل تُجھ سے ہی سجے
تُو جنگل کا مور ہے
روشنیاں کُملا گئیں
دوپہری میں بھور ہے
تیرے قدموں میں ہیں اب
یہی ٹھکانہ ٹھور ہے
جہاں کہیں لے جائے تُو
تیرے ہاتھ ہی ڈور ہے
فضل ، مُعافی اور کرم
سبھی تُمھاری اور ہے
کُچھ نہیں کہنا ظفرؔ کو
ڈھگا ہے اور ڈھور ہے

-☆-

مختصر یہ کہ بے مثال ہے تُو
بہت اعلیٰ کوئی خیال ہے تُو
میری دُشمن بنی ہے یہ دُنیا
مُطمئن ہُوں کہ میری ڈھال ہے تُو
اور ہر شے کو ہے زوال ، مگر
ایک تُو ہے کہ لازوال ہے تُو
کائنات اِک اشارہ ہے تیرا
کیا کہیں کتنا باکمال ہے تُو
بے محابا ترے خزانے ہیں
بے حساب اور مالا مال ہے تُو
حُسن تیرا حدوں سے باہر ہے
کہ بہُت صاحبِ جمال ہے تُو
میرے جیسے بھی پل رہے ہیں یہاں
سب سے بڑھ کر غریب پال ہے تُو
کون ہے جو نہیں تیرا نخچیر
کوئی کون و مکاں میں جال ہے تُو
تیری تعریف کیا کرے گا ظفرؔ
کوئی ایسا ہی خُوش خصال ہے تُو

-☆-

انکسار بھی تُجھ سے ہے
لاڈ پیار بھی تُجھ سے ہے
مُلاقات بھی تیرے ساتھ
اِنتظار بھی تُجھ سے ہے
کہکشاؤں اور تاروں کا
اِنتشار بھی تُجھ سے ہے
وہ بہار بھی ہے تُجھ سے
یہ بہار بھی تُجھ سے ہے
مستی بھی تیرے ہی طُفیل
اور ، خُمار بھی تُجھ سے ہے
دُنیاے فانی فی الحال
پائیدار بھی تُجھ سے ہے
چھپا ہُوا بھی ہے منظر
آشکار بھی تُجھ سے ہے
جمعیت بھی ہے تیری
خلفشار بھی تُجھ سے ہے
پُرسکوں رہے تُجھ سے ظفرؔ
بے قرار بھی تُجھ سے ہے

-☆-

روز و شب اور صبح و شام ترے
حیرت افروز ہیں مقام ترے
بے نشاں بھی تجھے کہا گیا ہے
ہیں نشانات گام گام ترے
تیری ہر مصلحت عجیب و غریب
اور ہی طرح کے ہیں کام ترے
میرے پاس اور کیا اثاثہ ہے
میرا عاجز کلام نام ترے
اپنے بندوں کی فکر ہے کیسی
اور ، کیا کیا ہیں اہتمام ترے
کسی دن اور کبھی دکھا تو سہی
کس طرح کے ہیں سقف و بام ترے
تُو میرا ہی نہیں ہے ، سب کا ہے
اور ، عاشق ہیں خاص و عام ترے
مُہر سب کی کمر پہ ہے تیری
بادشاہان بھی غُلام ترے
ہے ظفؔر ایک تیرا ہرکارہ
جس نے پہنچائے ہیں پیام ترے

-☆-

یہ زمان و مکاں کہاں کے ہیں
ابر اور آسماں کہاں کے ہیں
تیری شانِ نزول تھی کیسی
تیرے نام و نشاں کہاں کے ہیں
بجلیاں یہ کہاں سے آئی ہیں
اور ، یہ آشیاں کہاں کے ہیں
حیرت آباد ہے جہاں تیرا
یہ کرشمے کہاں کہاں کے ہیں
داستاں تو یہاں کی ہے ، لیکن
زینتِ داستاں کہاں کے ہیں
ہم یہیں کے ہیں دردمند ترے
یہ نئے رازداں کہاں کے ہیں
ہم مچھیرے ہیں ساحلوں والے
بحرِ بیکراں کہاں کے ہیں
ہیں زمینی کہ آسمانی یہ
تیرے یہ ہم زُباں کہاں کے ہیں
تُم کہاں کے ہو انجمن میں ظفؔر
اور ، یہ مہرباں کہاں کے ہیں

-☆-

سب میں چرچا کریں گے
خُود کو رُسوا کریں گے
آسماں کی سیر کو
ہم بھی جایا کریں گے
جس کو دیکھا ہی نہیں
اُس کی پُوجا کریں گے
جادُو نگری ہے یہ کیا
اُس سے پُوچھا کریں گے
پہلے تو سب میں اُسے
جُھوٹا سچّا کریں گے
خاک مِلی تو مُستقل
اُس پر سویا کریں گے
ہم بھی اُس کی طرح کا
کوئی تماشا کریں گے
جس کا نہیں وُجُود ہی
اُس کو دیکھا کریں گے
سوچیں سمجھیں گے ، ظفرؔ
دیکھا بھالا کریں گے

-☆-

آخر ہے یہ سب کیا راز
سیدھا راز اور اُلٹا راز
بات صِرف اِتنی سے ہے
کھویا خُود کو ، پایا راز
بھانڈا پھوڑ دِیا اس کا
پہلے پایا اس کا راز
پیچ ہمیں نے ڈالے ہیں
ہے وہ سیدھا سادہ راز
بے زاری کے اندر ہی
چھپا ہُوا ہے سارا راز
دیکھو ، اِسی زمین میں ہے
آسمان کا سارا راز
جس کو سمجھ نہیں آئی
خاص اُسی نے سمجھا راز
ایک بار جو سمجھ گیا
پھر نہیں اُس نے کھولا راز
خُود بھی وہ ظاہر تھا ، ظفرؔ
مَیں نے بھی نہیں رکھا راز

-☆-

ہیرا پھیری خُوب ہے
بُرقع اُٹھانا کوئی دِن

دُنیا تیری خُوب ہے
آنا جانا کوئی دِن

جیسی ہے یہ چاندنی
روک بھی رکھنا کبھی تو

رات اندھیری خُوب ہے
یہی زمانہ کوئی دِن

بیر ستاروں کے لگے
کہیں بدلنا بھی کبھی

اِس کو ، میری خُوب ہے
ٹھور ٹھکانہ کوئی دِن

بے لگام تھی کائنات
کہتے رہنا خلق سے

اُس نے گھیری خُوب ہے
یہی فسانہ کوئی دِن

دُنیا کسی کی بھی نہیں
دُور رہے ہو اِس قدر

تیری میری خُوب ہے
پاس بٹھانا کوئی دِن

آنکھیں اُسے دکھائی ہیں
دریا ہو اتنے بڑے

یہی دلیری خُوب ہے
پیاس بُجھانا کوئی دِن

مُنہ یہ چاند سا چمکتا
روک سکو شاید کبھی

زُلف گھنیری خُوب ہے
کھیل پُرانا کوئی دِن

چکر اچھا ہے سبھی
یہی ستارے چُھو گے

شام سویری خُوب ہے
دانہ دانہ کوئی دِن

گھوری سے آگے ، ظفرؔ
رکھنا آباد ، اے ظفرؔ

چلے پچھیری ، خُوب ہے
یہ ویرانہ کوئی دِن

-☆-

-☆-

ڈھیلے ڈھالے لوگ ہیں
بھولے بھالے لوگ ہیں
تیری عبادت رات دِن
کرنے والے لوگ ہیں
رات اور دِن کی طرح سے
گورے کالے لوگ ہیں
زندہ ہیں کس بات پر
کیا متوالے لوگ ہیں
ساتھ نہیں اُس کے کبھی
جس کے پالے لوگ ہیں
لڑ مرتے ہیں ایک دم
کیا یہ سالے لوگ ہیں
چال چلیں گے اور کی
یہ بے چالے لوگ ہیں
اِن کو میں سمجھاؤں گا
بچے بالے لوگ ہیں
اِسی لیے اُس نے ، ظفرؔ
کل پر ٹالے لوگ ہیں

-☆-

جب بھی سوچ بنائی ہے
اُلٹی سوچ بنائی ہے
اُس کو سوچنے کے لیے
کیسی سوچ بنائی ہے
اُتنے ہی بے فکر ہیں
جتنی سوچ بنائی ہے
کون ہے جس نے یہاں پر
اپنی سوچ بنائی ہے
مہنگے اخراجات سے
سستی سوچ بنائی ہے
تُجھے سمجھنے کے لیے
تیری سوچ بنائی ہے
وہی بڑا جس نے یہاں
پہلی سوچ بنائی ہے
ٹیڑھا تھا موضوع ہی
ترچھی سوچ بنائی ہے
بول نہیں سکتی ، ظفرؔ
گونگی سوچ بنائی ہے

-☆-

میرا اور تُمھارا کُچھ
چکراتا ہے سارا کُچھ
آسمان کے نیچے ہم
کرتے رہے گزارہ کُچھ
کُچھ خُود میں بھی ہمت تھی
ملتا رہا سہارا کُچھ
جاتی ہے یہ راہ کہیں
اور ، کہتا ہے ستارہ کُچھ
صُبح تو ٹھیک ہُوئی ، لیکن
ٹُوٹ گیا ہے کنارہ کُچھ
ہوتا رہا یہاں کُچھ اور
دیتے رہے اشارہ کُچھ
کُچھ زمین پر پھینک دیا
آسمان میں مارا کُچھ
باز نہیں آنے والے
کریں گے وہی دوبارہ کُچھ
آخر مانی ہار ، ظفرؔ
چلا نہیں ہے چارہ کُچھ

-☆-

قول و قرآن بھی اُسی کا ہے
اور شیطان بھی اُسی کا ہے
نیند پڑتی نہیں ہے ساری رات
خواب ہر آن بھی اُسی کا ہے
جس سے باغی ہُوئے ہیں آخری بار
یہ تو فرمان بھی اُسی کا ہے
سقف و در بھی اُسی کے ہیں سارے
اور ، دالان بھی اُسی کا ہے
راستہ مُشکلوں سے پُر ہے بہُت
اور ، آسان بھی اُسی کا ہے
وہ رہے گا ہمارے سر پہ سوار
اور ، امکان بھی اُسی کا ہے
ہے یہ تنہائی بھی اُسی کے لیے
شہر گُنجان بھی اُسی کا ہے
جنگ بھی اس نے جیتنی ہے ضرُور
کہ یہ میدان بھی اُسی کا ہے
خُوش بھی دُنیا سے ہے ظفرؔ ، لیکن
دِل پریشان بھی اُسی کا ہے

-☆-

کام ہے کیا حیرانی والا
اس دُنیائے فانی والا

اپنا اپنا سا لگتا ہے
خصلت وہ بیگانی والا

کیا کیا ہیں پہچانیں اُس کی
گھنگرو والا ، گانی والا

کوئی شرابی ہے پکّا وہ
چال کسی مستانی والا

کیسا ڈھونگ رچا رکھا ہے
روٹی والا ،پانی والا

کرتا ہے وہ سوچ سمجھ کر
نہری سے بارانی والا

ہم پر بند پڑا ہے ، تھا جو
رستا ایک آسانی والا

کسی سمندر پر آیا ہے
وقت کوئی طغیانی والا

لکھا ہُوا دیکھا تو ظفر کو
بھولا سبق زُبانی والا

-☆-

بُرا ہُوا یا اچھا ہو گا
جو چاہے گا ویسا ہو گا

اُس کی ذمے داری ہے یہ
اُلٹا سیدھا جیسا ہو گا

اِسی زمین کے اِک حصّے پر
آسمان۔ کا قبضہ ہو گا

سب کو دیں گے حِصّہ رسدی
جس کا جتنا جتنا ہو گا

اُوپر بھی شاید ایسے ہی
جنگل ہوں گے ، دریا ہو گا

مُلّا حُوروں کے جُھرمٹ میں
بیٹھا حلوہ کھاتا ہو گا

سسٹم یہی چلے گا شاید
پرجا ہو گی ، راجا ہو گا

وہ بھی لڑے گا کوئی الیکشن
جو ریفرنڈم جیسا ہو گا

نیک بیبیوں کی خاطر بھی
شاید اک اک حُورا ہو گا

-☆-

مَیں اپنی چال ہی چلتا ہُوا گذرتا ہُوں
یہ راستے جو بدلتا ہُوا گذرتا ہُوں

مجھے جو آب و ہوا راس ہی نہیں تھی کبھی
اُسی میں پھُولتا پھلتا ہُوا گذرتا ہُوں

بہُت چڑھا ہُوا پانی ہُوں اپنے دریا کا
سو ، لہر لہر اُچھلتا ہُوا گذرتا ہُوں

کبھی مَیں ڈرتا رہا بھی ہُوں دُشمنوں سے ، مگر
اب اُس گلی سے ٹہلتا ہُوا گذرتا ہُوں

کبھی سماتا ہُوا ایک شے میں ، اور ، کبھی
کِسی طرف سے نکلتا ہُوا گذرتا ہُوں

کہیں پڑا ہُوا ہر ایک شے کو ٹھُکراتا
کہیں مَیں آگ اُگلتا ہُوا گذرتا ہُوں

جہاں سے چھوڑ گیا ہے کوئی مجھے پیچھے
حسد کی آگ میں جلتا ہُوا گذرتا ہُوں

گڑھے سے کھود رکھے ہیں جو دُوسروں کے لیے
مَیں اُن سے گِرتا سنبھلتا ہُوا گذرتا ہُوں

بلا ہُوں ایک ، ظفر ، اور ، ناگہاں ، لیکن
مَیں اپنے سر سے بھی ٹلتا ہُوا گذرتا ہُوں

-☆-

ہوا کے ساتھ گذرتا ہُوا گذرتا ہُوں
جو برگ برگ بکھرتا ہُوا گذرتا ہُوں

اِسی طرف سے مجھے خطرہ ہے اگر کوئی ہے
مَیں اپنے آپ سے ڈرتا ہُوا گذرتا ہُوں

ہے ایک ہمہمۂ زِندگی مرے درپیش
جو اِس دیار سے مرتا ہُوا گذرتا ہُوں

مَیں اپنی شامتِ اعمال بھی نہیں کہ یہاں
کِیا نہیں ہے جو بھرتا ہُوا گذرتا ہُوں

جہاں سے تیز گذرتا تھا مَیں کبھی پہلے
وہیں سے رُکتا ٹھہرتا ہُوا گذرتا ہُوں

ہے کوئی بات جو بتلا رہا ہُوں رہ رہ کر
ہے کوئی کام جو کرتا ہُوا گذرتا ہُوں

بنی نہیں ہے ابھی کوئی میری آخری شکل
ابھی بگڑتا سنورتا ہُوا گذرتا ہُوں

مَیں بیٹھ جاؤں گا پھر جھاگ کی طرح یک دم
پھر اِک دفعہ جو بپھرتا ہُوا گذرتا ہُوں

مرے زوال کا موسم ہے زور پر ، سو ، ظفر
بُلندیوں سے اُترتا ہُوا گذرتا ہُوں

-☆-

نظر نہیں آ رہا جدھر سے لگے ہوئے ہیں
ڈرے ڈرے اپنے اپنے گھر سے لگے ہوئے ہیں
لگا تو رکھی ہے گھر میں چوروں نے سینڈھ، لیکن
پتا نہیں چل رہا کِدھر سے لگے ہوئے ہیں
بگاڑ دیتے ہیں شکل جب بھی ذرا سی نکلے
جسے بنانے میں عُمر بھر سے لگے ہوئے ہیں
خبر کوئی لا سکیں کبھی شاید اُس طرف کی
ہم اپنی دُھن میں جو بےخبر سے لگے ہوئے ہیں
مجھے یہ محسوس ہونے لگتا ہے جیسے مجھ میں
یہ بازوؤں کے بجائے پر سے لگے ہوئے ہیں
مرے علاوہ تمھیں بھی اک دِن دکھائی دیں گے
کہ جو ہواؤں میں یہ شجر سے لگے ہوئے ہیں
ہوا گذرتی ہے، اور، کبُوتر گنگنتے پھرتے
جہاں کہیں مجھ میں بام و در سے لگے ہوئے ہیں
کبھی جو دیکھو تو آ کے پھیلاو بھی ہمارا
کہ ہم بظاہر تو مختصر سے لگے ہوئے ہیں
ظفر، سمجھتے ہیں نفع و نقصان خوب اپنا
جو فائدے میں کِسی ضرر سے لگے ہوئے ہیں

-☆-

غُبارِ غربت میں بھی وطن سے ملے ہوئے ہیں
کہ یہ بیاباں کِسی چمن سے ملے ہوئے ہیں
کوئی بھی موسم ہو، تازہ تر ہے مہک ہماری
کہ ہم کبھی ایک گُلبدن سے ملے ہوئے ہیں
ہمارا مِل بیٹھنا یہی ہے کہ ہم کِسی سے
اگر ملے ہیں تو سُوءِ ظن سے ملے ہوئے ہیں
کبھی جو بیٹھے تو بےخبر ایک دوسرے سے
جو سچ کہیں تو اِسی مِلن سے ملے ہوئے ہیں
ہمارے اندر ہی اب ہیں موجود بھیڑیے بھی
کہ شہر پھیلے تو جا کے بن سے ملے ہوئے ہیں
یہ ہم جو اک دوسرے سے بدظن ہیں، اور، شاکی
ہمیں یہ تحفے اُس انجمن سے ملے ہوئے ہیں
اب اور محفوظ کیا ہو یہ جان و مال اپنا
کہ جو مُحافظ ہیں راہزن سے ملے ہوئے ہیں
سفید پوشی ہماری اِتنی سی ہے کہ اپنے
لباس جیسے بھی ہیں، کفن سے ملے ہوئے ہیں
ہُنر کوئی تھا تو ہاتھ اُس سے بھی دھو چکے ہم
ظفر یہاں، شاید اہلِ فن سے ملے ہوئے ہیں

-☆-

جو دوستی سے نہ دُشمنی سے ملے ہوئے ہیں
یہ لگ رہا ہے کہ ہم ابھی سے ملے ہوئے ہیں
ہمیں وضاحت سے یاد ہیں خدّوخال اُس کے
اگرچہ اک بار سرسری سے ملے ہوئے ہیں
جو تھی تو کِس طرح کی مُلاقات یہ ہماری
کہ دُور ہیں مجھ سے، اور، کِسی سے ملے ہوئے ہیں
یہ شہر اپنے لیے جو بیگانہ ہے سراسر
ہم اصل میں تو یہاں تجھی سے ملے ہوئے ہیں
اُڑائے پھرتی ہے رات بھر دُور دُور ہم کو
تو کیوں نہ ہو جب کِسی پری سے ملے ہوئے ہیں
ہمارے احوال کا اب اندازہ آپ کر لو
کبھی جو مِلتا نہیں، اُسی سے ملے ہوئے ہیں
ہمارے رُخ پر یہ نُور کیوں کر بھلا نہ آتا
کہ اندر اندر کِسی بدی سے ملے ہوئے ہیں
تو یہ سفیدی میں اک سیاہی کہاں سے آئی
اگر اندھیرے نہ روشنی سے ملے ہوئے ہیں
ہمارے حالات ہیں، ظفؔر، موت سے بھی بدتر
کہ ہم بظاہر تو زِندگی سے ملے ہوئے ہیں

-☆-

مقام ہی اور تھا جہاں سے ملے ہوئے تھے
کہ ہم زمیں سے نہ آسماں سے ملے ہوئے تھے
تمھیں ہی کچھ یاد ہو، کہ مَیں تو بُھلا چُکا ہُوں
کہاں سے بچھڑے تھے ہم، کہاں سے ملے ہوئے تھے
نکل رہے تھے تمام اطراف سے گذر کر
ہوا کے جھونکے جو بادباں سے ملے ہوئے تھے
سُنائے ہم نے بھی انجمن میں وہی کہ ہم کو
وہ چند ٹکڑے جو داستاں سے ملے ہوئے تھے
اخیر تک شہر بھر پہ کچھ بھی ہُوا نہ ظاہر
کہ راز بھی اپنے رازداں سے ملے ہوئے تھے
بجا ہے اپنائیت جو پیدا نہیں ہوئی تھی
مکین ہی کب یہاں مکاں سے ملے ہوئے تھے
چلا کیے ہیں معاملے ہی یہاں زبانی
کہ لوگ دل سے نہیں، زباں سے ملے ہوئے تھے
وہاں پہ مسجد سے باہر آواز کیسے جاتی
جہاں مؤذن ہی خُود اذاں سے ملے ہوئے تھے
ظفؔر، سزا بھی یہاں کہاں قاتلوں کو ملتی
کہ لکھنے والے تھے جو بیاں سے ملے ہوئے تھے

-☆-

چراغ تھے جس قدر ہوا سے ملے ہوئے تھے
یہاں پہ کفار بھی خُدا سے ملے ہوئے تھے
ابھی وہی فاصلہ تھا شہروں سے جنگلوں کا
مگر، یہ پھر بھی جگہ جگہ سے ملے ہوئے تھے
ندی کے ہم ایسے دو کنارے تو تھے، مگر ہم
کہیں کہیں پر ذرا ذرا سے ملے ہوئے تھے
اِسی میں شامل تھا میری جانب نہ دیکھنا بھی
یہ سارے حیلے تری حیا سے ملے ہوئے تھے
مرے سِتارے سے دُور کب تھا، ترا سِتارہ
ترے خلا بھی مرے خلا سے ملے ہوئے تھے
مَیں اندر اندر ہی اپنے تُجھ کو پُکارتا تھا
ترے سلیقے مری صدا سے ملے ہوئے تھے
کِسی بھی کوشش سے تیرے دریا کا رُخ نہ بدلا
اگرچہ آپس میں تیرے پیاسے ملے ہوئے تھے
دلوں میں ویسے تو ایک فرق آ گیا تھا، لیکن
الگ الگ بھی جُدا جُدا سے ملے ہوئے تھے
ظفؔر، اِرادے ہمارے اُس کے کہیں کہیں پر
کِسی اجازت، کِسی رضا سے ملے ہوئے تھے

-☆-

عرب سے اُٹھ کر کہیں عجم سے جُڑے ہوئے ہیں
زیادہ ہوتے ہوئے بھی کم سے جُڑے ہوئے ہیں
ہمارے ساتھ اُن کو آ کے جوڑا ہے مصلحت نے
کہیں نہیں جُڑ سکے تو ہم سے جُڑے ہوئے ہیں
اُکھڑ گئے تھے کِسی سبب سے تو اب دوبارہ
بڑا تردُّد کِیا ہے، گُم سے جُڑے ہوئے ہیں
تمھاری راہیں بھی اب تو مُشکل نہیں ہیں، لیکن
ابھی تو اپنے ہی پیچ و خم سے جُڑے ہوئے ہیں
کہیں پہنچتے ہیں یا نہیں، اِس کا ذِکر چھوڑو
قدم ہمارے کِسی قدم سے جُڑے ہوئے ہیں
ہم اپنی اوقات سے جو باہر نہیں نکلتے
ہماری خُوشیوں کے خواب غم سے جُڑے ہوئے ہیں
کِسی کا تحریر پر نہیں اختیار کوئی
کہ سارے کاغذ کِسی قلم سے جُڑے ہوئے ہیں
اب آخری بار اُس کے جلسے میں جائیں گے ہم
اُسے بھی لے کر مریں گے، بم سے جُڑے ہوئے ہیں
ظفؔر، کہ اُمیدوارِ جنت بھی ہیں سراسر
خُدا کے ہوتے ہوئے صنم سے جُڑے ہوئے ہیں

-☆-

بات سندیسا تھی اُس کی ، گفتگو پیغام تھا
دُور تھا وہ اور ہمارے رُوبرو پیغام تھا
جس نے موسم ہی بدل ڈالا تھا میرے ہر طرف
دفعتہً وہ ایک ایسا رنگ و بُو پیغام تھا
اِس سے اچھا کوئی موقع اور کیا ہوتا کہ وہ
تشنگی کے دشت میں جام و سبُو پیغام تھا
ایک طُوفانِ خزاں تھا جن دنوں چاروں طرف
اُس کے اندر ہی کوئی خوابِ نمُو پیغام تھا
کاٹ دی اُس کی وضاحت میں ہی ساری زندگی
ایسا پیچیدہ زمانے بھر میں تُو پیغام تھا
ایک سنگینی بھی تھی اُس میں کہیں رکھی ہوئی
دیکھنے میں تو کچھ ایسا نرم خُو پیغام تھا
یاد ہی رکھا نہ ہم نے ورنہ تو پہلے پہل
کُو بہ کُو اُس کا سبق تھا ، سُو بہ سُو پیغام تھا
ہم نہیں سمجھے تو اُس کا بھی بھلا کیا ہے قصُور
اک اشارہ سا تھا ، لیکن ہُوبہُو پیغام تھا
تھا یہی حاصل تنگ و تازِ معانی کا ، ظفرؔ
لفظ پیرایہ تھا اپنا ، اور لہُو پیغام تھا

-☆-

دربدر پیغام تھا یا جابجا پیغام تھا
دن سا اِک نکلا ہُوا تھا جیسے ، کیا پیغام تھا
پُھول پتّے بھی پسینے میں تھے جیسے تربتر
میری خاطر چلنے والی اک ہوا پیغام تھا
صِرف معنی اور مطلب ہی نہ تھا اُس کا کوئی
ورنہ کہنے کو تو وہ اچھا بھلا پیغام تھا
کوئی سُنتا ہی نہ تھا ، اِس کو سمجھنا تو بہت
دُور کی تھی بات ، جو میری صدا پیغام تھا
اہلِ دُنیا اپنے اپنے گز لیے پھرتے رہے
بات چھوٹی تھی ، مگر اُس میں بڑا پیغام تھا
سرزنش اُس میں ہمارے نام کی بھی تھی کوئی
دُوسروں کے واسطے جو آپ کا پیغام تھا
اک پُرانی ہی کوئی تکرار تھی انکار کی
ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ کوئی نیا پیغام تھا
چل رہا تھا مَیں ازل سے ، اور ، میرے سامنے
کوئی بھی منزل نہ تھی ، بس راستا پیغام تھا
اِس طرح لگتا نہ تھا باہر سے تو ، لیکن ، ظفرؔ
اندر اندر ہی کوئی بندِ قبا پیغام تھا

-☆-

وہ زمیں پیغام تھا ، یا آسماں پیغام تھا
خُود بھی وہ موجُود تھا اُس کا جہاں پیغام تھا
راستے تھے فاصلوں کو کاٹ کر چلتے ہوئے
گرد تھی ہر سمت ، کوئی کارواں پیغام تھا
تھے اشارے اور کنایے سے پسِ الفاظ کچھ
شور و شر میں ایک ایسا بے زُباں پیغام تھا
جس نے جو بویا تھا اُس نے کاٹنا بھی تھا ضرور
اور ، وہ سب کے لیے سُود و زیاں پیغام تھا
اس دفعہ تو یہ لطیفہ بھی رہا تھا میرے ساتھ
مَیں جہاں سے غیر حاضر تھا وہاں پیغام تھا
سُننے والا تھا نہ پہنچانے ہی والا تھا کوئی
ہر طرح اور ہر طرف سے رایگاں پیغام تھا
کچھ مکینوں کو خبر تھی ، اور کچھ تھے بے خبر
وہ مکاں پیغام تھا اور لامکاں پیغام تھا
شام تھی اور ٹُوٹتے تھے دم بہ دم تارے ، ظفؔر
صبح کی بھُولی ہُوئی اک داستاں پیغام تھا
کیوں بیاں اِس میں ظفؔر کچھ بھی نہیں تھا دُور دُور
کیوں سراسر اِس دفعہ طرزِ بیاں پیغام تھا

-☆-

کچھ نہیں سمجھا ہُوں ، اِتنا مختصر پیغام تھا
کیا ہوا تھی جس ہوا کے ہاتھ پر پیغام تھا
اُس کو آنا تھا کہ وہ مجھ کو بُلاتا تھا کہیں
رات بھر بارش تھی ، اُس کا رات بھر پیغام تھا
لینے والا ہی کوئی باقی نہیں تھا شہر میں
ورنہ تو اُس شام کوئی دربدر پیغام تھا
منتظر تھی جیسے خود ہی تنکا تنکا آرزُو
خار و خس کے واسطے گویا شرر پیغام تھا
کیا مُسافر تھے کہ تھے رنجِ سفر سے بے نیاز
آنے جانے کے لیے اک رہ گذر پیغام تھا
کوئی کاغذ ایک میلے سے لفافے میں تھا بند
کھول کر دیکھا تو اُس میں سر بہ سر پیغام تھا
ہر قدم پر راستوں کے رنگ تھے بکھرے ہُوئے
چلنے والوں کے لیے اپنا سفر پیغام تھا
کچھ صفت اُس میں پرندوں اور پتوں کی بھی تھی
کتنی شادابی تھی اور کیسا شجر پیغام تھا
اور تو لایا نہ تھا پیغام ساتھ اپنے ظفؔر
جو بھی تھا اُس کا یہی عیب و ہُنر پیغام تھا

-☆-

دِل کو رہینِ بندِ قبا مت کِیا کرو
ہے لاعلاج ، اِس کی دوا مت کِیا کرو
ویسے تو اختیار ہے سارا تمھیں ، مگر
جو ناروا ہے اُس کو روا مت کِیا کرو
توفیق تو ہوئی نہیں خیرات کی کبھی
کہتے ہیں اُس گلی میں صدا مت کِیا کرو
جو مِل گئے ہیں ، اُن کی تواضع کو چھوڑ کر
جو کھو گئے ہیں اُن کا پتا مت کِیا کرو
اِس کا معاملہ ہے جُدا ، وضع ہی کچھ اور
دِل میں حسابِ تنگیِ جا مت کِیا کرو
کچھ اور لوگ ہیں یہاں اِس کام کے لیے
واجب ہے جو بھی قرض ، ادا مت کِیا کرو
جیسا بھی ہے وہ یار ہے اپنا کھلاڈُلا
کچھ اِس لیے بھی خوفِ خُدا مت کِیا کرو
سچ ہے کہ ہم سے بات بھی کرنا نماز ہے
گر ہو سکے تو اِس کو قضا مت کِیا کرو
تُم سے تو ہے ظفؔر کا بس اِتنا مُطالبہ
خُود سے اُسے زیادہ جُدا مت کِیا کرو

-☆-

اِس کی تو کچھ خبر نہیں کیوں مت کِیا کرو
مَیں اِتنا جانتا ہُوں کہ یُوں مت کِیا کرو
جادُو ہے اک تمھاری خموشی میں بھی عجب
مجھ پر یہ گفتگو کا فسُوں مت کِیا کرو
آنکھوں کے آس پاس بھی نکلا کرو کبھی
دِل میں ہی اِتنی دیر سکوں مت کِیا کرو
مَیں نے تو کام لینا ہے اِن سے ابھی بہُت
میرے خیال و خواب کا خُوں مت کِیا کرو
خواہش کو دِل میں بیٹھنے دو جم کے ایک بار
اب اور اِسے درون و بروں مت کِیا کرو
نُقصان کوئی اس میں تمھارا بھی ہو نہ جائے
مایوسیوں کو اور فزوں مت کِیا کرو
مانا کرو بس ایک مری بات سربسر
اِس کے علاوہ جو بھی کہوں ، مت کِیا کرو
مقدُور بھر تو پہلے ہی رسوا ہُوں شہر میں
تم اور مجھ کو خوار و زبوں مت کِیا کرو
اُس کا خیال ہے کہ ظفؔر ، اُس کے سامنے
جو بھی کہے وہ ، تم کبھی چُوں مت کِیا کرو

-☆-

دِن رات میرے دل سے گذر مت کِیا کرو
اچھا نہیں ہے اِتنا سفر ، مت کِیا کرو
مُدّت کے بعد اِنھیں جو ہُوا ہے سکُوں نصیب
اِن پانیوں کو زیر و زبر مت کِیا کرو
ہو جائے گی ہماری ملاقات بھی کبھی
یہ خواب ہے تو اِس کو خبر مت کِیا کرو
اہلِ غرض بھی ہو کے جو کرتے نہیں سوال
ایسے گداگروں سے حذر مت کِیا کرو
مرضی سے اپنی جو بھی کرو ظلمِ ناروا
یہ دُوسروں کے زیرِ اثر مت کِیا کرو
رہنے دیا کرو یونہی خواب اور خواہشیں
سامان کو اِدھر سے اُدھر مت کِیا کرو
نُقصان بھی کبھی تو اُٹھانا ہی چاہیے
ہر کام بے زیان وضرر مت کِیا کرو
رونق انہی کے دم سے تمھارے جہاں میں ہے
خلقِ خُدا سے صَرفِ نظر مت کِیا کرو
دِل کا دُعا سے رابطۂ خاص ہے ظفؔر
یُوں امتیازِ شاخ و شجر مت کِیا کرو

-☆-

دِل میں طرح طرح کے گُماں مت کِیا کرو
کر لو تو اُن کو آگے بیاں مت کِیا کرو
طُغیانیاں بھی ہیں کہیں اندر چھپی ہُوئی
یخ بستہ پانیوں کو رواں مت کِیا کرو
رکھو کہیں کِسی کی پہنچ میں بھی جنسِ خواب
یعنی اِسے کچھ اِتنا گراں مت کِیا کرو
کہتے ہو کیا ، کہ میری تو پہچان ہی نہیں
جو خود نہیں ہے اُس کو نشاں مت کِیا کرو
دِل میں کِسی کے جم کے بھی بیٹھا کرو کبھی
اور ، آئے دِن یہ نقلِ مکاں مت کِیا کرو
کیوں بھسم ہی اُسے نہیں کرتے ہو ایک بار
آ کر ہمارے گھر میں دُھواں مت کِیا کرو
رونے پہ اختیار کِسے ہے ، کوئی بتائے
کہتے ہیں اِتنا شور یہاں مت کِیا کرو
یا پھر محاوروں کا رکھو ٹھیک سا خیال
یا پیرویِ اہلِ زباں مت کِیا کرو
دامانِ دِل پہ داغ نہ پڑ جائے ، اے ظفؔر
اتنا خیالِ لالہ رُخاں مت کِیا کرو

-☆-

ہزار بندشِ اوقات سے نکلتا ہے
یہ دن نہیں جو مری رات سے نکلتا ہے
وہ روشنی میں بھی ہوتا نہیں کہیں موجود
جو رنگ ماہِ مُلاقات سے نکلتا ہے
مجھے بہُت ہے جو خُوشبُو کا ایک جھونکا سا
کبھی کبھی ترے باغات سے نکلتا ہے
اِسی نواح میں آباد ہُوں کہیں مَیں بھی
دُھواں جو میرے مُضافات سے نکلتا ہے
دِل اور طرح کے حالات سے اُلجھتا ہُوا
کچھ اور طرح کے حالات سے نکلتا ہے
ثبُوت سارا ہمارے خلاف بھی اب تو
ہمارے اپنے بیانات سے نکلتا ہے
جو چاروں سمت گرانی کی ہے فراوانی
تو قحط بھی اِسی بہتات سے نکلتا ہے
وہ لحن جس کا سروکار ہی نہیں مجھ سے
کبھی تو وہ بھی مری ذات سے نکلتا ہے
ظفرؔ، یہ باعثِ تشویش بھی ہے سب کے لیے
جو مطلب اور مری بات سے نکلتا ہے

-☆-

وہ جس طرح کے بھی ہنگام سے نکلتا ہے
ہمارا کام ترے نام سے نکلتا ہے
کہیں وہ اپنے ہی کہرام سے نکلتا ہے
جو دیکھنے میں کِسی کام سے نکلتا ہے
ہے مُستحق وہ زیادہ تری توجُّہ کا
جو اپنے آپ ترے دام سے نکلتا ہے
ہے یہ بھی چیز مرے کام کی جو شُعلہ سا
تمھارے سلسلۂ شام سے نکلتا ہے
جو گھر میں گُھستا ہے اُودھم سا اِک مچاتا ہُوا
وہ باہر اُتنے ہی آرام سے نکلتا ہے
نوید ہو کہ نہ ہونے سے ہے مرا ہونا
شروع بھی مرا انجام سے نکلتا ہے
تو روشنی مرے دالان تک ہی رہتی ہے
جو ماہتاب کِسی بام سے نکلتا ہے
چلا جو کرتے ہیں مخصُوص لوگ ہی اُس پر
وہ راستہ روشِ عام سے نکلتا ہے
ظفرؔ، کِسی کے بھی پلّے نہ پڑ سکے بے شک
ہمارا کام تو ابہام سے نکلتا ہے

-☆-

جہاں یہ دل ترے جنجال سے نکلتا ہے
تو جیسے قیدِ مہ و سال سے نکلتا ہے
ابھی حساب نہیں ہو سکا ، ابھی اپنا
کچھ اور تیرے زر و مال سے نکلتا ہے
یہ راز کیا ہے کہ اِس بار میری حالت کا
سُراغ سا ترے احوال سے نکلتا ہے
سمجھتے ہیں کہ ترے گھر کا راستہ شاید
ہمارے سبزۂ پامال سے نکلتا ہے
تری جزا و سزا کا مُعاملہ بھی کہیں
ہمارے نامۂ اعمال سے نکلتا ہے
رواں ہیں دِل کی طرف سے ہرے بھرے آنسو
یہ چشمہ بھی اُسی پاتال سے نکلتا ہے
مَیں یادگار ہُوں اپنے پُرانے وقتوں کی
کہ ماضی اب بھی مرے حال سے نکلتا ہے
ابھی نہیں کِسی تفصیل کی طلب ہم کو
کہ مُدّعا ابھی اجمال سے نکلتا ہے
یہی ہیّت ہے کہ پرواز کے بجائے ، ظفرؔ
جو حوصلہ سا پَر و بال سے نکلتا ہے

-☆-

کہاں وہ کوششِ بسیار سے نکلتا ہے
جو کام طعنۂ اغیار سے نکلتا ہے
تجھے خبر نہیں ، پہلُو ہماری صحت کا
کبھی کبھی ترے آزار سے نکلتا ہے
کہاں پہنچتا ہے اِس کو ، یہ سب خبر ہے مجھے
جو راستہ ترے انکار سے نکلتا ہے
لگی ہے آگ تو دریا کے اِس کنارے پر
دُھواں سا کِس لیے اُس پار سے نکلتا ہے
ہوا نہ ہو بھی تو وقفوں کے ساتھ اب بھی کبھی
غُبار سا مرے آثار سے نکلتا ہے
ہمیں خبر ہے بہت ، اور ہی کوئی مطلب
ہماری گرمیِ گُفتار سے نکلتا ہے
کِیا ہے جمع تو یہ خاروخس ، اور اب دیکھیں
نتیجہ بھی کچھ اِس انبار سے نکلتا ہے
کبھی کبھی ہو برآمد بھی اِس مشین سے شعر
تو اِک تھکی ہُوئی رفتار سے نکلتا ہے
تعلُّق اپنی ہیّت لاتعلّقی کا ، ظفرؔ
کِسی ہمارے سروکار سے نکلتا ہے

-☆-

مزہ کچھ تو ملے گا موج کو منجدھار کرنے میں
بھلے مَیں ڈوب ہی جاؤں یہ دریا پار کرنے میں
محبت لفظ تھا، مُشکل بہُت پیش آئی تھی ہم کو
جسے مستُور رکھنے میں، جسے اظہار کرنے میں
یہ لگتا ہے لگے گی اور کافی دیر دُنیا کو
ہمیں اِک دن تمھارے خواب سے بیدار کرنے میں
تمھیں پہنچا ہو کوئی فائدہ اِس کا تو پہنچا ہو
ہمیں دوبارہ اِن حالات سے دوچار کرنے میں
ہماری موت کو کچھ اور بھی آسان ہونا تھا
ہماری زندگی کچھ اور بھی دشوار کرنے میں
کبھی لپکا تھا جن کو اِک جگہ مِل جُل کے رہنے کا
وہی اب مُستعد ہیں درمیاں دیوار کرنے میں
لگاتے اینٹ ایک آدھ اپنی بھی تعمیر میں کوئی
وہ جن کی عُمر گذری ہے مجھے مسمار کرنے میں
گڑھے بھی کھودنے کا کام ساتھ اُس کے رہا جاری
بہت مصروف تھے جب راستا ہموار کرنے میں
ظفرؔ کِس سے شکایت کیجیے جا کر، کہ بیش و کم
ہمارا ہاتھ بھی ہے اُس کو دنیادار کرنے میں

-☆-

ہیں نُقصانات یُوں تو اور بھی تعجیل کرنے میں
مَیں خُود معدوم ہو جاتا ہُوں کچھ تشکیل کرنے میں
ہمارا وقت بھی اچھا گذر جاتا ہے اور تم بھی
ہُنرمندی بہت رکھتے ہو قال و قیل کرنے میں
محبت پر ذرا اِک تازگی آ جائے گی اِس سے
سو کیا نقصان ہے لمبی سی اک تعطیل کرنے میں
کئی فرمایشیں ہیں اور بھی اِس طرح کی، یہ بھی
رُکاوٹ ہے تمھارے حکم کی تعمیل کرنے میں
اِسی مصروفیت میں رات دِن رہتے ہیں کیا کچھ
کہیں ارسال ہونے میں، کہیں ترسیل کرنے میں
مَیں اُن الفاظ کا بہتر کوئی مصرف نکالوں گا
جو استعمال ہوں گے آپ کی تذلیل کرنے میں
بُرا بھی شعر کہنے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے
مدد کرتا ہے مُنہ کا ذائقہ تبدیل کرنے میں
نکالی ہیں کئی خود شعر کی زنجیر سے کڑیاں
مکمّل صُورتِ اظہار کی تقلیل کرنے میں
ظفرؔ، اِس کو ادھورا چھوڑ دو اب بھی تو بہتر ہے
پریشاں ہو بہت جس کام کی تکمیل کرنے میں

-☆-

جہاں پہ ہونا نہیں ، وہیں سے لگے ہوئے ہیں
کہ آسماں پر ہیں ، اور ، زمیں سے لگے ہوئے ہیں

یہ پھول ہم نے چُنے ہوئے ہیں اِسی چمن سے
یہ زخم شاید ہمیں یہیں سے لگے ہوئے ہیں

مَیں خود تو پندار اپنا قائم رکھے ہوئے تھا
ہزار سجدے مری جبیں سے لگے ہوئے ہیں

تمھارا چہرہ کہ دیدنی اب ہُوا ہے جا کر
تمھارے پیچھے تو قبل ازیں سے لگے ہوئے ہیں

جو ایک پل میں جھلک دِکھا کر پلٹ گیا تھا
سو ، ہم اُسی خوابِ واپسیں سے لگے ہوئے ہیں

سمجھ رہے ہیں کہ ربط ہے اُستوار ، یعنی
مکاں سے باہر ہیں ، اور مکیں سے لگے ہوئے ہیں

جہاں بھی ہو اب ہمارا ٹوٹا ہُوا سفینہ
ہم اپنے اسبابِ تہ نشیں سے لگے ہوئے ہیں

یہ کام اپنا ہے ، جس قدر بھی ہے ، اور جس میں
لگے ہوئے ہیں جہاں کہیں سے لگے ہوئے ہیں

ظفر ، اگر کوئی خاروخس ہیں تو کِس لیے ہم
خُود اپنی آوازِ آتشیں سے لگے ہوئے ہیں

-☆-

گُل و چمن سے نہ رنگ و بُو سے لگے ہوئے ہیں
ابھی تو ہم صِرف گُفتگُو سے لگے ہوئے ہیں

نہیں لگے تھے تو ہم نہیں تھے کِسی طرف بھی
جو لگ گئے ہیں تو چار سُو سے لگے ہوئے ہیں

کبھی کوئی موج اُچھل بھی سکتی ہے اپنی جانب
اِسی لیے تو کنارِ جُو سے لگے ہوئے ہیں

یہیں کہیں اپنے آپ کو گُم کِیا ہُوا تھا
سو ، آج اپنی ہی جُستجو سے لگے ہوئے ہیں

چلو ، ہمارا نہیں ، کِسی کا تو ہے جو اب تک
سڑک پہ بکھرے ہوئے لہُو سے لگے ہوئے ہیں

یہ نرم کوشی ہماری حد سے بڑھی ہوئی تھی
اِسی لیے ایک تُند خُو سے لگے ہوئے ہیں

یہ ناتوانی ہماری جیسی بھی تھی ، مگر ، ہم
یہ دیکھیے کیسے دُوبدُو سے لگے ہوئے ہیں

ہر آن ذِلّت ہے ، اور ، رسوائی ہے شب و روز
سو ، کام ہے ، عزّت آبرو سے لگے ہوئے ہیں

ظفر ، ابھی ٹھیک سے ہمیں بھی خبر نہیں ہے
کہ آج کل کِس کی آرزُو سے لگے ہوئے ہیں

-☆-

ظفؔر ، یہ کِس طرح کے سفر میں پڑے ہوئے ہیں
کہ ایسے لگتا ہے جیسے گھر میں پڑے ہوئے ہیں
نکل تو آئے ہیں شہر سے ہم کِسی بہانے
یہی بہت ہے کہ رہگذر میں پڑے ہوئے ہیں
چُھپا ہُوا ہے جہاں یہ اعلان مختصر سا
ہم اپنے مرنے کی اُس خبر میں پڑے ہوئے ہیں
سمجھ سکو تو نہاد میری بھی ہے اُنھی پر
وہ خاک پارے جو دشت و در میں پڑے ہوئے ہیں
وہیں پہ ہر چیز ہے جہاں ہونا چاہیے تھی
فساد خُوں میں ، فتُور سر میں پڑے ہوئے ہیں
کِسی کو پروا نہیں کِسی کی ، مگر ہم ایسے
جو ڈر رہے تھے یہاں خطر میں پڑے ہوئے ہیں
یہ خاک ہے ، اور ، زور کرتی ہوئی روانی
کئی سفینے ابھی بھنور میں پڑے ہوئے ہیں
یہ آج تک بھی الگ نہیں کر سکا ہُوں اِن کو
جو عیب ہیں ، اور مرے ہُنر میں پڑے ہوئے ہیں
جو بجلیوں کے رہے ، ظفؔر ، منتظر ہمیشہ
وہ آشیانے ابھی شجر میں پڑے ہوئے ہیں

-☆-

الگ الگ ، اور ، جابجا میں پڑے ہوئے ہیں
ہوا کے ٹکڑے ابھی ہوا میں پڑے ہوئے ہیں
کوئی مُلاقات ، کوئی مُہلت ، کوئی محبت
یہ مرحلے سب مری دُعا میں پڑے ہوئے ہیں
پہنچ گئی ہے کہاں سے دنیا کہاں ، مگر ، ہم
یہاں اُسی وعدۂ وفا میں پڑے ہوئے ہیں
نہ جانے کیوں وہ بھی اپنی ضد پر اڑا ہُوا تھا
سو ، ہم بھی اپنی کِسی انا میں پڑے ہوئے ہیں
ہمیں خبر تھی کہ اُس کی تعبیر کیا ہے ، پھر بھی
ابھی اُسی خوابِ خُوش نُما میں پڑے ہوئے ہیں
زمین پر تھا اِسی طرح قصۂ زمیں بھی
خلا کے احوال بھی خلا میں پڑے ہوئے ہیں
ہمیں عبث ڈُھونڈتی تھی دنیا ، وگرنہ ہم بھی
یہیں کہیں خیمۂ خُدا میں پڑے ہوئے ہیں
جنھیں کبھی کوئی آنکھ بھر کر نہ دیکھ پایا
کچھ ایسے منظر ابھی فضا میں پڑے ہوئے ہیں
ظفؔر ، اِنھیں کھولنے کو بھی وقت چاہیے تھا
کہ پیچ ایسے مری نوا میں پڑے ہوئے ہیں

-☆-

اگرچہ ہم لوگ داستاں میں پڑے ہوئے ہیں
مگر، ابھی معرضِ بیاں میں پڑے ہوئے ہیں
زمین پر ہیں نہ آسماں میں پڑے ہوئے ہیں
نہیں بھی ہیں، اور ترے جہاں میں پڑے ہوئے ہیں
گِریں، مگر، واپس آسماں کو پلٹ گئی تھیں
جو بجلیوں کے پر آشیاں میں پڑے ہوئے ہیں
ابھی کِسی رہزنی کا ہے انتظار ہم کو
ابھی جو کچھ دن تری اماں میں پڑے ہوئے ہیں
ہماری ہستی بھی عکس ہے تیری نیستی کا
کہ وہم ہیں، اور، ترے گماں میں پڑے ہوئے ہیں
نظر ہی پڑتی نہیں خریدار کی تو ہم پر
کچھ اِس طرح سے کِسی دُکاں میں پڑے ہوئے ہیں
کچھ اِس نہ ہونے میں ہی کہیں تھا ہمارا ہونا
ہمارے نقشے اِسی نشاں میں پڑے ہوئے ہیں
ابھی جو تعمیر ہونے والا ہے اپنی خاطر
سو، ہم ازل سے اُسی مکاں میں پڑے ہوئے ہیں
زمین سے بھی، ظفر، نظر آنا چاہیں تھے
مرے ستارے جو کہکشاں میں پڑے ہوئے ہیں

-☆-

یہ موت ہے یا کہ زندگی میں پڑے ہوئے ہیں
کِسی سے باہر ہیں، اور کِسی میں پڑے ہوئے ہیں
ہمارے سر سے گذرنے والا ہے رنگپانی
جو ہم یہاں اپنی سادگی میں پڑے ہوئے ہیں
لطیفہ یہ ہے، وہی کِسی کو نظر نہ آئے
کہ جو یہاں تیز روشنی میں پڑے ہوئے ہیں
اِبھی سے گذرے گا کوئی تازہ ہوا کا جھونکا
یہ اِتنے رخنے جو دوستی میں پڑے ہوئے ہیں
لباس کی طرح سے اِرادہ بدل لیا ہے
کہ جو ابھی میں تھے، اب کبھی میں پڑے ہوئے ہیں
یہی محبت ہے آئے دِن کی کوئی مصیبت
نکل کے پہلی سے دوسری میں پڑے ہوئے ہیں
وہ آپ نے ہم کو جس گڑھے سے نکالنا تھا
کئی زمانوں سے ہم اُسی میں پڑے ہوئے ہیں
پنپ رہی کوئی ابتری سی ہے اندر اندر
کہ ہم بظاہر تو بہتری میں پڑے ہوئے ہیں
ظفر، ہر اک شے سے جیسے برکت ہی اٹھ گئی ہے
بہُت زیادہ کِسی کمی میں پڑے ہوئے ہیں

-☆-

رہ رہ کے زبانی کبھی تحریر سے ہم نے
قائل کیا اُس کو اِسی تدبیر سے ہم نے
کِس سمت لیے جاتے ہو، اور کیا ہے ارادہ
پوچھا نہ کبھی اپنے عناں گیر سے ہم نے
دل پر کوئی قابُو نہ رہا جب تو کِسی طور
باندھا ہے یہ وحشی تری زنجیر سے ہم نے
ہر بار مدد کے لیے اوروں کو پکارا
یا کام لیا نعرۂ تکبیر سے ہم نے
بہتر ہے کہ اب کام کوئی اور کِیا کر
یہ بھی نہ کہا کاتبِ تقدیر سے ہم نے
اپنی ہی کرامات دِکھاتے رہے سب کو
سرقہ نہ کِیا مُعجزۂ میؔر سے ہم نے
تخریب تو کرتے رہے سو طرح کی، لیکن
یہ کام کِیا جذبۂ تعمیر سے ہم نے
اب دیکھیے کیا اِس کا نکلتا ہے نتیجہ
ماتھا ہے لگایا ہُوا تاثیر سے ہم نے
وہ بامِ تماشا ہُوا غائب تو، ظفؔر آج
لٹکا لیا خود کو کِسی شہتیر سے ہم نے

-☆-

بدلہ یہ لیا حسرتِ اظہار سے ہم نے
آغاز کِیا اپنے ہی انکار سے ہم نے
دروازہ نہیں اپنے سروکار میں شامل
ہے رابطہ رکھا ہُوا دیوار سے ہم نے
امکان سا کھولا ہُوا ساحل کی ہوا پر
اُمید سی باندھی ہوئی اُس پار سے ہم نے
اپنی ہی بگاڑی ہوئی صُورت کے علاوہ
کچھ اور نکالا نہیں طُومار سے ہم نے
اُس کا بھی کوئی فائدہ پہنچا نہ کِسی کو
آساں جو برآمد کیا دُشوار سے ہم نے
منزل جو ہماری تھی، کہیں رہ گئی پیچھے
یہ کام لیا تندیِ رفتار سے ہم نے
یہ دُھوپ ہی تھی اپنی گذرگاہ، سو، رکھا
اک فاصلہ بھی سایۂ اشجار سے ہم نے
جانچا ہے کِسی اور طریقے سے یہ سب کچھ
پرکھا ہے کِسی اپنے ہی معیار سے ہم نے
اُس کی بھی ادا کی ہے، ظفؔر آج تو قیمت
جو چیز خریدی نہیں بازار سے ہم نے

-☆-

جوڑا ہے کِسی اور ہی انجام سے ہم نے
کرنا تھا جو آغاز ترے نام سے ہم نے

مصروفیت اپنے لیے گھر میں ہی نکل آئی
جانا تھا وہاں پر بھی کِسی کام سے ہم نے

رکھتی ہے پریشاں بھی وہی حد سے زیادہ
جو بات سُنی تھی بڑے آرام سے ہم نے

تادیر ہی رہنا تھا یہاں ذِکر تمھارا
کچھ لوگ بُلائے ہوئے تھے شام سے ہم نے

وہ شامتِ اعمال تھی اپنی کوئی ، ورنہ
اک فاصلہ رکھا ہُوا تھا دام سے ہم نے

اک چیز منگائی تھی بہُت دُور سے اُس رات
اک چاند اُتارا تھا لبِ بام سے ہم نے

جس شور سے قائم ہوئی پہچان ہماری
مُنہ موڑ لیا تھا اُسی کہرام سے ہم نے

پہلے تو نہیں تھی کوئی لوگوں کی توجّہ
سو کام نکالے ترے الزام سے ہم نے

تھا باعثِ رُسوائی ، ظفر ، اپنا وہی کام
ہٹ کر جو کِیا ہے روشِ عام سے ہم نے

-☆-

ٹکرا دیا بھرپور کو پایاب سے ہم نے
بدلا ہے ترا خواب کِسی خواب سے ہم نے

ایک اور طرح کی چمک اُس میں نظر آئی
دیکھا جو اندھیرے کو تب و تاب سے ہم نے

اک راز چھلکتا ہُوا ، دُشمن کی زباں پر
اک رنگ چھپایا ہُوا احباب سے ہم نے

رشتہ کوئی جوڑا ہُوا شاور سے شب و روز
ناتا کوئی توڑا ہُوا تالاب سے ہم نے

اوکاڑہ سے لاہور ہی پہنچی ہے بمشکل
آواز اٹھائی تھی جو پنجاب سے ہم نے

سرگرمیاں اپنی رہیں ملتان کی حد تک
اُمید لگا رکھی ہے خوشاب سے ہم نے

دُشنام طرازی پہ بھی مجبور ہوئے جب
کی ہے یہاں وہ بھی ادب آداب سے ہم نے

ظاہر ہے ، شکوتی ہوئی شُہرت میں اضافہ
ناچار کِیا جس پر سُرخاب سے ہم نے

دیوار ہی پھاندی ہے ، ظفر ، اُس کی ہمیشہ
زحمت نہیں کی کُھلتے ہوئے باب سے ہم نے

-☆-

ہوتے گئے تھے جمع ہی ارمان ہمارے
سارے جو ہوئے خواب پریشان ہمارے

خوش فہم تھے اِتنے کہ سمجھتے رہے ، خود ہی
اچھے کبھی ہو جائیں گے سرطان ہمارے

شب جنگ عدو سے رہی ، جاگے تو یہ دیکھا
ہاتھوں میں تھے اپنے ہی گریبان ہمارے

آبادیاں گُنجان تھیں باہر سے ہی اُتنی
اندر سے یہی شہر تھے سُنسان ہمارے

بادل کو ہوا لے گئی ہر بار اُڑا کر
ساون میں بھی سُوکھے ہی رہے دھان ہمارے

مضبُوط نہ تھا ہم سے کبھی کُفر تو اِتنا
لیکن ، ذرا کمزور تھے ایمان ہمارے

اشیاے خوردونوش کی قلت ہوئی جب سے
بچّوں ہی سے بھرپور ہیں دالان ہمارے

جس بات پہ یہ فخر کِیا کرتے تھے اِتنا
ہیں اُس پہ ہی اب لوگ پشیمان ہمارے

ہوتا رہا اندر تو ، ظفر ، گھر کا صفایا
سویا کیے باہر کہیں دربان ہمارے

-☆-

چلتی نہیں اب کوئی جو تدبیر ہماری
آتی ہے کہیں اور سے تقدیر ہماری

پیتل ہُوا جاتا ہے بنایا ہُوا سونا
اور ، راکھ ہوئی جاتی ہے اکسیر ہماری

سیدھا تھا اگر راستہ اپنا تو بھلا کیوں
اُلٹی ہوئی ہر خواب کی تعبیر ہماری

کچھ ہم بھی خموشی سے بُھگت لیتے ہیں تعزیر
کچھ وہ بھی بتاتے نہیں تقصیر ہماری

رخنہ جو کبھی اِس میں پڑا تھا کہیں پہلے
ویسی ہی رُکی رہ گئی تعمیر ہماری

دیوانہ پن اگلا سا وہ باقی بھی نہیں اب
کچھ کھول بھی رکھتے ہیں وہ زنجیر ہماری

جلسے جو ہیں سُنسان ، جُلوس اپنے ہیں ویران
آتا نہیں سُننے کوئی تقریر ہماری

دُشمن کے مُقابل تھے صف آرا تو بہت ہم
پر ، نیام سے نکلی نہیں شمشیر ہماری

بولا ہے ، ظفر ، جُھوٹ ہی لوگوں سے کُچھ اِتنا
اب آئے گی کیا بات میں تاثیر ہماری

-☆-

پتا نہیں چل رہا کہاں سے بندھے ہوئے ہیں
زمیں پہ ہیں اور آسماں سے بندھے ہوئے ہیں
ہماری وابستگی کوئی راز بھی نہیں اب
وہیں سے کھولو ہمیں جہاں سے بندھے ہوئے ہیں
نہیں کسی کے بھی پاس تحریر تو ہماری
بندھے ہوئے ہیں تو بس زباں سے بندھے ہوئے ہیں
گواہی اپنے خلاف جھوٹی تو تھی ، مگر ہم
جو دے چکے ہیں اُسی بیاں سے بندھے ہوئے ہیں
فریبکاری ہے سربسر بندوبست اپنا
جہاں سے لگتے نہیں وہاں سے بندھے ہوئے ہیں
تھا ایکدم مُشکل اور آساں ہمارا ملنا
ہیں بے سُراغ اور کسی نشاں سے بندھے ہوئے ہیں
ہمیں کناروں سے دُور لے جا رہے ہیں یکسر
ہوا کے جھونکے جو بادباں سے بندھے ہوئے ہیں
ہماری حیثیت اِس سے بڑھ کر نہیں ہے کوئی
غبار ہیں اور کارواں سے بندھے ہوئے ہیں
نکل کے جاتے بھی ہم یہاں سے ظفرؔ کہیں کو
مگر کریں کیا کہ اِس مکاں سے بندھے ہوئے ہیں

-☆-

کسی بہانے سے اب دوبارے کُھلے ہوئے تھے
کہ حبس تھا اور بٹن تمہارے کُھلے ہوئے تھے
ابھی مَیں سمتِ سفر ہی طے کر نہیں سکا تھا
مرے لیے راستے جو سارے کُھلے ہوئے تھے
مچی ہوئی کوئی جیسے بھگدڑ تھی آسماں پر
بندھی ہوئی تھی ہوا ، ستارے کُھلے ہوئے تھے
یہاں جو تھا انتظار دریا کو پانیوں کا
مثالِ آغوش کیا کنارے کُھلے ہوئے تھے
اِسی لیے پھر پھرا کے مَیں واپس آ گیا ہُوں
کہ میرے اِس شہر میں گزارے کُھلے ہوئے تھے
وہاں کہیں میں ہی چوک میں آ کے رُک گیا تھا
جہاں مرے سامنے اِشارے کُھلے ہوئے تھے
کہ شہر سے جیسے کوچ ہی کر رہا تھا مَیں اب
حساب جتنے تھے میرے بارے کُھلے ہوئے تھے
پڑھا ہُوا ذہن سے کُھرچنے کی خاطر اب تو
قدم قدم پر یہاں ادارے کُھلے ہوئے تھے
ظفرؔ، کسی چور نے بھی شب بھر نہ کی توجّہ
وگرنہ دروازے تو ہمارے کُھلے ہوئے تھے

-☆-

ہمارے اندر تو کوئی باہر لکھے ہوئے تھے
کہ فیصلے جو بھی تھے ، برابر لکھے ہوئے تھے

جنھیں مِٹایا تھا ہم نے دیوارِ دوستی سے
وُہ سارے مضمون اب ہوا پر لکھے ہوئے تھے

کوئی کھنڈر تھا اور اُس کی مِٹتی ہوئی عبارت
مُنڈیر تھی ، اور وہاں کبُوتر لکھے ہوئے تھے

خُدا کی قُدرت ہے لہلہائیں اُنھی میں فصلیں
جو کھیت پٹواریوں نے بنجر لکھے ہوئے تھے

وہ دُور آبِ سراب کا دُھوپ میں چمکنا
ہمارے صحراؤں پر سمُندر لکھے ہوئے تھے

ہماری قرأت ہی ڈھنگ سے کر سکا نہ کوئی
کہ ہم ذرا دوسروں سے ہٹ کر لکھے ہوئے تھے

کتاب میں رہ گئے تھے بھرتی کے خواب سارے
وہی حذف کر دیے جو بہتر لکھے ہوئے تھے

کبھی نہیں کھولنے بچھانے کی نوبت آئی
ہماری تقدیر میں جو بستر لکھے ہوئے تھے

کئی ظفر عُمر جن کی ساری مُسافرت میں
اُنھی کے ناموں کے سامنے گھر لکھے ہوئے تھے

-☆-

اصل تھا یا کِسی ہونے کا اشارہ ہُوا مَیں
صُورتِ حال تھی ایسی کہ دوبارہ ہُوا مَیں

خُود کو پہچان سکوں گا کہیں رفتہ رفتہ
کِسی اپنی ہی بُلندی سے اُتارا ہُوا مَیں

چین سے بیٹھنے دیتی نہیں آواز کوئی
ہُوں کِسی دُوسری دنیا کا پُکارا ہُوا مَیں

کہیں تیرا تو وہاں نام و نشاں تک نہیں تھا
جہاں پہنچا ترے رستے سے گزارا ہُوا مَیں

موج در موج سمُندر مرے اُوپر نیچے
کہ ڈبویا ہُوا ہُوں اور نہ اُبھارا ہُوا مَیں

ناپسندیدہ ہی جیتا رہا اِس دُنیا میں
آخری عُمر میں اب جا کے گوارا ہُوا مَیں

زندگی بھر کبھی یکساں مری تقدیر نہ تھی
کبھی آدھا ہُوا ہُوں اور کبھی سارا ہُوا مَیں

کِس طرح آئی ہے یہ اِتنی بڑی تبدیلی
کبھی اپنا بھی نہیں تھا جو تمھارا ہُوا مَیں

ریت ہی تھا کِسی سُوکھے ہوئے دریا کی ظفر
اب جو پانی نظر آیا تو کنارہ ہُوا مَیں

-☆-

بے نام جس قدر ہیں اُنھیں نام دے سکوں
شاید یہ کارنامہ سرانجام دے سکوں
اِس حال میں بھی میری تمنا ہے یہ کہ مَیں
کام آ سکوں ترے کہ تجھے کام دے سکوں
ہارا ہُوں آپ اور مجھے اُس کی تلاش ہے
اپنی شکست کا جسے الزام دے سکوں
اِتنا بھی کامیاب نہیں ہو سکا کہ مَیں
کوئی ثبوتِ کوششِ ناکام دے سکوں
اِتنا تو اختیار مجھے ہونا چاہیے
جس کو دُعا نہ دُوں اُسے دُشنام دے سکوں
مُشکل میں ہے جو اُس کو سہولت کرُوں بہم
مطلُوب ہو جسے اُسے آرام دے سکوں
مجھ سے سوال اُس نے کِیا ہے جو صبح دم
اُس کا جواب مَیں بھی سرِشام دے سکوں
دیکھیں تو یہ بھی فرضِ کفایہ ہے سربسر
دِل کا اگر کہیں اُسے پیغام دے سکوں
چھپ کر مرا سُراغ نہ لیتا پھرے، ظفؔر
یہ مشورہ اُسے جو سرِعام دے سکوں

-☆-

الگ الگ اور جُدا جُدا سے بندھے ہوئے ہیں
چراغ ہیں اور کِسی ہوا سے بندھے ہوئے ہیں
ہم اپنی مجبوریوں میں رہتے ہیں جیتے مرتے
کبھی خموشی، کبھی صدا سے بندھے ہوئے ہیں
جو ہم سے مِلنا تو بس ذرا احتیاط رکھنا
کہ ٹُوٹ کر ہم جگہ جگہ سے بندھے ہوئے ہیں
ہے اپنی یہ سنگ بستگی ہی ہمارا ہونا
ہمیں نہ کھولو کہ ہم سدا سے بندھے ہوئے ہیں
ہم اُس سے آزاد ہو رہے ہیں ضرور لیکن
ابھی کسر ہے کوئی، ذرا سے بندھے ہوئے ہیں
یہاں کئی لوگ اب بھی موجود ہیں جو اپنی
پھٹی پُرانی اُسی وفا سے بندھے ہوئے ہیں
نکل نہ سکتے تھے کوچۂ کُفر کی طرف کو
کہ ہم زمانہ ہُوا خُدا سے بندھے ہوئے ہیں
خلاف اُس کے ہے نالشِ وصل اپنی جاری
کہ مدعی ہیں سو مدعا سے بندھے ہوئے ہیں
ظفؔر یہ لگتی ہے دُشمنوں کی ہی کوئی سازش
جو ہم کِسی یارِ آشنا سے بندھے ہوئے ہیں

-☆-

کبھیں ہم اپنی ہی بے کرانی میں رہ گئے ہیں
سو ، کم ہیں باہر ، زیادہ پانی میں رہ گئے ہیں
بُرا بھلا واقعہ ہی کچھ باہر آ سکا ہے
ہمارے کردار سب کہانی میں رہ گئے ہیں
پہنچ گیا ہے یہاں کہیں کا کہیں زمانہ
مگر ، ہمیں تیری باغبانی میں رہ گئے ہیں
کبھی کناروں میں رُک گیا راستہ ہمارا
کبھی کِسی زور کی روانی میں رہ گئے ہیں
ترا فسوں ہی ترے فسانے میں بولتا ہے
ترے نشاں ہی تری نشانی میں رہ گئے ہیں
شکایت اُن کی بھی کوئی بے جا نہیں زیادہ
کوئی تو رخنے بھی رازدانی میں رہ گئے ہیں
وہاں پہ وہ انقلاب آنا ہی تھے جو آئے
کہ مست ہم اپنی خُوش گمانی میں رہ گئے ہیں
کوئی کسر رہ گئی ہے الفاظ میں کہیں پر
کئی دقیقے یہاں معانی میں رہ گئے ہیں
مُطالبات اے ظفرؔ ہمارے لکھے ہوئے تھے
جو رہ گئے ہیں تو کُچھ زُبانی میں رہ گئے ہیں

-☆-

کُچھ سبب ہی نہ بنے بات بڑھا دینے کا
کھیل کھیلا ہُوا یہ اُس کو بھلا دینے کا
اپنے ہی سامنے دیوار بنا بیٹھا ہُوں
ہے یہ انجام اُسے رستے سے ہٹا دینے کا
یونہی چُپ چاپ گذر جایئے اِن گلیوں سے
یہاں کچھ اور ہی مطلب ہے صدا دینے کا
راستہ روکنا مقصد نہیں ، کچھ اور ہے یہ
درمیاں میں کوئی دیوار اُٹھا دینے کا
آنے والوں کو ، طریقہ مجھے آتا ہے بہُت
جانے والوں کے تعاقُب میں لگا دینے کا
ایک مقصد تو ہُوا ڈھونڈنا اُس کو ہر سُو
لُطف ہی اور ہے پانے سے گنوا دینے کا
اِک ہُنر پاس تھا اپنے ، سو نہیں اب وہ بھی
جو دِکھائی نہیں دیتا ہے دِکھا دینے کا
سب کو معلُوم ہے ، اور حوصلہ رکھتا ہُوں ابھی
اپنے لکھے ہوئے کو خود ہی مِٹا دینے کا
ٹُوٹ پڑتی ہے قیامت کوئی پہلے ہی ، ظفرؔ
قصد کرتا ہُوں جو فتنے کو جگا دینے کا

-☆-

ہیں نقشِ دیوار ، جابجا سے مٹے ہوئے ہیں
سو، کچھ تو بارش سے ، کچھ ہوا سے مٹے ہوئے ہیں
گھر اور باہر ہماری حالت ہے ایک جیسی
یہاں الگ سے ، وہاں جُدا سے مٹے ہوئے ہیں
زیادہ بدلے نہیں ہیں کچھ خال و خد ہمارے
ہنوز باقی تو ہیں ، ذرا سے مٹے ہوئے ہیں
بُجھے ہوئے ہیں کئی ستارے سے آسماں پر
جو رہگذر پر بھی نقشِ پا سے مٹے ہوئے ہیں
حدیں ہیں ، اور ، تیرے دم قدم سے ہیں غیر واضح
حروف ہیں ، اور ، مری صدا سے مٹے ہوئے ہیں
ہمارا مٹنا بھی اِک تماشا تھا ، آؤ دیکھو!
مٹے ہوئے ہیں تو کِس ادا سے مٹے ہوئے ہیں
وہ اصل صُورت میں اپنی خود بھی نہ آئیں گے اب
جو تیری مرضی ، تری رضا سے مٹے ہوئے ہیں
قصُور اِس میں کہیں کِسی اور کا نہیں ہے
کہ ہم کِسی اپنی ہی خطا سے مٹے ہوئے ہیں
ظفر ، وہ تحریر ہیں جسے پڑھ سکے نہ کوئی
کٹے پھٹے ، اور ، جگہ جگہ سے مٹے ہوئے ہیں

-☆-

بُجھے بُجھے ، اور ، راستوں پر پڑے ہوئے ہیں
کہ ہم ستارے ترے فلک سے جھڑے ہوئے ہیں
ہوائیں بھی اپنے راستوں پر رواں ہیں یوں ہی
درخت بھی ایک خامشی میں کھڑے ہوئے ہیں
ہماری نسبت ہے خاک سے ، اور ، ثبوت یہ ہے
کہ آج زندہ ہی اِس زمیں میں گڑے ہوئے ہیں
یہ کیفیت ہے کہ اب سنبھالے نہیں سنبھلتے
مَیں خوش نہیں ہُوں جو میرے دریا چڑھے ہوئے ہیں
کوئی زمانہ تھا ، ہم یہاں خواب تھے کِسی کا
اور ، اب کِسی اور ہی کے ماتھے مڑھے ہوئے ہیں
کہاں تک اِس راستے پہ جانا ہے ، سب خبر ہے
کہ یہ سبق ہم بھی تھوڑا تھوڑا پڑھے ہوئے ہیں
نہیں ہے کوئی جو پیش رفت اپنی روک سکتا
غلط نہیں ہے کہ اپنی حد سے بڑھے ہوئے ہیں
کِسی کے پلّے ہی کیا پڑے شاعری ہماری
کہ لفظ کچھ بےحساب ہم نے جڑے ہوئے ہیں
مزاج ہی مِل نہیں رہا ہے ، ظفر کچھ اپنا
کہ آپ تو جیسے ہر کِسی سے لڑے ہوئے ہیں

-☆-

عجب نہیں ہے جو رفتگاں سے جُڑے ہوئے ہیں
زمیں پہ آ کر بھی آسماں سے جُڑے ہوئے ہیں

بہت صفائی سے ہم کو جوڑا گیا ہے اب کے
پتا نہیں چل رہا کہاں سے جُڑے ہوئے ہیں

ذرا سی ٹھوکر میں ٹوٹ سکتے ہیں پھر وہیں سے
خیال رکھنا جہاں جہاں سے جُڑے ہوئے ہیں

جب آئے دِن بجلیاں لپکتی ہیں اپنی جانب
تو کِس لیے شاخِ آشیاں سے جُڑے ہوئے ہیں

سفر میں یوں تو کِسی نے شامل نہیں کِیا تھا
مگر، کِسی طرح کارواں سے جُڑے ہوئے ہیں

کبھی تھے پیوستہ ایک خوابِ خزاں نُما سے
اور، اب کِسی رنجِ رایگاں سے جُڑے ہوئے ہیں

کہیں کِسی گُم شُدہ سِتارے کی جُستجو ہے
جو آج بھی تیری کہکشاں سے جُڑے ہوئے ہیں

ہم اپنی وابستگی کا احوال کیا بتائیں
جہاں نہیں بھی تھے ہم وہاں سے جُڑے ہوئے ہیں

ظفرؔ، ہماری یہ بےبسی کوئی آ کے دیکھے
زُباں کو توڑا ہے، اور، زُباں سے جُڑے ہوئے ہیں

-☆-

کِسی گُماں سے، کِسی یقیں سے جُڑے ہوئے ہیں
کہیں سے اُکھڑے ہوئے کہیں سے جُڑے ہوئے ہیں

کُچھ ایسی پیچیدہ تو نہیں ہے جُڑت ہماری
جہاں سے توڑا گیا، وہیں سے جُڑے ہوئے ہیں

ہمیں جُدائی نہیں تھی اُس ذات سے گوارا
اِسی لیے اپنے ہم نشیں سے جُڑے ہوئے ہیں

کوئی سلوک آسماں نے اچھا نہیں کِیا تھا
سو، اپنی چھوڑی ہوئی زمیں سے جُڑے ہوئے ہیں

یہ زہر شاید کبھی ہمارے بھی کام آئے
ضرورتاً مارِ آستیں سے جُڑے ہوئے ہیں

ہمارے اندر ہیں جو بھی ہیں فاصلے ہمارے
کہ دُور سے، اور، کبھی قریں سے جُڑے ہوئے ہیں

ابھی تو ممکن نہیں کہیں جاگنا ہمارا
ابھی اُسی خوابِ اوّلیں سے جُڑے ہوئے ہیں

ہمارے اندر کی برف شاید اِسی سے پگھلے
جو ہم اِس آوازِ آتشیں سے جُڑے ہوئے ہیں

ظفرؔ، اُنھیں بھی پناہ مِلتی نہیں کہیں پر
ہمارے دُشمن جو تھے ہمیں سے جُڑے ہوئے ہیں

-☆-

کہیں پہ موجود، اور، کہیں سے ہٹے ہوئے ہیں
زمین پر ہیں، مگر، زمیں سے ہٹے ہوئے ہیں
کہیں گئے ہیں نہ جانے والے ہیں سانپ اپنے
یہیں پہ ہیں، لیکن، آستیں سے ہٹے ہوئے ہیں
کمی کوئی آ رہی ہے رُسوائیوں میں شاید
کہ داغ اب کے مری جبیں سے ہٹے ہوئے ہیں
یہ فاصلے گھٹتے بڑھتے بھی ہیں، سو، آج کل وہ
قریں تو ہیں ہی، ذرا قریں سے ہٹے ہوئے ہیں
مکیں بھی رہتے ہیں اِن مکانوں میں اجنبی سے
مکاں بھی جیسے ہر اک مکیں سے ہٹے ہوئے ہیں
جُڑے ہوئے ہیں وہ دُوسروں کے تو ساتھ اب بھی
ہٹے ہوئے ہیں تو بس ہمیں سے ہٹے ہوئے ہیں
ہماری آنکھیں ہی خالی خالی ہیں مُدتوں سے
مگر، وہ منظر کہیں یہیں سے ہٹے ہوئے ہیں
ستم تو یہ ہے کہ ہاں بھی کرتے نہیں ہیں کُھل کر
اگرچہ وہ آج کل نہیں سے ہٹے ہوئے ہیں
خراب اُفتادِ طبع نے بھی کیا، ظفر، کو
جہاں سے اچھے لگے، وہیں سے ہٹے ہوئے ہیں

-☆-

ٹھہر گئے ہیں تو ہم سہاروں میں رہ گئے ہیں
اگر چلے ہیں تو رہگواروں میں رہ گئے ہیں
چھلک سکیں باہر، اتنی کوشش تو کی ہے، لیکن
اُچھل اُچھل کر بھی ہم کناروں میں رہ گئے ہیں
سوادِ ساحل پہ منتظر تھا کوئی، مگر، ہم
کچھ اپنے پانی کے تیز دھاروں میں رہ گئے ہیں
ہمارے کِس کام یہ نئی زندگی کی مُہلت
سِوائے اِس کے کہ اپنے پیاروں میں رہ گئے ہیں
بھٹک گئے سب، ہماری باری ہی آ نہ پائی
یہاں کھڑے ہم یونہی قطاروں میں رہ گئے ہیں
یہ لگ رہا ہے، ہمارے حصّے کے سارے دریا
وہیں کہیں اپنے کوہساروں میں رہ گئے ہیں
یہ ایک امانت ہے جس کو لوٹانا چاہتا ہُوں
ترے سِتارے مرے سِتاروں میں رہ گئے ہیں
مزہ تو یہ ہے، سنور گئی عاقبت اُنہی کی
جو چار دن ہم گُناہگاروں میں رہ گئے ہیں
ظفر، رہا ہو کے آئیں گے دیکھنا کِسی دن
ہوا کے جھونکے جو شاخساروں میں رہ گئے ہیں

-☆-

ظفر ، فسانوں کہ داستانوں میں رہ گئے ہیں
ہم اپنے گذرے ہوئے زمانوں میں رہ گئے ہیں
عجب نہیں ہے کہ خود ہوا کے سپرد کر دیں
یہ چند تنکے جو آشیانوں میں رہ گئے ہیں
مکین سب کوچ کر گئے ہیں کسی طرف کو
اب اُن کے آثار ہی مکانوں میں رہ گئے ہیں
سُنا کرو صبح و شام کڑوی کسیلی باتیں
کہ اب یہی ذائقے زبانوں میں رہ گئے ہیں
پسند آئی ہے اِس قدر خاطر و تواضع
جو میہماں سارے میزبانوں میں رہ گئے ہیں
ہمیں ہی شوکیس میں سجا کر رکھا گیا تھا
پڑے ہمیں شہر کی دُکانوں میں رہ گئے ہیں
ابھی یہی انقلاب آیا ہے رفتہ رفتہ
جو رونے والے تھے ، ناچ گانوں میں رہ گئے ہیں
الگ الگ اپنا اپنا پرچم اُٹھا رکھا ہے
کہ ہم قبیلوں نہ خاندانوں میں رہ گئے ہیں
ظفر ، زمیں زاد تھے ، زمیں سے ہی کام رکھا
جو آسمانی تھے ، آسمانوں میں رہ گئے ہیں

-☆-

گذر گئیں مدتیں ، برابر کھڑے ہوئے ہیں
ہمیں نہ چھیڑو ، ہم اپنے اندر کھڑے ہوئے ہیں
کِسی کی آمد کے منتظر بھی نہیں اگر ہم
تو کِس لیے ایک رہگذر پر کھڑے ہوئے ہیں
یونہی ذرا بند ہے ابھی داخلہ ہمارا
اِسی لیے آج گھر سے باہر کھڑے ہوئے ہیں
اب اپنا سُود و زیاں سمجھتے ہیں ، اِس لیے ہم
کِسی کے پاس اب کہیں سے ہٹ کر کھڑے ہوئے ہیں
اِسی طرح سے ہے ان ہواؤں میں اپنا ہونا
کہیں پہ بہتر ، کہیں پہ کمتر کھڑے ہوئے ہیں
بٹھا دِیا تھا ہمیں جھڑکنے کے بعد اُس نے
کِسی توقّع پہ اب مکرّر کھڑے ہوئے ہیں
کِسی اشارے پہ ہیں یہی موم ہونے والے
جو لگ رہا ہے کہ جیسے پتھر کھڑے ہوئے ہیں
دِیے ہیں ، اور ، روشنی نہیں دے رہے کہیں پر
درخت ہیں ، اور ، کب سے بنجر کھڑے ہوئے ہیں
یہ آپ کی بزم ہی کا اُسلوب ہے کہ ہم نے
ظفر کو دیکھا ہے جب بھی ، اکثر کھڑے ہوئے ہیں

-☆-

مرے گھر تو کیا سرِ رہگذر نہیں آ رہا
بڑی دیر سے کوئی بھی اِدھر نہیں آ رہا
مَیں اِس انتظار کی اُلجھنوں سے نکل سکوں
وہ بتا تو دے کِسی طور ، اگر نہیں آ رہا
وہی دُھوپ ہے مرے سر پہ چھانو کیے ہُوئے
مرے راستے میں کہیں شجر نہیں آ رہا
کوئی نیند ہے مری چشمِ تر میں رُکی ہُوئی
کوئی خواب ہے جو مجھے نظر نہیں آ رہا
تری آرزُو میں کوئی کمی ہے ، اِسی لیے
مری گُفتگُو میں ابھی اثر نہیں آ رہا
کئی روز سے مری دھڑکنیں ہیں رُکی ہُوئی
کئی روز سے کوئی بام پر نہیں آ رہا
کئی کام ہیں یُونہی درمیاں میں پڑے ہُوئے
اُسے آنا چاہیے تھا ، مگر ، نہیں آ رہا
مجھے بھیجتے تو ہیں ، لیکن اپنے حساب سے
کہ جو آ رہا ہے وہ اِس قدر نہیں آ رہا
جو ملے تو خُود ہی بتاؤ ، کیسے ملے ، ظفر
تُم اُدھر ہی جاؤ گے وہ جدھر نہیں آ رہا

کُچھ کام اِس زمین پہ کرنے تو دے مُجھے
اپنی بلندیوں سے اُترنے تو دے مُجھے
جاتا نہیں ہے جانبِ منزل تو کیا ہُوا
تُو اپنے راستے سے گذرنے تو دے مُجھے
یہ خُوب صُورتی کِسی دہشت سے کم نہیں
کُچھ روز دُور دُور سے ڈرنے تو دے مُجھے
اپنی جگہ پہ ایک رُکاوٹ ہُوں آپ بھی
دیوارِ دوستی ہُوں ، اُترنے تو دے مُجھے
جینا یہ میرا تیرے لیے تھا بھلا بُرا
تُجھ کو جو ناپسند ہے ، مرنے تو دے مُجھے
کیا کیا سمُندروں کا سفر کر کے آیا ہُوں
اِس خاک پر قدم کہیں دھرنے تو دے مُجھے
کہتے ہیں لوگ ، مَیں کِسی خُوشبُو کا خواب ہُوں
کُچھ دیر اِس ہوا میں بکھرنے تو دے مُجھے
پانی کی تہ جو اب مُجھے کرتی نہیں قبُول
مَیں ڈُوب ہی چُکا ہُوں ، اُبھرنے تو دے مُجھے
دریا بھی مہربان ہے ، موقع بھی ہے ، ظفر
خالی ہُوں ایک عُمر سے ، بھرنے تو دے مُجھے

-☆-

جیسے ہُوں شہربدر شہر میں آیا ہُوا مَیں
یاد آؤں گا کِسی روز بھلایا ہُوا مَیں
کِسی شیشے کی ملاوٹ بھی ہو جیسے مُجھ میں
ٹُوٹ سکتا ہُوں کبھی اپنا بنایا ہُوا مَیں
در و دیوار سے ہوتا ہے نمودار مجھے
اِسی تعمیر کے اندر ہُوں کھپایا ہُوا مَیں
اِتنے پردے ہیں مری ذات کے آگے پیچھے
کہیں ظاہر نہیں ہوتا ہُوں چھپایا ہُوا مَیں
کھوج پھر بھی نہیں مِلتا ہے کِسی کو میرا
لاپتا ہُوں یہاں سو بار بتایا ہُوا مَیں
میرے ہوتے ہوئے کچھ اور نظر آئے گا کیا
سامنے ہُوں وہی آگے سے ہٹایا ہُوا مَیں
اب جو دیکھا تو کوئی اور نکل آیا ہُوں
کہ نہیں ہُوں یہ وہ پہلے سے دکھایا ہُوا مَیں
دِن نکلتے ہی کِسی اپنی کمی کے ہاتھوں
خرچ ہو جاؤں گا شب بھر کا بچایا ہُوا مَیں
ایک جھونکے سے جل اُٹھوں گا دوبارہ سے، ظفر
رات کی بند ہواؤں کا بُجھایا ہُوا مَیں

-☆-

کچھ روتے ہی تھے ایسے کہ غُصیلا ہُوا مَیں
بےسبب تو نہیں میٹھے سے کسیلا ہُوا مَیں
یہ محبت ہی وہ کیچڑ تھا جو آخر آخر
ایک دن مُنہ پہ مَلا، اور، بجیلا ہُوا مَیں
کہیں گِرتی رہی شبنم سی مری شام سے دُور
اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے گِیلا ہُوا مَیں
دُور رہتا تھا بہُت اپنی اکڑ میں، لیکن
چُست چولی جو وہ دیکھی ہے تو ڈِھیلا ہُوا مَیں
دھیان رکھنا کہ اِسی شورشرابے میں کہیں
تیرے قابُو سے نکل جاؤں نہ رَکیلا ہُوا مَیں
پہلے پہلے رہی مجھ میں بھی لہُو کی رنگت
خاک سے رنگ جو پکڑا ہے تو پیلا ہُوا مَیں
اپنے ٹکڑے جو کِیا کرتا ہُوں اب شام و سحر
کُچھ پتا ہی نہ چلا، اور، کٹیلا ہُوا مَیں
آسماں زہر کی صُورت مرے اندر پھیلا
دُھوپ کی لہر کچھ ایسی تھی کہ نِیلا ہُوا مَیں
چھال اُتری تو، ظفر، سُوکھ بھی جاؤں شاید
تھوڑا اچھا تو نظر آؤں گا چِھلا ہُوا مَیں

-☆-

وقت بے وقت کہ ویلے سے کویلا ہوا میں
اور کا اور ہوں سو بار کا جھیلا ہوا میں

بے وفائی تری میرا ہی مقدّر ٹھہری
تیرا دِل جیتنے والا بھی اکیلا ہوا میں

جذب ہو جاؤں نہ مٹی میں ترے آنے تک
منتظر ہوں ترے رستے پہ اُنڈیلا ہوا میں

اپنی مرضی سے تو شاید نہ یہ ہمّت کرتا
آ گھسا ہوں تری محفل میں دھکیلا ہوا میں

اِتنے خُوش خُوش نہ پھرو مجھ سے لگا کر بازی
جیت بھی سکتا ہوں اِس کھیل میں کھیلا ہوا میں

مجھے کافی ہے یہ ہونا ترے آگے پیچھے
تُو گرو بھی نہیں لیکن ترا چیلا ہوا میں

اپنی ہی بستیاں غرقاب کیے بیٹھا ہوں
کِس نئے خواب کے سیلاب کا ریلا ہوا میں

ایک حد تک ہے یہ آوارہ خرامی میری
جا بھی سکتا ہوں کہاں تیرا نکیلا ہوا میں

ایک ہی وقت میں غائب ہوں نہ موجود ، ظفر
شہر والوں کے لیے ایک جھمیلا ہوا میں

-☆-

کِس نئے خواب میں رہتا ہوں ڈبویا ہوا میں
ایک مدّت ہوئی جاگا نہیں سویا ہوا میں

میری سُورج سے مُلاقات بھی ہو سکتی ہے
سُوکھنے ڈال دیا جاؤں جو دھویا ہوا میں

مجھے باہر نہیں ، سامان کے اندر ڈھونڈو
مِل بھی سکتا ہوں کِسی شے میں سمویا ہوا میں

بازیابی کی توقّع ہی کِسی کو نہیں اب
اپنی دُنیا میں ہوں اِس طرح سے کھویا ہوا میں

شام کی آخری آہٹ پہ دہلتا ہوا دِل
صبح کی پہلی ہواؤں میں بھگویا ہوا میں

آسماں پر کوئی کونپل سا نکل آؤں گا
سال ہا سال سے اِس خاک میں بویا ہوا میں

کبھی چاہوں بھی تو اب جا بھی کہاں سکتا ہوں
اِس طرح ترے کانٹے میں پرویا ہوا میں

میرے کہنے کے لیے بات نئی تھی نہ کوئی
کہہ کے چُپ ہو گئے سب لوگ تو گویا ہوا میں

مُسکراتے ہُوئے مِلتا ہوں کِسی سے جو ، ظفر
صاف پہچان لیا جاتا ہوں رویا ہوا میں

-☆-

راکھ ہوتا ہُوا ، ہر لحظہ نبڑتا ہُوا مَیں
رفتہ رفتہ یہ کوئی آگ پکڑتا ہُوا مَیں
نہیں دیتا ہُوں کِسی طور ہوا کو زحمت
ایک پتّا سا کہیں آپ ہی جھڑتا ہُوا مَیں
پھر کِسی کے لیے آغوش کُشا ہُوں شاید
اپنی کمزور سِلائی سے اُدھڑتا ہُوا مَیں
مجھ میں رہتی ہے جو ہر آن کی بیشی سی
کہیں گھٹتا ہُوا ہُوں اور کہیں بڑھتا ہُوا مَیں
یہ ہوا ہے جو ہمیشہ مرے کام آتی ہے
سُوکھ جاؤں گا اِسی طرح نچڑتا ہُوا مَیں
کبھی ایسا تو لگا ہی نہیں پہلے شاید
جیسا لگتا ہُوں ترے خواب میں جڑتا ہُوا مَیں
ملنے آؤں گا اُنھیں پھر کِسی موسم میں کبھی
جو پریشاں نہیں لوگوں سے بچھڑتا ہُوا مَیں
روک دے کوئی اگر آ کے یہیں پر مجھ کو
پھیلتا جاتا ہُوں کُچھ اور ، سُکڑتا ہُوا مَیں
دیکھتے دیکھتے ہوجاتا ہُوں قائم بھی ، ظفرؔ
کِسی اندر ہی کی آندھی سے اُکھڑتا ہُوا مَیں

-☆-

ہُوں وہ پہلا سا پُرانا کہ نرالا ہُوا مَیں
رفتہ رفتہ جو ترا چاہنے والا ہُوا مَیں
تُو فقط ایک اشارے سے اُٹھائے مجھ کو
زندہ ہو جاؤں ترے سامنے ڈالا ہُوا مَیں
مجھے باہر سے پذیرائی ملی ہے ، ورنہ
یہ وہی ہُوں تری محفل سے نکالا ہُوا مَیں
تُجھ سے نسبت تو کوئی خاص نہیں تھی ، لیکن
اِس بھرے شہر میں کیوں تیرا حوالہ ہُوا مَیں
یہ کِسی اور کے گھیرے میں نہ آیا تھا کبھی
پھر ہُوا یُوں کہ ترے چاند کا ہالہ ہُوا مَیں
اپنی کوشش بھی مجھے چاہیے کرنی کوئی اب
گِر بھی سکتا ہُوں کہیں تیرا سنبھالا ہُوا مَیں
کیفیت اور ہی کچھ ہے مرے اندر باہر
کہ اندھیرا ہی رہا اور نہ اُجالا ہُوا مَیں
اکثر اوقات کِناروں سے چھلک جاتا ہُوں
زور کرتا ہُوا ، اپنا ہی اُچھالا ہُوا مَیں
ایک ہونا بھی مرے واسطے مُشکل تھا ، ظفرؔ
کون سے لوگ ہیں یہ جن میں دوبالا ہُوا مَیں

-☆-

مُسترد ہو گیا جب تیرا قبولا ہُوا مَیں
یاد کیا آؤں گا اِس طرح سے بھُولا ہُوا مَیں
بات مجھ میں بھی کچھ اِس طرح کی ہو گی جو یہاں
کبھی واپس ہی نہ ہوتا تھا وصولا ہُوا مَیں
خاک تھی اور ہوا تھی مرے اندر باہر
دشت اک سامنے تھا ، اور ، بگولا ہُوا مَیں
نہیں مرنے میں بھی درکار تعاون مجھ کو
چھت سے اپنی ہی نظر آؤں گا جُھولا ہُوا مَیں
وقت وہ تھا کہ خدوخال نُمایاں تھے مرے
اب یہ حالت ہے کہ بس ایک ہیُولیٰ ہُوا مَیں
یہ بھی سچ ہے کہ عمل مجھ پہ کِسی نے نہ کِیا
ورنہ کہنے کو تو مشہور مقولہ ہُوا مَیں
اِک نحوست ہے مرے موسموں پر چھائی ہوئی
ہے یہی وجہ کہ پھلتا نہیں پھُولا ہُوا مَیں
پھر کِسی سے بھی گِرہ مجھ پہ لگائی نہ گئی
کوئی بے ڈھب ہی بہت مصرعِ اُولیٰ ہُوا مَیں
موت کے ساتھ ہوئی ہے مری شادی ، سو ظفؔر
عُمر کے آخری لمحات میں دُولھا ہُوا مَیں

-☆-

جب تُمھارے اور اپنے درمیاں ہوتا ہُوں مَیں
کون مُجھ کو ڈھونڈ سکتا ہے کہاں ہوتا ہُوں مَیں
ٹکڑوں ٹکڑوں میں نِکل پڑتا ہُوں منزل کی طرف
اور ، آخر رفتہ رفتہ کارواں ہوتا ہُوں مَیں
اِک زمینِ عاجزی ہُوں اہلِ دُنیا کے لیے
اُس سے مِلتا ہُوں تو کُچھ دِن آسماں ہوتا ہُوں مَیں
اپنے ہی رحم و کرم پر ہُوں کوئی سمجھے اگر
برق سے رشتہ ہے میرا ، آشیاں ہوتا ہُوں مَیں
مخمصہ ہُوں اپنے ہونے اور نہ ہونے کا یہاں
کُچھ وہاں بھی ہو نہیں سکتا جہاں ہوتا ہُوں مَیں
اک زمانے سے لیے پھرتا ہُوں لہروں پر اِسے
کوئی کشتی ہے کہ جس کا بادباں ہوتا ہُوں مَیں
شوق سے سُنتے بھی ہیں ، تسلیم بھی کرتے نہیں
آنے والے دور کی اِک داستاں ہوتا ہُوں مَیں
ڈھونڈنے والوں کی خاطر اِک اشارہ ہی سہی
ہے یہی میری نشانی ، بے نشاں ہوتا ہُوں مَیں
میرے اندر ہے سِتاروں کا کوئی جُھرمٹ ، ظفؔر
رات پڑتی ہے تو اپنی کہکشاں ہوتا ہُوں مَیں

-☆-

ترے راستوں سے جبھی گذر نہیں کر رہا
کہ مَیں اپنی عُمر ابھی بسر نہیں کر رہا

کوئی بات ہے جو ہے درمیاں میں رُکی ہُوئی
کوئی کام ہے جو مَیں رات بھر نہیں کر رہا

ہے کوئی خبر جو چھپائے بیٹھا ہُوں خلق سے
کوئی خواب ہے جسے دربدر نہیں کر رہا

تری بات کوئی بھی مانتا نہیں شہر میں
تو مرا کہا بھی کہیں اثر نہیں کر رہا

کہیں میرے گردونواح میں کوئی شے نہیں
مَیں کِسی طرف بھی ابھی نظر نہیں کر رہا

کوئی شاخ ہے جسے برگ و بار نہیں مِلے
کوئی شام ہے جسے مَیں شجر نہیں کر رہا

کوئی اِس پہ غور اگر کرے بھی تو کِس لیے
یہ سخن مَیں آپ بھی سوچ کر نہیں کر رہا

ابھی میری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی
مَیں جبھی تو بات کو مختصر نہیں کر رہا

یہ مَیں اپنے عیب جو کر رہا ہُوں عیاں ، ظفؔر
تو دراصل یہ بھی کوئی ہُنر نہیں کر رہا

☆

کوئی چیز بھی مَیں یہاں وہاں نہیں کر رہا
جو زمین کو ابھی آسماں نہیں کر رہا

مری واردات سے باخبر ہیں سبھی کہ مَیں
کوئی کام بھی یہاں ناگہاں نہیں کر رہا

جو نہیں ہے اُس کا یقین ہے مجھے سربسر
جو ہے سامنے ، مَیں اُسے گُماں نہیں کر رہا

ترا دل کہ تیری ہی برقِ ناز کی زد میں ہے
مَیں اِسی لیے اِسے آشیاں نہیں کر رہا

مَیں وہاں بھی کام سے بھاگتا رہا رات دِن
سو ، بجا ہے ، کچھ بھی اگر یہاں نہیں کر رہا

مری محنتوں کا معاوضہ مجھے چاہیے
کہ مَیں عِشق بھی کوئی رائیگاں نہیں کر رہا

مرا خواب زادِسفر ہے جس کے مدار میں
کوئی ہے کہ مَیں جسے کارواں نہیں کر رہا

جو رواں ہے مَیں اُسے روکتا نہیں ، اور پھر
جو رُکا ہُوا ہے اُسے رواں نہیں کر رہا

مُجھے خُود کو غور سے دیکھنا ہے کبھی ، ظفؔر
جو مَیں اپنا آپ دُھواں نہیں کر رہا

☆

جو یہ تیرے بارے میں گفتگو نہیں کر رہا
یہ نہیں کہ مَیں تری آرزو نہیں کر رہا
مَیں بکھیر بیٹھا ہُوں خود ہی اپنے وُجود کو
مگر ، آپ ہی اِسے ایک سُو نہیں کر رہا
کوئی لہر ہے جو مری خبر نہیں لے رہی
کوئی لفظ ہے جسے مَیں لہُو نہیں کر رہا
سو ، گلے لگا کے ہی پاک ہو گیا ہُوں اُسے
جو نماز کے لیے میں وُضو نہیں کر رہا
فقط ایک بار تری گلی میں لگائی ہے
وہ صدا جو مَیں ابھی کُوبکُو نہیں کر رہا
کئی بار مَیں نے زمانے بھر کو سُنائی ہے
وہی بات جو ترے رُوبرُو نہیں کر رہا
کوئی انتظار ہے جس میں ڈُوبا ہُوا ہُوں مَیں
کوئی اعتبار ہے جس کو تُو نہیں کر رہا
مرے حال سے تجھے آشنائی ہو کِس طرح
مَیں بیان ہی اِسے ہُوبہُو نہیں کر رہا
کہیں مِل ہی جاؤں گا اپنے آپ کو اے ، ظفرؔ
مَیں اِسی لیے کوئی جستجو نہیں کر رہا

-☆-

اِس اندھیرے دِل میں جو روشنی نہیں کر رہا
کروں گا ضرُور ، مگر ، ابھی نہیں کر رہا
کِسی طرح سے بھی یہ دُشمنی تو نہیں کوئی
یہ جو تیرے ساتھ مَیں دوستی نہیں کر رہا
مرا کچھ نہ کرنا بھی خُوب سوچ سمجھ کے ہے
کہ مَیں کوئی کام بھی سرسری نہیں کر رہا
مجھے پانو پڑنے سے اتفاق نہیں ابھی
مگر ، اِس طرح سے مَیں سرکشی نہیں کر رہا
جو ہمیشہ رہتا ہُوں ایک اشارے کا منتظر
یہی کہہ رہا ہُوں کہ نوکری نہیں کر رہا
وہی آسماں کو مِلا رہا ہُوں زمین سے
کہ یہ کام اور یہاں کوئی نہیں کر رہا
یہ خلافِ طبع ہی کرتا رہتا ہُوں رات دِن
کہ جو کرنا چاہتا ہُوں وُہی نہیں کر رہا
مجھے اتفاق ہے آپ سے کہ دراصل مَیں
یہ کُچھ اور کرتا ہُوں ، شاعری نہیں کر رہا
مری عاجزی ہی بہُت ہے میرے لیے ، ظفرؔ
مَیں یہاں کِسی کی برابری نہیں کر رہا

-☆-

خرچ ہوتا ہُوں اِسی چال سے چلتا ہُوا مَیں
جابجا اپنے کناروں سے اُچھلتا ہُوا مَیں
بیٹھنا ایک جگہ پر مری قِسمت میں نہیں
آتا جاتا رہوں گا رنگ بدلتا ہُوا مَیں
فیض چاہوں بھی تو پہنچا ہی کہاں سکتا ہُوں
لبِ دریا کوئی چشمہ سا اُبلتا ہُوا مَیں
بے اثر رہتا ہے میٹھا کوئی موسم مجھ پر
اپنے ہی زہر سے ہُوں پھولتا پھلتا ہُوا مَیں
بھاگ کر جاتا ہُوا اجنبیوں کی جانب
اور ، اپنی طرف آتا ہُوں ٹہلتا ہُوا مَیں
کوئی پانی کا پتا مجھ کو بتا سکتا ہو
پُوچھتا پھرتا ہُوں ایک ایک سے جلتا ہُوا مَیں
اِتنا باہر سے یہ مضبُوط نظر آتا ہُوا
اندر اندر ہُوں شب و روز دہلتا ہُوا مَیں۔
ایسے حالات میں اِتنا بھی غنیمت سمجھو
کہ بُرا وقت ہُوں اور شہر سے ٹلتا ہُوا مَیں
اپنے ہی آپ میں ہر وقت مگن بھی ہُوں ، ظفر
اور ، خُود سے کہیں باہر بھی نکلتا ہُوا مَیں

-☆-

آخری ہُوں کہ ترے گھاٹ پہ پہلا ہُوا مَیں
جتنا دھویا گیا ہُوں اُتنا ہی مَیلا ہُوا مَیں
سیرگاہوں کو عجب کیا ہے جو خاطر میں نہ لاؤں
تیرے باغات میں کچھ دیر کو ٹہلا ہُوا مَیں
ڈالتا رہتا ہُوں پھر تیری محبت اِس میں
دوسری بار جو اپنے لیے تھیلا ہُوا مَیں
یہ ترا خوف ہے یا اپنی ہی دہشت کوئی
سَحر و شام جو رہتا ہُوں یہ دہلا ہُوا مَیں
عین مُمکن ہے کروں شورِفُغاں پھر سے بُلند
رونقِ شہر میں تھوڑا سا یہ بہلا ہُوا مَیں
احترام اور محبت میں نہیں فرق بہُت
ہو کے بوڑھا تو یہاں اور بھی چھیلا ہُوا مَیں
اس میں کیفیتیں دونوں ہیں یہ ناز اور نیاز
کبھی مجنوں ہُوا ہُوں اور کبھی لیلیٰ ہُوا مَیں
صاف سُتھرا نظر آؤں گا بظاہر تو ، مگر
اندر اندر سے بہُت مَیلاکچیلا ہُوا مَیں
دیکھ کر خُود کو ، ظفر ، ہوتی ہے وحشت کیا کیا
بے مُحابا سا جو ہر سمت ہُوں پھیلا ہُوا مَیں

-☆-

پہلے ہی ٹھیک طرح سے ہُوں ٹٹولا ہُوا مَیں
گھٹتا بڑھتا نہیں اُس شوخ کا تولا ہُوا مَیں
روشنی کرتا ہُوا جا کے گِروں گا بھی کہیں
خُوش نہ ہوں لوگ اگر آگ کا گولا ہُوا مَیں
چیر سکتا کبھی اِس رات کے سناٹے کو
روشن آواز کی گہرائی سے بولا ہُوا مَیں
کہیں اطراف و جوانب میں نہ ڈھونڈو مجھ کو
ان ہواؤں میں ہی موجُود ہُوں گھولا ہُوا مَیں
سعی بے سُود ہے ساری کہ یہ ممکن ہی نہیں
بند ہو جاؤں کِسی اور کا کھولا ہُوا مَیں
اِس توقّع پہ کہ تُو ہی مجھے کر دے گا بحال
تجھ تک آیا ہُوں جو اِس طرح مدھولا ہُوا مَیں
ایک ہی وضع کا پابند نہیں ہو سکتا
اِس لیے بھی کبھی ماشہ، کبھی تولا ہُوا مَیں
مجھے تقسیم کِیا اُس نے کئی ٹکڑوں میں
ایک سے چار ہُوا، چار سے سولہ ہُوا مَیں
وقت ایسا تو ہمیشہ نہیں رہنے کا، ظفؔر
کبھی قائم بھی تو ہو سکتا ہُوں ڈولا ہُوا مَیں

-☆-

یہ بھی کیا ہُوں کِسی جانب سے جھجکتا ہُوا مَیں
اور اُسی لمحے کِسی سمت لپکتا ہُوا مَیں
کوئی اطراف کا اندازہ ہی رکھتا نہیں اب
اپنے ہی شہر کی گلیوں میں بھٹکتا ہُوا مَیں
کبھی لیتا ہی نہیں شورشرابے کا اثر
خامشی کی کِسی آہٹ پہ ٹھٹکتا ہُوا مَیں
چور ہُوں، اور، کبھی آنکھ چُرا کر خُود سے
اپنے ہی خواب کی گٹھڑی کو اُچکتا ہُوا مَیں
تیر کھایا تھا کِسی اور طرف سے، لیکن
گِر رہا ہُوں ترے پہلُو میں پھڑکتا ہُوا مَیں
اور تھا رنگِ تماشا مری خاطر، جس کو
دیکھنا چاہتا، اور، دیکھ نہ سکتا ہُوا مَیں
بُجھنے ہی والا ہُوں چھوڑے ہوئے گھر میں آخر
در و دیوار سے بے سُود جھلکتا ہُوا مَیں
خاک ہو جاؤں گا، احباب تسلّی رکھیں
اور کچھ دیر اندھیرے میں چمکتا ہُوا مَیں
کر رہا ہُوں اُسے ظاہر جو چھپانا ہے، ظفؔر
جو دِکھانا ہے سراسر اُسے ڈھکتا ہُوا مَیں

-☆-

ڈاکٹر مغل فاروق پرواؔز

غزلیں

(اپنے چھوٹے بھائی زمرد مغل کی
نذر)

زہے نصیب اندھیروں میں نور جاگا ہے
کسی وجود میں کچھ تو ضرور جاگا ہے

ابھی تو سارے جہاں کا ضمیر جاگے گا
ابھی تو صرف ہمارا شعور جاگا ہے

اُسی سے چاروں طرف پھر سے روشنی ہوگی
وہ ایک لفظ جو بین السطور جاگا ہے

کوئی سوال کہیں محوِ اضطراب ہے کیا؟
کوئی جواب جو لفظوں سے دور جاگا ہے

تمام شہر کا نقشہ بدل کے رکھ دے گا
وہ ایک خواب جو زخموں سے چور جاگا ہے

کسی نے آنکھوں کو اپنی ضرور موندا ہے
کوئی تو نیند سے اپنی ضرور جاگا ہے

وہ پہلی بار جو دیکھا نہ تھا دکھائی دیا
پھر اُس کے بعد کوئی نور سا دکھائی دیا

وہ بار بار کا دیکھا ہوا دکھائی نہ دے
کبھی کبھی تو ہمیں یوں لگا دکھائی دیا

جو ہونے والا ہے کھل کر وہ آج ہوجائے
جو ہورہا تھا وہی کون سا دکھائی دیا

پھر اُس کے بعد کبھی اُس طرف نہیں دیکھا
وہ بد دماغ جہاں پر نہ تھا دکھائی دیا

چلا تو دور تلک دیکھتی رہی آنکھیں
رُکا تو ایک قدم پر کھڑا دکھائی دیا

وہ میری راہ سے گزرا وہ میرے پاس آیا
وہ میرے سامنے مجھ سے ملا دکھائی دیا

میں اپنی روح میں اترا تو مجھ کو یاد آیا
وہ میرے ساتھ اترتا ہوا دکھائی دیا

کسی کے نام سے روپوش ہوگیا پرواؔز
کسی کا نام جو پھر سے لیا دکھائی دیا

ڈاکٹر مغل فاروق پرواز

غزلیں

کسی کا داؤ پہ سب کچھ لگا کے آجانا
کسی کا شام تلک گُل ملا کے آجانا

خُدا کا شکر کہ سب کچھ یہاں سلامت ہے
خدا کا حکم ہے سب کچھ گنوا کے آجانا

دُعا کے بعد دعا کا جواب آجائے
دُعا کو ہاتھ اٹھانا اُٹھا کے آجانا

میں جانتا ہوں وہ ممکن تو ہو نہیں سکتا
میں چاہتا ہوں جو ممکن بنا کے آجانا

تو کیا ہوا کہ جو تکمیل ہو نہیں سکتی
تو کیا ہوا کوئی صورت بتا کے آجانا

تمام عمر ترا انتظار دیکھوں گا
کسی بھی موڑ پہ مجھ کو بتا کے آجانا

☆☆

یہ سوچ کر کہ یہ کسی کی آخری صدا نہ ہو
پلٹ کے آگیا ہے جو کہیں وہ فاصلہ نہ ہو

اب اس سفر کا کیا کریں کہ یہ سفر طویل ہے
بس ایک ہی سبیل ہے کہ دل ابھی بھرا نہ ہو

یہاں کا ذائقہ جدا یہاں کی بات ہی الگ
یہاں کے رنگ میں کہیں وہ رنگ مل گیا نہ ہو

کھڑے ہو جو جس سنگ میں رنگے ہو جس کے رنگ میں
وہ سر پھری ہوا نہ ہو وہ کوئی بد دعا نہ ہو

تو وہ صلیب درد تھا تو وہ قریب مرگ تھا
تو سانس لے رہا تھا وہ کہ اٹھ کے چل دیا نہ ہو

وہ تو مرا قریب تھا، وہ تو زہے نصیب تھا
وہ تو مرا حبیب تھا یہ کوئی دوسرا نہ ہو

بہت دنوں کی بات ہے گئے دنوں پہ تبصرہ
کہ مڑ کے دیکھتا تھا وہ جو مڑ کے دیکھتا نہ ہو

نظم کی دہلیز پر

ساقی فاروقی کا شمار ہمارے عہد کے ممتاز ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ ساقی فاروقی کی شاعری، خواہ وہ غزل ہو یا نظم، جہاں ایک طرف مثبت توانائیوں سے بھرپور ہوتی ہے، وہیں ساقی منفی توانائیوں کو بھی رائیگاں نہیں جانے دیتے، بالفاظِ دیگر ساقی نے شاعری کے ''علوی جذبات'' کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ''سفلی جذبات'' کو بھی قابل قبول بنانے اور اس انرجی سے بھی بڑا ادب پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ساقی نے اپنے علم اور ہنر دونوں سے کام لیتے ہوئے ان برائیوں کو بھی باہر کا راستہ دکھایا ہے جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ نیکی کا درجہ حاصل کر چکی تھیں۔ یہ عمل جراحی اتنا آسان نہ تھا یہ اُردو زبان کی کرامت ہے کہ اس میں ساقی جیسا شاعر پیدا ہوا ہے۔

زمرد مغل

ساقی فاروقی

سیمیا[۱]

(مصنوعی حمل کاری)

برف سلاسل (۲) میں
ایک شرر کی بے تابی سے
شیشے کی شریانیں چیخ رہی ہیں
پردیسی دھڑکن کی دھمک سُنائی دیتی ہے

راز گلاب کے
مُڑے ہوئے کانٹے (۳) سے
اوس کے شل آنسو کی لاش ٹنگی ہے
جسے تمنّا کی ناراض کرن
اپنی چھینی سے کاٹ رہی ہے

روز مرے مشتاق بدن کے
ناف زخم سے
خوش بوئیں پھوٹیں گی
رنگ بہیں گے

آج اَنگ میں
سیپی ماں کی زرخیزی سے
مٹی پلٹ گئی

اس جگ مگ جگ مگ کمرے میں
دو اُجلے اُجلے دستانے
اک جگر جگر موتی

(۱) وہ علمِ طلسم جس کی رُو سے ایک جسم سے دوسرے جسم میں رُوح منتقل ہوتی ہے (یا) وہ علمِ طلسم جس سے موہوم اشیاء جن کا حقیقت میں وجود نہ ہو، لوگوں کو دکھا سکتے ہیں۔ غالبؔ کے ہاں ع ''وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود'' زورِ معنی کے دوسرے حصے پر ہے۔ میں نے پہلے حصے کو مدِّ نظر رکھا ہے۔

(۲) ٹسٹ ٹیوب (۳) سرِنج۔ ساقی

حَمل سَرا

دادی اماں.....
(بستی کے سب سے ممتاز
گھرانے کی بیٹی.....
سب سے مُعزّز
آنگن کی دلہن.....
ماشاءاللہ
ستّر کے پیٹے میں ہوں گی)
.....اپنا استحقاق مانگتی ہیں

دادا جان کہ
دس کم ساٹھ برس تک اِن سے
اَندھی گھُپ کالی راتوں میں
چھپ چھپ کے ملنے آئے
بیوی کی زرخیز آنکھوں میں
صرف اولادِ نرینہ کے

خواب اُگا کے چلے گئے.....
یہ شوہر کے رستے میں
حائل نہ ہوئیں
دِل کے ٹکڑے
ہوسٹلوں میں پلے بڑھے
حیف کہ ان کے دُکھ سُکھ میں
شامل نہ ہوئیں
دادا جان کی سخت طبیعت نے
اِس کا موقع ہی نہ دیا
یہ وہ ناطق
جو خاموش رہیں.....
اُس نازیبا خاموشی میں
آگ لگانے کے دن آئے
اب اپنے چقماق مانگتی ہیں.....

اِن کے اندر تنہائی کا زہر اُترتا چلا گیا
(اور زمانہ
اردگرد سے
پرچھائیں کی طرح گزرتا چلا گیا)
سوگ میں ہیں،
تریاق مانگتی ہیں.....
ایک جنم تک
اَندھی گونگی بہری بَن کے
اپنے ہی گھر میں بے دخل،
بے قدری کے سخی حسن* میں دفن رہیں
آج نئے آفاق مانگتی ہیں
دادی امّاں طلاق مانگتی ہیں

* کراچی کا ایک قبرستان۔ساقی

سِسٹر ماریا تیریزا

یاد بستر میں
تمنا کے پرانے آئینے کے سامنے
جسم کی ایذا دہی میں
رُوح کی خود لذّتی میں

کیا مِلے گا؛

روز جیلی فِش کی صورت
نارسی کے بادباں کھولے ہوئے
سبز گدلے سوگ ساگر میں
نئی لہریں بنانے
اور پانی کاٹنے میں

کیا مِلے گا؛

اپنی تنہائی میں اِک دن میری تنہائی ملا دو
میں ہی رُوحِ قدُس ہوں
نورِ ازل ہوں
دیر سے تم میں چُھپا ہوں

جن دَھنک لمحوں کو اپنے دھیان میں
زنجیر کر کے مطمئن ہو
میں انہی کا سلسلہ ہوں
اور تمہاری راز بستہ چھاتیوں.....
.....چاندی کٹوروں سے چھلکنا چاہتا ہوں
میں خدا ہوں

شارق کیفی

نظمیں

منہ پیٹتے ہوئے ایک نظم

گزر گیا
سامنے سے مسجد کے بے خطر
سینا تان کر میں
مگر مسراری کے خون سے
میں نے راستہ تک بدل دیا ہے
کمال کی بات ہے کہ میں یہ بھی جانتا ہوں
ادھر بڑھتا ہی جا رہا ہے خدا کا مجھ پر
قضائے عمری کی رکعتیں بڑھتی جا رہی ہیں
مگر میں پھر بھی سکون سے ہوں
مجھے پتا ہے
یہاں وہ مجھ سے
کوئی تقاضا نہیں کرے گا
نظر کے آگے ادھار کھاتا نہیں دہرے گا
مگر مراری
وہ پان والا
تو روک لے گا سڑک پہ مجھ کو
اگر حساب اس کا وقت پر میں نہیں کروں گا
ذلیل کر دے گا یار کے سامنے وہ پل میں
قبول کرنے میں شرم تو آ رہی ہے لیکن
جو سچ ہے سچ ہے
اور سچ یہی ہے
مرے لیے ان گلی محلوں میں ہونے والی
ذرا سی ذلت
بڑی ہے دوزخ کی ہر سزا سے
مجھے
مراری کا ڈر کہیں بڑھ کے ہے خدا سے
ایک کینسر کے مریض کی بڑبڑ
گلے پر لگا کے نشان
جس گھڑی ڈاکٹر نے یہ مجھ سے کہا
اور تو ساری پرہیز ختم آپ کی آج سے
شیو مت کیجیے گا
جب تلک یہ گلے کی سینکائی چلے
شیو مت کیجیے گا
تو ساری مشیت خدا کی مجھ میں
مری آگہی
ارے
مجھ کو داڑھی سے انکار کب تھا جو یہ رخ نکالا گیا
میں تو خود شیو کے نام سے
یوں بدکتا رہا آج تک جیسے پانی سے بلی
ہاں مری ساس کو کچھ ضرور اعتراض تھا
جس کی عزت کی خاطر میں داڑھی نہیں رکھ سکا
مگر اُن کو بھی میں سمجھا لیتا
خیر

اب تو جو ہونا تھا ہو ہی گیا
یوں بھی بھلا کس کو کوئی متوقع ملا ہے
خدا کے حضور
بات رکھنے کی اپنی
تو یہ بات ہے
یعنی میں
شکل سے
پکا سچا مسلمان نہ لگنے کے شک میں گیا
جس میں
کسی گالی سے میری کان تک کا راستہ
آسان ہو جائے
اور یہ سب
اس طرح ہوتا ہے میرے ساتھ
کہ سوچوں
تو عقل حیران ہو جائے

مرنے والے سے جلن

ہاں وہ گلی بھی
میرے حصے کی
میری ہی طرح گھر سے نکلتی ہے
پرانی سائیکل پر بیٹھ کر
اسے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا
کہ وہ کس منہ پہ ٹھوکی جائے گی آج
ادھر میں بھی نہا دھو کر
نکل آتا ہوں باہر
ڈھونڈتے ہیں وہ موڑ وہ محفل
جہاں ٹکراؤں گا اس سے
یہ جیسے میری ذمہ داریوں میں ہے
کہ وہ حالات پیدا کرسکوں

مرنے والے سے جلن

ذرا سا غم نہیں چہرے پہ ان کے
میاں سر پہ کوئی رومال ہی رکھ لو
انہیں تو موت آنی ہی نہیں ہے
وہی طعنے
وہی فقرے
ابھی تک میرا پیچھا کر رہے ہیں ہر جنازے میں
میں اپنی چال کی رفتار تھوڑی اور کم کر کے
نکل آتا ہوں باہر بھیڑ سے
اور رک کر ایک دوکان پہ سگریٹ جلاتا ہوں
جنازہ دور ہوتا جا رہا ہے
یہ سب کیا ہے؟
اداکاری نہیں آتی مجھے تو کیوں کروں میں
اور سچی بات کہہ دوں تو مجھے
پاگل سمجھ لے گی یہ دنیا

ہاں یہ سچ ہے
مجھے رتی برابر غم نہیں ہوتا کسی کی موت کا
اور یہ بھی سن لو
مری جس مسکراہٹ پر یہاں ناراض ہیں سب
سبب اس کا جلن ہے
جو میں محسوس کرتا ہوں کسی بھی مرنے والے سے
کڑھن ہوتی ہے مجھ کو سوچ کر
کہ میں جس امتحاں کے خوف سے
بے حال اور بے چین پھرتا ہوں
وہ یہ صاحب جو کاندھوں پر ہے
ان کا ہو چکا
اور میرا باقی ہے

سمجھ سے پرے

کسی کی جھلک بھر دیکھنے کے واسطے روزانہ
ستر میل ک لمبا سفر کرنا
محبت کی یہ شاید انتہا تھی
مگر جاتا تھا اس بس سے
زیادہ لڑکیاں ہوتی تھیں جس میں

☆☆

تنویر انجم

بالکل آپ کی طرح

وہ ہنسی
اور بھری محفل میں کہا
کہ میں بالکل آپ کی طرح ہوں
سب نے قہقہہ لگایا
اور بیک آواز کہا
ہاں، کچھ ایسا ہی لگتا ہے

سب نے ایسا کہا
کیونکہ سب کو پتہ ہے
ساری دنیا میں مجھے سب سے زیادہ نفرت
آپ ہی سے ہے

میری نظر میں آپ بدہیئت ہیں
بدصورت ہیں
بدمزاج ہیں
آپ کا اندازِ گفتگو ناقابلِ برداشت ہے
آپ نے کبھی اسکول نہیں دیکھا
کوئی ہنر نہیں سیکھا

آپ نے اس زندگی میں ایک ہی بات سیکھی
کس طرح لوگوں کو بے وقوف بنا کے
یا ظلم وستم ڈھا کے
اپنا مطلب نکال لیا جائے

میرے خیال میں
آپ نے کسی سے محبت نہیں کی
نہ اپنے خاندان سے
نہ اپنے شوہر سے
نہ اپنی اولاد سے
اور نہ ہی مجھ سے

میرے بس میں ہوتو میں آپ کو
ایک دُم ہلاتی کتیا بنادوں
یا بندریا بنا کر
ڈگڈگی پر نچاؤں
یا مکھی بناؤں
اور اپنے جوتے کے تلے سے مسل دوں

یا اتنی دور چلی جاؤں
جہاں آپ اور وہ
مجھے ایک کتیا، ایک بندریا اور ایک مکھی بنا کر
مار نہ سکیں

فوراً ہی مر جانا

وہ ایک بہت حسین شوہر کے ساتھ
ساری زندگی آخر کیوں رہے

ایک بہت دلچسپ شوہر نے
شادی کی پہلی رات
اپنے ہلکے پھلکے معاشقوں کا تذکرہ
مزے لے لے کر کیا

بہت مقبول شوہر نے
رات رات بھر ہوٹلوں میں
گھرے اور عزیز دوستوں کے ساتھ
خوش گپیاں کرنے کا معمول
ہمیشہ جاری رکھا

بہت تیز رفتار شوہر نے
ایک لمبے سفر کا منصوبہ بنایا
اور اس پر ہنستے ہوئے
سب کے سامنے کہا
کہ اس جیسی سست رو کے ساتھ کوئی نہیں چل سکتا

بہت دانشور شوہر نے
بچوں کی تعلیم کے معمولی کام میں
اس کے پاگل پن کو کبھی نہیں سراہا
ایک معمولی بوڑھی عورت
بہت بلند آواز شوہر کے ساتھ
ساری عمر رہ لیتی
اگر بیوی کے مکان سے
پہلی ہی دفعہ
نکالے جانے پر
وہ فوراً نہ مر جاتا

گڑییں ، پریاں ، شہزادیاں

ایک ننھی منی گڑیا ناراض ہوتی ہے
جب میں اسے ننھی منی گڑیا کہہ کر بلاتی ہوں

ایک اچھی پری شرمندہ ہوتی ہے
جب میں بے دھیانی میں
سب کے سامنے
اسے اچھی پری کہہ بیٹھتی ہوں

ایک چھوٹی سی شہزادی غصہ کرتی ہے
جب میں اس کی بار بار دی ہوئی ہدایت
بھول جاتی ہوں
اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر
پھر کہتی ہوں
میری چھوٹی سی شہزادی

ہمارے ننھے بیٹے
بیٹیوں کے برعکس
پسند نہیں کرتے
جنس کی تبدیلی
اور ماؤں سے کہلانا
ننھی منی گڑیا
ایک اچھی پری
چھوٹی سی شہزادی

آپ کی شناخت

اپنی نگاہیں اپنی پلیٹ پر رکھیے
اور اپنے کانٹے پر
اور اپنی چھری پر

آپ کی شناخت
اس مچھلی سے نہیں
جو آپ کے ہاتھ نہیں آئی
نہ اس مچھلی سے
جسے آپ نے خود چھوڑ دیا

آپ کی شناخت
صرف اس سے ہے
جو آپ کے پاس ہے
آپ کی پلیٹ کی کانٹوں بھری مچھلی

پیار بھری دعائیں

تم کہیں نہ جاؤ
میرے پاس رہو
میری آنکھوں کے سامنے
میرے دوستوں کے پاس

اور ہم سے سیکھو پیار بھری باتیں
اور جواباً کرو پیار بھری باتیں

تم کہیں بھی جاؤ
میرے دشمنوں کے پاس نہیں جاؤ
ان سے مت سیکھو
دشمنی کی باتیں
میری موت کی گھاتیں

تم کہیں بھی جاؤ
رات کو آ جاؤ
آدھی رات کو
پھر چاہے بند ہو جاؤ
اکیلے کمرے میں
بغیر جھری کے بند کمرے میں

تم کہیں بھی جاؤ
بس زندہ رہ جاؤ
میرے دشمنوں سے لے لو
زندہ رہنے کا ایک آسان نسخہ
چاہے اس کے ساتھ ملے
میری موت کی اک واضح ترکیب

تم میرے پاس آ جاؤ

ایسا ہو سکتا ہو
کہ ایک متوازن ترازو کے ایک پلڑے سے
میں کچھ وزن ہٹا لوں
اور پلڑا اوپر نہ اٹھے

ایسا ہو سکتا ہو
کہ ایک گہری جھیل کے کنارے
میں پانی میں اپنے عکس کے ساتھ
ایک زمانہ بتاؤں
اور پھول نہ بنوں

ایسا ہو سکتا ہو
کہ ایک جان لیوا بیماری کے ساتھ
لمبے سفر کے آخری مراحل میں
میں اس کے لیے ایک نظم لکھوں
اور وہ مجھے اس دنیا کے لیے چھوڑ جائے

ایسا ہو سکتا ہو
کہ میں اسی طرح
جیسا کہ ایک ہمیشہ موجود تصور میں ہوتا ہے
اپنے ہاتھ کا گولیوں سے بھرا پستول
اپنی کنپٹی تک لے جا کر
استعمال کروں
اور زندہ رہ جاؤں

یا ایسا ہو سکتا ہو
کہ ایک حسین صبح
تم میرے پاس آ جاؤ
اور پھر کبھی دور نہ جاؤ

ڈاکٹر مغل فاروق پرواز

آرزو کا سفر

جو دور تلک روایتی فضائے اہتمام ہے
کھو صلائے عام ہے
دوام ہی دوام ہے
تغیرات اپنی اپنی سرحدوں پہ آ گئے
کہ آرزو سفر کا کوی معرکہ شروع ہوا
کوئی نقوشِ پائے رفتگاں کے روبرو ہوا
اُس آخری سحر میں بھی
وہ درد رو نما ہوا
جو ساعت ازل سے لوحِ دل پہ تھا لکھا ہوا
کوئی تو ہو جو میری جستجو میں رنگ بھر سکے
مرے خیال کو مرے جواز رنگ کر سکے
دعا کے لفظ لفظ میں ہیں دھڑکنیں بنی ہوئی
بہت دنوں سے ایک مسئلہ اٹھا رہا ہوں میں
کہ اپنے ہونے اور نہ ہونے پر چراغ پا ہوں میں
مرے خُدا مرے جنوں پہ سادگی اتار دے

☆☆

کل، آج اور کل

اک جہاں دیدہ مسافر ہے
گزرتا ہوا پل
اک نئی سوچ کا پیکر ہے یہ دنیا ساری
ایک تہذیب کا ہر پھول ہے مُرجھایا ہوا
اس کے لہجے میں تھکن بھی تو اتر آئی ہے
یا ہواؤں نے کسی موڑ پہ سرگوشی کی
کوئی اس راہ سے گزرا ہے یقیناً جس نے
غور سے دیکھے ہیں کچھ دیر گماں کے رنگ ڈھنگ
وقت نے جب بھی کسی موڑ پہ لی انگڑائی
مجھ کے اے جانِ وفا تیری بہت یاد آئی
مجھ کو معلوم نہ تھا
گرمیٔ گفتار ہے سب
اور کیا ہوگا تیری ذات سے نسبت کا سبب
اک جہاں دیدہ تغافل تھا
وہ گزرا ہوا پل
ان کہی بات پہ رہتا تھا بھروسہ کیسا
ادھ کھلے چاند دریچے میں تھا چہرہ کیسا

لیک بہتے ہوئے آنسو بھی تو لکھنے تھے مجھے
اور بھی کام تھے کچھ ایسے جو کرنے تھے مجھے
بیچ منجدھار میں تخئیل کو تنہا چھوڑا
رُخ ہواؤں کا ترے نام سے تنہا موڑا
آج پھر عنصرِ بے باک چلا آتا ہے
آج پھر دامنِ صد چاک چلا آتا ہے
دور سے دیر تلک کوئی سنائی دے گا
وہ سرِ بامِ فلک تیری دہائی دے گا
اک جہاں دیدہ معالج ہے
جو گزرے گا وہ پل

☆☆

روزنِ یقیں

ہے حافظے میں کھنڈر کی صورت
وہ ایک عالم وہ ایک منظر
کہ ربِ انسان نے جب کہا تھا
زمین ہو گی زمین کی ہر بہار ہو گی تمہاری خاطر
گلوں میں رنگت
نسیمِ صبح کی سرسراہٹ
سمندروں کی تہوں میں پنہاں
گہر بھی ہوں کے تمہاری خاطر
غرض کہ ارض و سما میں جو کچھ بھی ہو گا ہو گا تمہاری خاطر
مگر خدائے بحور و بر نے
سبھی سے پھر اس کے بعد پوچھا
کہ کیا میں تم سب کا رب نہیں ہوں
اور آج پھر مجھ کو سامنا ہے
یہ سارا عالم، یہ ساری دنیا
یہ چار سو نفرتوں کے موسم
یہ ماؤں کی اجڑی سونی گودیں
یہ بھائی بھائی کے درمیاں جو کھڑی ہیں
یہ سب کی سب دیواریں
یہ دورِ حاضر کے ننھے مُنّے سسکتے روتے بلکتے لمحے
یہ آج پھر مجھ سے پوچھتے ہیں
کہ کیا تو ہم سب کا رب نہیں ہے
کل تو میں نے ''بلیٰ'' کے نعروں سے
خود کو محفوظ کر لیا تھا
پر آج میں گھٹ رہا ہوں میں جس میں
ہے یاس و حرماں کا ایک کمرہ
نہیں ہے جس میں یقیں کا روزن

☆☆

کارل مارکس ایک مطالعہ

زمرد مغل